THE ZAMANA, JULY 1943 — Regd. No.

زمانہ

یادگار منشی دیانرائن صاحب نگم

نمبر ۱	جولائی سنہ ۱۹۴۳ء	جلد ۸۱

فہرست

[illegible] پریس کانپور سے شائع ہوا
[illegible]





رام بالک کا

روغن سوکھا

یعنی

بچوں کے سوکھا روگ کی شرطیہ اکسیری دوا

یوں تو دنیا میں ہزاروں بیماریاں ہیں مگر یہ ظالم دشمن جان سوکھا مسان جس کو سوکھا روگ بھی کہتے ہیں بڑی بلا ہے اس نے لاکھوں ماؤں کی گودیں خالی کر دیں ہنستے کھیلتے خوبصورت بچوں کو اس دشمن نے خاک میں ملا دیا۔ اس بیماری کا حال اُن غمزدہ دکھیاری ماؤں سے پوچھیے جن کے پیارے بچے سوکھا روگ میں مبتلا ہو کر اُن کے ممتا بھرے دلوں کو داغ دے جاتے ہیں۔ سوکھا روگ کے واسطے ماں باپ طرح طرح کے کام کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں بچوں کو دغواتے ہیں سر کی رگ سے خون نکلواتے ہیں پیٹھ پر پان میں دوا ڈاکر کیڑے نکلواتے ہیں گنے کے کھیت میں لیجاتے ہیں۔ تالاب میں نہلواتے ہیں۔ جھاڑ پھونک کرواتے ہیں گلے میں گنڈے ڈالتے ہیں۔ لال تیل اور لال تیل ملواتے ہیں اور گدھی کا دودھ پلواتے ہیں۔ چونکہ بہت سے لوگوں کو سوکھا مرض کی پہچان نہیں ہوتی اور نا واقفیت طرح طرح کے علاج و تدابیر کے باوجود فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مرض بڑھتا ہی رہتا ہے اس لئے اس مرض کی معمولی علامات درج کی جاتی ہیں تاکہ تشخیص مرض میں آسانی ہو اور جن بچوں میں یہ علامتیں پائی جائیں فوراً روغن سوکھا استعمال کر کے فائدہ اُٹھایا جا سکے۔ یہ مرض عام طور سے چیت کے مہینے سے شروع ہو کر ساون بھادوں میں زور پکڑتا ہے اور اگہن کے مہینے تک رہتا ہے اس عرصے میں لاکھوں بچے اس مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سوکھا مرض میں بچہ دن بدن سست رہتا ہے حرارت قائم ہو جاتی ہے آنکھیں ہر وقت نڈھال رہتی ہیں بدن کا خون دن بدن کم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بچہ سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے۔ ہاضمہ بالکل بگڑ جاتا ہے اور بدبودار ہرے پیلے دست آنے لگتے ہیں سر کا تالو خالی ہو جاتا ہے کان کی لو دبانے سے بچہ روتا نہیں بچے کے ہاتھ پاؤں اور گردن پتلی پڑ جاتی ہے اور پیٹ بڑھ جاتا ہے کھانسی آنے لگتی ہے آنکھیں سفید ہو کر دھنس جاتی ہیں چہرہ پر جھریاں پڑ جاتی ہیں بچہ ناک کان کھجلاتا ہے بھوک مر جاتی ہے اور دودھ ڈالنے لگتا ہے جب یہ متواتر سست نظر آئے تو سمجھ لینا چاہیے کہ سوکھا روگ شروع ہو گیا ہے ایسی حالت میں فوراً رام بالک کا روغن ملانا چاہیے کیونکہ یہ تیل اس روگ کو ہمیشہ کے لئے جڑ سے کھو دیتا ہے چاہے بچے سوکھ کر کانٹا ہی کیوں نہ ہو گئے ہوں اس کے استعمال سے بچے لال لال اور موٹے تازے ہو جاتے ہیں۔ اگر سوکھا مرض نہ بھی ہو اور بچے دُبلے پتلے ہو رہے ہوں تو بھی اس کے استعمال سے بچے بہت جلد تندرست اور طاقتور ہو جاتے ہیں۔ آجکل سوکھا روگ کیلئے بازاروں میں بہت سے تیل ملتے ہیں جو جسم پر ملنے کیلئے ہوتے ہیں مگر ہمارا روغن سوکھا جسم پر ملا نہیں جاتا بلکہ پلایا جاتا ہے اسلئے اس منحوس مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور بچے کے اچھے ہو جانے پر پھر دوبارہ اس مرض کا اثر باقی نہیں رہتا بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مرض سوکھا دوا سے نہیں جاتا لیکن یہ خیال غلط ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے ہر مرض اور درد کی دوا پیدا کی ہے اور رام بالک روغن سوکھا ہزاروں بار کی آزمودہ اور مجرب دوا ہے آج تک سوکھا روگ کی اس سے بڑھ کر مفید دوا نہیں بن سکی آزمائش کے بعد آپ خود ہی ہماری صداقت کی شہادت دیں گے اور آزمائش ہی بہترین کسوٹی ہے۔

روغن سوکھا کا اشتہار نفع کمانے کیلئے نہیں دیا جاتا ہے بلکہ اس مہلک مرض سے بے زبان بچوں کی زندگی کی حفاظت مقصود ہے کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جسکا ہر عیالدار کے گھر میں رہنا نہایت ضروری ہے اور اسی لئے یہ لاگت ہی کے دام پر ضرورتمندوں کو دیجاتی ہے یعنی ایک شیشی کی قیمت صرف بارہ آنے ۱۲ ہے جو قریب قریب ایک ہفتہ تک کام آتی ہے باہر سے منگانے والوں کو خرچ پیکنگ و ڈاک خرچ خود دینا پڑیگا ایک سے تین شیشیوں تک آٹھ آنہ ۸ محصول لگتا ہے ایک شیشی پر بھی ۸ خرچ پڑیگا اسلئے کئی شیشیاں اکٹھی منگانے سے ڈاک خرچ کفایت ہوتی ہے۔ روغن سوکھا کیلئے ہر جگہ ایجنٹوں کی ضرورت ہے جن کو معقول کمیشن دیا جاتا ہے۔

المشتہر رام بالک عطار بیگم گنج والے نیاری فروش، ریل بازار کانپور

برانچ آفس بیگم گنج۔ کانپور

زمانہ

جلد ۵۱ | جولائی سنہ ۱۹۴۳ء | نمبر ۱

نظیر اکبرآبادی کا تغزّل

(از مسٹر سلیم جعفر)

کسی ایسے شاعر کی قدر و منزلت کا اندازہ کرنے میں امکاناتِ لغزش بہت کم ہوتے ہیں جس کا تخیل اپنی انتہائی حدوں تک پھیل کر بھی اقلیم سخن کا فقط ایک گوشہ ہی گھیرتا ہے کیونکہ اس کا حاصلِ زندگی گو کافی و وافی مواد و مصالح بہم پہنچاتا ہے نگاہ کو ایک ہی مرکز پر قائم رکھتا اور خیال کو ایک ہی محور پر گردش کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ خیال و نظر اس کے مختصر سے ایوان تخیل کے کونے کونے میں گھس کر اور اس کے ہر سامان کو اچھی طرح مفروضہ و مسلمہ اصول پر جانچ تول کر فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ لیکن وہ ایسے شاعر کے کلام کی تنقید و تبصرے کے وقت اکثر شکارِ فریب ہو جاتے ہیں جس کے تخیل کا تنوع اقلیم سخن کا ایک وسیع حصہ گھیرے ہوئے ہو، اور اس تنوع نے جو مختلف سامان بہم پہنچائے ہیں وہ بے ترتیب اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہوں اور ہم رنگ و ہم جنس اشیا اس طرح یک جا نہ کی گئی ہوں کہ ان میں حدِ فاصل پیدا ہو کر ان میں سے ہر ایک کو ممتاز درجہ بخش دے۔

نظیر اکبرآبادی کا کلیات ایک مجموعۂ بے ترتیب ہے اور یہ نقص اس کے کلام کے مطالعہ کرنے والوں کے آئینۂ دل پر ایک صاف تصویر کے انعکاس کا مانع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر دلوں میں ایک غلط خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ جو رائے قائم کی جاتی ہے وہ اس کی ایک ہی صنفِ کلام پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ اسکی بنا حیثیتِ مجموعی پر ہوتی ہے۔ اس قسم کی رائے میں مغالطہ ہوتا ہے کہ جس معیار پر ایک صنف جانچی جاتی ہے اسی پر دوسری بھی اور نتیجہ وہی ہوتا ہے جس کا اُس صورت میں امکان ہے کہ سیاسیات کو اخلاقیات کی کسوٹی پر کسا جائے۔

اس پر ستم یہ ہے کہ مطبعوں اور مرتبوں نے اس بے پروائی سے کام لیا ہے کہ معاذ اللہ آج تک بھی اس کا کلام

صحیح صحیح نہیں چھپا۔ مثلاً نظیر کے تعدد طبع نے "کنہیا جی کا جنم" کے ایک بند میں تین مصرع کرشن جی کے اسمائے مروجہ سے موزوں کر دیئے ہیں۔ اس مصرع کے "گوپال منوہر مرلی دھر سیکش کنتورن کنول نین" آخری دو لفظ "کنول نین" کو سب "کیول من" چھاپ رہے ہیں۔ کوئی نہیں دیکھتا کہ "کیول من" اس جگہ بے معنی ہے۔ یہاں "کنول" (یہ کمل) "نین" ہونا چاہیئے جو کہ سری کرشن جی کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اسی طرح ذیل کے مصرعوں میں:-

(۱) پھر کشن گرب نے نام رکھا سب کنبے کے آمل بیٹھے (کنہیا جی کا جنم)
(۲) کوئی کہتا بالک خوب ہوا اسے بھینا تیری نیگ رتی (”)
(۳) یہ بالے اُن کو ملتے ہیں جو دنیا میں بڑھ بھاگی ہیں (”)
(۴) گوری کا وقت ہو وے تو گاتا ہے وہ بہاس (مفلسی)
(۵) کیا چل پون نظیر یکھیو دکیا ہرن (بانسری)
(۶) مرلی بھلایا آپ کو ناری نے سُدھ تجی

"گرب" کی جگہ "گرگ"۔ "نیگ" کی جگہ "نیک"۔ "بڑھ بھاگی" کی جگہ "بڑبھاگی"۔ "بہاس" کی جگہ "بہاس"۔ "چل پون" کی جگہ "جل پون"۔ "مرلی" کی جگہ "نرنے" ہونا چاہیئے۔ مطبع اور کاتب تو خیر لیکن اگر مرتبین ذرا سی توجہ فرماتے تو یہ غلطیاں نہ ہوتیں۔ لغات انھیں بتا دیتے کہ "گرگ" نہ کہ "گرب" نے سری کرشن جی کا نام رکھا تھا۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ "نیگ رتی" بے معنی ہے اور "نیک رتی" کے معنی خوش قسمت ہیں۔ "بڑھ بھاگی" کا پہلا جز "بڑ" مخفف "بڑا" ہونا چاہیئے، کیونکہ ہندی میں اسم مکبّر "بڑ" لگا کر بنایا جاتا ہے، مثلاً "بڑدُما (بڑی دُم والا، ایک قسم کا ہاتھی)" "بڑبولا" (لمبی چوڑی ہانکنے والا) ذرا سی توجہ اس راز کو منکشف کر سکتی تھی کہ "بہاس" کسی راگ کا نام نہیں ہے اور کاتب نے "بھاس" کی مٹی پلید کی ہے۔ اُن کے فہم میں آسکتا تھا کہ شاعر بتانا چاہتا ہے کہ حیوانات وجمادات تک مرلی کی آواز سُن کر مسحور ہو جاتے تھے۔ یہ اُن کی فکر رسا سے پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا کہ مُرلی اپنے آپ کو نہیں بُھلا سکتی۔ نر اور ناری کا جوڑا ہے۔ ناری کا ذکر آیا ہے تو اس کے ساتھ نر کا ذکر بھی آنا چاہیئے۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہی چند مثالیں ہیں جو محل نظر ہیں۔ کلیات اور انتخابات کے ایڈیشنز کا مطالعہ پہلی ہی نظر میں خیال کو اس طرف لے جائیگا کہ اس قسم کی غلطیاں بکثرت ہیں، مثلاً "کنہیا جی کا جنم" میں لفظ "گرب" سنسکرت کے دو لفظوں گرو (गुरु) اور گربھ (गर्भ) کی مسخ شدہ صورت ہے۔ میرے پاس اس نظم کے دو ایڈیشنز ہیں، ایک تو وہی ہے جو بازار میں ملتا اور تجارتی اغراض کا منت کش ہے اس لئے شاعر کے کلام کا صحیح صحیح پیش کرنا اس کا مطمح نظر نہیں۔ مگر دوسرا وہ ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ قدر دانی اور ہمدردی نے اسے عرصۂ وجود میں لائی ہیں۔ دونوں کے مصرعے شاہد ہیں کہ شاعر کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، دونوں میں ہے:-

(۱) شبھ ساعت سے یوں دنیا میں اوتار گربھ میں آتے ہیں = گربھ = حمل

(۲) پیرتا یا وان ایک وقت ایسا جب آئے گرب میں من موہن = گرب = حمل

(۳) وہ ایسے ایسے کتنے ہی جو بول گربھ کے کہتا تھا = گربھ = غرور

(۴) بل بیچ گرب میں تونے سب کا رچ گیان لسایا ہے = گرب = غرور

(۵) دھن ڈھیر بہت بل بیچ ہیٹ سامان انیک اور ڈیل بڑا =

(۱)۔(۲) اگر اصل کی طرف رجوع کرنا مقصود تھا تو دونوں میں "گربھ" لکھنا چاہیئے تھا۔ اگر عوام کی زبان کی نقلیا منظور تھی تو پھر دونوں میں "گرب" ہونا چاہیئے۔ شاعر دونوں لفظ بے تکلف استعمال کرسکتا ہے۔ لیکن ایک ہی نظم میں یہ دو رنگی کوئی مقتدر شاعر گوارا نہ کریگا بالخصوص جبکہ ضروریات شعری کا بھی تقاضا نہ ہو۔ گمان غالب یہی ہے کہ شاعر کو "گرب" پسند ہوگا کیونکہ وہ عوام کی زبان لکھنا پسند کرتا ہے۔

(۳)۔(۴) خیر "گربھ" تو بصورت "گرب" بہ معنی حمل ملتا بھی ہے لیکن "گرو" بہ معنی غرور محض بصورت "گرب" ملتا ہے اس لئے (۳) میں "گربھ" کا استعمال کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ شاعر نے ضرور یہاں "گرب" لکھا ہے لیکن ہدردی وقدردانی بھی اُسے کاتب کے جور و ستم سے نہ بچا سکی۔

(۴)۔(۵) دونوں میں "بل بیچ" ہونا چاہیئے جیسا کہ (۵) کا اقتضا ہے۔ "بیچ" قطعی بے معنی نہیں لیکن اس کو "بیچ" پڑھنے سے ایک دلپسند اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۵) شاید "دھن ڈھیر" بھی غلط ہے، اور "ڈھیر" کی جگہ "دھیر" بہ معنی ہمت و استقلال ہونا چاہیئے۔ کیونکہ سیاق وسباق کلام چاہتا ہے کہ دو چیزوں کا ذکر کیا جائے "بہت" کو مؤکد کرنے کی ضرورت نہیں۔

نظیر کے کلیات کو صحیح شائع کرنے کے لئے صرف اُس دور کی زبان ہی پر نظر نہ ہونی چاہیئے جس سے اُس کا تعلق ہے بلکہ برج بھاشا سے واقفیت ضروری ہے۔ یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ کلیات کا وہ حصہ جو معتقدات ہنود سے متعلق ہے خصوصیت سے اس کا طالب ہے کہ برج باسیوں کی اُس وقت کی زبان کا علم ہو جب کہ نظیر نے اُسے لکھا تھا، اُن کی دیو مالا بھی آنی چاہیئے۔ زبان کے لئے ہندی شاعری سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور دیو مالا کے لئے پریم ساگر سکھ ساگر وغیرہ سے۔

کاش! کلام نظیر کی صحیح طباعت کا کوئی انتظام پھر ممکن ہوتا، ان کے پرجوش ہم وطن علم و فضل سے بہرہ ور ہونے کے علاوہ صاحب ثروت بھی ہیں، وہ چاہیں تو کوئی بڑی بات نہیں۔ پروفیسر شہباز کا ایڈیشن شاید اب نا پید ہے، مجھے سخت تلاش پر بھی نہ ملا۔ لکھنؤ کانپور جے پور۔ جودھ پور تک کے کتب خانوں کی خاک چھانی، دوستوں کے گلے کا ہار ہوا مگر گل مراد سے دامن مقصود پُر نہ ہوا لیکن یہ بھی تو کہتے ہیں کہ وہ بھی غلطیوں سے پاک نہیں!!

نظیر کا کلام پانچ اصناف میں منقسم ہوتا ہے:۔

(۱) غزل (۲) مناظر فطرت (۳) موعظت (۴) مذہب (۵) ظریفیات، یعنی اس قسم کی نظمیں جیسے ریچھ کا بچہ وغیرہ

سے ...

اس وقت صرف غزل زیر بحث ہے، کلیات میں بہت کم غزلیں ہیں پھر بھی اگر ان غزلوں کو الگ کر لیا جائے جنھیں خود نظیر نے تضمین وتخمیس کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے تو تعداد ۴۴ تک پہونچ جاتی ہے۔ لیکن اُن سے وہ مخمس ومسدس بھی الگ نہیں کئے جا سکتے جو اُنھوں نے اپنے مستقل مضامین پر لکھے ہیں جیسے "فراق" یا جو اوروں کی غزلوں پر مصرع لگانے سے پیدا ہوئے ہیں، مثلاً مزاج۔ قدرت۔ حافظ وسعدی وغیرہ کی غزلیں۔ اس قسم کے مسدس ومخمس بھی ۴۴ ہیں رسم عام کی تقلید منظور ہو تو جو نظمیں مذہب سے تعلق رکھتی ہیں وہ بھی انھیں سے منسلک کردی جائیں۔ دیوان "الفرد خواہ خواہ مرد آدمی" بن جائیگا۔

کہتے ہیں کہ غزل کے لغوی معنی ہیں عورتوں سے باتیں چیتیں کرنا اور اصطلاحی معنی عاشق کا اپنے معشوق کے ہجر یا وصل کے خیالات کو وسعت دیکر اس کے بیان سے دل کے ارمان یا غم کا بخار نکالنا۔ اور زبان بھی وہ کہ گویا دونوں آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن غزل حُسن کی دل فریبیوں اور دلربائیوں کے دام میں پھنسکر نہیں رہ گئی۔ اس نے متانت کا دامن پکڑکر روحانی خیالات کی پرواز کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ اسے اس پر بھی صبر نہ آیا اور اخلاق کا ہاتھ پکڑکر پاس بٹھالیا۔ اس لئے جب وہ ایرانی بزموں کو گرماتی ہوئی ہندوستانی محفلوں میں جلوہ فرد فسیوں کے لئے پہنچی تو اس کے نغمے تین اُنمیل سُروں کا مجموعہ تھے۔ اس کے سرود میں صرف حُسن کی کشش اور اس کے تاثرات کا بیان داخل نہ تھے۔ وہ سرشاران بادہ سرمدی کی موج کا نعرۂ مستانہ لگاتی اور مبلغان اخلاق کی چین ابرو کا ڈر دکھاتی تھی۔ وہ صرف سرگردانان بادیۂ مجازہی کی رفیق نہ تھی۔ جادہ پیمایان حقیقت کبھی ہمرکاب اور واعظان تزکیۂ نفس انسانی کے جلو میں تھی۔ عرصہ تک تو اس نے ایرانی لباس ہی میں اپنے ناز وکرشمے دکھائے لیکن ملکی اثرات نے ہندوستانی وضع وقطع اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ وہ ہندوستانی بنی، مگر جلد ہی اصل کی طرف رجوع کرنا پڑا اور ایک ایسے لباس میں جلوہ گر ہوئی کہ جس پر ہر لحاظ سے ایرانی رنگ غالب تھا۔ درحقیقت اسے اپنے قدردانوں کے تشفیٔ مذاق کا فکر دامنگیر ہو گیا۔ اس نے غضب ڈھایا یہ مصیبت ہماری شاعری ہی پر نازل نہیں ہوئی۔ واقف کار جانتے ہیں کہ انگلستان کے قرون وسطیٰ کا لٹریچر فرانس کے گوشۂ چشم کے اشارے پر چلتا تھا، اور چاسر۔ اور گوور کی کوششوں نے اسے پنجۂ اغیار سے چھڑایا۔

اب غزل کی نیرنگی مجبور کرتی ہے کہ اسے یہ لحاظ موضوع تین اور بلحاظ زبان وبیان دو زاویہ ہائے نظر سے دیکھا جائے یعنی اس میں اُن ہستیوں کے لئے جنکی پرواز خیال عالم ناسوت سے بالاتر نہیں، وہ سامان آتشیں ہے یا نہیں جو دل وجگر کو پھونک کر کباب کر دیتا اور سینے کو دود آہ وفغاں سے کسی ریلوے کے کارخانے کا دودکش بنا دیتا ہے اس سے وہ اہل دل جن کی نگاہیں عالم لاہوت کے جلووں کی تاب لاسکتی ہیں، تشفی وتسلی حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں اور اس میں ملکات فاضلہ کی تعلیم وتلقین کا کتنا عنصر ہے یہی نہیں بلکہ محبوب سے ہم کلامی کے وقت زبان ایرانی تکلفات سے آراستہ وپیراستہ ہے یا وہ ملکی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ معجون مرکب جسے ہم غزل کہتے ہیں اپنے ابہام

تفہیم کے لئے جن اعمال دماغی کو حرکت میں لانا چاہتا ہے، اُن کا تنوع اپنی مثال آپ ہی ہے۔

غزل اپنے لغوی و اصطلاحی حدود سے باہر قدم نکال چکی، اس کے مربی ہندی تھے مگر انھوں نے اپنے وطن سے منہ موڑ لیا ورنہ اُن کی وہ وسعت وہی فکار یا انتشار و اختلال نہ ہوتی۔ اور جس طرح ہندی کا شاعر اپنے قوائے دماغی سے مختلف متعین طور سے کام لیتا ہے وہ بھی لیتے۔ ہندی کا شاعر جب غزل سرائی کرتا ہے تو شرنگار رس میں ویراگ اور نیتی کو خلط ملط نہیں کرتا، وہ بالعموم ہر مضمون پر صاف صاف اور جداگانہ طبع آزمائی کرتا ہے۔ اس کی نظم میں دماغ شرنگار سے ویراگ اور ویراگ سے نیتی کی طرف اور پھر وہاں سے ویراگ یا نیتی کی طرف منتقل نہیں ہوتا رہتا۔ وہ ایک نظم میں ایک ہی موضوع پیش کرتا ہے اور بس سننے والا کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک ایک دوہے۔ گیت۔ چوپائی۔ یا سَوَیتے پر اکتفا کرتا ہے۔ ہماری غزل کا ہر شعر اس کا جواب ہے۔ لیکن یہاں ذکر اُس صورت کا ہے جسے غزل کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ میری نظر سے آج تک کوئی اُردو یا فارسی کا دیوان ایسا نہیں گزرا جس میں غزلیہ اشعار سب ایک جگہ جمع کردئیے گئے ہوں، تصوّف سب جگہ۔ اور تعلیم اخلاق ایک جگہ۔ میرا دعویٰ یہ نہیں کہ اُردو کے شاعروں کی بعض بعض غزلیں ایسی نہیں جن پر صرف غزل ہی کی تعریف صادق آتی ہو۔ ایسی غزلیں ہیں مگر کم، اور حکم ہمیشہ کثرت پر لگایا جاتا ہے۔ ذوق کی وہ غزلیں ملاحظہ ہوں جن کے مطلع درج ذیل ہیں:۔

او سے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا
الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے کہ آج کوچے میں خود اُس کے باقی ذنب قتلتی ہے

نظیر نے بہت کم غزلیں کہی ہیں لیکن جتنی بھی کہی ہیں سب میں اُن کے دَور کا رنگ موجود ہے۔ وہ بھی غزل کہتے کہتے وعظ کہنے لگتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

وہ رشک چمن گل جو زیب چمن تھا چمن جنبش شاخ سے سینہ زن تھا
گیا میں جو اُس بن چمن میں تو ہر گل مجھے اُس گھڑی اخگر پیرہن تھا
یہ غنچہ جو بے درد گل چیں نے توڑا خدا جانے کس کا یہ نقش دہن تھا
تن مردہ کو کیا تکلف سے رکھتا گیا وہ تو جس سے مزین یہ تن تھا
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا مشین بدن تھا معطر کفن تھا
جو قبر کہن اُن کی اُکھڑی تو دیکھا نہ عضو بدن تھا نہ تار کفن تھا
نظیر ہم کو آگے ہوس تھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

ایسی غزلیں بھی ہیں جن میں وعظ و پند نہیں:-

درجِ غم میں چشم نے گوہر اُگل کر بھر دیئے　　اشک نے جنگل کے جنگل دم میں ڈھل کر بھر دیئے
جلوہ گر محفل میں رات اُس حسن کے شعلہ کو دیکھ　　شمع داں شمعوں نے اپنے سب پگھل کر بھر دیئے
کل جو ٹک رویا کسی کو یاد کر وہ گلبدن　　اشک تھے آنکھوں میں یا موتی اُچھل کر بھر دیئے
جام کم بھرنے میں ساقی کو ذرا چھیڑا جو میں　　اُس نے اک دو چار ساغر مجھ کو جل کر بھر دیئے
ذبح کرتا تھا وہ قاتل مجھ تپش آلودہ نے　　خوں میں سب دامن کے پاٹ اسکے اُچھل کر بھر دیئے
زخمِ شانے کے تری زلفوں نے اے وعدہ خلاف　　آخرش لیت و لعل سے آج کل کر بھر دیئے
کہتے ہیں اے باغباں جتنے کہ خالی تھے چمن　　جوشِ گل نے اب کے وہ سب پھُل پھل کر بھر دیئے

اب ترے رونے کا عالم حد سے گزرا ہے نظیر
اشک نے تیرے تو سب جل تھل نکل کر بھر دیئے

لیکن نظیر مصور ہیں، تصویر کھینچتے ہیں، جس موضوع پر ہاتھ ڈالتے ہیں اُسے اس حد تک بیان کرنا اور دکھانا چاہتے ہیں کہ ایک پوری کی پوری تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ وہ مختلف موضوع پر ایک ایک شعر کہہ کر غزل میں تنوع نہیں پیدا کرتے۔ اُن کی طبیعت کا اقتضا انھیں تسلسل کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور کلام میں وہ بات پیدا ہو جاتی ہے غزل سے جس کا فقدان آج باعثِ اعتراض ہے۔ موسمِ بسنت میں معشوق "سبز پوش ہو" گل گشت کے لئے نکلا ہے، یہ والہانہ عرضِ مدعا کر رہے ہیں، اس غزل کا مطلع ہے:-

نکلے ہو کس بہار سے تم زرد پوش ہو　　جس کی نوید پہونچی ہے رنگِ بسنت کو

کہیں موقع مل گیا ہے۔ آپ نے حیلے سے خوشامد کرنے کو کہہ دیا کہ بسنت آگیا۔ محبوب نے بسنت منانا شروع کر دیا اس جشن میں جو جو سامان کئے گئے ہیں سب پر بسنتی رنگ چھایا ہوا ہے، ہر شئے زرد ہے۔ اس غزل کا مطلع ہے۔

مل کر صنم سے اپنے ہنگامِ دل کشائی　　ہنس کر کہا یہ ہم نے اے جاں بسنت آئی

چونکہ نظیر ہندی سے بہ خوبی واقف تھے، اس لئے گمان غالب ہے کہ اُنھوں نے اس غزل میں ہندی کے نایکا بھید کے ایک اصول کو پیش کیا ہو۔ وہ اصول یہ ہے کہ جس معاملے اور سین (scene) کا ذکر کیا جائے سب باتیں اُس کے حسبِ حال ہوں، کوئی بات خلاف نہ ہو، اگر ہو گی تو شعر ساقط المعیار ہو گا۔ مثلاً ایک نایکا جو دن دھاڑے دوپہر کو اپنے محبوب سے ملنے چلی ہے اور راز چھپانا چاہتی ہے ایسا بہروپ بدلے گی کہ اُسے کوئی نہ پہچان سکے، دیکھئے کس ٹھاٹھ سے چلی:

सारी जरतारी की झलक झलकत जैसी केसर को अंगराग कीनो सब तन में।
तीखन तरनि के किरनि ते दुगुन जोति जगत जवाहिर जराऊ अभरन में॥

कवि मतिराम अंग अंगार कैसी धूम कैसी धार छवि छाजत कजन में।
ग्रीषम दुपहरी में पिय को मिलन चली जानी जात नारि ना दवारि जात बन में॥

زرتاری کی ساری جگمگ جگمگ کر رہی ہے سارے جسم پر زعفرانی اوبٹن ملا ہوا ہے جواہرات اور جڑاؤ زیوروں کی چمک تیز ستاروں کی روشنی سے بھی دو چند ہے جسم کی صنو انگارہ سی معلوم ہوتی ہے دھواں سا اٹھ رہا ہے، گلے میں حبیب چھائی ہوئی ہے، کوئی نہیں پہچانتا، معلوم ہوتا ہے کہ جنگل میں آگ لگی ہے۔

اس کبت میں کسی سرخ یا سیاہ چیز کا نام لیا جاتا جس کو دوپہر کی دھوپ کے رنگ سے مناسبت نہ ہوتی اور جو اس نازنین کی پردہ پوشی نہ کرتی تو وہ ساقط الاعتبار ہو جاتا۔

ان کی طبیعت کی افتاد انھیں ایک ہی مضمون پر بار بار طبع آزمائی کے لئے مجبور کرتی ہے۔ شوخ و تشنگ معشوق کی عیاری و دلربائی کی تصویر اس مخمس میں کس چابکدستی سے کھینچی ہے، جس کا پہلا مصرعہ ہے ع

چلا جب گھر سے اِک دلبر دلوں کو حسن سے چھلنے

وہ بن ٹھن کر نکلتا ہے میاں نظیر سے مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے۔ ان دل پھینک کا دل فوراً ہاتھوں سے نکل جاتا ہے، یہ گھورنے لگتے ہیں، وہ عیاری سے چپ رہتا اور مسکراتا ہے، اس پر یہ ہاتھ پاؤں پھیلانے لگتے ہیں، وہ بگڑ جاتا ہے اور ڈانٹتا ہے، حضرت حواس باختہ ہو جاتے اور بھاگ نکلنا چاہتے ہیں، وہ ان کی گھبراہٹ پر قہقہہ کی لیتا اور کہتا ہے "چلے کہاں" یہ اور بھی گھبراتے اور گڑگڑاتے ہیں، اسے رحم نہیں آتا، زبردستی ان کا دل چھین لیتا ہے، بیچارہ ایک دل اور اس کے کمزور حامی میاں نظیر، اور مقابلہ ایک ظالم سے جس کے پاس سامان جنگ ہے اور فوج بھی۔

ایران و ہندوستان کا کون سا شاعر ہے جس نے "فراق" پر زورِ طبع نہیں دکھایا۔ اگر یہ کہا جائے کہ دنیائے عشق میں سب سے پہلے یہی ذاتِ شریف تشریف لائے اور ان کے پیچھے پیچھے ان کے جلنگی پوٹلے، آہ و فغاں، نالہ و فریاد، وحشت و جنون، صبر و شکیب، آ دھمکے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ شاید ہی کوئی غزل حضرت اور حضرت کی ذریات کے ذکر سے خالی ہوگی۔ وہ ذکر خواہ کسی انداز سے ہو۔ نظیر نے اسے ایک موضوع مستقل بنا دیا اور اس میں بھی شان انفرادیت قائم رکھی۔ ایک مخمس میں جس کا پہلا مصرع ہے ؎

ہمیشہ چاہت کی دھن ہے جس کو دل اس کا ہے مدّ چوں کا پالا

فراق کا ذکر کر کے اسے المیہ ڈرامے کا سا رنگ دیدیا، ایک اور تضمین میں جس کا پہلا مصرعہ ہے ؎

نظر آیا مجھے اک شوخ ایسا نازنیں چنچل

ایک طربیہ ڈراما سا پیش کر دیا۔ مگر شاہینِ فکر ہمیشہ پر پرواز تولتا ہی رہا۔ چنانچہ دو مسدس و مخمس اور بھی کہے یہ دونوں ترجیع بند جس کے شروع کے مصرعے میں (۱) جہاں میں نام تو سنتے تھے ہم جدائی کا۔

(۲) جب سے تم کوئے گیا ہے یہ فلک اظلم کہیں

خاص طور سے قابلِ توجہ ہیں۔ پہلے کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ فراق وحشت پیدا کر کے آوارہ و سرگرداں کر دیتا ہے، اس
ایک لطیف نفسیاتی پہلو رکھا ہے جو اس ضرب المثل کی تفسیر ہے جس کے تن پڑے پرائی وہ کیا جانے پیڑ پرائی،
خود مصائبِ فراق کا شکار ہونے سے پہلے اور گرفتارانِ فراق پر قہقہہ لگانا آسان تھا، لیکن جب خود پھنس گئے تو حقیقت
معلوم ہوئی اور اوروں کی حالت کے احساس نے بیدردی کو ہمدردی سے بدل دیا۔ دوسرے میں فراق کی وہ منزل کو
ہے جہاں اس کا ہجوم دو فورِ قوتِ عمل کو معطل اور طبیعت میں بیزاری پیدا کر دیتا ہے۔ یہ نقاش تصویر کامل مختلف موضو
کے ساتھ ہی برتاؤ کرتا ہے۔ بہت سے موضوع کی مکمل تصویریں کھینچی اور اُن کے مختلف پہلو دکھائے ہیں۔ یہاں ان
میں سے صرف چند کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:۔

گرفتاریِ دل = جس دن سے ادا مجھ کو اُس بت کی لگی پیاری
شوقِ دید = دکھلا کے جھمک جس کو ٹک چاہ لگا دیجیے۔
پاکیزگیِ حسن پرست = ہے دید فقط منظور جنھیں وہ ہو کر جب ہیکل نکلے
دلربائی مژگان (انداز = ہے دام بچھا اس کی زلفوں کے ہر اک بل میں
عیاری و دلربائی = چلا جب گھر سے اک دلبر دلوں کو حسن سے چھلنے
تقاضائے دید = کیا بات ہے جو گل رخ نظریں چھپائے ہم سے
رنگ بھنگ ہو گیا = شب کو چمن میں واہ وا کیا بہار تھی مجی
آرائشِ معشوق = رہے ہے اب تو پاس اُس شوخ کے شام و سحر موتی
شکوہ = اے صنم کرتے ہیں خوباں جو کسی پر بیداد

نظیر کی مصوری و نقاشی کے بارہ میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ کلیات کا ہر صفحہ اُن کے کامل فن ہونے کا
ہے۔ لیکن دو تصویریں جاذبِ نظر ہیں۔ دانتوں ہونٹوں کے مجموعی منظر یا تبسم کی اس کیفیت کو شاید ہی کسی نے اب
دکھایا ہو "جواہر خانۂ قدرت" اس نظم میں وہ ٹکڑا ہے کہ اربابِ ذوقِ سلیم سے سر دھنواتا ہے۔

غلط ہے اُس لبِ رنگیں کو برگِ گل سے کیا نسبت   کہ جن سے ہے عقیق اور پنّے اور یاقوت کو حسرت
اُداہٹ کچھ مسی کی اور اُس پر پان کی رنگت   وہ ہنستے ہیں تو کھلتا ہے جواہر خانۂ قدرت
ادھر لعل اور اُدھر نیلم، ادھر مرجاں اُدھر موتی

یہ ارضی سین تھا اب ایک سماوی منظر بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

شفق میں اتفاقاً جیسے سورج ڈوب کر نکلے   دیا ابر گلابی میں کہیں بجلی چمک جاوے

بیاں ہو کس طرح سے آہ اُس عالم کو کیا کہئے　　تبسم کی جھلک میں یوں جھلک جاتے ہیں دانت اُس کے
کسی کے یک بیک جس طور جاتے ہیں بکھر موتی

اگر تصوف کے معنی ہیں "از خواہش نفسانی پاک شدن و اشیائے عالم را مظہر حق دانستن" تو نظیر کے ہاں تصوف ہی تصوف ہے۔ غزلوں میں کم اور مخمسات و مسدسات میں زیادہ۔ حافظ، سعدی، سراج، قدرت وغیرہ کی غزلوں کی تضمین صاف صاف ظاہر کرتی ہے کہ نظیر نے جذبۂ صوفیانہ کے ماتحت ان پر مصرع لگائے ہیں لیکن وہ ہمیشہ انگلی پکڑ کر ہی نہیں چلے ہیں کہ ان کی نسبت کہا جائے کہ حافظ وغیرہ کی غزلوں کے اقتضا نے انھیں تقلید پر مجبور کیا۔ خود انھوں نے بہت سی نظمیں ایسی کہی ہیں، جو اُن کے صوفیانہ جوش و خروش پر دال ہیں۔ ذیل کے ترجیع بند وغیرہ اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

کیا علم انھوں نے سیکھ لیا جو بن لکھے کو جانچے ہیں
تنہا نہ اسے اپنے دل تنگ میں پہچان
نے خاص نہ دنیا میں کوئی عام رہے گا

تصوف کی جو تعریف سطور بالا میں درج ہے وہ اخلاق یا تزکیۂ نفس پر بھی حاوی ہے۔ شاعر نے طرح طرح سے بے ثباتی دنیا کا نقش دل پر بٹھانا چاہا ہے۔ علاوہ اُن نظموں کے جن کے عنوان صاف صاف بتاتے ہیں کہ ان کا مقصد کیا ہے اُس نے قصے کہانیوں کے ذریعہ سے بھی یہ درس دیا ہے۔ مثلاً :۔

(۱) گر شاہ سر پر رکھ کر افسر ہوا تو پھر کیا　(۲) دنیا میں کوئی شاد کوئی درد ناک ہے۔ (۳) قصۂ ہنس (۴) کلجگ (۵) بنجارہ وغیرہ۔

نظیر اُن دیگر اصناف کلام پر بھی قدرت رکھتے تھے جنھیں غزل تو کسی معنی میں نہ کہنا چاہئے لیکن باتباع رسم و رواج ان کا ذکر غزل کے ساتھ آتا ہے اور یہاں بھی کرنا ضروری ہے۔ قصیدے کے سوا مثنوی، شہر آشوب، واسوخت، سب کچھ اس کلیات میں موجود ہے۔ ان کے زمانے میں مثنوی بہت ہی پست حالت میں تھی۔ ایسے ایسے خدایان سخن جیسے مرزا و میر۔ ان کی مثنویوں کی نسبت بھی زمانۂ قدیم کا ایک معتبر نقاد کی رائے یہ ہے۔ ایک کے لئے کہتا ہے کہ "عاشقانہ مثنویاں ان کے مرتبہ کے لایق نہیں" اور دوسرے کی تعریف سے بھی تعریض کی بو آتی ہے "بعض بعض لطف سے خالی نہیں۔ ان میں شعلۂ عشق اور دریائے عشق نے اپنی خوبی کا انعام شہرت کے خزانہ سے پایا۔ مگر افسوس یہ کہ میر حسن مرحوم کی مثنوی سے دونوں پیچھے رہیں۔ مرزا کی نسبت زمانۂ حال کے ایک نقاد کی رائے ہے" مثنویاں کہنے کو ۲۴ ہیں مگر ایک بھی ڈھنگ کی نہیں ہے سب نہایت پھسپھسی بے جان اور بے کیف ہیں۔ "میر صاحب کو سارٹیفکیٹ دیتا ہے مثنوی اپنے عہد کی بہترین نہیں [غالباً کاتب نے یہاں غلطی کی اور "ہیں" کی جگہ "نہیں" لکھدیا] مگر بعد میں اس صنف میں اس قدر ترقی ہوئی کہ اب میر صاحب کی مثنویوں کے لئے کوئی خاص جگہ نہیں دی جاسکتی"۔ قصہ لیلیٰ مجنوں بھی

اپنے عہد کی ایک یادگار ہی یادگار ہے، لیکن اگر اسے ان استادوں کی مثنویوں کے پہلو بہ پہلو رکھا جائے تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ نظیر کے کمال پر اس سے حرف نہ آئیگا۔ یہ توقع کہ وہ اپنے زمانے سے اس قدر آگے نکل جاتے کہ ایک صدی بعد کے اخلاف کی صف میں نظر آتے ایک ایسی امید ہے کہ جسے زمانے نے شاذ و نادر ہی پورا ہونے دیا ہے۔ خیال میں وہ عمق یا ہمہ گیری ممکن ہے جو کسی تصنیف کو حیاتِ جاوید عطا کرے۔ لیکن زبان کی انقلاب پسند فطرت کا بخل اس کو کبھی گوارا نہیں کرتا۔ مثنوی کا پلاٹ ایک حیثیت جسے محک امتحان پر کسا اور یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ جس قصے پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے، اُس سے کہاں تک مطابقت ہے۔ لیلےٰ مجنوں کا پلاٹ بالکل سادہ ہے اور بظاہر جن قصوں پر اس کی بنیاد ہے ان سے اختلاف نہیں رکھتا۔

مستزاد ایک ہی ہے، واسوخت فارسی میں ہیں، شہر آشوب بھی ہے، لیکن شہر آشوب کے علاوہ حبِّ وطن کے بہت سے ثبوت موجود ہیں۔ (۱) اکبرآباد کی تعریف، آگرہ کی تیراکی، تاج گنج وغیرہ اس کی شاہد ہیں۔

غزلوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر ایک زندہ دل شاعر تھے، اور ان میں نالہ و فغاں، آہ و بکا کی جسے عرفِ عام میں سوز و گداز سے تعبیر کرتے ہیں کمی ہے۔ درحقیقت ان کا سوز و گداز ان کی صوفیانہ نظموں میں منتقل ہو گیا ہے۔ اُن کے دل پر نقشِ بے ثباتیِ دنیا ایسا گہرا بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے وہ دائع وہی اپنی پوری قوت سے اسی وقت کام کرتے تھے جب ساغرِ دل مئے عرفاں سے لبریز ہوتا تھا۔ تصوف کے علاوہ جو کچھ اُنھوں نے کہا ہے وہ محض ان کے رنگا رنگ ہمہ گیر دماغ کے ضمنی عمال کے نتائج ہیں۔ ان کے اعمال قوائے ذہنی کی اصلی مظہر صوفیانہ نظمیں ہی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وجدانِ روح دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر نکلا اور اس کے حقیقی تاثرات میں گہرا رنگا ہوا ہے۔ ایسی نظمیں سوز و گداز، متانت اور شکوہ سے معرا نہیں ہیں، بلکہ ان کا مایۂ امتیاز یہی ہے۔ یہ دو نظمیں جن کے بندوں کے پہلے مصرع ہیں:-

(۱) کیا علم انھوں نے سیکھ لیا جو بن لکھے کو بانچے ہیں۔

(۲) پڑھ علم کئی اس دنیا میں گر کامل ذی ادراک ہوئے

پڑھیے اور دیکھیے کہ دل پر کیا اثر ہوتا ہے۔

نظیر اس عہد میں ہوئے ہیں جب فارسی کا دور دورہ تھا، اُردو نے اپنی ہستی کے اعتراف پر مجبور کر دیا تھا لیکن طبائع اسے فارسی لباس میں جلوہ گر دیکھنا پسند کرتی تھیں۔ اس کی ترقی کے آرزومندوں کی نگاہیں ایران پر لگی ہوئی تھیں، وہ زبان کے موجودہ مواد و مصالح کو کام میں لا کر اسے عروج کی منزلیں طے کرانے کی فکر میں نہ تھے بلکہ ان کی تمام کوششوں کی غایت یہ تھی کہ اس کی آراستگی و پیراستگی عاریت و گدائی سے کی جائے یعنی اس کے ظاہر و باطن کو جہاں تک ہو سکے فارسی سے ملا دیا جائے۔ انھوں نے ہندی یا ہندی کے ذریعہ سنسکرت سے استفادے سے دریغ کیا۔ اس باب میں ان کے غلو کا یہ عالم تھا کہ ہندوستانی سین تک چھوڑ دیئے، اس کوشش میں نظیر تقلیداً شریک تھے مگر انھوں نے جادۂ اعتدال سے قدم باہر

نہیں نکالا اس لئے ان کی زبان و بیان سے قیدِ ایرانِ فارسی کو تشفی نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنے اشعار کو سطحِ عام سے بلند ہونے دیا اور زبان کو اس کا ہم عنان رکھا۔ مگر ان صورتوں میں جبکہ غیروں کی غزلوں کی تضمین کی ہے رنگ سے رنگ ملانے کی کوشش میں انھیں قابلِ داد کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ خسرو اور سراج کی مشہور غزلوں کی جن کے پہلے مصرع ہیں:۔

(۱) اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آذری۔

(۲) خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔

تضمین دیکھئے، زبان کا یہ رنگ ہے ؎

کب لالہ و گل کر سکیں عارض سے تیرے ہمسری — قد سے خجل سروِ سہی رفتار سے کبکِ دری
ہیں خلق میں ہر سو عیاں رنگیں ادا زیبا صنم — گلگوں قبا نازک بدن سو زیب و زینت سے بہم
آیا نظر جس روز سے تجھ سا شکر لب مہ لقا — ابرو کماں، جادو نظر تیر پری سحر و عشوہ زا
کھلی جبکہ چشمِ دلِ حزیں تو وہ تم رہا نہ تری رہی — ہوئی حیرت ایسی کچھ آن کر کہ اثر کی جلوہ گری رہی
ہوئیں دل کو کیا ہی فراغتیں گئی قید جب سے لباس کی — نہ ہوائے اطلس و کلبدن نہ تلاش بافتہ و زری رہی

اس کے بعد اُس غزل کو دیکھئے جو خسرو کی اس غزل پر لکھی ہے جس کا مقطع ہے ؎

گفتم کہ حوری یا پری گفتا کہ من شاہ و بتاں — گفتم کہ خسرو ناتواں گفتا پرستارِ من است

نظیر کی غزل کا مطلع ہے ؎

کہا جو ہم نے ہمیں در سے کیوں اُٹھاتے ہو — کہا کہ اس لئے تم یاں جو غل مچاتے ہو

خسرو کی غزل میں معشوق کے جوابوں میں شوخی ہے وہ اُن کی غزل میں بھی پائی جاتی ہے لیکن جن تضمینوں کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے ان سے اس غزل کی سطح پست نظر آتی ہے۔ ان کا مسلک بھی وہی معلوم ہوتا ہے جو بنگال کے مشہور ناول نویس شرت چندر چٹرجی کا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں عوام کے لئے لکھتا ہوں اور ٹیگور فلسفیوں کے لئے۔ نظیر عوام کے لئے شعر کہتے تھے اور اُن کے معاصر دلدادگانِ فارسی کے لئے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعی غلط ہوگا کہ ان کے کمال کی سطح پست و محدود تھی۔ انھوں نے ایک غزل صنعت واسع الشفتین میں کہی ہے۔ اس کا پہلا مصرع ہے ؎ آیا نہیں جو کر کے اقرار ہنستے ہنستے۔ حافظ، سعدی اور اساتذۂ اُردو کی غزلوں کی قابلِ داد تضمینیں کی ہیں۔ ایک مسدس میں جو شکوۂ محبوب پر مشتمل ہے یہ غضب کیا ہے کہ سعدی، حافظ، صائب، نظیری، آصفی اور وحشت کا ایک ایک شعر لے کر مصرع لگائے ہیں اور مقطع کے بند میں اپنے فارسی شعر پر چار مصرع لگا کر حسبِ عادت شکوہ کی ایک مکمل تصویر پیش کر دی ہے۔ نظیر کے کمال پر یہی ایک مسدس شاہد نہیں ہے، وہ ہفت زبان تھے۔ اس کا ثبوت انھوں نے ایک مخمسے میں دیا ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے

اور جو اس مصرع سے شروع ہوتا ہے ؎

ہمیشہ چاہت کی دُھن ہے جس کو دل اُس کا ہے سو دِچوں کا پالا

ہندی کے تو وہ عالم تھے اس لئے خیال ہوتا ہے کہ اس کے بعد کی دو تضمینوں میں جن کے ابتدائی مصرع یہ ہیں:۔

(۱) نظر آیا مجھے ایک شوخ ایسا نازنیں چنچل

(۲) مجھے اے دوست تیرا ہجر اب ایسا ستاتا ہے

فارسی کے شعر اور ہندی کے دو بے انھیں کی تصنیف ہیں، پہلے ترکیب بند کے آخری شعر میں ان کا تخلص موجود ہے (نظیر این حرف چوں گفت آں نگارِ دلستانِ من) اس لئے اس کے تمام فارسی شعروں کا انھیں مصنف ماننا خلافِ عقل نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے ترکیب بند کے فارسی اشعار کی نسبت محض قیاس ہی سے کام لے سکتے ہیں کیونکہ وہاں اس قسم کی کوئی شہادت نہیں ملتی جو قیاس آرائی کو مدد دے لیکن وہ تو فارسی میں بھی بے تکلف شعر کہتے تھے پھر کیوں نہ ان شعروں کو انھیں سے منسوب کریں، رہے ان ترکیب بندوں کے دو ہے۔ قیاس کا میلان اسی طرف ہے کہ یہ نظیر ہی کے تراوشِ کلک ہیں اور ان کے مصنفوں کی تلاش کی جھکنڈن میں نہ پڑنا چاہیئے کہ وہ کوہ کندن و کاہ بر آوردن سے زیادہ نہیں۔ مگر ان میں سے بعض نے ضرب المثل کا رتبہ حاصل کر لیا ہے اس لئے اس خیال کی بھی گنجایش ہے کہ یہ اوروں کے ہوں۔ بہرصورت اس وقت انھیں تشنۂ تحقیقات ہی چھوڑ نا بہتر ہے

ایک ایسا شاعر جو اپنے کلام کی سطح کو فہمِ عوام سے بالاتر نہیں جانے دیتا، اس کے ہاں بکثرت ایسے شعر ملیں گے جن کے مصرعوں کے لفظوں کی ترتیب بالکل وہی ہو یا اس سے بہت ہی قریب ہو جو روزمرۂ عوام ہے۔ نظیر کا کلام اس کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ ہو۔

(۱) خدا کے واسطے اتنا تو جھوٹ مت بولو کہیں نہ ٹوٹ پڑے آسمان کوٹھے پہ

(۲) ہم تو کیا ہیں دل فرشتے کا بھی کافر چھین لے ٹک جھمک دکھلا کے پھر انگیا چھپالی آپ کی

(۳) ہنسے روئے پھرے رسوا ہوئے جاکے بندھے چھوٹے غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبت کے مزے لوٹے

(۴) ہزاروں گالیاں دیں پھر ذرا مسکرا اُدھر دیکھا بھلا اتنی تسلی سے پھپھولے دل کے کب پھوٹے

ان کے ہاں محاورات کی بھی کمی نہیں:۔

(۱) ندان میرے ہی آکر گلے کا ہار ہوا

(۲) وہ جس دم مسکرایا پھر تو میں خوش ہو کے کھل کھیلا

(۳) یہ کافر اُن کی بھی چھاتی پہ مونگ دلتے ہیں

(۴) موتی کی آب پانی پانی ہے۔

ضرب الامثال کو بھی اپنے مصرعوں میں ترکیب دے جاتے ہیں:۔

(۱) تو کہا جو نیکی ہووے تو پھر اس کا پوچھنا کیا

(۲) وقت تو جاتا رہا پر بات باقی رہ گئی

(۳) آگے کو رکھ نہ ناتھ نہ پیچھے کو رکھ پگا

(۴) چہ نسبت خاک را با عالم پاک

فارسی ترکیبیں بھی خاصی تعداد میں ملتی ہیں:۔

(۱) ہیں جو وہ کشتۂ شمشیر نگاہِ قاتل

(۲) کمند زلفِ پُرخم نے بھی گردنِ دل کی پھر جکڑی

(۳) اے ہوسناک یہ ہے میکدۂ قدس مقام

(۴) پرواز میں ہم شہپرِ عنقائے نظر ہیں۔

(۵) یہ تو ہے معدنِ انوار و یقیں صدق و صفا

کلیات ہندی الفاظ کے استعمال سے بھرا پڑا ہے، بخوفِ طوالت دو مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے:۔

حشمت کے چمتکار بناتے ہیں اسی سے

اس روپ سے ہے حسن فسوں کا رہتیا

جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے نظیر کا لفظیات وہی ہے جو اس کے معاصرین کا تھا۔ لیکن کلیات بحیثیت مجموعی شاہد ہے کہ اس وصف میں وہ ان سے بہت بڑھے ہوئے تھے، مثلاً کبوتر بازی، پیراکی وغیرہ پر جو نظمیں ہیں وہ پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ہمارا لکھنے والا وہ وہ لفظ و محاورات لکھ رہا ہے جو معمولی تو معمولی بڑے بڑے شاعروں کے اکتساب کے دسترس سے باہر ہیں۔

کلامِ نظیر کی تنقید و تبصرہ کے وقت اس بات کو نظر انداز کرنا بے انصافی ہے کہ جو رعایتیں سودا اور میر کے ساتھ کی گئی ہیں، وہ بھی ان کے مستحق ہیں، سودا کے حالات میں پروفیسر آزاد لکھتے ہیں:۔

"بے شک ان کی غزلوں کے بھی اکثر شعر چستی و درستی میں قصیدے کا رنگ دکھاتے ہیں۔"

متقدمین اور متاخرین کے کلاموں کا مقابلہ کرنے والے کہتے ہیں کہ ان کے دفتر تصنیفات میں ردی بھی بے انتہا ہے ... اس رائے میں مجھے بھی شامل ہونا پڑتا ہے۔"

"ایسے زمانہ کے کلام میں رطب و یابس ہو تو تعجب کیا، ہم اس الزام کا بُرا نہیں مانتے۔"

میر کے حالات میں کہتے ہیں:۔

"میر صاحب کو شگفتگی یا بہار عیش و نشاط، یا کامیابی وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا، وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے اُس کا دکھڑا سناتے چلے گئے"

"غزلوں کے دیوان اگرچہ رطب ویابس سے بھرے ہوئے ہیں مگر ان میں جو انتخاب ہیں وہ فصاحت کے عالم میں انتخاب ہیں۔ اُردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آئے ہیں کہ ستّر اور دو بہتّر نشتر ہیں، باقی میر صاحب کا تبرک ہے"

شاعر اپنی فطرت کے خلاف نہیں چل سکتا اور زیادہ تر کلام اعلےٰ درجہ کا نہیں ہوتا۔ اور شاعروں کی طرح یہ نظیر پر بھی صادق آتا ہے، فطرت انھیں مصوری کی طرف مائل کر دیتی ہے اور اُن کی سادگی زبان میں وہ وصف پیدا ہو جاتا ہے جو غزل کی جان ہے۔ ان کے مخمس و مسدس دیکھئے، کیا وہ واقعی بے تکلفانہ اپنے محبوب سے باتیں چیتیں نہیں کرتے؟

اب نظیر کے متعلق مستشرقین انگلستان کی رائے بھی سُن لیجئے۔ ڈاکٹر ڈبلیو ایس۔ فالن، اپنی تالیف "نئی ہندوستانی انگریزی ڈکشنری" کے دیباچہ میں ۱۸۷۹ء میں لکھتے ہیں:۔

"تحریری ادب میں کلام نظیر سے سب سے زیادہ اقتباس لئے گئے ہیں، یہی ایک اصلی ہندوستانی شاعر ہے جو یورپین معیار حقیقی شاعری پر پورا اُترتا ہے، اور جسے اُس کے ہم وطن پرستاران الفاظ، شاعر ہی تسلیم نہیں کرتے"

"نظیر ہی ایک شاعر ہے جس کے شعر عوام تک پہونچے ہیں، لوگ اس کی نظمیں گلی گلی کوچہ کوچہ گاتے پھرتے ہیں خاصکر اس کے وطن آگرہ میں۔ جو مشنری اُس کی نظموں سے واقف ہیں وہ اس کے اور کبیر کے کلام کی چاشنی سے اپنے سر بازار وعظوں میں بہت اثر پیدا کر دیتے ہیں۔ نظیر میں دل و دماغ کے وہ تمام اوصاف تھے جو باکماروں کے طرۂ امتیاز ہیں۔ اس کی نظمیں ہی اس کے سوانح حیات ہیں کیونکہ اس آئینہ میں اس کی جیتی جاگتی تصویر مع اس کی انفرادیت کے نظر آتی ہے۔ اگرچہ اس کی تصویر کھینچنے کے لئے اور مواد و مصالح نہیں ملا لیکن چند باتیں نمایاں طور سے سامنے آجاتی ہیں۔ اُسے "آزاد" ہونے کا دعویٰ تھا اور بجا تھا۔ مدعی تو بہت ہیں مگر وہی واقعی رند مشرب تھا جو رنج و راحت دنیا سے آزاد تھا۔ اُسے قسمت کے تبسم یا چین جبیں کی پرواہ نہ تھی وہ متوکل اور مستغنی تھا مگر بہرصورت وہ کسی کی طرف توجہ نہ کرتا تھا، ہاں دُور ہی سے عورتوں کی تعریف سے دریغ نہ تھا۔ نہ مساعدت زمانہ سے خوشی ہوتی تھی اور نہ اس کی نامساعدت سے افسردہ خاطر ہوتا تھا، جیسا کہ اس نے خود کہا ہے، اپنی کھال میں مست تھا۔ اُس نے اپنے کلام کو محفوظ رکھنے کی کبھی پرواہ نہ کی۔ کہتے ہیں اُس کی عادت تھی کہ اپنے خیالات کو قلمبند کیا اور پھینک دیا، دوستوں شاگردوں میں سے جس کا جی چاہے اٹھا لے جائے۔

"نہایت وسیع معنی میں وہ بہت ہی آزاد، اوپجنل، فلسفی اور وسیع النظر تھا۔ وہ طرح طرح کی نظمیں اس کی رنگ برنگی طبیعت کا آئینہ ہیں جو اُس نے مختلف مضامین پر لکھی ہیں۔ جو نظم کہ اُس نے معمولی معمولی باتوں سے پیدا کر دی ہے وہ دیگر شعرا کو نصیب نہیں ہوئی۔ اسے اُس کے ہم وطن اُس کے شاعر نہ ہونے کا ثبوت سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اُس نے آٹے دال لکھی۔ مچھر پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس کی ہمہ رنگیٔ طبع اور پروازِ تخیل کا مظہر وہ نظمیں بھی ہیں جن میں اُس نے ایک ہی مضمون کو مختلف پہلوؤں سے دکھایا ہے۔ اُس کی نظمیں ایک مرقع ہیں جس میں سیر و تماشا، عیش و عشرت، رنج و غم اور ہندوستانیوں کے احساسات و جذبات کی بولتی تصویریں ہیں۔

"نظیر فطرت و جذباتِ انسانی کے ہر پہلو کو بخوبی سمجھتا تھا، اُسے ہر چیز میں خیر ہی خیر نظر آتی تھی، سارا جہان خوش تو وہ بھی خوش، اُسے اُس کے کھیل تماشوں اور خوشیوں میں مزہ آتا تھا، اس کے کرب و تعب سے تڑپ اُٹھتا تھا وہی ایک ہندوستانی شاعر ہے جس نے بچوں پر نظم لکھی ہے، وہی ہے جو غریبوں اور بدنصیبوں کی قسمت پر آنسو بہاتا ہے، ادنیٰ طبقے کی بیکسی دیکھکر اُس کے دل میں ٹیس اُٹھتی ہے، اس کی ایک اعلیٰ نظم ہے "آدمی نامہ" اُس کے آخری شعر میں کس شریفانہ انداز میں کہا ہے

اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیرؔ — اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

پاک عشق کا کیسا اچھا نقشہ کھینچا ہے، وہ اسی کا حصہ ہے۔ اس کے نام سے جو کلیات شائع ہوئے ہیں وہ اعلیٰ نظموں سے خالی ہیں، وہ اُن آزادوں کی زبان سے سننے میں آتی ہیں جو شہر شہر مارے مارے پھرتے ہیں یا ان جاہلوں سے جنھیں اُس کے کلام میں اپنے دل کی دھڑکنیں محسوس ہوتی ہیں۔ ان جاہلوں کو اسی طرح اپنی پسند کی نظمیں زبانی یاد ہیں جس طرح مدعیان علم و فضل کو اپنے پسندیدہ شعرا کا کلام۔ جاہلوں کی بہت بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو ان ہر دلعزیز شعروں کو گھنٹوں سنا کرتی ہے، لکھے پڑھے اپنی پسند کے نقلی و لفاظ شعرا کا جن پڑھے ہونے کا انھیں دعویٰ ہے، کلام اتنی دیر تک اور اس ذوق و شوق سے نہیں سُنتے جتنی دیر اور جس ذوق و شوق سے یہ جاہل نظیرؔ کا کلام سُنتے ہیں۔

س کی طبیعت کی نفاست اور تحریر کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ جب تکمیل و صحت تصویر کا تقاضا ہوتا ہے کہ بتذل تصویریں کھینچے تو اس پر ایسا اچھا پردہ ڈال دیتا ہے کہ اس کے ہم وطنوں کی بھی جو ذو معنی طرز بیان گو کے بہت ہی عادی ہیں، نگاہیں اسے پار نہیں کر سکتیں۔ جب کسی ادنیٰ جذبہ کا اظہار مطلوب ہوتا ہے کہ کا نقش معرض تحریر میں لایا جائے تو وہ ناظرین کی توجہ پاک و لطیف تصویر پر مرکوز کرکے ناپاک کثیف ویر کو اتنی دیر تک دماغ میں قائم نہیں رہنے دیتا کہ اصل الذکر کا اثر زائل ہو جائے۔ بعض بعض ذرا سے بھی متبذل مضمونوں پر قلم اٹھانا پڑتا ہے مگر ان میں ایسی شوخی و مذاق بھر دیتا ہے کہ کثافت و ظرافت

وظرافت کا پردہ پڑ جاتا ہے اور پڑھنے والے کے منہ سے واہ واہ نکل جاتی ہے۔

نظیر نے نادری زبان سے بدرجۂ اتم استفادہ کیا ہے اور اُس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا بڑا حصہ قابل مطالعہ ہے اس کے خیالات کا عمق اور وہ ترتیب الفاظ کہ جس کے عذبہ ایک لفظ دوسرے کے معنی میں جان ڈال دیتا ہے اور انھیں روشن کر دیتا ہے، اتنے ہی زیادہ منکشف ہوتے ہیں جتنا کہ غور و خوض کیا جائے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی عالم جن کی رسائی فہم ناقص ہے اور محض لفظوں پر مرتے ہیں نظیر کا مطلب سمجھنے سے اکثر قاصر رہتے ہیں، اور یہ لوگ اس کی ترتیب الفاظ کا مخصوص محل استعمال اور اُس کے مطالب سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ یہ وہ شاعر ہے جس کی ہوا تک یورپین طلبار کو نہیں لگتی کیونکہ ہندوستانی عالم اور شاعر اس کا نام ہی نہیں لیتے۔"

تعلیم یافتہ طبقہ نظیر کی قدر و قیمت کی تمیز سے بے بہرہ ہے، وہ ناسخ کا پُجاری ہے جس کی تشبیہات و استعارات کو حقیقت سے دُور کا واسطہ بھی نہیں اور جس کی زبان محض عربی و فارسی کے الفاظ اور ان محاورات کا ایک طومار ہے جس میں ہندی کا ایک آدھ لفظ اس لئے رکھ دیا جاتا ہے کہ اسکا خارج کرنا ممکن نہ تھا۔"

ڈاکٹر گراہم بیلی اپنی تصنیف "تاریخ اُردو ادب" میں لکھتے ہیں:-

"جیتے جی نظیر کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا، مرنے کے بعد بھی عرصہ تک یہی حال رہا لیکن شکر ہے کہ مذاق تنقید میں تبدیلی کی وجہ سے اُن چھ یا سات شاعروں میں گنے جانے لگے ہیں جو اہم مرتبہ سودا ہیں۔ معاصرین سے موازنہ کیا جائے تو وہ پابند رسم و رواج نظر نہیں آتا اور عام فارسی کے طریقوں سے گریز کرتا ہے۔ ان تصویروں کو چھوڑ کر جو دلدادگانِ فارسی کو مرغوب و مطبوع ہیں وہ جس ملک میں رہتا ہے اُسے بیان کرتا ہے، اس کے بسنے والوں اور ان کے مشغلوں کا حال لکھتا ہے۔ اسے فارسی کے عالمانہ خیالات اور فارسی کی بھرمار سے نفرت تھی۔ وہ بے تکلف ہندی کے لفظ استعمال کرتا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاملات کی نقاشی کرتا تھا۔"

ڈاکٹر بیلی نے نظیر کو اس گروہ شعرار میں داخل کیا ہے جس نے پُرانے مضامین کو نئے لباس میں پیش کیا اور کوئی حقیقی ترقی نہیں کی۔ یہ اُن کی اپنی رائے ہے مگر اس کے مضامین ہی جب نئے ہیں اور اس قسم کے جن پر اس سے پہلے کسی نے قلم نہیں اُٹھایا تو پھر اسے کسی کے ساتھ کیوں رکھا جائے اور وہ کیوں انشا اور مصحفی کے حلقہ میں زبردستی شامل کیا جائے۔

"تتلی"

(جناب بدری ناتھ شاطر الہ آبادی)

اری تتلی تجھے کیا ہو گیا ہے　　یہ کس کی جستجو میں مبتلا ہے
ٹھہرتی ہی نہیں دم بھر کہیں تو　　جدھر اُٹھتی ہیں نظریں ہے وہیں تو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا ترا راز　　ہمیشہ رہتی ہے مصروفِ پرواز
تجھے کس باغباں کی جستجو ہے　　کہ محوِ لطفِ سیرِ رنگ و بُو ہے
نرالی شان کی ہستی ہے تیری　　عجب تُو ہے عجب مستی ہے تیری
شرابِ ناب پی کر جھومتی ہے　　دہن ایک ایک گل کا چومتی ہے
ذرا سے پر کے بھی رُتبے بڑے ہیں　　کہیں ہیرا کہیں موتی جڑے ہیں
رسیلی ہے، سجیلی ہے، رنگیلی　　ہری، اُودی، کبودی، لال، پیلی
ہزاروں طرز لاکھوں ڈھنگ ترے　　خدا رکھے ہیں کیا کیا رنگ تیرے
نہ مسکن ہے نہ کوئی آشیاں ہے　　ٹھکانا اور تیرا گھر کہاں ہے
اگر جگنو کی زینت رات سے ہے　　تو دن کا حُسن تیری ذات سے ہے
غضب کے ناز آفت کی ادائیں　　ہوائیں کیوں نہ لیں بڑھکر بلائیں
یہ آئی ذہن میں تشبیہ معقول　　تجھے میں جان لوں اُڑتا ہوا پھول
جو ٹوبلے سے زمیں پر گر پڑا ہے　　ہوا کی گود میں اب کھیلتا ہے

نظر شاطر کی ہے خود داریوں پر
تعجب ہے تری گل کاریوں پر

تصحیح

زمانہ مئی ۱۹۴۳ء میں صفحہ ۲۴ پر جو نظم "میرے ساقی" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے اُس کے آخری بند میں لفظ "کچھوا" کے بجائے "کچھ" شائع ہو گیا ہے۔ ناظرین اسکو درست کرکے یوں پڑھیں "چھُپے گھبرا کے کچھوا جیسے اپنے خول کے بل میں"

آواز

(از پنڈت اندرجیت شرما، ماچھرہ ضلع میرٹھ)

پیاری اماں جب تھپک کر تو سلاتی ہے مجھے — گونج کر تاروں میں اک آواز آتی ہے مجھے
گنگنا کر خوابِ شیریں سے جگاتی ہے مجھے — یاد اِک بھولے ہوئے گھر کی دلاتی ہے مجھے
پیاری اماں جب تھپک کر تو سلاتی ہے مجھے

اے مری اماں بتا دے کس کی وہ آواز ہے — جس کا دنیا کی صداؤں سے عجب انداز ہے
کون ہے پردہ میں وہ کس کا طلسمی ساز ہے — اس طلسمی ساز میں کیا بھید ہے کیا راز ہے
اے مری اماں بتا دے کس کی وہ آواز ہے

پر لگا دے تو مرے میں اُڑ کے جاؤں گا ابھی — تاروں کے جھرمٹ میں اس کو دیکھ آؤں گا ابھی
بھید سب معلوم کر کے اس کا لاؤں گا ابھی — کیا ہے وہ کیسی ہے وہ تجھ کو سناؤں گا ابھی
پر لگا دے تو مرے میں اُڑ کے جاؤں گا ابھی

جذباتِ بسمل

(حضرت بسمل الہ آبادی)

دل اگر سرفراز ہوتا ہے — ناز محوِ نیاز ہوتا ہے
جو حقیقت میں راز ہوتا ہے — نام اُس کا مجاز ہوتا ہے
عشق کی فتنہ سازیاں کیسی — حسن ہی فتنہ ساز ہوتا ہے
ہر طرح کا گناہ دنیا میں — مجھ سے بندہ نواز ہوتا ہے
دیکھنا یہ ہے بتکدے میں ہمیں — کون محوِ نماز ہوتا ہے
عشق میں امتیاز کچھ بھی نہیں — حسن میں امتیاز ہوتا ہے

آنیوالا ہے بسمل بدمست
درِ مے خانہ باز ہوتا ہے

تخلیق عالم کے مختلف عقائد

(از جناب محمد حسین صاحب)

تاریخ تمدن کا پہلا باب اہل مصر کی تہذیب سے شروع ہوتا ہے، انھیں مہذب قوموں کے "بابا آدم" ہونے کا منصب رفیع حاصل ہے تکوینِ عالم کا مسئلہ ہر تہذیب اور مذہب کی توجہ کا مرکز رہا ہے، اس واسطے مناسب یہی ہے کہ اہل مصر ہی کے معتقدات سے اس باب کا افتتاح کیا جائے۔ کتبات اور آثار قدیمہ ان کے عقیدۂ تکوین پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے، ان کے منھ پر مہر سکوت لگی ہے۔ مگر آثار و قرائن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ یہ تھا:۔

پتاہ Ptah or Phthah نے جس کے معنی ہیں "توڑنے والا" اور جو حرارتِ عالم یعنی Cosmic Fire کا مالک تھا بیضۂ عالم کو توڑ کر دنیا کو پیدا کیا۔ مگر آفرینشِ عالم کا اصلی کام را (Ra) دیوتا نے انجام دیا جو آمن را (Amen or Ammon Ra) دیوتا کا اوردہ تھا اور جیسے پتاہ (Ptah) نے پیدائش عالم کے واسطے سامان بہم پہونچایا تھا۔ عوام را (Ra) کو سورج دیوتا مانتے ہیں مگر کاہن اور محقق اُسے روح عالم سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ابتدا میں اس نے سمندر کو مشتعل کر دیوتا اور انسان پیدا کئے۔ (Thoth) توتھ دیوتا چاند دیوتا ہے اور یہی آفرینش کا اصول اول مانا گیا اور اس کے ساتھ آٹھ توتہائے عالم کی بھی پوجا کی جانے لگی جو "سے سلو" کہلاتی تھیں، اور "اور کی زبان" دیوتا ان سب کا مظہر تصور کیا جاتا تھا۔ (ملاحظہ ہو "کوائف ماضیہ" (Records of the Past)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد دوم صفحہ ۴۴ پر مرقوم ہے کہ Ra دیوتا نے بذات خود دنیا کو پیدا کیا

فرانسیسی محقق اثرات موسیو تنول نے اس باب میں بہت ہی دلچسپ تحقیق کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اہل مصر کے خیالات اس مسئلہ میں بہت حد تک یہودیوں کے تخیل سے ملتے جلتے ہیں۔ چنانچہ دونوں قوموں کا اس پر اتفاق ہے کہ سب سے پہلے (۱) ہیولیٰ اور روح الٰہی عرصۂ وجود میں آئے، اور (۲) سورج سے پہلے نور پیدا ہوا، اور (۳) خدا خالقِ کائنات ہے یہ تو تھے اہل مصر کے خیالات۔ اب اہل فنیشیا (Phoenicians) کے خیالات و عقائد سنئے جنھوں نے ان کے بعد تمدن میں ترقی کی اور جن کی جہازرانی آج تک مسلمہ ہے، ان سے ایجادات اور اختراعات میں ہمسری کا دعویٰ[1] کرنا چاند پر تھوکنا ہے۔ اس مسئلہ پر اہل فنیشیا کا جو عقیدہ تھا اُس سے ہم پر یہ روشن ہوتا ہے کہ انسانی عقل نے تہذیب کے ابتدائی دور سے گذر کر تہذیب کے دورِ دوئم میں کتنی حیرت انگیز ترقی کر لی تھی۔ اہل فنیشیا کے عقیدہ کی نسبت مشہور جرمن فلاسفر ہیگل بنیاتھون لکھتا ہے:۔

[1] تاریخ عالم جلد اول دیباچہ مطبوعہ ٹامس لندن سنہ ۱۹۰۷ء

"ابتدا میں تاریکی اور ایک قسم کی کثیف ہوا تھی اور ہیولیٰ کی طرح ہر طرف محیط تھی، اس کی وسعت کی کوئی حد نہ تھی، قرنوں تک اس کی یہی حالت رہی مگر جب اس ہیولیٰ نے اپنے اصول اولیٰ سے ارتباط پکڑا اور دونوں میں خوب موافقت اور اتحاد ہوگیا تو یہ "پوتاس" کہلایا اور اسی سے آفرینش عالم ہوئی مگر ہیولے اپنی ابتدا اور اصل سے بالکل بے بہرہ تھا، جب وہ ہوا سے ہلا تو "موٹ" پیدا ہوا جسے بعض کیچڑ کا اور بعض ترکیب آبی کا فضلہ کہتے ہیں۔ اس سے عالم کا تخم برآمد ہوا اور اسی سے بالآخر عالم کی پیدائش ظہور میں آئی بعض جاندار بھی پیدا ہوئے جو حس سے محروم تھے ان سے ذی عقل جانور پیدا ہوگئے جو آسمانوں کے دیکھنے والے سمجھے جاتے تھے وہ بیضہ کی صورت میں تھے۔ "موٹ" سے آفتاب عالمتاب پیدا ہوا اور اسی سے چاند ستیارے اور دیگر اجرام فلکی و علوی وجود میں آئے، بحر و بر پر ہوا کے پُر حرارت اثر سے جاندار وجود پذیر ہونے لگے تو کرۂ باد اور افلاک بھی معرض وجود میں آئے۔ جب آسمان سے پانی اُترا تو دریا جھیلیں وغیرہ بن گئیں اور جب آفتاب کی طرح سے ان میں انتشار پیدا ہوا تو وہ اپنے اصلی ظرف کو چھوڑ کر اور اطراف میں پھیل گئے کرۂ ہوا میں ان سب کا ایک دوسرے سے تصادم ہوا اس سے کڑک اور برق پیدا ہوئی، بجلی کے دھاکے سے ذی عقل جانور چونک اُٹھے اور سخت خائف ہوگئے۔ بحر و بر پر نر اور مادہ چلنے پھرنے لگے ــــ"

فلکی خیالات تکوین جن کی تحقیق فرانسیسی محقق ارلنسٹ رینوا اور جرمن محقق نے کی ہے نہایت دلکش اور دلچسپ ہیں، یہودی خیالات بحیثیت ہمسایہ کے ان خیالات سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں، مگر چونکہ دونوں ایک دوسرے کے ہمسایہ ہیں اس واسطے ان کے خیالات کی مطابقت کچھ زیادہ حیرت زا نہیں ہے۔

اہل فنیشیا کے بعد اہل آکاد (Accadians) کا نمبر ہے، آکاد بابل کا نام تھا مگر انجیل میں بابل کو شینار (Shinar) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اور قدیم ترین تاریخوں میں اس کا پرانا نام سُمیر (Sumer) ملتا ہے جو ابتدا ایک شہر کا نام تھا اور بعد کو بمعنی تمام ملک کے واسطے استعمال ہونے لگا۔ تاریخی حیثیت سے حروف تہجی کی ایجاد اور ترقی تمدن کا سہرا ان کے سر ہے۔ اور اُن کا شمار اُن قوموں میں ہوتا ہے جنہوں نے دنیا کی ترقی میں تعمیری اور بنیادی کام کیا ہے۔ کچھ دنوں بعد ایک راعی بادیہ گرد قوم نے متحد ہوکر اہل آکاد پر چڑھائی کی اور انھیں فتح کر لیا مگر بجائے اس کے کہ ان کے ایوان تہذیب و تمدن کو مسمار کرکے اپنے رسم و رواج کو ان سے قبول کرا لیتے خود ہی ان کی تہذیب اور ان کے رسم و رواج کے گرویدہ ہوکر مفتوح قوم کے رنگ میں رنگ گئے۔ اور ان کی تہذیب کی برتری آج بھی ان کتبوں اور دفینوں سے ظاہر ہوتی ہے جو نینوا (Nineveh) کے کھنڈروں سے سال بسال وقتاً فوقتاً برآمد ہوتے رہتے ہیں۔ مگر یہ سب کے سب کتبے اس امر کا کوئی جواب نہیں دے سکتے کہ اہل آکاد تخلیق و تکوین عالم کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے مگر قیاس اور آثار بتلاتے ہیں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ:۔

"موجودات کی تخلیق کا واحد ذریعہ پانی تھا۔ اسے حرکت دینے کے واسطے ایک خالق کی ضرورت ہوئی وہ اسی کے بیچ میں سے نکلا اور اُس نے دنیا و آخرت کو اس کی موجودہ شکل میں مرتب کردیا۔ مبدائے عالم ایک عجیب ہستی تھی جسے ہیولیٰ اور اُصول اولیٰ پر اختیار حاصل تھا۔ اس خیال کی رو سے علت العلل ایک آلہی ہستی ٹھہرتی ہے"

آکادیوں کے زمانۂ تہذیب کے بعد اہل بابل (Babylonians) نے دنیائے تہذیب میں اپنا سکہ چلایا۔ ان کے خیالات آکادیوں کے خیالات سے تاریک تر گوشۂ لاعلمی میں مستور ہیں۔ اگر اس زمانے میں کوئی ان کے خیالات کو ہم تک پہونچاتا ہے تو وہ ایک بابلی پروہت براسوس (Berosus) (۳۸۰-۲۶۰ ق.م) کا تاریخی ذخیرہ ہے، مگر فلاسفر اور محققین اس کے بیانات کی صحت کو بنظر شک دیکھتے ہیں، حالانکہ یہ پروہت خود کوئی محقق و مورخ نہ تھا محض حق کا متلاشی اور اُس کی تلاش میں سرگرداں تھا، اور بابل کے شاہی کتبات خشتی کے کتب خانوں اور دیگر ممتاز لائبریریوں تک اس کی رسائی تھی۔ حال ہی میں جان اسمتھ (John Smith) کی ان تھک کوششوں اور کاوشوں سے خط میخی کے کتبے پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بڑے بڑے محقق بھی براسوس کے ذخیرہ کو تاریخی وقعت دینے کے لئے کسی حد تک تیار ہوگئے ہیں۔ براسوس خط میخی کا ایک اعلیٰ درجہ کا ماہر فن تھا۔ اور اسی مہارتِ فن کی بدولت بابل میں بہت قابل پروہت مشہور تھا۔ حالانکہ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں اس کے بیانات میں بہت کچھ ردوبدل ہوچکی ہے مگر "سائن لیس" وغیرہ کی کوششوں کی بدولت (جو اُنھوں نے براسوس کی تصانیف کو محفوظ کرنے میں صرف کیں) براسوس کی تصانیف کا کثیر حصہ ہم تک پہونچا ہے۔ براسوس کی کتاب میں جو خیالات تکوین عالم کی بابت ظاہر کئے گئے ہیں وہ یہودیوں کے خیالات سے بہت کچھ مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں چند باتیں خاص طور پر لکھی ہیں مثلاً: وہ ایک ابتدائی سیلاب کا ذکر کرتا ہے اور اُسے "تھاؤ آتھ" کے نام سے پکارتا ہے جو اہل مصر کے Thoth یعنی چاند دیوتا کے نام سے ملتا ہے اور عناصر کو پیدا کرنے کا تذکرہ بھی بہت بسوط و تشریح کیا ہے، اس نے ابتدائی سمندر کے جانداروں کا ذکر کیا ہے جس میں سمندر سے مراد "ایتھر" اور جاندار سے مراد سیارے[1] ہیں۔ ابتدا میں ہر جگہ اندھیرا اور پانی تھا جس کے اندر خوفناک عفریت رہتے تھے، اس برہمی میں بیل دیوتا داخل ہوا۔ ابتدائی پانی کے سمندر کو پھاڑ ڈالا اور تاریکی کے حصے کئے معمولی جانور عفریتوں کی جگہ آن موجود ہوئے۔ پھر انسان پیدا ہوا اور سورج چاند اور پانچ سیارے بھی پیدا کئے گئے[2]۔

اسوریہ کا نہایت باعظمت اور مشہور بادشاہ اسرتی پال ساتویں صدی قبل مسیح میں گذرا ہے۔ اسوریہ کے دارالحکومت نینوا سے جو خشتی ذخیرہ اور کتبات برآمد کئے گئے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ بادشاہ بڑا علم دوست تھا اُس نے ایک شاہی کتب خانہ قائم کیا تھا جس میں خشتی ذخیرہ بہت زیادہ جمع کیا گیا تھا جتنی اینٹیں اور کتبات ابتک محققین کے

[1] تاریخ عالم جلد اول دیباچہ ص۷ [2] نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا جلد پنجم صفحہ ۴۵

ہاتھ لگی ہیں ان میں ایک مکمل سلسلہ تکوین عالم کے متعلق ہونے کا گمان ہوتا ہے جس کی صرف بارہ لوحیں دستیاب ہوئی ہیں، مگر وہ بھی کسی اصل کی نقل سمجھی جاتی ہیں۔ جارج اسمتھ (George Smith) کہتا ہے کہ اصل نسخہ سنہ ق۔م کا ہے۔ اور دو ہزار قبل مسیح کا زمانہ لکھنے پڑھنے کا ابتدائی عہد تھا۔ Smith نے ان خشتی لوحوں کو پڑھکر انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے اور یہی ذخیرہ ہے جس سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ اہل آسوریہ اور نینوا کے باشندے تکوین کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے۔ اس عقیدۂ تکوین کی مطابقت یہودیوں کے بیان سے ہوتی ہے، دونوں قومیں خلقت کی ترکیب و ترتیب کے متعلق یکزبان ہیں اور ہر دو متکلم دیوتا کا ظہور میں آنا مانتے ہیں، دونوں ہی کہتے ہیں کہ طوفان نے نمودار ہو کر دنیا کو تباہ کر دیا اور دونوں قومیں خلقت کی تکمیل اور خوبی پر خالق کا اظہار خوشنودی کرنے پر عقیدہ رکھتے ہیں، دونوں سیاروں سے تعین زمانہ ہونا یعنی دن رات، مہینے سال، قرن کی میعاد، اجرام فلکی کی گردش کے مطابق قرار پانے پر ایمان رکھتے ہیں۔

اہل بابل کے بعد اہل ہند نے مشعل تہذیب روشن کی۔ اہل ہند کے خیالات تکوین ہم زیادہ واضح صورت میں دیکھ سکتے ہیں، مگر ہندوؤں کے نظریوں اور عقائد میں اختلاف اور افتراق کے ساتھ ساتھ ان کے تصور تخلیق میں بھی اختلاف ہے، ہمیں ان پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی ہے، اس سلسلہ میں کئی عقائد کو پیش کرونگا اور اس کے واسطے "ہندو فلاسفی" مطبوعہ کلکتہ سے امداد لونگا۔ ویدک نظریۂ تکوین ملاحظہ ہو:

"آدی[۱] میں نہ ہست تھا نہ نیست۔ نہ کرۂ باد تھا نہ آسمان، اس وقت نہ حیات تھی نہ ممات، اُس وقت دن اور رات کا امتیاز نہ تھا، واحد ہستی قائم بالذات موجود اور آہستگی سے دم لیتی تھی۔ اس سے جدا اور اس سے بالا کوئی اور شے نہ تھی۔ یہ ہستی ابتدا میں تاریخی ظلمت میں پوشیدہ تھی جو نا قابل شناخت پانی تھا۔ واجب الوجود عدم شے میں لپٹا ہوا موجود تھا۔ تپ کی طاقت سے اس نے نشو و نما پائی، اس کے اندر خواہش پیدا ہوئی جیسی بدھی کا ابتدائی بیج موجود تھا جسے رشیوں نے اپنی عقل سے ہست و نیست کے درمیان سمبندھ[۲] قرار دیا ہے"

"دین حق کی تحقیق" جو انگریزی کی ایک عالمانہ اور محققانہ کتاب ہے، اس کا مصنف صفحہ ۱۷-۱۸ پر رگ وید کے ایتریہ آرنیہ (ऐतरेय आरण्य) کا ترجمہ درج کرتا ہے:۔

"ابتدا میں یہ برہمانڈ[۳] کیول آتما تھا اس کے سوا کوئی جاندار اور بیجان شے نہ تھی، اُس نے سوچا کہ میں عالم پیدا کرونگا اس لئے اس نے مختلف دنیائیں پیدا کیں، پانی، روشنی، جاندار وغیرہ۔ اُس نے یہ خیال کیا کہ درحقیقت یہ عالم ہیں، میں ان کے محافظ بھی پیدا کرونگا، اس نے پانیوں میں سے کچھ نکالا اور ایک شخص بنایا اُس نے اُسے دیکھا اُس کا منہ کھل گیا جیسے انڈا پھٹ گیا منہ سے باڑی[۴] اور باڑی سے آگ نکلی، نتھنے پھولے اور سانس نکلا

۱ے آغاز ۲ے تعلق۔ واسطہ۔ ۳ے بیضۂ عالم صرف روح ۴ے گویائی۔ کلام

اور سانس سے ہوا پیدا ہوئی، اس کی آنکھیں کھلیں، ان سے شعاع نکلی اور اس سے سورج پیدا ہوا، اس کے کان چوڑے ہوگئے، اس سے قوت سمع پیدا ہوئی، اور اس سے خلا کے تمام خطے بن گئے، خلانے وسعت اختیار کی اس سے بال پیدا ہوئے اور اس سے گھاس جڑی بوٹیاں اور درخت پیدا ہوئے، سینہ پھٹا اور اس سے عقل نکلی اور عقل سے چاند وجود پذیر ہوا، ناف پھٹی اور اس سے کھانے کی طاقت نکلی جو موت کو وجود میں لانے کا باعث ہوئی۔ آلہ تناسل پھٹا اور اس سے جان والا تخم پیدا ہوا اور اس سے سمندر بنے"۔۔۔۔ الخ

یجر وید اس سلسلہ میں بتاتا ہے :۔

"اس نے اپنا ثانی پیدا کرنے کی خواہش کی فی الفور مرد و عورت ہم آغوش پیدا ہوگئے، اس نے اپنی ذات کے دو حصے کر لیے، مرد و عورت بن گئے۔ اس طرح بنی آدم وجود میں آئے۔ عورت کو حجاب معلوم ہوا اور گائے بن گئی مرد نے اس سے بیل بن کر وصل کیا اس طرح گائیں پیدا ہوئیں۔ پھر وہ گھوڑی بنی اور یہ گھوڑا، اس طرح گھوڑے پیدا ہوئے۔ اسی طرح یہ دونوں مختلف جانوروں کی صورتیں اختیار کرتے گئے اور انواع پیدا کرتے رہے"۔ الخ

اسی کتاب میں اسی وید کے حوالے سے درج ہے :۔

"ابتدا میں سمندر تھے، یہ دنیا شروع میں پانی تھی، خداوند عالم ہوا بنکر چلا پھرا کرتا تھا، اس نے اس زمین کو دیکھا خود سور کی شکل اختیار کر لی اور اسے اپنے اوپر سنبھال لیا پھر بوار بنکر زمین کو ترکیب دی وہ مشہور اور یہ پرتوی بنی، اس وجہ سے اسے نام دیا گیا۔"   الخ

اب تک صرف ویدوں کی تفریق اور اختلاف ظاہر کیا گیا ہے اب ویدوں کے کچھ مستقل قصوں اور ویدوں کے متن کے اختلافی عقائد پر طائرانہ نظر ڈالتا ہے۔ براہمن (ब्राह्मण) کے لغوی معنی ہیں گیت یا زمزمے۔ گیت یا منتر۔ ان براہمنوں کے معنی ہیں جو ہر وید کے ساتھ ضمیموں کی شکل میں شامل ہیں، ان میں مراسم عبادت، نجات اور نروان کے اہم مسائل پر بسیط تبصرے ملتے ہیں، براہمنوں کا عقیدۂ تکوین کا خلاصہ ڈاکٹر ولیم ڈیکر نے اس طرح کیا ہے :۔

۱۔ ابتدا میں عدم وجود تھا۔

۲۔ دیوتاؤں کے دل میں اسرار کے علم کی خواہش پیدا ہوئی اور سات مختلف قسم کے انسان پیدا کئے۔

۳۔ انھوں نے کہا ہم سات آدمیوں کو پیدا نہیں کرسکتے آؤ ایک آدمی بنالیں، اس طرح انھوں نے سات آدمیوں کا ایک ہی بنا دیا۔

۴۔ یہ انسان خدا بن گیا وہ قربان گاہ پر آگ کے طور پر رکھا گیا۔

Hindu Philosophy ۵۱

۵۔ اُس نے چاہا کہ میں اپنے کو بڑھاؤں، میں اپنے کو پیدا کروں، چنانچہ اُس نے ریاضت کی اور مناجات کی جسے متنِ وید قرار دیا جاتا ہے۔

۶۔ اس نے کلمہ سے پانی پیدا کیا خلا ہی خلا تھا کلمہ اسی کا ہے اُسی نے پیدا کیا ہے اور وہ عالم کے اندر محیط ہے۔

۷۔ اُس نے چاہا کہ میں پانیوں سے پیدا ہو جاؤں، وہ وید کو لیکر پانی کے اندر داخل ہو گیا جس میں سے ایک بیضہ نکلا، اُس نے اُسے چھوا اور تین مرتبہ کہا "یہ ہو جائیگا" اس سے ارتھنا بنی اور یہ رچا بتی (خداوندا) ہی برہمانڈ تھا

۸۔ واچ (کلمہ) اس کی رفیق تھی، اس نے اس سے وصل کیا اور وہ حاملہ ہو گئی اور دُور بھاگ گئی اس سے مخلوقات وجود میں آئی وہ برہمانڈ میں ملکر غائب ہو گئی۔

اب رہے ہندو صوفیوں کے خیالات جو اپنشدوں کے قائل ہیں، اپنشد صحیائے فلسفۂ وید کے پہلے اور آخری لباب ساغر ہیں، اور اگر دلدادگانِ تصوف کے لئے وید کے کسی حصہ میں سامان وارفتگی مل سکتا ہے تو وہ اپنشدوں ہی کا حصہ ہے۔ وہ فلسفۂ "ہمہ اوست" کی تعلیم دیتے ہیں، جو ہمارے مسلمان صوفیا کے عقیدہ سے مطابقت رکھتا ہے۔ رگ وید کے اپنشد میں لکھا ہے:۔

"ابتدا میں روح تھی اُس نے خیال کیا میں کچھ پیدا کروں اور اُس نے خلا پیدا کیا اور پھر پانی روشنی اور انسان پیدا ہوئے خلا آسمان کے اوپر ہے، کرۂ ہوا میں روشنی ہے اور زمین پر انسان ہیں" ...... الخ

مبدأ عالم نے خیال کیا یہ عالم ہیں اور عالم کے محافظ دیوتا ہیں، میں ان کے لئے اب خوراک پیدا کروں گا۔ اُس نے پانی میں دیکھا وہاں سے "روپ" نکلا پھر پرماتما پرش یعنی خداوند نے یہ خیال کیا "یہ میرے بغیر کیسے جی سکتا ہے" اُس نے اپنے دل میں سوچا کہ میں کس راستے سے اس کے اندر داخل ہوں اُس نے کھوپڑی کے دو ٹکڑوں کو الگ کیا اور داخل ہو گیا اس طرح پرماتما انسان کے جسم میں جاکر روح انسانی بن گیا۔ انسان نے عناصر کی دیکھ بھال کی اور کہا۔

"میں اپنے سوا یہاں اور کس کے وجود کا اعتراف کر سکتا ہوں مبدائے عالم پر دھیان جمایا اور کہنے لگا

"اسے میں نے دیکھ لیا"

اس واسطے اسکا نام (وہ دیکھا ہوا) ہوا جو بعد ازاں اندر کہلانے لگا یجروید کے برہدارنیکیہ (बृहदारण्यक) میں یہ لکھا ہے:۔

"یہ برہمانڈ مع مختلف شکلوں کے مبدائے عالم تھا، اس نے چاروں طرف اپنے سوا اور کچھ نہ پایا اور کہا "میں ہی میں ہوں" اس واسطے اس کا نام "میں" رکھا گیا ...... جیسے مکڑی جالا تنتی ہے جیسے پودے زمین پر اُگتے ہیں اور جیسے سر اور دھڑ پر بال نکلتے ہیں اسیطرح ہر ایک شے ناقابل وجود سے نکلکر وجود پذیر ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ برہم ہی برہم ہے اسی سے نکلتا ہے اور اسی سے قائم ہے اسی میں غائب ہو جاتا ہے۔ برہمانڈ سے آگ نکلی جسکا منبع سورج ہے، چاند سے بارش کا دیوتا نکلا اور اس سے زمین کی جڑی بوٹیاں پیدا ہوئیں اس طرح مبدائے عالم سے بہت سے جاندار پیدا ہوئے جیسے چاند ستارے۔ سچ جھوٹ عالم و مافیہا دریا پہاڑ سمندر روئیدگی۔ الغرض سب چیزیں اسی سے وجود پذیر ہوئیں۔ برہمانڈ مبدائے عالم تھے۔ اعمال حسنہ دعا اور سدا کا جیون سب اسی سے ہے۔"

مجھے تم یاد آتے ہو!

(از حضرت یکساں اکبرآبادی)

قریبِ عارضِ گُل جب کوئی بُلبُل چہکتی ہے
کبھی جب حُسن کے جلووں سے بجلی سی چمکتی ہے
خمار آلود آنکھوں سے کبھی جب مے برستی ہے
مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

کوئی دھیمے سُروں میں راگ جب گاتا ہے اُلفت کا
کوئی تاروں پہ جب نغمہ سُناتا ہے محبت کا
صبا گل کے لئے پیغام جب لاتی ہے عشرت کا
مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

کبھی جب شمع تک اُڑ کر کوئی پروانہ آتا ہے
تپِ سوزِ دروں سے جان کو اپنی گھُلاتا ہے
محبت اور وفا کوشی کا اِک منظر دکھاتا ہے
مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

کبھی جب اشکِ شبنم عارضِ گل پر جھلکتے ہیں
کبھی برسات کی راتوں میں جب تارے دمکتے ہیں
چمک جگنو کی ہوتی ہے شرارے سے چمکتے ہیں
مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

فضا میں ابر آ کر جب کبھی موتی لٹاتا ہے
زمیں سیراب ہوتی ہے ہر اِک ذرّہ نہاتا ہے
کبھی فرطِ مسرت سے جو غنچہ مسکراتا ہے
مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

بہار آکر چمن میں اپنا جب سکّہ بٹھاتی ہے
نسیمِ صبح جب خوابیدہ غنچوں کو جگاتی ہے
صبا میٹھے سُروں میں جب حسیں نغمے سناتی ہے
مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

تصوّر سے ترے جب میں کبھی دنیا بساتا ہوں
تو پھر خود کو شباب و شعر کے عالم میں پاتا ہوں
وفورِ بیخودیِ شوق میں پھر گنگناتا ہوں
مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

غزل

(مسٹر منظور حسین خاں مضطر نعمانی، ایم اے، لکچرار فیض عالم کالج میرٹھ)

خاک ہو جانا کلیدِ راز ہے
زندگی اِک دُکھ بھری آواز ہے

دل کی خلقت راز اندر راز ہے
جانے کیا مفہوم مینا ساز ہے

بوالہوس! نیرنگیِ اعجاز ہے
تیری نظروں میں حریمِ ناز ہے

میری صورت دیکھ کر واضح ہوا
خامشی اِک آہ کا انداز ہے

بیخودی ہے خامیِ دل کا ثبوت
ہوش کھو جانا شکستِ ساز ہے

حُسن مصروفِ تماشا کیوں نہ ہو
پر نہیں ہے ہمّتِ پرواز ہے

عقل اور روداد جبر و اختیار
عشق ہے اور آپ کی آواز ہے

سازِ دل ہے وقفِ صوتِ سرمدی
آہ کو درکار اک دم ساز ہے

کر چکی تکمیلِ مشقِ بازگشت
میری ہستی غیب کی آواز ہے

ہستیِ مضطر جہانِ عشق میں
درد کی اِک آخری آواز ہے

"بیٹا"

ایک ایکٹ کا مختصر ڈراما

(از پروفیسر عبدالحی، ایم۔ اے، بی۔ ای۔ ایس، کلکتہ)

افراد ڈرامہ:۔

(۱) نرنجن داس ——— ایک ادھیڑ عمر کا متوسط درجہ کا آدمی،

(۲) نرملا دیوی ——— اُس کی بیوی،

(۳) نریش چندر ——— نرملا کا بیٹا،

(۴) نریندر ناتھ ——— ایک سادھو،

(۵) ایک طوطا

(طوطا پنجرہ میں بند ہے، نرملا دیوی اُس کے پاس بیٹھی آپ ہی آپ یوں باتیں کر رہی ہے)

نرملا دیوی:۔ آہ پنچھی، تو اب پنجرے میں بند ہے، میرے پتی تجھے بازار سے ایک روپے میں لائے تھے، تیری آزادی چاندی کی ایک ٹکلی میں بک گئی۔ آہ تو اب آسمان سے زمین پر آگیا، تیرے پر پُرزے بیکار ہوگئے، تاروں کی چمک تجھ سے چھن گئی، ندیوں کا بہتا ہوا پانی تیری نظروں سے اوجھل ہوگیا، ہرے بھرے اور لدے پھندے درختوں پر تیرا بیٹھنا اب ختم ہوگیا، تیری بولی بھی اب وہ نہ رہی، اور تیرا جوڑا بھی نہ رہا۔ تیری آنکھیں کتنی اُداس ہیں، آہ بچارے بپتا کے مارے پنچھی تو کتنی بے بسی سے پنجرے کی سیخوں پر بار بار اپنی چونچ مارتا ہے، کیا تو پھر آزادی کا سانس لینا چاہتا ہے؟ لیکن اب کیا فائدہ؟ تو ایک بار قید ہو چکا ہے، مجھے تجھ پر ترس آتا ہے۔ آہ پنچھی! آہ پنچھی! گھبرا مت۔ میں بھی تیری طرح ایک قیدی ہوں، دُکھیاری ہوں، بپتا کی ماری ہوں۔ (گاتی ہے) گانا

"انھیں جی سے میں کیسے بھلاؤں سکھی! ——— مرے جی کو جو آکے لبھا ہی گئے
مرے من میں وہ پریم بسا ہی گئے ——— مجھے پریت کا روگ لگا ہی گئے
کیئے میں نے ہزار ہزار جتن ——— کہ بچا رہے پریت کی آگ سے من
مرے من میں اُبھار کے اپنی لگن ——— وہ سینہ کی اگن لگا ہی گئے
کبھی سپنوں کی چھاؤں میں سوئی نہ تھی ——— کبھی بھول کے دُکھ سے میں روئی نہ تھی
مجھے پریم کے سپنے دکھا ہی گئے ——— مجھے پریم کے دُکھ سے رُلا ہی گئے

رہے رات کی بات سدھار گئے — مجھے سپنا سمجھ کے بسار گئے
میں تھی ہار گلے سے اُتار گئے — میں دِیا تھی، جیسے وہ بُجھا ہی گئے
اُنھیں جی سے میں کیسے بُھلاؤں سکھی — مرے جی کو جو آ کے بُجھا ہی گئے"

(نرملا دیوی کا لڑکا نریش چندر آتا ہے)

نریش :۔ ماں ! ماں ! ماں !!!

نرملا :۔ ہاں میرا چاند، میرا موتی، میرا ہیرا، میرا لعل، میرا بیٹا،

نریش :۔ ماں، سنو، میرا جی چاہتا ہے کہ میں بادل بن جاؤں اور ہوا میں اُڑوں،

نرملا :۔ (اُسے پیار کرتے ہوئے) ہاں بیٹا، میں جانتی ہوں،

نریش :۔ ماں، کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں بارش کا پانی بن جاؤں، اور کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں دھواں بن کر اُڑ جاؤں۔ کبھی میں چاہتا ہوں کہ پھول بن جاؤں، کبھی میں چاہتا ہوں کہ بجلی بن جاؤں"

نرملا :۔ ہاں بیٹا، ایسا ہی ہوتا ہے، پر کیا کریں، ہم جو چاہتے ہیں وہ ہوتا نہیں۔

نریش :۔ ماں، ماں، سُنو، اگر میں جگنو بن جاؤں تو پھر کیسا ہو؟

نرملا :۔ ہاں بیٹا، پھر تم بہت سندر معلوم ہو گے۔

نریش :۔ اچھا، ماں، اگر میں کتے کا بچہ بن جاؤں (وہی کتے کا بچہ جو پتاجی نے آج گولی سے مار دیا) تو پھر کیسا ہو؟ اور ہاں، ماں، یہ تو بتاؤ، کہ پتاجی کی آنکھیں ہر وقت لال کیوں رہتی ہیں؟ تمھاری آنکھیں تو لال نہیں، یہ تو مجھے بہت ٹھنڈی ٹھنڈی لگتی ہیں، پر پتاجی کی آنکھیں تو ہر وقت چتا کے انگاروں کی طرح سلگتی ہیں، اور دیکھو نا، بھلا پتاجی نے میرا ننھّا سا کتا گولی سے کیوں مار دیا؟

نرملا :۔ اچھا اب اس بات کو جانے دو، آؤ اپنی ماں کو پیار دو۔ (اُسے پیار کرتی ہے)

نریش :۔ ماں، ماں، کیا پتاجی تم کو بھی مارتے ہیں؟

نرملا :۔ پگلا، ایسی بات نہیں کرتے، سُنو، کل دیوالی ہے، ہم اپنے گھر میں بہت سے دیئے جلائیں گے!

نریش :۔ (خوش ہو کر ہنستے ہوئے) ہاں میری اچھی ماں جی، تم کتنی اچھی ماں ہو؟

نرملا :۔ ہاں بیٹا۔

نریش :۔ مگر پتاجی مجھے اچھے نہیں لگتے۔

نرملا :۔ دیکھو بیٹا، کل ہم دیئے بھی جلائیں گے اور مٹھائی بھی کھائیں گے۔

(ایک آدمی شراب کے نشہ میں بدمست کمرے میں داخل ہوتا ہے، یہ نرملا کا شوہر نرنجن داس ہے)

نرنجن:- ہا ہا ہا ہا، دیس! یہ تم ابھی کیا کہہ رہی تھیں کہ کل ہم دیئے جلائیں گے؟ تم کیسی باتیں کرتی ہو؟ کیا تم پگلی ہو؟ دیوالی تو آج ہے، لاؤ آج ہی سب دیئے جلاؤ، لاؤ، جلدی کرو۔

نرملا:- آپ ہر بعد اتنی شراب پی کر بیہوش کیوں ہو جاتے ہیں؟

نرنجن:- کیا؟ شراب! آہ، شراب پی کر ہی تو میں ہوش میں آتا ہوں۔

نریش (اپنی ماں نرملا سے کہتا ہے) ماں، ماں، مجھے بہت نیند آرہی ہے۔

نرنجن (لڑکے کے پاس جاتا ہے اور جھک کر اس کا منھ سونگھنے لگتا ہے) ابے پاجی! تیرے منھ سے تو شراب کی مہک آرہی ہے! کیا تو چھپ کر پیتا ہے؟ کتا کہیں کا! اسی لئے تو ایسی بکواس کیا کرتا ہے کہ کبھی تیراجی ٹڈا بننے کو چاہتا ہے اور کبھی جگنو بننے کو، کبھی مرغا بننے کو۔ اور کبھی مرغی بننے کو کبھی کچھ اور کبھی کچھ! شرابی کہیں کا! اور تیری ماں کہتی ہے کہ میرا بیٹا بڑا سُندر ہے، یہ نہیں جانتی کہ شرابی ہے، منھ سے مہک آتی ہے!

نرملا:- شراب کی مہک تو آپ کے منھ سے آرہی ہے!

نرنجن (غصہ سے) چپ رہ! تجھے معلوم ہے تو کیا کہہ رہی ہے؟ عورت ذات ہے نا! جو منھ میں آیا بک دیا! (نریش سے کہتا ہے) دیکھو بیٹا نریش! آؤ ادھر آؤ، میرے ساتھ چلو، تمہارا شراب والا منھ سمندر کے پانی سے دھو لائیں۔

نرملا: ہے۔ ہے۔ آپ کہہ کیا رہے ہیں؟

نرنجن:- چپ رہو! بکومت!!

نرملا:- آپ کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے، رات بھی آپ نہ سوئے ہونگے، اب آپ سو کیوں نہیں جاتے؟

نرنجن:- ہاں، میں تو رات بھر نہیں سویا، کیا تم لوگ بھی نہیں سوئے؟

نرملا:- ہم کہاں سوئے! آپ گھر آئے نہیں، ہم رات بھر جاگتے اور آپ کی راہ دیکھتے رہے۔ آدھی رات کے وقت محلے سے کسی کی ارتھی گئی، رونے پیٹنے کی آوازیں آتی ہیں، نریش بھی ڈرنے لگا اور وہ بھی جاگتا رہا۔

نریش:- اچھا ماں، اب میں سونے جاتا ہوں۔ نمسکار

نرنجن:- چلو، بیٹا چلو، میرے ساتھ چلو، وہاں ہم سمندر میں نہائیں اور ڈبکیاں لگائیں گے، تم پانی کی لہروں پر تیرنا، کیا تم جانتے ہو کہ سمندر کا پانی بہت گہرا ہوتا ہے؟ آؤ، ادھر آؤ، ایک پیار دو، (اُسے پیار کرتا ہے) چلو، اب ہم چلیں، پھر بہت دیر ہو جائیگی۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔

نرملا:- نہیں، نہیں، آج مت جائیے، پرماتما کے لئے آج نہ جائیے، کل چلے جائیے گا۔

نرنجن:- کل نام کال کا ہے، ہم کل وَل کچھ نہیں جانتے، ہم آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتے، جو ہوگا ابھی ہوگا۔

فوراً ہوگا۔ آہا۔ ہا۔ ہا۔ کتنا سہانا سماں ہے۔ ٹھنڈی ہوا سے شراب کی مہک آرہی ہے۔ او ہو ہو شراب! (جیب سے شراب کی بوتل نکالتا ہے اور غٹ غٹ کرکے پی جاتا ہے) آہ! شراب بھی کیا چیز ہے
(پی چکنے کے بعد بوتل جیب میں رکھتا ہے)

نرملا (اپنا داہنا ہاتھ پیشانی پر مارتے ہوئے) ہے نرنکار! پھر شراب! ہر وقت شراب!!

نرنجن (نشے میں) آہا۔ ہا۔ ہا۔ میری بات سنو، دیکھو۔ دنیا کی سب چیزیں شرابی ہیں۔ یہ دیوار، پلنگ، فرش چھت، سب شرابی ہیں۔ ذرا اپنے سر کے کالے بالوں کو تو دیکھو یہ بھی تو شرابی ہیں، اور تو اور پرماتما خود شرابی اور اُس نے شراب کے نشے میں مست ہوکر بچھو، مینڈک، سانپ، بندر، گینڈے، طوفان، قحط، دکھ، بیماریاں، منا گرجے، سیٹھ ساہوکار پیدا کردئیے۔ یہ سارا قصور اُسی شرابی کا ہے، وہ آدمیوں کے خون کی شراب پیتا ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ (چلاتا ہے، اور پھر زور سے کھلکھلا کر ہنستا ہے)

نرملا:۔ کچھ بھی ہو، نریش کو آج اپنے ساتھ نہ لے جاؤ۔ سنو، میری بات سنو آج کل سمندر میں بہت طوفان ہوگا۔

نرنجن:۔ تو پھر کیا ہوا، (نریش سے) دیکھو بیٹا، کل تمھارا جی سمندر دیکھنے کو چاہ رہا تھا نا؟ ہاں بیٹا! سمندر بڑی اچھی

نریش:۔ ہاں، مجھے بہت نیند آرہی ہے۔

نرنجن (نریش کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے) چلو آؤ، پھر آکر سونا، ساری عمر سوتے ہی رہنا ہے، (جیب سے پھر شراب کی بوتل نکالتا، اور بچی ہوئی شراب پی کر خالی بوتل ایک کونے میں پھینک دیتا ہے)

نریش:۔ ہاں، ہاں، ہاں، ہاں!

نرملا:۔ ہاں بیٹا! (نرنجن سے) دیکھو تو میرے بچے کو نیند آرہی ہے

نرنجن:۔ آنے دو، کچھ ہرج نہیں۔ (اُٹھکر باہر جاتا ہے اور ساتھ ہی نریش کو بھی کھینچکر اپنے ساتھ لے جاتا ہے)

نرملا (آپ ہی آپ طوطے سے باتیں کرتی ہے) آہ پنچھی تو اپنے پنجرے میں قید ہے، میں اپنی قسمت کی زنجیروں جکڑی ہوئی ہوں، ہم دونوں قیدی ہیں، آہ ہم کیا کریں کیا نہ کریں، ہے بھگوان! (باہر سے کھٹکھٹانے آواز آتی ہے، کھٹ، کھٹ، کھٹ") کون ہے؟ کون ہے؟

سادھو:۔ (گاتا ہے):۔

بات نہ پوچھے بابا کوئی، دی در در آواز — کیوں بجتا ہے اب بھی پاپی یہ جیون کا ساز
گھنگھور گھٹا، رات اندھیری، ٹوٹا بیچ منجدھار — میرا پیالہ ٹوٹا ہے، اور قسمت کھیون ہار
بات نہ پوچھے بابا کوئی، دی در در آواز
یہ گونہ تاروں کے ہمسائے، یہ اونچے استھان — یاں مانگے پر بھی ملتا ہے کب بھکشو کو دان؟

جس کو دیکھو داتا ہے، اور سب داتا ہیں چید اِس نگری میں سب کو پایا یکتا لال کٹھور
بات نہ پوچھے بابا کوئی، دی در در آواز
چاند ستارے لعنت بھیجیں، سورج دے دھتکار بیٹھے بیٹھے دھیان میں مجھکو دھکے دے سنسار
مایا بن جیون ہے جگ میں جیون کا ایمان مایا ہی جنجال ہے بابا، مایا ہی نروان
بات نہ پوچھے بابا کوئی، دی در در آواز

دروازہ کھولو، نرملا۔

نرملا :- (اچنبھے سے) ہیں۔کون ہے؟
سادھو :- میں ہوں سادھو،
نرملا :- سادھو جی، اس وقت میرے پتی گھر میں نہیں، پھر کسی وقت آئیے۔
سادھو :- نرملا جلدی سے دروازہ کھولو، زیادہ بات نہ کرو۔
نرملا :- اچھا، ٹھہرو، میں بتّی جلاؤں۔ (اُٹھکر دیا سلائی سے بتّی جلاتی ہے، اتنی دیر میں سادھو خود ہی دروازہ کھول کر کمرہ میں آ جاتا ہے) اوہ، سادھو جی، آپ آ گئے، کہئے، کیا کام ہے؟
سادھو :- میں بہت تھک گیا ہوں،
نرملا :- کیسے تھک گئے؟
سادھو :- گھومتے پھرتے، آہ، نرملا تم نے میری کچھ پرواہ نہ کی،
نرملا (حیران ہو کر) پرواہ! کیسی پرواہ؟ — تم ہو کون؟
سادھو :- واہ! کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟
نرملا (ایک لمحہ کے لئے سوچکر) بہت دیر ہوئی، شاید میں نے تم کو کہیں دیکھا تھا، مگر اب یاد نہیں، اور تمھاری آواز بھی کچھ سُنی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے، مگر میں تم کو نہیں جانتی
سادھو :- نہیں جانتی؟
نرملا :- نہیں!
سادھو :- ہاں ٹھیک ہے، شاید تم مجھے بھول گئی ہو، میری صورت بدل گئی ہے، میں نے اب اپنے سر کے بال بڑھا لئے ہیں، ڈاڑھی رکھ لی ہے، اور جوگی کی سی شکل ہو گئی ہے۔
نرملا :- پھر تم ہو کون؟
سادھو :- سنو جب تم اور میں ابھی جوان نہیں ہوئے تھے، ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے، ہمارا گھر تمھارے پتا کے گھر کے پاس تھا

پھر جب ہم دونوں جوان ہوئے، تو ہم دونوں میں کتنا پریم تھا، ہم کتنے خوش ہوتے تھے، تم کو بھی مجھ سے سچا پریم تھا، پھر ہم جدا ہو گئے، تمھاری شادی ہو گئی، اور اب میں ایک بھکاری بن کر سادھو کے بھیس میں تمھارے در پر آیا ہوں۔

نرملا:۔ ہیں! بھکاری؟ کیسا بھکاری؟

سادھو:۔ سنو۔ میں رات کو کئی بار گھومتے پھرتے تمھارے رونے چیخنے کی آوازیں سن چکا ہوں، وہ شخص جو دنیا کی نظروں میں تمھارا پتی ہے، تم کو مارتا پیٹتا مجھے صاف سنائی دیتا ہے، ایک بار اس نے تمھارے چاقو پھینک کر مارا تھا مگر چاقو نہ لگا اور تم بچ گئیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ تمھاری کانچ کی چوڑیاں توڑ کر تمھاری باہوں کو لہولہان کر دیتا ہے، آہ، وہ کتنا بڑا پاپی ہے، مجھے تم پر بہت ترس آتا ہے، تم یہ بھی جانتی ہو کہ مجھے تم سے اب تک پریم ہے، اس لئے آج موقع پاکر میں تم کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آیا ہوں، میرے ساتھ چلو، وہاں تم بڑے سکھ اور آنند میں رہو گی۔

نرملا:۔ بھلا میں کیونکر جا سکتی ہوں؟

سادھو:۔ اچھا، تو میں جاتا ہوں، لیکن یہ یاد رکھو، اگر تم کو کوئی دکھ ہو تو مجھے بلا بھیجنا، اس سڑک کے پار جو جھونپڑی ہے، میں اسی میں رہتا ہوں۔

نرملا:۔ اچھا، ٹھہرو۔ ٹھہرو، میری ایک بات سنتے جاؤ۔

سادھو:۔ نہیں اب میں جاتا ہوں،

نرملا:۔ ذرا ٹھہرو تو سہی، لڑکا تو دیکھتے جاؤ، میرا بیٹا کتنا سندر، کتنا پیارا، چاند جیسا لڑکا ہے!

سادھو:۔ دھنیہ باد، میں جاتا ہوں۔

(کمرے سے باہر جاتا ہے، نرملا بھی اس کے پیچھے دروازہ تک جاتی ہے، اور اس کو جاتے ہوئے دیکھ کر آہ بھرتی ہے اور وہیں کھڑی رہتی ہے)

(اس کا پتی نرنجن داس اسی دروازے سے آتا ہے، کمرے میں داخل ہوتے ہی کھلکھلا کر ہنستا ہے)

نرنجن (نشے میں چور) ہا۔ ہا۔ ہا، ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔

نرملا:۔ ہیں! کیا آپ اکیلے آئے ہیں؟ نریش کہاں ہے؟

نرنجن (پھر کھلکھلا کر ہنستا ہے) ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔

نرملا (گھبرا کر) میں پوچھتی ہوں، نریش کہاں ہے؟

نرنجن:۔ سمندر سے پوچھو۔

نرملا :- ہیں! کیا؟

نرنجن :- نریش سے سمندر کو تم سے زیادہ پریم تھا، بس پھر کیا ہوا، میں کیا بتاؤں، مگر واہ، کیا سماں تھا؟

نرملا :- مگر نریش ہے کہاں؟

نرنجن :- وہ سمندر میں نہا رہا تھا، پانی کی لہر آئی اور اُس کو بہا کرلے گئی۔ مگر واہ، کیا سماں تھا؟ سنو، سنو، لڑکا سمندر میں نہا کر بہت خوش ہوا اور مجھ سے کہنے لگا کہ پتاجی گھر جاؤ، اب میں سمندر کی پریوں سے کھیلونگا بس پھر کیا تھا، سمندر کا راجہ آیا اور اُس کو اُٹھا کرلے گیا۔

نرملا (سر پیٹ کر ہائے، یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا وہ سچ مچ ڈوب گیا، آہ میرے بیٹے! میرے چاند، تو کہاں ہے؟

نرنجن :- اوہ گھبراؤ مت، کل دیوالی ہے وہ آئیگا۔ ہا ہا ہا ہا۔ (کھلکھلا کر ہنستا ہے)

نرملا :- مگر ابھی تو آپ کہتے تھے کہ ڈوب گیا؟

نرنجن :- سنو، میری بات سنو، میں تم کو سچی بات بتاتا ہوں، یہ چھوکرا کئی دن سے انوکھی انوکھی باتیں کرتا تھا کبھی اُس کا جی کچھ بننے کو چاہتا تھا اور کبھی کچھ۔ وہ شرابیوں جیسی باتیں کرتا تھا۔ اب کرتا، تو میں بھی کیا کرتا؟ یہ چیز تو ہمارے خاندان ہی میں چلی آرہی ہے۔ میرا پردادا بھی شرابی تھا، میرا دادا بھی شرابی، میرا باپ بھی شرابی، اور اب میں شرابی۔ اس لئے ہماری رگوں ہی میں کئی پیڑھیوں سے شراب بھری چلی آرہی ہے۔ اور میں یہ نہیں چاہتا کہ "میرا بیٹا" بڑا ہو کر شرابی بنے، اس لئے میں اُس کو سمندر میں لے گیا اور ڈبو آیا۔

نرملا :- ہے۔ ہے! پرماتما تمھارا ناس کرے۔ وہ تمھارا بیٹا تھا کہاں؟

(اتنے میں سادھو کھلے دروازہ سے چپ چاپ کمرے میں داخل ہوتا ہے)

سادھو :- نرملا، نرملا، میں آگیا۔ لاؤ دکھاؤ لڑکا کہاں ہے؟

(ماخوذ)

گاؤں کی صبح

(از جناب خلیل الرحمٰن مستقیمی)

حسیں اُفق کے کناروں سے آفتاب آیا
بہار لے کے وہ نظارۂ شباب آیا
برس رہی ہیں وہاں بدلیاں شعاعوں کی
ہیں کیف و وجد میں جو کھیتیاں ہیں گاؤں کی
چہک اُٹھی ہے فضا میٹھے میٹھے گیتوں سے
درخت جھوم رہے ہیں کسی کے نغموں سے
چمک رہے ہیں وہ موتی بھی سبزہ زاروں پر
لُٹائے صُبح کی دیوی نے جو نظاروں پر
وہ پنگھٹوں پہ محبت بھرے نظارے ہیں
وہ جلوہ ریز جو معصوم ماہ پارے ہیں
سُنائی دینے لگے پیارے گیت چکّی کے
وہی رسیلے ترانے کسان لڑکی کے
وہ جا رہے ہیں چراگاہ کی طرف گوالے
بجا کے بانسری گاتے ہیں گیت متوالے
کنول کے پھول بھی انگڑائی لے کے اُٹھے ہیں
نسیمِ صبح کے جھونکے تمھیں جگاتے ہیں

اُٹھو کہ چاروں طرف سے یہی پکار آئی
تمھارے گاؤں پہ اک دلنشیں بہار آئی

جذباتِ اثر

خیالاتِ محبت میں اگر وسعت نہیں ہوتی
بقدرِ ذوق پیدا درد میں لذّت نہیں ہوتی
وہ جس کے درد سے معمور ہے دل کا ہر اک گوشہ
نہیں ہوتی تو اُس کی یاد سے فرصت نہیں ہوتی
سراپا درد بن کر رہ نہ جائے آدمی جبتک
نہیں ہوتی سکونِ قلب کی صورت نہیں ہوتی
ابھی کیا ہے، ابھی خونِ تمنا رنگ لائے گا
ابھی صورت سے ظاہر قلب کی حالت نہیں ہوتی
یہ دولت بے بہا ہے، یہ محبت کا عطیہ ہے
متاعِ درد کی، اے دل کوئی قیمت نہیں ہوتی

اثر کے غم کی دنیا ہے، زمانہ سے جداگانہ
کہ جس کے ہوتے فکرِ عیش کی فرصت نہیں ہوتی

مہابھارت

زیرِ تالیف کتاب "اردو کے ہندو مثنوی نگار" کے چند ورق

(از عطاء اللہ پالوی، سبزی باغ۔ بانکی پور پٹنہ۔)

"مہابھارت" سنسکرت زبان کے مشہور مایۂ ناز شاعر "وید بیاس" کی ایک ایسی بے نظیر رزمیہ مثنوی ہے جسے ہم گنجینۂ علوم کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ اس میں "کوروؤں" اور "پانڈوؤں" کی جنگ کا ذکر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چندربنسی راجہ "شانتنو" (शान्तनु) کے تین لڑکے تھے "بھیشم" (भीष्म) "چترانگد" (चित्रांगद) اور (विचित्रवीर्य) چترانگد ایک جنگ میں مارے گئے، اس لئے بھیشم نے دنیا سے ترک تعلق کرکے سلطنت اپنے چھوٹے بھائی "وچتر ویریہ" کے حوالہ کر دی، چنانچہ "وچتر ویریہ" اپنے باپ کی وفات کے بعد بحیثیت راجہ تخت نشین ہوئے۔ ان کے دو بیٹے ہوئے ایک "دھرتراشٹر" (धृतराष्ट्र) اور دوسرے "پانڈو" (पाण्डु) دھرتراشٹر چونکہ مادر زاد اندھے تھے لہذا "وچتر ویریہ" کی وفات کے بعد پانڈو تخت نشین ہوئے، ان کے پانچ بیٹے یدھشٹر (युधिष्ठिर) بھیم (भीम) ارجن (अर्जुन) نکل (नकुल) اور سہدیو (सहदेव) برخلاف ان کے دھرتراشٹر کے سو بیٹے تھے، ان میں سب سے بڑے بھائی دریودھن (दुर्योधन) تھے۔ قاعدے کے رو سے تخت پانڈو کے بچوں کا موروثی حق تھا مگر پانڈو کا انتقال ایسے وقت میں ہوا کہ سب بچے چھوٹے چھوٹے تھے، لہذا سلطنت کا بار دھرتراشٹر نے سنبھالا۔ دریودھن نے یہ زریں موقع ہاتھ سے نہ دیا، اور ایک دن پانڈو کے گھر میں رات کے وقت آگ لگا دی، تاکہ تخت پانڈو کے بچوں سے محفوظ ہو کر ان کے لئے مخصوص ہو جائے۔ پانڈو کی بیوی ایک دیوی کی حیثیت رکھتی تھیں، انھیں خبر ہو گئی اور وہ ایک دن پیشتر اپنے بچوں کو لے گھر سے نکل جنگلوں میں چھپ گئیں اور بارہ سال تک روپوش رہیں۔ اسی اثنا میں انھیں پنچال دیش (पंचाल देश) کے راجہ دروپد (द्रुपद) کی بیٹی کے سویمبر کی خبر ملی۔ بھیم اور ارجن کا جوش شباب تھا، لہذا فن سپہگری کی اس نمائش میں یہ بھی بحیثیت تماشائی پہونچے اور وہاں ارجن نے فن تیر اندازی میں سارے نوجوان چھتریوں کو نیچا دکھلا کے دروپدی (द्रौपदी) کو حاصل کیا۔ بارہ سال جلاوطنی کی زندگی گزار کے پانڈوؤں نے پھر گھر کا رخ کیا، یہاں پہونچ کر تخت نشین چچا اور صاحب سلطنت بھائیوں سے اس امر پر تصفیہ ہو گیا کہ تھوڑا سا خطہ ان لوگوں کو سلطنت کے لئے دیا جائے، چنانچہ انھیں بھیم کا حصہ دیا گیا جہاں انھوں نے دار السلطنت کی حیثیت سے ایک شہر بنا کر "

(इन्द्रप्रस्थ) دِلّی کے نزدیک آباد کیا۔ بظاہر یہ سب کچھ ہوا مگر بباطن دُریودھن کو یہ شرکت گوارا نہ تھی۔ لہٰذا اُس نے یہ چال چلی کہ یدھشٹر کو جُوا کھیلنے پر راضی کیا۔ کھیل شروع ہوا۔ یدھشٹر بازی پر بازی ہارتا رہا، نوبت یہاں تک پہونچی کہ جوئے میں آخری بازی سلطنت کی بھی لگادی، اور وہ بھی ہار بیٹھا۔ جب یہ قصہ زیادہ بڑھا اور راجہ دھرتراشٹر تک یہ بات پہونچی تو انھوں نے اُس کا حل یہ نکالا کہ پانڈوؤں کو تیرہ سال اور جلاوطن رہنے کا حکم دیا۔ بیچارے پانڈوؤں نے یہ تیرہ سال بھی جوں توں کاٹ دیئے اور واپس آکر سلطنت کا مطالبہ کیا۔ اب دونوں خاندان کافی بڑھ چکے تھے، لہٰذا دونوں نے زور دکھایا اور لڑائی کی ٹھنی۔ سیناپُور مقام جنگ قرار پایا اور ہندوستان کے سارے راجاؤں نے اس عظیم، خوفناک، اور تباہ کن جنگ میں شرکت کی۔ میدان پانڈوؤں کے ہاتھ رہا۔ اسی کے حالات کو بیاس نے مثنوی کی صورت میں پیش کیا ہے جسے لوگ "مہابھارت" کہتے ہیں۔ یہ جملہ محاسنِ شاعرانہ کی حامل ہے۔ کہتے ہیں سنسکرت زبان کی یہ دوسری بہترین اور اعلیٰ درجہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے، چنانچہ ظفر نے لکھا ہے کہ:۔

"سنسکرت زبان آج کی یورپین ترقی یافتہ زبانوں کا مقابلہ بہت عرصہ قبل کرچکی تھی، جب ہی تو رامائن اور مہابھارت کی سی بےمثل کتابیں اس زبان میں وجود میں آئی تھیں۔"

مشرق کی کئی زبانوں میں اس مثنوی کا ترجمہ ہوا ہے۔ فیضی نے اسے فارسی کا جامہ پہنایا ہے، اوڑیسہ کی "اوڑیا" زبان میں سرلداس نے ترجمہ کیا ہے۔ بنگالی زبان میں کیشں رام متر نے بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ صرف اُردو زبان اس سے محروم تھی، ظاہر ہے کہ ایک ہندوستانی اسے کب گوارا کرسکتا تھا کہ اُسکی ملکی زبان اس بین الاقوامی مایۂ ناز ادب سے محروم رہے، چنانچہ منشی طوطارام شایاں نے اسے اُردو میں منتقل کیا، اور ایسا کارنامہ پیش کیا جس میں اب اضافہ کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ مثنوی بڑی ضخیم اور دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے، اور یہ نہ صرف رزمیہ شاعری کی حیثیت سے قابل قدر ہے بلکہ اس میں پُرجوش جوانمردی، دلربا شوخی اور دلفریب رنگینی بھی کچھ ایسی بےتکلف طرز میں پیش کی گئی ہے کہ ہم اسے اُردو نظم کی حیثیت سے ایک خاص مرتبہ دینے پر مجبور ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ شایاں نے سنسکرت کی اس مایۂ ناز مثنوی کو اُردو میں جس ادیبانہ آن بان کے ساتھ منتقل کیا ہے اس کے مقابلے پر منشی کی مثنوی "داستانِ عجم" بھی نہیں ٹھہرتی اگرچہ وہ بھی فارسی کی بےمثل رزمیہ مثنوی "شاہنامۂ فردوسی" کا ترجمہ ہے۔ ذرا تمہیدی ملاحظہ تو دیکھئے۔ مثنوی اس شان سے شروع ہوتی ہے:۔

زبانِ قلم گلفشانی پہ ہے
بہارِ مضامیں جوانی پہ ہے

دکھائے ورق تختۂ گل کا رنگ
صریرِ قلم بانگِ بلبل کا رنگ

مہک اُٹھے نافہ کی صورت دوات
نہ ہو جس سے سربستہ غنچہ کی بات

اور حقیقت یہ ہے کہ ساری مثنوی "گل و گلزار" کی حیثیت رکھتی ہے، ایسا نہ ہونے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی کیونکہ اس کا مصنف بھی تو کوئی معمولی شاعر نہ تھا ؎

فنِ شاعری میں سرافراز ہوں   تخلص سے شایاں کے ممتاز ہوں
خدا نے کیا علم سے بہرہ ور   بنا فیض سے اُس کے صاحب ہنر
پسندِ زباندان ہے اپنی زباں   سند جانتے ہیں اسے نکتہ داں
نجوم اور علوں سے ہوں باخبر   نہ کیوں نظم پر ہوں تصدق گہر
کئے ہیں نئے طبعِ موزوں نے کام   کہ دلچسپ و شیریں ہے اپنا کلام

یہ مثنوی اس حیثیت سے اور بھی زیادہ قابلِ قدر ہے کہ اس میں شاعر نے دو باکمالوں پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے:-

کیا ترجمہ خوب فیضیؔ نے صاف   کوئی حال لکھا نہیں بر خلاف
جو پوتھی میں تھا ہے رقم حرف حرف   بیاں نثر میں ہے وہ حالِ شگرف
وہ پشتارہ، دفتر ہے، انبار ہے   مہینوں میں سیر اُس کی دشوار ہے
ہزاروں میں ہوگا کوئی نیک نام   پڑھا ہوگا جس نے وہ قصہ تمام
فقط جانتے دل میں ہیں وہ غریب   "مہابھارت" اک ہے کتابِ عجیب

پھر سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ اس مشکل کام میں ہاتھ ڈالنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی تھی، مہابھارت کو ہاتھ لگاتے ہوئے سب کا زہرہ آب ہوتا تھا، بقول شاعر ؎

ہزاروں ہوئے ناظمِ باہنر   رہا یوں ہی ناسفتہ پر یہ گہر

اس لئے ؎

مرے قلزمِ دل میں اُٹھی ترنگ   کہ ہو اب صف آرائی نظمِ جنگ
یہ قصہ جو ہے نثر منظوم ہو   کہ زورِ طبیعت کبھی معلوم ہو
قلم بھی دکھائے نئے داؤں پیچ   کہ نظروں میں ہوں نال و سہراب ہیچ
کرے کام نیزہ کا نوکِ قلم   دمِ تیغ و خنجر بھرے دمبدم
فضائے قلم رشکِ میدانِ جنگ   وہ وسعت، قصیدہ کا عرصہ ہو تنگ
صف آرائی لفظ ہو آشکار   ہر اک شعر ہو تیغ ساں آبدار
دکھا لے وہ شفاف جوہر زباں   چمک برقِ شمشیر کی ہو عیاں

اب اس "شعلۂ و شبنم" کے چند نمونے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ حمد مثنوی کا ایک خاص رُکن ہے، یہ بہتوں نے لکھی ہے، مگر ایسی حمد شاید نظر سے نہ گزری ہوگی ؎

ہمائے سخن کے کھلیں بال و پر — لکھوں وصف فرمانِ بحر و بر
نگارندۂ نقش لوح و قلم — خداوندِ مُلکِ حدوث و قدم
علیم و خبیر و سمیع و بصیر — کریم و رحیم و غفور و قدیر
وہ ترچھا دیا قطرۂ آب کو — خجالت سے ہے داغ مہتاب کو
دکھائی خدا نے وہ قدرت کی شان — کہ مٹی کے پُتلے کو بخشی ہے جان

پچاسویں شعر کے بعد فرماتے ہیں ؎

بیاں سے ہے عاجز زبانِ قلم — بس اب ہوچکا امتحانِ قلم

اس کے بعد قصہ شروع ہوتا ہے اور کوثر و سلسبیل موجیں مارنے لگتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے اور شاعر نے رزم کے موقع پر خوب خوب زورِ قلم دکھایا ہے اس لئے بطور نمونہ یہاں وہی چند ٹکڑے پیش کئے جاتے ہیں جو "رزم" سے تعلق رکھتے ہیں، "بزم" کے فدائی اصل مثنوی ملاحظہ فرمائیں۔

بھیم ماں کے حکم سے ایک دیو سے لڑنے کو بھیجا جاتا ہے، وہ دیو کے جائے قیام پر پہونچ کے اُس کے سارا آب و غذا کا صفایا کر دیتا ہے اور ایک درخت کے نیچے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے، یہاں تک کہ :-

رہا منتظر جو گئی نصف شب — تو وہ دیو آیا بشکل غضب
ہوا خشمگیں دیکھ تازہ یہ حال — رُخ زرد آتش کے مانند لال
بدن بھی ہوا جل کے خاکِ سیاہ — بھری غصہ و قہر سے تھی نگاہ
جو کھینچا وہاں نعرۂ ہولناک — زمیں کا ہوا سینہ دہشت سے چاک
جو بیٹھا تھا وہ بھیم زیرِ شجر — ہوا مشت زن وہ لعیں پشت پر
نہ اِس سے ہوا بھیم اصلا خبر — بنی تھی مگر دیو کی جان پر
کہا دل میں کیسا یہ انسان ہے — بڑی سخت اِس شخص کی جان ہے
یہ کوہِ گراں کو بھی قدرت نہ تھی — جو آتی اُسے تاب اِس ضرب کی
مگر سر میں تھا زور کا جو غرور — بلا کی طرح آیا اُس کے حضور
بہم پھر وہ دست و گریباں ہوئے — لڑے اس قدر دل پریشاں ہوئے

یہاں تک کہ بھیم کو فتح ہوئی ؎

اُڑا دیو کے جسم سے مرغِ جاں　　بدن رہ گیا کیسۂ استخواں
دریہ شہر پر لا کے پھینکی وہ لاش　　ہر اک عضو زخموں سے تھا پاش پاش

بےجان جسم کو "کیسۂ استخواں" کہنا اختراعِ فائقہ ہے اور صد درجہ قابلِ ستایش۔

دُروپدی کے بَر کی تلاش کے موقع پر بزم جشن منعقد ہوئی ہے، گلعذار دُروپدی کے ساتھ ساتھ سارے بہادر دل اور راجاؤں کا اجماع ہے، ایک ستون سا کچھ لٹھا بنوا کے اُس پر ایک دیگ چڑھادی گئی ہے اور اُس میں ایک مچھلی چھوڑ دی گئی ہے، اور مچھلی کو بیقرار کرنے کے لئے اس ستون کے نیچے آگ روشن کرا دی گئی ہے، پھر اس مچھلی کو شکار کرنے کے لئے اس ستون کے نزدیک ایک بھاری کمان اور تیر رکھا گیا ہے، اس ساز و سامان کے بعد اعلان ہوتا ہے ؎

کہ جو شخص اِن میں سے ہو نامدار　　اُٹھائے خدنگ و کماں ایک بار
طرف دیگ پُر جوش کے دیکھ کر　　اڑائے نشانے سے مچھلی کا سر
وہ اُس رشکِ زہرہ کا ہو خواستگار　　یہی بزمِ شادی میں ہے جیت ہار

اس کے بعد ایک ایک کر کے بہادر اور سُورما آنے شروع ہوئے، مگر ؎

کسی سے نہ ہرگز ہلی وہ کماں　　ہنر سب طرح کے ہوئے رائیگاں
بڑے جن کی قوت کے تھے زور و شور　　بنا یا خجالت نے مانندِ مور
دلوں کی شکستہ ہوئی آرزو　　مٹی سورماؤں کی سب آبرو

ارجن بھی اس مجمع میں موجود ہے سب کچھ دیکھ رہا ہے مگر چُپ ہے اس لئے کہ نہ وہ نامور راجا ہے اور نہ مدعو ہوا ہے۔ جب ایک ایک کر کے سارے سُورما ہار کر بیٹھ جاتے ہیں تو وہ شجاعت کی اس تذلیل سے بیتاب ہو جاتا ہے اور عین اُس وقت جبکہ سارے لوگ دم بخود ہیں ؎

یکایک گوشے سے مانندِ تیر　　نمایاں ہوا ارجنِ بے نظیر
صفیں سورماؤں کی وہ چیر کر　　قریبِ کماں آیا شکلِ نظر
جسے دیکھ کر دل میں پیر و جواں　　کہ لڑکا اُٹھائے گا تیر و کماں
یہ ارجن کا چمکا ہوا تھا نصیب　　گیا شکلِ ناوک کماں کے قریب
زباں سے لیا پہلے نامِ خدا　　تصور کیا دل میں اُستاد کا
اُٹھا کر کماں کو کیا اُس نے زہ　　ہوا ایک بیک شورِ تحسین و بہ

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ؎

وہ تیر افگنی میں جو تھا بے نظیر — روانہ کئے پے بہ پے پانچ تیر
تھارا جو مچھلی نشانہ ہوئی — تو بحرِ فنا کو روانہ ہوئی
ہوا ہو گئے ہوش ہر جنگجو — ملی خاک میں بزم کی آبرو
جو پہنایا اُس گل نے ارجن کو ہار — چُبھا دل میں ہر سروِ قامت کے خار

سبحان اللہ کیا سماں اور کیا بیان ہے، ہم حیران ہیں کہ یہاں ارجن کو زورِ بازو کی داد دیں یا شاعر کو زورِ قلم کی۔

جنگ مہابھارت شروع ہوتی ہے، سارے بہادر اور سورما تیار ہو رہے ہیں، ارجن بھی تیاریاں کرتا ہے:-

جو ارجن ہوا مستعد جنگ پر — لئے خنجر و تیغ و تیر و تبر
بسر خود، ترکش، کماں، گرز و تیر — کمند اور جوشن ہر ایک بے نظیر
چھری برق دم، دشنہ آبدار — وہ برچھا کہ تیرِ فلک شرمسار
زرہ، بکتر و خود چار آئینہ — جو پہنا، فلک بن گیا آئینہ
سراپا تھا دریائے آہن میں غرق — ہلالی چمکتی تھی مانندِ برق

پھر ہر چیز کی تعریف الگ الگ کی گئی ہے، نمونہ کے طور پر ہم یہاں ارجن کے تیر کی تعریف کے چند شعر سناتے ہیں:-

زبانِ قلم پر ہے تیروں کا حال — دمِ رزم سنئیے یہ اُن کا کمال
کماں پر کوئی تیر رکھا اگر — جو کھینچا تو سب کو وہی آئے نظر
ہوا جس گھڑی وہ کماں سے جدا — نظر آئے سو تیر پھر برملا
گیا فوج دشمن پہ جب برق وار — جراحت رسیدہ ہوئے ایک ہزار

بخوفِ طوالت اور نمونوں سے احتراز کیا جاتا ہے، صرف اتنا کہنے پر اکتفا کی جاتی ہے کہ مثنوی کا کھلنا دراصل جنگ مہابھارت کے مناظر پر سے پردہ ہٹانا ہے۔ ہر صفحہ ایک خونریز معرکہ کا منظر پیش کرتا ہے، ہر شعر سنان و خنجر کی آبداری دکھاتا ہے اور ہر ورق شجاعت و بسالت کا بے پناہ مرقع ہے، مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ ساری مثنوی ایک ہولناک، زہرہ گداز مناظر کا دفتر ہے۔ اس میں مہر و سحر کے بھی مرقعے ہیں۔ جنگ مہابھارت کی چوتھی صبح کا سماں ملاحظہ ہو:-

اُٹھایا جو خورشید نے اپنا سر — ہوا چرخِ چارم پہ وہ جلوہ گر
سیاہی شبِ تار کی ہٹ گئی — ستاروں کی وہ فوج سب کٹ گئی

آپ کہیں گے کہ اس میں بھی تو وہی چمک اور دمک ہے، بجا، مگر کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ جنگ کی صبح بھی شانِ جنگ لئے ہوئے نمودار ہوتی ہے۔ شایاں میر انیس نہ تھا کہ اجاڑ اور سنسان ریگستان کربلا کی صبح اس شان سے پیش کرکے ناظرین کو خلاف قیاس مناظر سے روشناس کرتا۔

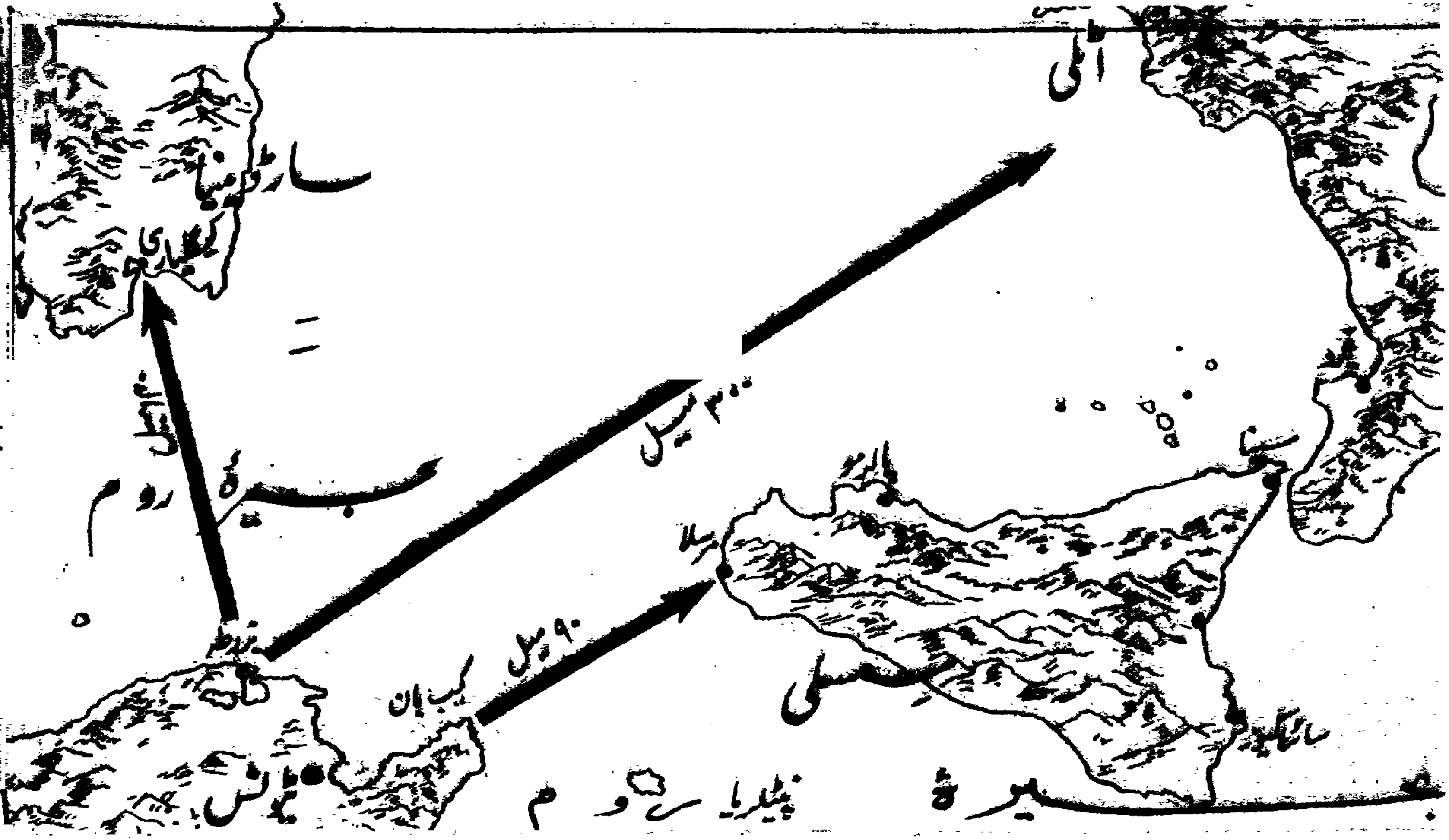
چھپنا وہ آفتاب کا وہ صبح کا ظہور　　　یادِ خدا میں زمزمہ پردازیٔ طیور
وہ رونق اور سرد ہوا وہ فضا وہ نور　　　خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

شاید میر انیس کو یہ معلوم نہ تھا کہ شاعر کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اس کی تخلیقی قوت بیان واقعات کے لئے اس کے مناسب ماحول قائم کرے۔

غزل

(حضرت بیتاب بریلوی، بی۔اے)

کام اپنی بے زبانی آ گئی　　　برق کی آتش فشانی آ گئی
ڈوبنے والے جموں میں بہ گئے　　　بند پانی میں روانی آ گئی
چھٹ پڑا ساغر تری آغوش میں　　　ذرہ ذرہ پر جوانی آ گئی
بلبلوں کی سن کے نغمہ سنجیاں　　　یاد پھولوں کی کہانی آ گئی
چونچلے توبہ کے رکھتے رہ گئے　　　جھلجھلاتی زعفرانی آ گئی
پھر وہ اگلی سی رواداری کہاں　　　جب دلوں میں بدگمانی آ گئی
تم نے مجھ کو کردیا ساغر بدست　　　ہاتھ عمرِ جاودانی آ گئی
اپنی حد سے تلخیاں جب بڑھ چلیں
سر پہ مرگِ ناگہانی آ گئی


سارڈینیا
کیگلیاری
بحیرہ روم
۳۰۰ میل
۹۰ میل
کیپ بان
ٹیونس
مرسالا
سسلی
مسینا
سائراکیوز
پنٹیلاریا

رفتارِ زمانہ

ٹیونس کی فتح اور شمالی افریقہ سے محوریوں کے اخراج کے بعد خشکی کے میدان جنگ میں نسبتاً خاموشی چھائی ہوئی ہے جو یقیناً آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے اور عنقریب بہت سخت و ہولناک جنگ چھڑنے والی ہے جس کے لئے فریقین تیار ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روس کے محاذ پر باوجود موسم گرما آ جانے کے ابھی تک جرمن حملہ شروع نہیں ہوا، اور نہ ہونے کی امید نظر آتی ہے۔

لیکن اگر خشکی کی لڑائی سست ہے تو ہوائی حملے بڑی سرگرمی سے جاری ہیں اور روزانہ برطانوی و امریکن ہوائی جہاز روز و شب جرمنی کے فوجی و صنعتی مقامات کو بموں کا نشانہ بناتے رہتے ہیں جس سے جرمنی میں بڑی ابتری پھیل رہی ہے اور ذرائع رسل و رسائل کو بھی سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ جرمنی کا صنعتی علاقہ رُوہر اس بمباری کا خاص طور پر نشانہ بنا ہے۔ اس بمباری کا اندازہ کچھ مسٹر چرچل کی تقریر مورخہ ۳۔ جون ۱۹۴۳ء سے ہوتا ہے جو انھوں نے لندن کے گلڈ ہال میں کی۔ انھوں نے بیان کیا کہ ۱۹۴۳ء کے شروع کے چھ ماہ میں برطانوی طیاروں نے جرمنی میں جو بم گرائے وہ ان بموں سے جو جرمنی نے انگلستان میں گرائے وزن میں ۵ سے ۳ گنا تھے۔ فقط ایک رات میں جرمنی کے شہر ڈوسلڈورف میں دو ہزار ٹن کے بم گرائے گئے۔ یہ بمباری روز بروز شدید ہوتی جا رہی ہے اور اس میں اب روسی ہوائی جہاز بھی، جن کو اپنے ملک کی حفاظت سے کچھ مہلت ملی ہے حصہ لے رہے ہیں۔ اس بمباری کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ جرمنی کے سامان حرب کی تیاری کو سخت دھکا لگا ہے اور اُن کو اپنے کارخانے بڑے بڑے شہروں سے ہٹا کر چھوٹے چھوٹے شہروں میں منتقل کرنا پڑے ہیں۔ لیکن عنقریب جرمنی کا کوئی حصہ بمباری سے محفوظ نہ رہے گا۔

پچھلے ماہ بحری لڑائی کا رنگ بھی متحدہ اقوام کے حق میں رہا اور اس ماہ ڈوبکی کشتیوں سے جہازوں کا بہت کم نقصان ہوا۔ بقول مسٹر چرچل اس ماہ میں جتنے جہاز ضائع ہوئے اتحادیوں نے اس کے سات اور دس گنے جہاز اسی وقت میں تیار کئے۔

اس وقت سب سے دلچسپ سوال یہ ہے کہ یورپ پر اتحادی حملہ کہاں اور کب ہوگا؟ اس کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں اور یہ سوال اس وقت ہٹلر کو بہت پریشان کئے ہوئے ہے۔ بہت ممکن ہے یہ حملہ یک وقت کئی جگہ ہو لیکن اٹلی پر بہت جلد حملہ ہونا یقینی ہے۔ شمالی افریقہ کی فتوحات کے بعد بحیرۂ روم میں محوری اقتدار کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اگر اٹلی کا جنوبی حصہ اتحادیوں کے زیر اثر ہو جائے تو بحیرہ روم محوریوں سے بالکل صاف ہو جائیگا۔ جغرافیائی حالت جیسا کہ نقشے سے ظاہر ہوگا اتحادیوں کے موافق ہے۔ اٹلی کا جنوبی حصہ جس کو "[illegible]" کہتے ہیں [illegible] تین سو میل کے فاصلہ پر ہے اور اٹلی کے جزیرہ سسلی [illegible] [illegible]

[illegible]

کہ جاتک روس پر اپنی پوری طاقت سے حملہ کر دیا تھا اسے یقین تھا کہ چند ہفتوں میں یہ مہم ختم ہو جائیگی لیکن باوجود دو سال گذر جانے کے ہٹلر اپنے مقصود سے بہت دور ہے اور روس کی فتح کا خیال محض خواب پریشاں معلوم ہونے لگا ہے۔ اس عرصہ میں جرمن فوجوں نے ماسکو، لینن گراڈ، اور کوہ قاف کے تیل کے چشموں پر قبضہ کرنے کی سر توڑ کوشش کی، مگر بہادر روسیوں کے مقابلہ میں ایک نہ چلنے پائی۔ اس جنگ کی شدت اور ہولناکی وسعت کا اندازہ ان نقصانات سے ہو سکتا ہے جس کی تفصیل ۲۲ جون کو ماسکو کے ریڈیو سے بتلائی گئی ہے۔ اس بیان کے مطابق روس کی جنگ میں چونسٹھ لاکھ جرمن افسر اور سپاہی ہلاک، زخمی، قید، لاپتہ ہوئے چھپن ہزار پانسو توپیں، بیالیس ہزار ٹینک، اور سینتالیس ہزار جرمن ہوائی جہاز ضائع ہوئے۔ اس کے مقابلہ میں بیالیس لاکھ روسی ہلاک، زخمی، قید اور لاپتہ ہوئے اور پینتیس ہزار روسی ہوائی جہاز کام آئے۔ اس کے علاوہ سول آبادی کے نقصان جان و مال کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ روس کے خلاف جرمن فوجی کارروائی اب بجائے جارحانہ کے بچاؤ کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ باوجود موسم گرما کے شروع ہو جانے کے ابھی تک ہٹلر کا بڑے پیمانے پر کوئی حملہ شروع نہیں ہوا جیسا کہ پچھلے برسوں میں ہوتا رہا ہے اور نہ فی الحال ہونے کی کوئی امید نظر آتی ہے۔ البتہ فریقین کے ہوائی جہاز بہت کچھ سرگرمی دکھا رہے ہیں جہاں تک خشکی کی میدانداریوں کا تعلق ہے ڈونٹز، اورئل ویلکی لیوکی، روستوف کے مغرب اور قفقاز کی وادی کیوبن میں کبھی کبھی لڑائی بھڑک اٹھتی ہے، مگر ان معرکوں کی حیثیت بالکل مقامی ہوتی ہے۔

یہاں پر جرمنوں کی ناکامیابی اور روسیوں کی کامیابی کے اسباب پر ایک سرسری نظر ڈالنا بے محل نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ روسی سپاہی اپنے وطن کی محافظت میں اس جانبازی سے لڑے کہ ان کی جرأت و بہادری اور استقلال ضرب المثل ہو گیا ہے، اور یہی روس کی کامیابی کا راز ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ایک غیر جانبدار شخص اس نتیجہ پر پہنچیگا کہ روسی سپاہیوں کی جانبازی کے پس پشت ان کا جذبۂ حریت کارفرما تھا۔ روسی سپاہی جانتا تھا کہ وہ نہ فقط اپنے جان و مال کے لئے بلکہ وہ اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ شکست کا نتیجہ اس کی اور اس کی اولاد کی غلامی ہوگا۔ جو موت سے بدتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ جنگ عظیم میں روسی کبھی بھی جرمنی کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکے تھے۔ لیکن بیس سال کی آزادی ہی نے انھیں وہ قوت بخشدی جس نے جرمنوں کے چھکے چھڑا دیئے اور یہ ثابت کر دیا کہ جس جانبازی سے ایک آزاد سپاہی اپنے ملک کی آزادی کے لئے لڑ سکتا ہے وہ ایک غلام ملک کے سپاہی کے لئے ممکن نہیں ہے۔

اس مہینہ میں چین کے میدان جنگ پھر جاگ اٹھے۔ دریائے یانگسی کے مغربی کنارے متعدد میدانداریاں ہوئیں جن میں چینیوں کا پلہ بھاری رہا۔ دریائے یانگسی میں ایک جاپانی فوج بردار جہاز چینی سرنگوں سے ٹکرا کر غرق ہو گیا، اور ایک ہزار جاپانی سپاہی موجوں کی نذر ہوئے۔ اس وقت مختلف محاذات پر جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ جھیل تونگٹنگ کے جنوب مغربی کنارے پر جو جاپانی موجود ہیں ان پر چینیوں کے مسلسل حملے ہو رہے ہیں، دوسری طرف شہر اوچکاؤ کے اندر گھمسان کا رن پڑ رہا ہے اور تیسری طرف چینیوں کے فوجی دستے ہیانگ اور سنگوہ پر حملے کر رہے ہیں۔ ۷۔ جولائی کو چین و جاپان کی جنگ کا ساتواں سال شروع ہو گیا ہے قابل داد ہے چینیوں کی شجاعت اور حب وطن جو باوجود بے سر و سامانی کے ایک بیدرد اور خونخوار دشمن کا اس بے جگری اور پامردی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔

جنوبی مغربی بحرالکاہل میں اتحادیوں کی طاقت روز افزوں ہے۔ نیوگنی کے جزیرہ سلاموا کے نزدیک اتحادی فوجیں اتر گئی ہیں۔ اور جزیرہ ریاندا اور ووڈلارک کے مجمع الجزائر پر امریکن فوجوں نے بلا مزاحمت اور خلیج ناسو پر جو سلاموا سے ۲۵ میل جنوب واقع ہے، کسی قدر مقابلہ کے بعد قبضہ کر لیا ہے۔ یہ تمام کارروائیاں خود جنرل میک آرتھر کی رہنمائی میں کی جا رہی ہیں اور ان تمام چالوں کا مقصد یہ ہے کہ نیو برٹین میں رابول کے جاپانی اڈہ پر مشرق و مغرب دونوں

سمت سے نرغہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ جاوا سے لیکر جزائر سلیمان تک دشمن کے ہوائی اور سمندری اڈوں کا جو زبردست سلسلہ قائم ہے اُسے تباہ و برباد کر دیا جائے۔ ان سب کا ایک اُمید افزا پہلو یہ ہے کہ جنوبی مغربی بحرالکاہل میں لڑائی کی پہل جاپانیوں کے ہاتھوں سے نکل کر اتحادیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے، اور جاپانی پیچھے ہٹنے اور بچاؤ کی لڑائی لڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ وغیرہ آسٹریلیا پر حملہ کا امکان باقی نہیں رہا۔

امریکہ میں کوئلے کے کارکنوں نے اپنی اجرت میں دو ڈالر یومیہ کے اضافہ کا مطالبہ کیا تھا اور اس کی نامنظوری پر ہڑتال کر دی جس سے امریکہ کی آٹھ ریاستوں میں کوئلہ کی کانوں میں کام بند ہو گیا، پانچ لاکھ مزدور بیکار ہو گئے اور سامان حرب تیار کرنے والے کارخانوں کا بہت ہرج ہوا بالآخر گورنمنٹ نے کانوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ لیبر بورڈ نے مزدوروں کی اجرت میں نصف ڈالر یومیہ کا اضافہ منظور کیا جس کو مزدوروں نے نامنظور کر دیا۔ گفت و شنید کے بعد مزدوروں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک گورنمنٹ کا قبضہ کانوں پر رہے گا وہ کام کرتے رہیں گے لیکن جب قبضہ کان کے مالکان کو واپس کر دیا جائے گا وہ پھر کام چھوڑ دیں گے۔

اس سلسلہ میں و نیز پریسیڈنٹ روزویلٹ کی دوسری تجویز کی بابت کہ زندگی کی ضروریات کی قیمت کو ارزاں رکھنے کے لئے Foodsubsides دی جائے جو رویہ امریکن کانگریس نے اختیار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے اندرونی معاملات میں کانگریس اور پریسیڈنٹ میں شدید اختلافات ہیں۔ کانگریس نے پریسیڈنٹ کی Food Subsides کی تجویز کو رد کر دیا اور آئندہ ہڑتال کی روک تھام کے لئے Anti Strike Bill پاس کر دیا ہے، جس کی رو سے ہڑتال کرنے والے کو قید و جرمانہ کی سزا دی جا سکتی ہے۔ یہ بل پریسیڈنٹ کی مرضی کے خلاف کانگریس میں پیش و پاس ہوا، اس کے پاس ہونے کے بعد پریسیڈنٹ نے اپنے اختیار خصوصی سے کام لیتے ہوئے اس بل کو مسترد کر دیا، لیکن کانگریس نے پھر اس بل کو پاس کر کے اسے قانون بنا دیا۔ بعض امریکن حلقوں میں کانگریس کا یہ رویہ پریسیڈنٹ کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ تصور کیا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پریسیڈنٹ روزویلٹ چوتھی بار پریسیڈنٹ منتخب نہ ہو سکیں گے۔

اُصولی طور سے پریسیڈنٹ روزویلٹ کی Food Subsides کی تجویز درست تھی، کیونکہ اگر جنگ کے بعد ملک کو اقتصادی تباہی سے بچانا ہے تو اس کا ایک ذریعہ فقط یہی ہے کہ ضروریات زندگی کی قیمت زیادہ نہ بڑھنے پائے تاکہ غیر معمولی تعداد میں زیادہ نوٹ چھاپے جانے کی ضرورت نہ پڑے۔ اور ملک inflation سے محفوظ رہے، یہ خطرہ اس وقت ہندوستان کے سامنے بھی موجود ہے۔

پریسیڈنٹ روزویلٹ کی پالیسی Anti Strike Bill کے متعلق بھی اُصولی طور سے صحیح تھی کیونکہ اگر ضروریات زندگی کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے تو پھر مزدوروں کا اضافۂ اجرت کا مطالبہ بھی انصافاً جائز ہے۔ اور اضافہ نہ ملنے پر اُن کو اپنے مطالبہ کے لئے ہڑتال کرنے کا بھی حق ہونا چاہیئے۔ بہرحال اب دیکھنا ہے کہ کانگریس اور پریسیڈنٹ کے درمیان جو اختلافات ظہور میں آئے ہیں اُن کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

۲۔ جون ۱۹۴۳ء کو ڈیٹرائٹ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں گوروں اور حبشیوں کے درمیان ایک سخت نسلی بلوہ ہو گیا جو کئی روز تک رہا۔ مقتولین کی تعداد میں زیادہ تر حبشی تھے۔ پیشتر اس بلوہ کو پانچویں کالم کی کارروائی کہی جاتی تھی مگر بعد میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس بلوہ کی وجہ یہ ہے کہ حبشیوں کی بہت بڑی تعداد جنوبی ریاستوں سے ڈیٹرائٹ میں آگئی ہے لیکن غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ پریسیڈنٹ روزویلٹ نے حبشی و گورے مزدوروں کے درمیان جو غیر مساوی سلوک اب تک ہوتا تھا اُسے آئندہ کے لئے ممنوع کر دیا ہے جس سے گورے مزدوروں میں بے چینی پھیل گئی۔ حبشیوں کا زیادہ تر نقصان جان پولیس سے ہوا [illegible]

ہندوستان | جیسا کہ ہم پیشتر لکھ چکے ہیں فیلڈ مارشل سر آرچی بالڈ ویول ہندوستان کے آئندہ وائسرائے منتخب ہوئے ہیں۔ برٹش حکومت کی تاریخ میں فیلڈ مارشل ویول پہلے فوجی شخص ہیں جن کو یہ عہدہ دیا گیا ہے۔ اس کے پیشتر تیس سال ہوئے ایڈورڈ ہفتم اسی عہدہ پر لارڈ کچنر کا تقرر کرنا چاہتے تھے، لیکن اس وقت کی برٹش گورنمنٹ نے اس کی سخت مخالفت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایڈورڈ ہفتم کو گورنمنٹ کی پالیسی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ فیلڈ مارشل ویول کے تقرر سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ برٹش گورنمنٹ اپنی موجودہ پالیسی پر سختی سے قائم رہنا چاہتی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ ہندوستان کے نظم و نسق کے لئے سول ایڈمنسٹریشن کافی نہیں ہے بلکہ فوجی فولادی پنجہ کی ضرورت ہے۔ غالباً برٹش گورنمنٹ نے اس اصول کو نظرانداز کر دیا کہ ملکی حکومت میں سول ذکر فوجی طاقت سب سے اعلیٰ ہونا چاہیئے، جس کے جنگ کے دوران میں برتنے کی زیادہ ضرورت اس لئے اور بھی ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں قانونی و آئینی پہلوؤں کو عام طور سے جنگی ضروریات کے مقابلہ میں نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ فیلڈ مارشل ویول نے اپنی ایک تقریر میں سیاسی عہدوں پر فوجی اشخاص کے تقرر کی مخالفت کی تھی جس کا آزاد اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے:-

"میری دانست میں گذشتہ صدی ہی میں اس امکان کا خاتمہ ہو گیا کہ کوئی سپاہی سیاست داں کی جگہ لے سکے یا کوئی مدبر فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ جرمنوں نے لڑائی کو ایک پیشہ بنا دیا ہے اور جدید ایجادات و انکشافات نے اسکی تکنیک میں اضافہ کر کے اسے مخصوص کر دیا ہے، یہی حال سیاسیات کا ہے جسے جمہوریت نے ایک پیشہ کی شکل دیدی ہے، اب ایک شخص کا دونوں میں ماہر ہونا ممکن نہیں ہے۔ حالانکہ دونوں ایک ہی علم کی شاخیں ہیں۔ آدمیوں پر حکومت اور انسانی معاملات کی تشکیل۔ ایک سیاسی لیڈر کو ترغیب و تردید دونوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے دماغ کو زیادہ کشادہ اور لچکدار اور استدلال و تعریف کا عادی ہونا چاہیئے، لیکن ایک سپاہی کا دماغ جو فوج کی کمان کرتا ہے اور بے چون و چرا تعمیل احکام کرتا ہے یقیناً مستقل، تربیت یافتہ اور پابند قواعد ہو گا۔"

اس انتخاب سے یہ بھی نمایاں ہوتا ہے کہ برٹش گورنمنٹ کو اس عہدہ کے لئے جو وزیر اعظم کے عہدہ کے بعد سب سے اہم خیال کیا جاتا ہے کوئی دوسرا شخص میسر نہیں آیا یا بہ الفاظ دیگر کوئی دوسرا شخص موجودہ سیاسی گتھیوں کے سلجھانے کی ذمہ داری لینے پر آمادہ نہیں ہوا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ لارڈ ہیلیفیکس (سابق لارڈ ارون) اور سر آرچی بالڈ سنکلیر کو یہ عہدہ پیش کیا گیا تھا لیکن انھوں نے اسکی ذمہ داریاں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

فیلڈ مارشل ویول کے تقرر کے حق میں کم از کم ایک بات یہ ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی فوجی معلومات سے فائدہ اٹھا کر فوج کے غیر مناسب مطالبات کی روک تھام کر سکتے ہیں جو جنگی ضروریات کی آڑ میں وقتاً فوقتاً پیش کئے جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ موجودہ آرڈیننس کے دور میں کچھ کمی کر سکیں لیکن ہندوستان کا موجودہ پولیٹیکل جمود کچھ ایسا مایوس کن ہے کہ یہ کسی ایک شخص کے بس کا روگ نہیں معلوم ہوتا ہے جبتک کہ اسکی شخصیت دماغی و اخلاقی حیثیت سے غیر معمولی طور پر اونچی نہ ہو، اور اس معنی میں فیلڈ مارشل سر ویول کے تقرر سے اس ملک کو کوئی اُمید نہیں رکھنا چاہیئے۔ حالانکہ انھوں نے اپنی تقریر میں جو انھوں نے لندن کے پریس نمایندوں کے سامنے کی ہے اپنے خلاف شکوک و شبہات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس تقرر کے سلسلہ میں امریکہ میں جو رائے زنی کی گئی ہے وہ خالی از دلچسپی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایشیا و یورپ میں متحدہ اقوام کی اعلیٰ کمان ایک امریکن جنرل کے ہاتھ میں دیجانے والی ہے اور فیلڈ مارشل ویول کو اس کا ماتحت بنانا بعید از مصلحت تھا لہذا مسٹر چرچل نے امریکن و برٹش تعلقات کا خیال رکھتے ہوئے ان کا تقرر وائسرائے کے عہدہ پر کر دیا۔

بہرحال فیلڈ مارشل ویول کے تقرر سے ہندوستان کے معاملات پر کوئی زیادہ اثر نہیں [illegible] حالات اتنی [illegible] ہے کہ اسکے بہتر ہونے کا امکان باقی نہیں رہا۔

کپڑے پر کنٹرول کے متعلق گورنمنٹ ہند نے ایک نیا آرڈیننس جاری کر دیا ہے جس کی رو سے ایک ٹکسٹائل کمشنر اور چھ اشخاص کا ایک بورڈ، جس کا چیئرمین غیر سرکاری ہوگا، مقرر کئے گئے ہیں۔ علاوہ خالص اونی، ریشمی، نقلی سلک اور سَن کے کپڑوں اور سوت کے اس حکم کا نفاذ ہر قسم کے سوت اور کپڑے پر ہوگا۔ ٹکسٹائل کمشنر کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ پارچہ باف کارخانوں کو یہ حکم دیں کہ وہ فقط ایک خاص قسم کا کپڑا یا سوت کسی خاص مقدار میں تیار کریں، اور کپڑے کی تھوک اور خوردہ فروخت کی انتہائی قیمت مقرر کر دیں۔ اس حکم کی رو سے ۳۱ جولائی ۱۹۴۳ء کے بعد جو کپڑا یا سوت تیار ہوا کریگا اس پر پیکنگ کی تاریخ چھاپ دی جایا کریگی، اور اس کے تیس یا چالیس دن کے اندر وہ مال کارخانوں سے روانہ کر دیا جایا کریگا اور یہ کپڑا یا سوت بند گانٹھوں کی شکل میں کسی ایک مقام پر تین ماہ سے زیادہ نہیں رکھا جائیگا اور چھ ماہ کے اندر فروخت کر دیا جائیگا۔ جو کپڑا یا سوت پہلی اگست ۱۹۴۳ء سے پیشتر کا بنا ہوا ہوگا وہ ۳۱ اگست ۱۹۴۳ء کے بعد بند گانٹھوں کی شکل میں نہ رکھا جائیگا اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۳ء تک فروخت کر دیا جائیگا۔ اس آرڈیننس کے نفاذ سے کپڑے کی قیمت گرنا شروع ہو گئی ہے اور قیمتوں میں ۲۵ فیصدی کی کمی اس وقت تک ہو گئی ہے اور ابھی مزید کمی ہونے کی امید ہے۔

وزارت سازی | ہندوستان کے سات صوبوں میں جہاں جنگ سے پہلے کانگریسی وزارتیں قائم تھیں اب گورنر صاحبان اپنے مشیروں کی مدد سے حکومت کر رہے ہیں، ان صوبوں کی اسمبلیاں اور کونسلیں معطل ہیں، اور کانگریسی ممبروں کی بڑی تعداد جیل خانوں میں ہے۔ ان حالات کا بیرونی دنیا پر یہ غیر موافق اثر پڑ سکتا ہے کہ عوام حکومت کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ اب گورنری حکومتوں پر آئینی رنگ چڑھانے کی غرض سے اکثر کانگریسی صوبوں میں مخلوط وزارتیں قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے صوبۂ اڑیسہ نے قدم اٹھایا۔ جہاں مہاراجہ صاحب پارلیکمیڈی ایک مخلوط وزارت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد صوبہ سرحد شمالی مغربی میں سردار اورنگزیب خان کے ذریعے مسلم لیگی وزارت قائم ہوئی جس میں صرف ایک ممبر (سکھ) غیر مسلم ہے۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے اب بمبئی، مدراس، سی۔ پی، بہار اور یو۔ پی میں بھی وزارت سازی کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ہندو مہا سبھا کے پریسیڈنٹ مسٹر ساورکر نہ صرف خود بمبئی میں وزارت کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں، بلکہ انھوں نے اپنی جماعت کے ممبروں کو مخلوط حلقوں میں شریک ہونے کی عام اجازت دیدی ہے۔ لیکن ان صوبوں میں وزارت قائم ہونے کا امکان کم معلوم ہوتا ہے، اور اگر کسی طرح سے وزارت قائم ہو بھی گئی تو وہ دیرپا ثابت نہ ہوگی۔

جنوبی افریقہ کی کانگریس کا اجلاس | ۲۶ جون کی رات کو کونسلر کے۔ اسمٰعیل کی صدارت میں جنوبی افریقہ کی انڈین کانگریس کا سولہواں سالانہ اجلاس ہوا جس میں ان مظالم کی داستان سنائی گئی جو جنوبی افریقہ کے یورپین باشندے اور وہاں کی حکومت ایشیائی نژادوں خصوصاً ہندوستانیوں پر کر رہی ہے۔ ۱۹۴۳ء کے "پیگنگ بل" کا ذکر کرتے ہوئے پریسیڈنٹ نے کہا کہ اس قانون کی بنیاد جمہوریت اور آزادی پر نہیں بلکہ نسلی امتیاز پر ہے جسے سیاسی مصالح کی وجہ سے پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تھا اور پاس اس وجہ سے ہو گیا کہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کو نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستانیوں کو اس وقت نہ صرف خود متحد ہونا چاہیئے بلکہ تمام غیر یورپین نسلوں کو اپنے ساتھ ملا کر متفقہ جد و جہد کرنا چاہیئے۔

مسٹر [illegible] نے بھی اتفاق و اتحاد باہمی پر زور دیتے ہوئے کہا کہ وہ ہندوستانیوں کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں ہیں، کیونکہ اسمبلی کے ممبری حیثیت سے وہ جانتی ہیں کہ بہت سے یورپین اس قانون کی مذمت کرتے ہیں۔

کانگریس کی جانب سے چند ریزولیوشن پاس کئے گئے جن میں اہم ترین تجویز یہ ہے جس کی رو سے حکومت ہند سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ جنوبی افریقہ سے اپنے سیاسی تعلقات منقطع کرنے اور وہاں کمشنر کو واپس بلا لے۔

متحدہ اقوام کا موقف ہے کہ یہ جنگ دنیا کی آزادی اور جمہوریت کے لئے لڑی جا رہی ہے اور اس جنگ میں حصہ لینے والی ہندوستانی فوج کی بہادری و جرأت کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے، لیکن حیرت ہے کہ اس کے باوجود جنگ کے دوران میں بھی متحدہ اقوام میں سے ایک قوم ہندوستانیوں کے ساتھ رنگ و نسل کا امتیاز کرتی ہے اور محض اس بنا پر ان کو جائز حقوق سے محروم رکھنے کے لئے قانون بھی پاس کر دیتی ہے لیکن اس کے خلاف کوئی پروٹسٹ نہیں

کچھ اپنی نسبت

"زمانہ" کو نئے دور سے گزرتے ہوئے آٹھ ماہ ہو گئے، ہمارے احباب و قدردان رسالہ کے مستقبل اور اس کی آئندہ پالیسی کے متعلق اکثر دریافت کرتے رہتے ہیں، حالانکہ ان کے خطوط کا حتی الامکان فرداً فرداً جواب دیا جاتا ہے، تاہم ان امور کے متعلق چند کلمات تحریر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہماری ہر ممکن کوشش ہوگی کہ رسالہ کو نہ فقط قائم و جاری رکھیں بلکہ اس کا اعلیٰ معیار اور ادبی مذاق ہمیشہ برقرار رکھیں۔ رسالہ کی جو پالیسی گزشتہ چالیس سال سے رہی ہے وہی اس کا نصب العین آئندہ ہوگا۔ "زمانہ" نے ہمیشہ مختلف الخیال اصحاب کو اپنے اظہار خیالات کا موقع دیا ہے بشرطیکہ ان کا تعلق محض ذاتیات سے نہ ہو اور وہ علم و دلچسپی کے باعث ہوں۔ سنجیدہ تنقید و مباحث بھی رسالہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں لیکن کسی فرقہ یا جماعت کی دل آزاری کبھی مقصود نہیں رہی اور متانت سے گرے ہوئے مضامین و ذاتیات سے ہمیشہ احتراز کیا گیا۔ یہی رسالہ کی آئندہ پالیسی ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے مضمون نگار اصحاب اس کا خیال رکھیں گے۔

رسالہ کے متعلق لمیٹڈ کمپنی قائم کرنے کی تجویز تقریباً مکمل ہو رہی ہے۔ اس کی تفصیلات رسالہ کی کسی قریبی اشاعت میں شائع کی جائیں گی۔ گورنمنٹ ہند کے نئے آرڈیننس کے مطابق کمپنی کے قیام کے قبل گورنمنٹ کی اجازت لینا لازمی قرار دے دیا گیا ہے لہذا بعد حصول اجازت حصوں کی خریداری کی اپیل شائع کی جائے گی۔

مضمون نگار اصحاب سے ہماری التماس ہے کہ وہ مضامین کی عبارت صاف تحریر فرمائیں ورنہ بدخط مضامین شائع نہ ہو سکیں گے۔

نیاز مند
ایڈیٹر

THE ZAMANA, AUGUST 1943. Regd. No. A 14.

زمانہ

یادگار منشی دیانرائن صاحب نگم

جلد [illegible]	اگست ۱۹۴۳ء	نمبر ۲

فہرست

ناشر [illegible]

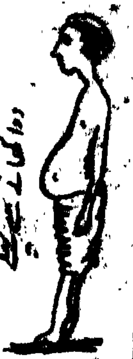


رام بالک کا

روغن سوکھا

یعنی

بچوں کے سوکھا روگ کی شرطیہ اکسیری دوا



یوں تو دنیا میں ہزاروں بیماریاں ہیں مگر یہ ظالم دشمن جان سوکھا مسان جس کو سوکھا روگ بھی کہتے ہیں بڑا بلا ہے اس نے لاکھوں ماؤں کی گودیں خالی کر دیں۔ ہنستے کھیلتے خوبصورت بچوں کو اس دشمن نے خاک میں ملا دیا۔ اس بیماری کا حال اُن غمزدہ دکھیاری ماؤں سے پوچھئے جن کے پیارے بچے سوکھا روگ میں مبتلا ہو کر اُن کے ماتا بھرے دلوں کو داغ دے جاتے ہیں سوکھا روگ کے واسطے ماں باپ طرح طرح کے کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں بچوں کو جھولے میں سر کی رگ سے خون نکلواتے ہیں میٹھے پان میں دوا ڈال کر کیڑے نکلواتے ہیں گنے کے کھیت میں لیجا کر تالاب میں تہلواتے ہیں جھاڑ پھونک کراتے ہیں گلے میں گنڈے ڈلواتے ہیں۔ لالٹین تیل اور لال تیل ملواتے ہیں اور گدھی کا دودھ پلواتے ہیں چونکہ بہت سے لوگوں کو سوکھا مرض کی پہچان نہیں ہوتی اور نادانی سے طرح طرح کے علاج و تدابیر کرکے باوجود فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مرض بڑھتا ہی رہتا ہے اسلئے اس مرض کی معمولی علامات درج کی جاتی ہیں تاکہ تشخیص مرض میں آسانی ہو اور جن بچوں میں یہ علامات پائی جائیں فوراً روغن سوکھا استعمال کرکے فائدہ اُٹھایا جا سکے یہ مرض عام طور سے پیٹ کے پھیلنے سے شروع ہو کر سات دن کے بچہ سے زور پکڑتا ہے اور آٹھویں کے مہینے تک رہتا ہے اس عرصے میں لاکھوں بچے اس مرض کا شکار ہو جاتے ہیں سوکھا مرض میں بچہ دن بدن سست رہتا ہے حرارت قائم ہو جاتی ہے آنکھیں ہر وقت نڈھال رہتی ہیں بدن کا خون رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے جسکی وجہ سے بچہ کانٹا ہو جاتا ہے ہاضمہ بالکل بگڑ جاتا ہے اور بدبودار ہرے پیلے دست آنے لگتے ہیں سر کا تالو خالی ہو جاتا ہے کان تھی دبانے سے بچہ روتا نہیں بچے کے ہاتھ پاؤں اور گردن پتلی پڑ جاتی ہے اور پیٹ بڑھ جاتا ہے کھانسی آنے لگتی ہے آنکھیں سفید گڈھے میں گھس جاتی ہیں چہرہ پر جھریاں پڑ جاتی ہیں بچہ ناک کان کھجلاتا ہے بھوک مر جاتی ہے اور دودھ ڈلنے لگتا ہے جب بچہ میں سست نظر آئے تو سمجھ لینا چاہئے کہ سوکھا روگ شروع ہو گیا ہے ایسی حالت میں فوراً رام بالک کا روغن سوکھا بچانا چاہئے کیونکہ یہ تیل اس روگ کو ہمیشہ کیلئے جڑ سے کھو دیتا ہے چاہے بچے سوکھ کر کانٹا ہی کیوں نہ ہو گئے ہوں اسکے استعمال سے لاغر لال بادر ہو کر تماشہ ہو جاتے ہیں اگر سوکھا مرض نہ بھی ہو اور بچے دبلے پتلے ہو رہے ہوں تو بھی اسکے استعمال سے بچے بہت تندرست اور طاقتور ہو جاتے ہیں آجکل سوکھا روگ کیلئے بازاروں میں بہت سے تیل ملتے ہیں جو جسم پر ملنے کیلئے ہوتے ہیں ہمارا روغن سوکھا جسم پر ملا نہیں جاتا بلکہ پلایا جاتا ہے اسلئے اس منحوس مرض کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکتا ہے اور بچے کے ہو جانے پر پھر دوبارہ اس مرض کا اندیشہ نہیں رہتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرض سوکھا دوا سے نہیں جاتا لیکن یہ خیال غلط ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے ہر مرض اور درد کی دوا پیدا کی ہے اور رام بالک کا روغن سوکھا ہزاروں بار کی آزمودہ اور مجرب دوا ہے آجتک سوکھا روگ کی اس سے بڑھکر مفید دوا نہیں بن سکی آزمائش کے بعد آپ خود ہی ہماری صداقت کی گواہی دینگے اور آزمائش ہی بہترین کسوٹی ہے روغن سوکھا کا اشتہار نفع کمانے کیلئے نہیں دیا جاتا ہے بلکہ اس سے مقصد بے زبان بچوں کی زندگی کی حفاظت مقصود ہے کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا ہر عیالدار کے گھر میں رہنا نہایت ضروری ہے اور اسی لئے یہ لاگت ہی کے دام پر مزدور تمندوں کو دیا جاتا ہے یعنی ایک شیشی کی قیمت صرف بارہ آنہ (۱۲/) ہے جو قریب قریب ایک مہینہ تک کام آتی ہے باہر سے منگانے والوں کو خرچ پیکنگ و ڈاک خرچ علحدہ دینا پڑیگا ڈاک سے تین شیشی تک آٹھ آنہ ۸/ محصول لگتا ہے ایک شیشی پر بھی ۸/ خرچ پڑیگا اسلئے کئی شیشیاں ایک ساتھ منگانے سے ڈاک خرچ میں کفایت رہتی ہے روغن سوکھا کے ایجنٹ [illegible] ایک فہرست سے جن کو معقول کمیشن دیا جائیگا۔

رام بالک پنساری عطار نیم گنج والے نادر مل بازار کانپور — برانچ آفس [illegible] گنج کانپور

زمانہ

جلد ۸۱ — اگست ۱۹۴۳ء — نمبر ۲

ہندوستان کی تجارت کا زوال

(از مسٹر پریم نارائن ورما ۔ کانپور)

سنہ ۱۹۴۳ء کا سال ہندوستان کی تجارت اور کاروبار کے لئے کوئی نیک شگون یا خوشگوار کامیابی لیکر نہیں آیا۔ درآمد شدہ مال کی دوبارہ برآمد کا کاروبار ایسا تھا جس سے ہندوستان کے تاجروں کو بہت کچھ درمیانی نفع ہوجاتا تھا اب یہ کاروبار بالکل بند ہے جس سے افغانستان و دیگر ممالک کو جہاں بدیشی مال ہماری معرفت جاتا تھا، بہت تکلیف ہوگا علاوہ ازیں خود ہمارے درآمدی کاروبار کو بہت کچھ زوال ہوگیا ہے۔ دوسری طرف متعدد اشیا جنھیں ہندوستان سے باہر نہ جانا چاہیئے تھا، ملک سے باہر روانہ کردی گئی ہیں، مثلاً سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء کے دس ماہ میں جو جنوری سنہ ۱۹۴۳ء ختم ہوتے ہیں بانوے کروڑ ستتر لاکھ روپیہ کی شکر ہندوستان سے باہر بھیجی گئی۔ اس وقت ہندوستان میں شکر جو قلت محسوس ہورہی ہے اُس کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ دیگر اسباب سے قطع نظر جو ہمارے ملک میں اجناس کی قلت کا باعث ہوئے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء کے دس ماہ میں جس قدر غلہ اور آٹا ہندوستان درآمد کیا تھا اُس سے سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء کے انھیں دس مہینوں میں تیرہ کروڑ دو لاکھ روپیے کم قیمت کا غلہ اور آٹا ملک آیا ہے ہماری حرفت پارچہ بافی کی حالت بھی چنداں اچھی نہیں رہی۔ فروری سنہ ۱۹۴۳ء میں ختم ہونے والے پانچ مہینوں میں ہماری ملوں نے روئی کی سولہ لاکھ اسی ہزار چار سو اٹھاون گانٹھیں خرچ کیں، حالانکہ سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء کے انھیں پانچ ماہ میں سترہ لاکھ، سترہ ہزار تین سو تیس گانٹھیں خرچ ہوئی تھیں۔

تازہ ترین مجموعی اعداد و شمار جو ۲۸ جون سنہ ۱۹۴۳ء کو حاصل ہوئے ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء کے متعلق ہیں یعنی

جنوری ۱۹۴۳ء گذشتہ دس ماہ کے اعداد و شمار ہیں لیکن چونکہ جنوری سال کا پہلا مہینہ ہوتا ہے اس لئے اگر ہم اس مہینہ پر گہری نظر ڈالیں تو ہم پر نہایت دلچسپ واقعات اور اعداد منکشف ہونگے۔ لہذا ہم جنوری ۱۹۴۳ء کو مرکز قرار دیکر اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔

سوتی کپڑا اور ٹاٹ | جنوری ۱۹۴۲ء میں ہندوستانی کارخانوں نے تین کروڑ سرسٹھ لاکھ بیس ہزار گز اور جنوری ۱۹۴۳ء میں تین کروڑ چھیاسی لاکھ گز کپڑا تیار کیا۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں ختم ہونیوالے دس ماہ میں تین ارب اسی کروڑ ستر لاکھ گز کپڑا بنا گیا تھا۔ جنوری ۱۹۴۳ء کو ختم ہونیوالی اسی مدت میں تین ارب ۲۸ کروڑ دس لاکھ گز کپڑا تیار ہوا۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں چوبیس لاکھ گز اور جنوری ۱۹۴۳ء میں ایک لاکھ گز برآمد کیا گیا۔ جنوری ۱۹۴۲ء کو ختم ہونیوالے دس ماہ میں نوے کروڑ پچاس لاکھ دو ہزار گز کپڑا ہندوستان سے برآمد کیا گیا تھا۔ ۱۹۴۳ء کی اسی مدت میں صرف پانچ کروڑ گز کپڑا باہر بھیجا گیا۔

سن کا مال جنوری ۱۹۴۳ء میں ۳۷ ہزار ٹن تیار ہوا تھا جو بمقابلہ جنوری ۱۹۴۲ء کے بقدر ۳۸ ہزار ٹن کم ہے۔ دس ماہ کے اعداد و شمار سے یہ کمی بہت زیادہ واضح ہے۔ ان دس ماہ میں جو مال تیار ہوا اس کا وزن صرف آٹھ لاکھ ۴۳ ہزار ٹن تھا یعنی پیشتر کی نسبت دو لاکھ سولہ ہزار ٹن مال کم تیار ہوا۔ یہ دس ماہ کی مدت جنوری ۱۹۴۳ء میں ختم ہوتی ہے۔ برآمد کی تجارت کے اعداد و شمار سے یہ حقیقت اور بھی مترشح ہو جاتی ہے۔ یہ اعداد اگرچہ صرف دس ماہ کے بارے میں ہیں لیکن ان سے صاف نمایاں ہے کہ اس مدت میں ہندوستان کی تجارت برابر رو بہ تنزل رہی ہے۔ اس دس ماہ کے زمانہ میں جو جنوری ۱۹۴۳ء کو ختم ہوتا ہے صرف ۵ لاکھ ۱۹ ہزار ٹن مال ہندوستان کے باہر روانہ کیا گیا، حالانکہ سال ماقبل کی اس مدت میں ۷ لاکھ ۵۳ ہزار ٹن مال باہر بھیجا گیا تھا۔

لوہا اور اسٹیل | ۱۹۴۲-۴۱ء کے دس ماہ میں ہم نے ایک لاکھ اکیس ہزار ٹن لوہا اور اسٹیل درآمد کیا۔ اس کے مقابلہ میں ۱۹۴۳-۴۲ء کی اسی مدت میں صرف ۴۴ ہزار ٹن لوہا اور اسٹیل باہر سے آیا تھا۔ دسمبر ۱۹۴۲ء ۵۳۰۰ ٹن لوہا اور اسٹیل درآمد کیا گیا تھا جس کی مقدار جنوری ۱۹۴۳ء میں گھٹ کر ۳۴ ہزار ٹن رہ گئی۔

برآمد کے اعداد میں اور بھی افراط و تفریط ہے۔ مثلاً جنوری ۱۹۴۳ء میں ہندوستان سے پندرہ ہزار ٹن لوہا اور اسٹیل برآمد کیا گیا جو دسمبر ۱۹۴۲ء کی برآمد سے نو ہزار ٹن اور جنوری ۱۹۴۲ء کی برآمد سے سولہ ہزار ٹن کم ہے ۱۹۴۳-۴۲ء کے دس ماہ کی برآمد کے اعداد ایک لاکھ ۶۰ ہزار ٹن ہیں۔ حالانکہ ۱۹۴۲-۴۱ء کی اسی مدت میں اس کی مقدار چار لاکھ ۱۷ ہزار ٹن تھی۔

شکر اور کوئلہ | اس مضمون کے شروع ہی میں ہم نے شکر کے متعلق اعداد و شمار درج کئے ہیں، لیکن یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر مزید روشنی ڈالی جائے۔

ہندوستان میں شکر کی درآمد تو قطعی بند ہے۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ دسمبر ۱۹۴۲ء اور جنوری ۱۹۴۳ء میں ہندوستان

نے کوئی شکر درآمد نہیں کی۔ البتہ جنوری ۱۹۴۲ء میں ساڑھے چھ ہزار ٹن کے قریب درآمد کی تھی۔ ۱۹۴۲-۴۱ء کے دس ماہ میں ۴۸ ہزار ٹن شکر درآمد ہوئی تھی، لیکن ۱۹۴۳-۴۲ء کی اتنی ہی مدت میں صرف چھ سو ٹن شکر باہر سے ہندوستان میں آئی۔ "شکر کا سال" ماہ نومبر سے شروع اور اگلے سال کے اکتوبر میں ختم ہوتا ہے۔ ۱۹۴۰-۳۹ء کے سال میں ہندوستان میں پچیس لاکھ ۴۸ ہزار ہنڈرڈ ویٹ اور ۱۹۴۱-۴۰ء میں دو کروڑ ۳۵ لاکھ ۷۰ ہزار ہنڈرڈ ویٹ شکر تیار ہوئی۔ مارچ ۱۹۴۱ء میں ہندوستان میں پانچ لاکھ ۸۰ ہزار تین سو ہنڈرڈ ویٹ شکر بنائی گئی۔ لیکن مارچ ۱۹۴۲ء میں اس کی مقدار صرف ۲۶ لاکھ ۴۸ ہزار ہنڈرڈ ویٹ رہ گئی تھی۔ ان اعداد سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں شکر کی پیداوار بھی زوال پذیر ہے اور درآمد تو بالکل ہی بند ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں شکر کی قلت کا باعث معلوم کرنا مشکل نہیں۔ مگر امسال توقع کی جاتی ہے کہ شکر کی پیداوار بقدر دو لاکھ بیس ہزار ٹن بڑھ جائیگی۔

اب ذرا کوئلہ اور کوک کی برآمد کا حال سنیئے، ماہ جنوری ۱۹۴۲ء میں ایک لاکھ ۲۳ ہزار ٹن کوئلہ ہندوستان سے باہر بھیجا گیا تھا۔ دسمبر ۱۹۴۲ء میں اس کی مقدار ۲۳ ہزار ٹن اور جنوری ۱۹۴۳ء میں صرف ۱۳ ہزار ٹن رہ گئی تھی۔ جنوری ۱۹۴۳ء تک ختم ہونیوالے دس ماہ کی برآمد کے اعداد سے کچھ اور بھی ترشح ہوتا ہے۔ ۱۹۴۲-۴۱ء کے دس ماہ میں ہندوستان سے چودہ لاکھ ستر ہزار ٹن کوئلہ باہر بھیجا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۴۳ء کی اتنی ہی مدت میں صرف ۲ لاکھ ۲۵ ہزار ٹن کوئلہ باہر روانہ ہوا۔ اب شکر کی طرح ہندوستان میں کوئلہ کی درآمد بھی تقریباً بند ہو گئی ہے۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں تین ہزار ٹن کوئلہ ہندوستان میں باہر سے آیا تھا۔ جنوری ۱۹۴۳ء میں اس درآمد کی مقدار صرف ۲۵۰ ٹن رہ گئی تھی۔ دس ماہ کی درآمد کے اعداد حسب ذیل ہیں:۔

۱۹۴۲-۴۱ء　۱۱۳۴۰ ٹن　　　۱۹۴۳-۴۲ء　۴۴۲۷ ٹن

اسی طرح جنوری ۱۹۴۲ء کے مقابلہ میں جنوری ۱۹۴۳ء میں ہندوستان میں دیگر اشیاء کی تیاری بھی کم ہو گئی تھی، ذیل کا نقشہ ملاحظہ ہو:۔

سوتی مال	۵ فیصدی کم تیار ہوا	
سن کا مال	۳۴ " " "	
کاغذ	۲۹ " " "	(جنوری ۱۹۴۲ء میں ایک لاکھ انسٹھ ہزار پانچسو دس ہنڈرڈ ویٹ اور جنوری ۱۹۴۳ء میں فقط ایک لاکھ تیرہ ہزار چھ سو ساٹھ ہنڈرڈ ویٹ کاغذ تیار ہوا)
شکر	۴۸ " " "	
دیا سلائی	۵۲ " " "	(جنوری ۱۹۴۲ء میں تینتیس لاکھ ساٹھ ہزار گروس اور جنوری ۱۹۴۳ء میں چودہ لاکھ ساٹھ ہزار گروس مال تیار ہوا)

دیگر اشیاء | البتہ چائے کی پیداوار اور برآمد دونوں میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۱ء میں چائے کی پیداوار اکتالیس کروڑ ۵۳ لاکھ ۷۰ ہزار پاؤنڈ اور ۱۹۴۲ء میں سینتالیس کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ تھی۔ ۱۹۴۳ء کی فصل ابھی تیار نہیں ہوئی ہے لہذا

جنوری ۱۹۴۳ء کے بعد کوئی مزید پیداوار نہیں ہوئی ہے۔ ۱۹۴۱-۴۲ء میں ۴۴ کروڑ ۱۹ لاکھ ۵۹ ہزار پونڈ اور ۱۹۴۲-۴۳ء میں ۳۰ کروڑ ۱۸ لاکھ ۴۷ ہزار پونڈ چائے ہندوستان سے باہر بھیجی گئی۔

جنوری ۱۹۴۲ء میں ۳۰۴ ٹن اور جنوری ۱۹۴۳ء میں صرف ۲۱۳ ٹن سیمنٹ ہندوستان میں باہر سے آیا۔
اسی زمانہ یعنی جنوری ۱۹۴۲ء و جنوری ۱۹۴۳ء میں کاغذ کے درآمد کے اعداد ساٹھ ہزار اور اٹھارہ ہزار ہنڈرڈ ویٹ بالترتیب تھے۔

ہندوستان میں آجکل کاغذ کا جو قحط ہے اس کی وجہ صرف مندرجہ بالا اعداد سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ محکمہ زراعت کی پیشین گوئیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۴۲-۴۳ء میں بمقابلہ ۱۹۴۱-۴۲ء کے تین فیصدی دھان کم پیدا ہوا یعنی ۱۹۴۲-۴۳ء میں دھان کی پیداوار دو کروڑ ۵۲ لاکھ ۵۱ ہزار ٹن سے گھٹ کر دو کروڑ ۴۵ لاکھ ۳۳ ہزار ٹن رہ گئی۔ گیہوں میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ۱۹۴۱-۴۲ء میں گیہوں کی پیداوار ایک کروڑ ۲۷ ہزار ٹن تھی، اور ۱۹۴۲-۴۳ء میں ایک کروڑ ستر ہزار ٹن ہوئی۔ البتہ کاشت نیشکر میں ۳۰ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۱-۴۲ء میں گنے کی پیداوار ۴۳ لاکھ ۱۷ ہزار ٹن اور ۱۹۴۲-۴۳ء میں ۵۶ لاکھ ۹۲ ہزار ٹن تھی۔

ریلوے | اگر ریلوے کے اعداد سے تجارت و کاروبار کا رخ معلوم ہو سکتا ہے تو ذیل کے اعداد کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ درجہ ایک کی سرکاری ریلوں کی آمدنی جنوری ۱۹۴۲ء میں گیارہ کروڑ ۳۹ لاکھ روپیہ اور جنوری ۱۹۴۳ء میں ۱۳ کروڑ ۴۳ لاکھ روپیہ تھی یعنی جنوری ۱۹۴۳ء میں ۲۱ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہو کہ ویگنوں کی تعداد میں ۱۱ فیصدی کی کمی ہوئی۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں چھ لاکھ ۹۱ ہزار ویگنیں لادی گئی تھیں۔ مگر جنوری ۱۹۴۳ء میں ایسی ویگنوں کی تعداد صرف پانچ لاکھ نوے ہزار تھی۔ کوئلہ اور کوک کا نقل و حمل بقدر ۱۵ فیصدی کم ہوا یعنی جنوری ۱۹۴۲ء میں ایک لاکھ سات ہزار ویگنیں لادی گئیں تھیں۔ مگر جنوری ۱۹۴۳ء میں ۹۳ ہزار ویگنوں سے کام لیا گیا، اس طرح متفرقہ ویگنوں میں ۲۶ فیصدی کی کمی واقع ہوئی۔ اور ان کی تعداد جنوری ۱۹۴۳ء میں ایک لاکھ ۴ ہزار سے گھٹ کر ۷۷ ہزار رہ گئی۔

ریلوے اور جہازوں کے ذریعے اندرون ملک میں سامان تجارت کا جو نقل و حمل ہوا اُس کے متعلق دستیاب شدہ اعداد و شمار سے پوری حالت معلوم نہیں ہوتی، لیکن اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ جون ۱۹۴۲ء تک تجارتی مال کے نقل و حمل میں کچھ ترقی ہوئی، مگر اس سے کوئی خاص نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ بہرحال ملک کی تجارتی حالت کے بارہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کی تازہ ترین رپورٹ سے حسب ذیل کیفیت معلوم ہوتی ہے:-

"ماہ زیر نظر (جنوری ۱۹۴۳ء) میں ہندوستان کی کاروباری حالت میں کسی قدر ترقی ہوئی لیکن کوئی نمایاں تغیر معلوم نہیں ہوا۔ بمبئی کی معرفت پارچہ بافی کی سرگرمیاں پورے درجہ پر جاری رہیں لیکن سن (جوٹ) کی حرفت میں بمقابلہ ماہ سابق کے کسی قدر تنزل ہوا ... ماہ زیر نظر میں اشیاء کے تھوک نرخ میں مزید اضافہ ہوا ...... ملک کی

رت خارجیہ میں کمی ہوتی رہی۔ لیکن ماہ زیر نظر میں درآمد شدہ اشیاء کی قیمتیں بہ نسبت ماہ سابق زیادہ تھیں۔
مد کردہ مال کی قیمت کچھ کم رہی۔ بہرحال تجارتی اعتبار سے ہندوستان کا پلّہ بھاری رہا۔"

سامان تجارت | اب ہم ہندوستانی سامان تجارت کی برآمد اور بدیشی سامان کی درآمد کے اعداد و شمار پر توجہ کرتے ہیں
جنوری ۱۹۴۲ء کے دس ماہ میں ایک ارب ۷۹ کروڑ ۴۵ لاکھ روپیہ اور جنوری ۱۹۴۳ء تک اتنی ہی مدت میں ایک
ارب ۷۰ کروڑ ۳ لاکھ روپیہ کا سامان تجارت ہندوستان سے باہر گیا۔ یعنی برآمد کردہ مال کی قیمت میں ۴۱ کروڑ ۵۲ لاکھ
کی کمی ہوئی۔ اسی طرح جنوری ۱۹۴۲ء تک دس ماہ کی مدت میں ایک ارب ۵۳ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ اور جنوری ۱۹۴۳ء
تک اتنی ہی مدت میں بانوے کروڑ ۴۷ لاکھ روپیہ کا سامان تجارت ہندوستان میں باہر سے آیا۔ درآمد کی
میں ۹۷ لاکھ روپیہ صرف شکر کا حصہ ہے۔

اس طرح درآمد و برآمد کا فرق دراصل ہندوستان کے حق میں نہیں ہے، البتہ فرضی کھینچ تان اور
فگرنگ کی شعبدہ بازی سے کام لیکر کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان فائدہ میں ہے۔ درآمد و برآمد کا فرق بحق ہندوستان
جنوری ۱۹۴۲ء میں تین کروڑ ۴۳ لاکھ روپیہ، دسمبر ۱۹۴۲ء میں دس کروڑ ۸۵ لاکھ روپیہ اور جنوری ۱۹۴۳ء میں دس
کروڑ ۳۳ لاکھ روپیہ تھا۔ مال کی قیمت کے لحاظ سے درآمد و برآمد کا فرق ہندوستان کے حق میں جنوری ۱۹۴۳ء
کو ختم ہونے والے دس ماہ تک ۷۱ کروڑ ۱۹ لاکھ روپیہ اور ۱۹۴۲ء کی اتنی ہی مدت میں ۷۵ کروڑ تین لاکھ روپیہ تھا۔
درحقیقت جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، اس اضافہ میں مال کی قیمت کے بڑھ جانے اور سٹہ بازی کا
تھا، اور کاروبار کی حالت اس کی ذمہ دار نہیں تھی۔ سرکاری طور پر جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں اُن سے بھی
ہوتا ہے کہ اشیاء کی تھوک قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اگر ۱۹؍ اگست ۱۹۳۹ء کے نرخ کو سَو قرار دیا جائے تو
مندرجہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہوگا کہ مال کی قیمتوں میں کس حد تک اضافہ ہو گیا تھا۔

اوسط قیمت اشیاء

	جنوری ۱۹۴۲ء	جنوری ۱۹۴۳ء
چاول	۱۵۱	۲۱۸
گیہوں	۱۹۹	۲۵۲
شکر	۱۱۴	۱۳۸
اجناس خام	۱۵۸٫۶۷	۱۷۱٫۶۵
مصنوعات	۱۵۰٫۶۹	۲۲۴٫۶۱
جملہ اشیاء	۱۴۳٫۶۰	۱۹۰٫۶۳

ایک طرف تو اشیاء کی قیمتیں اس قدر چڑھ گئیں اور دوسری طرف ملک کی مالی حالت اتنی پست ہوگئی کہ زمانۂ قبل از جنگ کے مقابلہ میں جاری کردہ نوٹوں کی تعداد میں ۳۰ فیصدی کا اضافہ ہوگیا۔ روپیہ کی نقل و حرکت تیز رہی ۴۲-۱۹۴۱ء میں بیس ارب چھپن کروڑ، نوے لاکھ روپیہ کے چیک ادا کیئے گئے اور ۴۲-۱۹۴۱ء میں ۲۶۔ارب، ۴۵ کروڑ ۸۰ لاکھ روپیہ چیکوں کی ادائگی میں دیا گیا۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں منظور شدہ بنکوں کے ذمہ ہندوستان میں فوری مطالبات کی تعداد دو ارب سترہ کروڑ دو لاکھ روپیہ اور جنوری ۱۹۴۳ء میں تین ارب چوالیس کروڑ اکھتر لاکھ روپیہ تھی۔ نقدی جنوری ۱۹۴۲ء میں دس کروڑ چھ لاکھ روپیہ اور جنوری ۱۹۴۳ء میں پندرہ کروڑ سترہ لاکھ روپیہ کی تھی۔ ریزرو بنک میں بقایا ۳۵ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ سے بڑھکر ۴۴ کروڑ ۳۰ لاکھ روپیہ ہوگئی تھی۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں بنکوں کے ذمہ میعادی مطالبات ایک ارب ۶ کروڑ ۷۰ لاکھ اور جنوری ۱۹۴۳ء میں ایک ارب ۱۳ کروڑ ۶۹ لاکھ روپیہ تھے دسمبر ۱۹۴۲ء سے جنوری ۱۹۴۳ء کے درمیان صرف ایک ماہ کی مدت میں بینکوں کے ذمہ فوری اور میعادی مطالبات کی رقم آٹھ کروڑ روپیہ بڑھ گئی۔ نوٹوں کی اشاعت صرف ایک سال میں ۷۹ فیصدی بڑھ گئی یعنی جنوری ۱۹۴۲ء میں تین ارب ۲۸ کروڑ کے نوٹ جاری تھے۔ جو جنوری ۱۹۴۳ء میں پانچ ارب ۸۸ کروڑ کے ہوگئے۔ مرکزی حکومت کے ٹریژری بلوں کی فروخت بحق ریزرو بنک آف انڈیا جنوری ۱۹۴۲ء میں چھ کروڑ ۲۲ لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ اور جنوری ۱۹۴۳ء میں ۹۷ کروڑ ۸۰ لاکھ روپیہ ہوئی۔ اس طور پر ان کی قیمت میں ایک ہزار چار سو اکھتر فیصدی کا اضافہ ہوا۔ چیکوں کی ادائگی میں بھی بمقابلہ جنوری ۱۹۴۲ء کے جنوری ۱۹۴۳ء میں ۲۳ فیصدی ماہوار کا اضافہ ہوا۔

زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اعداد مندرجہ بالا یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں کہ ہندوستان میں تجارتی حالات بہتر نہیں ہیں۔ البتہ مصنوعی طور پر زر کی بہتات ہوگئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کی اقتصادی مشعل میں ابھی کچھ روشنی باقی ہے لیکن در اصل ہماری تجارتی اور کاروباری حالت گرتی جارہی ہے بقول مسٹر جی۔ ایل۔ مہتہ "حکومت ہند کو سامان جنگ کی سپلائی کے سوا کسی بات سے دلچسپی نہیں ہے" اگر یہ سچ ہے تو ہندوستان، اس کی تجارت اور اوس کی صنعت و حرفت کا خدا حافظ۔

کہاں

آئی مرے کانوں میں یہ آواز کہاں سے؟ دیتا ہے سُنائی یہ مجھے ساز کہاں سے
حیرت میں ہی احساس تو ادراک ہے خاموش اِس نغمۂ دلکش کا ہے آغاز کہاں سے

جگن ناتھ آزاد بی۔ اے

بہت دُور

(حضرت روشن صدیقی)

خزاں کے ساتھ بہت دُور مجھکو جانا ہے
نہ انتظار کرے محفلِ بہار مرا

خوب ہے خوب ہے دنیا تری جنت لیکن
راستہ چھوڑ کہ جانا ہے بہت دُور مجھے
صُبح کی وادیِ زریں سے گزرنا ہر روز
منزلِ لالہ و نسریں میں ٹھہرنا ہر روز
اِک نئے خُلد کا گردوں سے اُترنا ہر روز
ہاں دلآویز ہے یہ خوابِ مسرّت، لیکن
اب تو ہر خواب سے جانا ہے بہت دُور مجھے

یہ خموشی یہ ستارے، یہ غزل ہائے سکوں
یہ مہ نیم شبی، انجمن آرائے سکوں
یہ سکوں، حسنِ سکوں، حسن تقاضائے سکوں
سب ہیں پیغامبرِ جنتِ راحت لیکن
خلدِ راحت سے تو جانا ہے بہت دُور مجھے

؎ اشاعت باجازت آل انڈیا ریڈیو لاہور۔

دوشِ کہسار پہ یہ جوئے رواں کی زنجیر
دشت کی چھاؤں میں یہ خواب سکوں کی تعبیر
یہ ہر اِک گام پہ مدہوشِ ہوا دامنگیر
روکتے ہیں مجھے ہر چند بہ منت، لیکن
مَیں یہ کہتا ہوں کہ جانا ہے بہت دُور مجھے

یہ گلستاں، یہ خیاباں، یہ تجمل گاہیں
یہ مہکتی ہوئی گلیاں، یہ گل افشاں راہیں
یہ مری سمت کو بڑھتی ہوئی نازک باہیں
یاد آتا تو ہے اِک خوابِ محبت لیکن
چونک اُٹھتا ہوں کہ جانا ہے بہت دُور مجھے

آسماں، عشق کا افسانہ سرا ہے اب بھی
کہکشاں قاصدِ اربابِ وفا ہے اب بھی
زندگی حسن نما، عشق ادا ہے اب بھی
کم نہیں کچھ کششِ حسن و محبت، لیکن
خود گریزاں ہوں کہ جانا ہے بہت دُور مجھے

زیرِ گردوں ہیں طرب خانۂ آزاد بہت
خلد کے گیت ہیں انساں کو ابھی یاد بہت
ابھی دلکش ہے رخِ عالمِ ایجاد بہت

اور نایاب نہیں گوشۂ فرصت۔ لیکن
وقت محدود ہے جانا ہے بہت دُور مجھے

میں بھی اندوہِ جدائی کو بھلا سکتا تھا
غم کو سیلابِ مسرّت میں بہا سکتا تھا
میں بھی ہر خواب کو فردوس بنا سکتا تھا

وہ مرے سامنے ہے قصرِ مسرّت۔ لیکن
یاد آتا ہے کہ جانا ہے بہت دُور مجھے

جذبۂ شوق کی باتوں سے بہت دُور ہوں میں
حسن کی چاندنی راتوں سے بہت دُور ہوں میں
زندگی، اب ترے ہاتھوں سے بہت دُور ہوں میں

کیا کہوں تجھ سے، بڑی ہے یہ حکایت، لیکن
مختصر یہ ہے کہ جانا ہے بہت دُور مجھے

سُن! کہ، میں صبحِ قیامت کی طرف جاتا ہوں
آگہی سوزِ حقیقت کی طرف جاتا ہوں
آج میں وادیٔ فرقت کی طرف جاتا ہوں

لڑکھڑاتے ہیں قدم، غیر ہے حالت، لیکن
جادہ پیما ہوں کہ جانا ہے بہت دُور مجھے

فتحِ عشق

(از حضرت شائق ہندو)

مسلط تھا جمود عرصہ سے دنیائے محبت پر بھلا بیٹھے تھے نجد و بیستوں رسم جنوں خیزی
پڑا تھا سرد سوزِ غزنوی ملبوسِ شاہی میں دھواں تھی پرچمِ زلفِ ایازی کی دل آویزی
ضرورت تیشۂ فرہاد کی تھی کوہ و وادی کو بیاباں چاہتا تھا دیدۂ مجنوں کی گل ریزی
تمنا حسن کو تھی پھر خراجِ عشق حاصل ہو تقاضا تھا کرے پھر دیدۂ محمود دُرریزی
غرض دنیا پہ اک ایسی جمودیت تھی مستولی کہ جس میں پا رہی تھی پرورش غم کی بلاخیزی
سکوں یہ رفتہ رفتہ ایک طوفاں بن گیا آخر حدودِ عشق کو توڑا دکھائی اس قدر تیزی
روایاتِ کہن کا دفترِ پارینہ دھو ڈالا نئی صورت سے کی دنیا میں تحریکِ جنوں خیزی
چمک کو حسن چھانٹا اب کی ایرانی نہ تورانی تڑپ کو دل لیا اب کی نہ افغانی نہ تبریزی
نئی دنیا کو بخشا اک نرالا حسن کا پیکر نئے جذبات کا حامل بنایا قلبِ انگریزی
بڑی مدت میں جادو عشق کا سر چڑھ کے بولا ہے نہ سر بر ہو سکے گی پیرزن کی حیلہ انگیزی

اعادہ کر رہی ہے جرأتِ فرہاد پھر اپنا
مگر اب کی بزورِ قوتِ بازوئے پرویزی

یورپینوں کی خدماتِ اَدَبِ اُردو

عہدِ مغلیہ میں جب اہلِ یورپ ہندوستان آئے تو اُس وقت سرکار اور دربار کی زبان فارسی تھی امرا اور رؤسا سب فارسی بولتے تھے، البتہ عوام کی زبان ہندوستانی تھی۔ اس وقت ان یورپینوں کا مقصد ہندوستان میں تجارت یا دینِ مسیحی کی تبلیغ کرنا تھا جس کا تعلق عوام سے تھا۔ اس لئے ہر پادری کو جو ہندوستان بھیجا جاتا تھا عربی، فارسی اور ہندوستانی زبان پر عبور ہوتا تھا۔

شروع میں جب یسوعی (Jesuit) فرقہ کے پادری ہندوستان آئے تو انھوں نے ترجمانوں سے کام چلایا، چنانچہ پادری اکوا وائوہ (Acqua Viva) نے جو اکبر اعظم کے دربار میں تھا، ہنریقیز (Henriquez) نامی ایک ایرانی سے جو عیسائی ہوگیا تھا، اور ڈومنک پیریز (Dominic Perez) سے ترجمانوں کا کام لیا تھا۔ لیکن ان پادریوں نے بہت جلد یہ محسوس کیا کہ براہ راست گفتگو کا جو اثر ہوتا ہے، وہ ترجمانوں کی اعانت سے نہیں ہوسکتا، اس لئے نہ صرف درباری و دفتری بلکہ عوام کی زبان کا جاننا ضروری ہوا۔ چنانچہ پادریوں نے عربی، فارسی اور ہندوستانی زبانیں سیکھنا شروع کردیا۔ عربی اس لئے سیکھی کہ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرکے ان سے مناظرہ کیا جائے، فارسی اس لئے پڑھی کہ وہ سرکاری زبان تھی، اور ہندوستانی اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے عوام میں عیسائیت کی تبلیغ کی جائے۔ بعض پادریوں نے سنسکرت کی طرف بھی توجہ کی فارسی سیکھنے کے لئے ان پادریوں کو شہنشاہ اکبر نے علامہ ابوالفضل کے سپرد کردیا تھا۔ اس کے بعد یہ قاعدہ ہوگیا کہ جو پادری فارسی نہ جانتا اُسے ہندوستان نہ بھیجا جاتا۔

ان پادریوں میں فارسی زبان کی خدمت سب سے زیادہ پادری زیویر (Xavier) نے کی۔ اس نے بہت سی کتابیں اور رسالے فارسی زبان میں لکھے مثلاً (۱) مرأۃ القدس یعنی داستانِ مسیح (۲) آئینۂ حق نما (۳) داستانِ احوالِ حواریین (۴) زبور (۵) اناجیل (۶) فارسی و لاطینی گرامر، اور (۷) آدابُ السلطنت۔

اگرچہ مشنریوں کے لئے فارسی کا جاننا لازمی تھا، مگر وہ عوام کی زبان یعنی ہندوستانی سے غفلت نہیں برت سکتے تھے۔ چنانچہ پادری ڈیزیڈری (Dezederi) نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۱۔ اگست سنہ ۱۷۱۴ء میں اس بات پر اظہارِ افسوس کیا تھا کہ انھوں نے اتنی مدت فارسی سیکھنے میں فضول صرف کی، اگر اتنا زمانہ ہندوستانی کی تحصیل میں صرف کرتے تو کہیں زیادہ مفید ہوتا۔ درحقیقت ہندوستانی زبان عوام کی مستقل زبان بن گئی تھی۔

اور ہندوستانی اُس زبان کو کہتے تھے جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی جاتی تھی۔

۱۶۰۳ء میں پادری ایکوا وانوہ نے تجویز کیا کہ گووا میں ایک اسکول قائم کیا جائے جس میں ہندوستانی عیسائیوں کو ہندوستانی زبان سکھائی جائے۔ پادری کورسی (Cosi) (۱۶۱۲ء) نے ہندوستان آتے ہی ہندوستانی زبان سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۶۱۵ء میں حکم ہوا کہ آگرہ کے گرجا میں تمام پادری ہندوستانی زبان میں "اعترافِ گناہ" (Confession) کیا کریں، اور ۱۶۳۲ء میں ہندوستانی زبان میں پادریوں کا امتحان لیا جائے گا۔

سب سے پہلی ہندوستانی کتاب جو پادریوں نے شائع کی وہ پادری زیویر کی کتاب "داستان احوال حواریین" کا اردو ترجمہ تھا جو سردھنہ ضلع میرٹھ کے پادریوں نے شائع کیا تھا۔ اس کا نام انھوں نے "نقشۂ کتاب بارہ حواریین" رکھا تھا۔ اس کے بعد سترھویں صدی میں ایک اردو ڈکشنری اور گرامر شائع کی گئی جو لاطینی زبان میں تھی۔

جان جوشوا کٹلر (John Joshua Cutler) ایک جرمن نے جو سلطنت ہالینڈ کی طرف سے بہادر شاہ اور جہاندار شاہ کے دربار میں سفیر تھا، ایک ہندوستانی ڈکشنری اور گرامر لکھی۔ یہ شخص بہت مدت تک دہلی، آگرہ، اور لاہور میں رہا تھا، مگر ۱۷۱۶ء میں ایران چلا گیا۔ اس کی کتاب کو ڈیوڈ مل (David Mill) نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا تھا لیکن زبان لاطینی تھی۔

اب اردو کی ڈکشنریوں اور گراموں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ ۱۷۴۴ء میں شیلز نے لاطینی زبان میں ایک اردو گرامر لکھی جس میں عربی و فارسی رسم الخط سے بھی کام لیا گیا تھا۔ اس کتاب میں ناگری حروف کا بھی ذکر تھا۔ اور الفاظ کے واحد و جمع بھی دیئے تھے۔

۱۷۷۲ء میں مسٹر ہیڈلے (Headley) نے ایک اردو گرامر لکھی، اور ۱۷۷۸ء میں پرتگال کے دارالحکومت شہر لزبن سے ایک اردو گرامر شائع ہوئی جس کی زبان پرتگیزی اور نام "گرامیٹکا انڈکا" (Gramatica Indica) تھا۔

۱۷۸۵ء میں مسٹر کے۔بی۔ ڈف (K. B. Duff) نے مدراس میں ایک اردو گرامر لکھی۔ یہ شخص بنگلی، اردو، اور سنسکرت جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے دو ڈراموں کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

اب تک گویا اردو زبان نے انفرادی حیثیت اختیار نہ کی تھی۔ اس کے بعد دوسرا دور آیا جبکہ سرکاری طور پر اردو زبان کو فروغ دیا جانے لگا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کلکتہ میں ایک کالج قائم کیا جس میں انڈین سول سروس والوں کو اردو زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جان گلکرسٹ (John Gilchrist

اِس کالج کے افسرِ اعلیٰ تھے، اور لطف، جوان، نہال چند، افسوس، میر امن دہلوی اور حیدری جیسے مشہور اہلِ قلم شعبۂ اُردو سے وابستہ تھے۔ درحقیقت بقول مسٹر رام بہادر سکسینہ، اُردو نثر فورٹ ولیم کالج ہی کے طفیل میں عرصۂ وجود میں آئی۔ اور جان گلکرسٹ اُردو نثر کے جنم داتا تھے۔ حکومت کی توجہ و التفات سے اُردو کو اتنی ترقی ہوئی کہ نصف صدی بعد اُس نے فارسی کو اُکھاڑ دیا۔

۱۷۸۷ء اور ۱۷۹۰ء کے درمیان جان گلکرسٹ نے ایک اُردو گرامر لکھی، جو ۱۷۹۶ء میں شائع ہوئی گلکرسٹ کی اور تصانیف حسبِ ذیل ہیں:- (۱) انگریزی ہندوستانی ڈکشنری جو ۱۷۹۶ء میں شائع ہوئی۔ (۲) اورینٹل لنگوسٹ (Oriental Linguist) یعنی مقدمہ زبان ہندوستانی، جو ۱۷۹۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ (۳) ہندوستانی گرامر جو ۱۷۹۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ (۴) ہندوستانی لسانیات (Philology) ۱۸۱۰ء میں جان گلکرسٹ نے کلکتہ سے ایک اُردو رسالہ بھی جاری کیا تھا جس کی زندگی غیر مسلسل رہی۔ ۱۸۳۱ء، ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۶ء کے متعدد پرچے ابھی تک موجود ہیں۔ فورٹ ولیم کالج سے قطعِ تعلق کے بعد بھی وہ اُردو کی خدمت کرتے رہے، چنانچہ وہ لیسسٹر کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں ہندوستانی زبان کے پروفیسر ہو گئے۔ اسی سلسلہ میں ابراہام لاکٹ، جے۔ ڈبلو۔ ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر (Abraham Lacket, J.W. Taylor & Dr. Hunter) کے بھی نام لئے جا سکتے ہیں۔

۱۸۱۳ء میں جان شیکسپیئر (John Shakespear) نے ایک اُردو گرامر شائع کی جو اس قدر مقبول ہوئی کہ اُنیسویں صدی میں کئی بار شائع ہوئی۔

۱۸۲۲ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ایک کتاب "مقدمۂ زبان اُردو" شائع ہوئی جس میں لغت، صرف و نحو اور درسی مضامین تھے۔

۱۸۲۹ء میں گارساں دتاسی نے پیرس میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام "اُصول زبانِ اُردو" تھا۔ دتاسی نے ایک اور کتاب "تاریخ شعرائے اُردو" بھی لکھی جس میں اُردو کے شاعروں کا تذکرہ تھا۔

۱۸۳۰ء میں آئی۔ ڈبلو۔ بریٹن (I.W. Breton) نے لندن سے ایک اُردو گرامر شائع کی، اور ۱۸۳۱ء میں اسٹنفورڈ (Stanford) نے قواعد اُردو شائع کی جس کا طویل نام یہ تھا:-

"جدید خود آموز قواعد زبان ہندوستانی جو برٹش انڈیا کی نہایت کارآمد اور عام زبان ہے۔"

اس کتاب کی زبان اُردو مگر حروف انگریزی تھے۔ یہ اس قدر مقبول ہوئی کہ متعدد بار شائع ہوئی۔

۱۸۴۴ء میں لندن سے اُردو زبان کی ایک محشی لغت شائع ہوا اور ۱۸۴۷ء میں پادری اسمال (Small) نے اُردو لٹریچر کا انتخاب مع گرامر شائع کیا۔ اس کا نام "اُردو علم ادب" تھا۔

۱۸۶۲ء میں کاٹن ماتھر Cotton Mather نے قواعد اُردو لکھی جو ۱۸۶۶ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی۔ ۱۸۶۲ء میں ڈاوسن (Dowson) نے اُردو کے منتخب مضامین کا مجموعہ شائع کیا، اور اسی سال لندن سے پامر (Palmer) نے اُردو، فارسی، اور عربی کی گرامر شائع کی۔ ۱۸۸۲ء میں کیگر (Keggar) اور ۱۸۹۳ء میں نیپلز سے فان کیو (Von. kew) کی اُردو گرامر منظرِ عام پر آئی۔ ۱۸۸۸ء میں ایک یورپین نے شہر ستارہ میں ایک اُردو گرامر چھپوائی اور ۱۸۹۳ء میں ایک جرمن فاضل اے۔ سی۔ ڈف (A.C.Duff) نے اُردو ڈکشنری تصنیف کی جس کا نام "جنامی و عملی" تھا۔ ایک انگریز خاتون نے بھی ایک اُردو ڈکشنری لکھی تھی جس پر تاریخِ اشاعت درج نہیں ہے۔

ان بہت سی اُردو ڈکشنریوں اور گرامروں کی اشاعت اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اُردو داں یورپینوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اور بہت سے یورپین ایسے تھے جنھیں اُردو زبان پر اس قدر عبور حاصل ہوگیا تھا کہ وہ اُردو شاعری میں فخر کے ساتھ انہماک رکھنے لگے تھے۔ ان میں سے بعض کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:۔

کپتان فرانسیس کونیر، یہ آگسٹائن (Augustine) کے صاحبزادہ تھے۔ اُردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کی ایک غزل دہلی میں دستیاب ہوئی ہے، جس کا ایک شعر حسب ذیل ہے:۔

ہے خواب میں دیکھا تو بظاہر بھی ملیں گے قسمت سے نہ گر خواب کی تعبیر الٹ جائے

شہنشاہ شاہ عالم کے زمانہ میں جان طامس (John Thomas) ایک یورپین تھے جن کے صاحبزادہ جارج طامس (George Thomas) کو اُردو زبان پر خاصہ عبور حاصل تھا، یہ دہلی میں "خانصاحب" کے لقب سے بہت مشہور تھے۔ اپنی شائستہ اطواری کی بدولت ۱۷۹۲ء میں شہنشاہ کے درباریوں میں داخل ہوگئے شاہ عالم ان کی صحبت سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ ۱۸۰۲ء میں کلکتہ جارہے تھے کہ اثنائے راہ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، مندرجہ ذیل شعر انھیں کا ہے:۔

سودا ہے زلفِ یوسفِ ثانی کا اس قدر روتے ہیں ہم کھڑے سرِ بازار، زار زار

مسٹر اسٹیفن انیسویں صدی کے اوائل میں اچھے شاعر گذرے ہیں، جنھوں نے ۱۸۰۲ء میں یہ شعر کہا تھا:

خط کا جواب آیا ہے، لکھتا جو کبھی خط کر ڈالونگا اک دم میں ترے آن کے پرزے

۱۸۶۲ء میں جارج بی۔ شور (George B.Shore) بھی اچھے شاعر گذرے ہیں، اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، اُنھوں نے اپنے دو دیوان بھی مرتب کیئے تھے، مگر اب ایک کا بھی پتہ نہیں، طبیعت تصوف کی طرف زیادہ مائل تھی، ذیل کا شعر ملاحظہ ہو:۔

دیر و حرم میں دے نہ تو ترجیح زاہدا سر جس طرف جھکا یا وہی سجدہ گاہ تھی

انیسویں صدی کے اوائل میں الگزینڈر ہیڈلے (Alexander Headley) ایک فرانسیسی نژاد ڈاکٹر دہلی میں رہتا تھا، غریبوں کا علاج مفت کرتا تھا، اُس نے ایک ہندوستانی عورت سے شادی کر لی تھی، کچھ دن آگرہ میں بھی رہا، اُردو زبان خوب جانتا تھا، شعر و سخن سے شوق تھا، مرزا غالب کے معتقدین اور عمر خیام کے ارادت مندوں میں تھا۔ آزاد تخلص کرتا تھا، اُس نے اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا، مگر افسوس کہ اُس نے نا وقت یعنی صرف ۳۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس لئے دیوان شائع نہ ہو سکا، بعد میں اُس کے بھائی نے دیوان مرتب کر کے مع اُردو مقدمہ شائع کیا۔ اس کی زبان صاف و سلیس اور الفاظ مترنم ہوتے تھے۔ ایک شعر نذر ہے:۔

ہنگام سحر بادہ گساری کا مزا ہے ۔۔۔ اوقات کریں اپنی تلف بہر دعا ہم

آگرہ میں ڈی سوزا (De Souza) نامی ایک پرتگیز بہت جفاکش اور محنتی آدمی تھا، قدرت نے دل و دماغ بھی اچھا عطا فرمایا تھا، مفتوں تخلص اور مرزا عنایت علی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ ذیل کا شعر اسی کی طبع رسا کا نتیجہ ہے:۔

نکالوں کس طرح پہلو سے ٹکڑا اُس کے پیکاں کا ۔۔۔ کہ مدت میں گذر دل میں ہوا ہے آج مہماں کا

جان (John) نامی ایک اینگلو انڈین میر وزیر علی لکھنوی کا شاگرد تھا اور "صاحب" تخلص کرتا تھا۔ یہ شعر اُسی کا ہے:۔

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤنگا ۔۔۔ مجھ کو پہناتے ہو زنجیر یہ زنجیر عبث

جیکب آئرلینڈ Jacob Ireland گورکھپوری حضرت ریاض خیرآبادی سے شرف تلمذ رکھتے تھے، حال ہی میں انتقال ہوا ہے، ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

ترا تیر دل سے جدا ہو رہا ہے ۔۔۔ یہ ظلم او کماندار کیا ہو رہا ہے

سردھنہ ضلع میرٹھ میں بیگم سمرو کے دربار میں چھ شاعر تھے، ان میں سے ایک واکر (Walker) نامی یورپین تھا۔ خوب اُردو بولتا اور شعر کہتا تھا۔ افسوس کہ اس کا کوئی شعر دستیاب نہیں ہوا۔

انیسویں صدی کے وسط میں مسٹر بلیکر (Blaker) ایک انگریز کلکتہ پولیس کے بڑے افسر تھے، اُن کی صاحبزادی آین (Anne) اُردو میں شعر کہتی تھیں، حضرت ناسخ سے مشورۂ سخن کرتی تھیں، تخلص ملکہ تھا، مندرجۂ ذیل شعر اُنھیں کا ہے:۔

ہجر میں دل کو بے قراری ہے ۔۔۔ جوش فریاد و آہ و زاری ہے

(نوٹ۔ مضمون ہذا کی تدوین میں "ہندوستان ریویو" سے استفادہ کیا گیا ہے)

تأثّرات

(گاؤں میں ایک شام)

(از بشیر ساجد، بی۔ اے)

آفتاب گرمِ دل، گھر کی طرف جاتے ہوئے — کر رہا ہے آدمی کی سرد مہری کو سلام
خرمنِ گندم پہ ہے دہقان مصروفِ عمل — کوششِ پیہم ہے اسکی بے نیازِ صبح و شام
گوپیا گردش میں ہے مکّی کے کھیتوں پر ابھی — پاسبانِ نعرہ زن کا ہاتھ آزادِ مقام
فطرتِ آشفتہ کو دیتا ہے پیغامِ سکوں — شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں ندی کا خرام
ہیں کنارِ آبجو بیلو کے دو جڑواں درخت — جن کی ہریاول نہیں کرتی خزاں کا احترام
فاختہ پتوں میں چھپ کر نغمۂ کوکو میں محو — دے رہی ہے قلبِ حاضر کو خرد افزا پیام
شام کی تنہائیوں میں ہے اداسی رنگ پر — گونج سے کوکو کی ہیں خاموشیاں رنگیں کلام
قلبِ حاضر کے لئے اذنِ تفکر ہے یہاں — ہے ضمیرِ دہر اک تقدیرِ محزوں کا غلام

آفتاب و آبجو، دہقان و کشت و فاختہ
آہ کتنا منتشر ہے بزمِ ہستی کا نظام!

ریاض خیرآبادی اور اظہارِ شباب

(از مسٹر مظہر عزیز، ایم۔ اے، بی۔ اے (آنرز) ایل ایل بی، سول و فنس مجسٹریٹ کانپور)

میرے نزدیک ناقد کی سب سے بڑی لغزش یہ ہے کہ وہ فن کار کے فن میں وہ بات ڈھونڈھے جو اُس میں ہو یا جو ناقد کا خود جی چاہے کہ اُس میں ہوتی، بدقسمتی سے اُردو شعر و ادب کے بیشتر نقادوں سے یہی لغزش سرزد ہوتی ہے وہ اُس چیز سے (خواہ وہ اُن کے خیال میں بُری ہو یا بھلی) لُطف اندوز ہونا (اور دوسروں کو اُس لطف میں شریک کرنا) نہیں جانتے جو شاعر یا ادیب دراصل پیش کرتا ہے، بلکہ اپنی علمیت اور سخن فہمی کے زعم میں شاعر کے کلام میں کھینچ تان کر ایسے معانی بھر دیتے ہیں جو وہ خود شاعر کے الفاظ کو پہنانا چاہتے ہیں کیونکہ خود اُن کے دماغ میں (اپنے ماحول اور تربیت کے زیر اثر) وہی معانی بھرے ہوتے ہیں، اور گو بیچارے شاعر کے الفاظ ان کے متحمل نہیں ہوتے پھر بھی کسی نہ کسی طرح وہ معانی اُس کے اشعار میں ٹھونس ہی دیئے جاتے ہیں۔ نقاد کے اس "ستم کرم نما" سے اکثر شعرا کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کو بہت نقصان پہونچا ہے۔ کیونکہ فن کار کی اصل قدر و قیمت کا جائزہ لینے کے بجائے اُس کی شکل و صورت توڑ مروڑ کر ایسی بنا دی جاتی ہے کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ چنانچہ ریاض خیرآبادی کے کلام کی بھی یہی درگت بنائی گئی ہے اور اُس کے اُن اشعار میں جنھیں تصوّف اور روحانیت سے دُور کا بھی لگاؤ نہیں کوٹ پیٹ کر تصوّف بھرا گیا ہے، لوگ اُس کے "خمریات" اور "شبابیات" کے مجازی عنصر پر جان دیتے ہیں، سر دُھنتے ہیں، مگر اسیرِ رسم و روایت ہونے کی بنا پر نہ اُس مجازی کیف کا ذکر کرتے ہیں جو اُس کے اشعار کی جان ہے نہ دوسروں کو اِس لطف میں شریک ہونے دیتے ہیں، بلکہ زبردستی اس کو روحانیت کی سرحد تک پہونچا کر "حقیقت" کو "آئیڈیل" پر قربان کر دیتے ہیں۔ ہندوستان میں ممنوعاتِ جنسی (Sexual Taboos) آرٹ کی دنیا میں بھی زور پکڑے ہوئے ہیں! کسی اور جگہ میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اُردو شاعری میں عشق مجازی اور عشق حقیقی کے خلط ملط ہو جانے اور اپنی اصلی اور جداگانہ حیثیت گم کر دینے کا باعث نقاد کی یہی "تصوّف زدگی" ہے

مجھے اس سے انکار نہیں کہ ریاض صوفی منش تھا، مگر کیا صوفی انسان نہیں ہوتا؟ کیا "فنا فی اللہ" ہونے سے پیشتر وہ دوسرے عام انسانوں کے سے ادوارِ زندگی سے نہیں گزرتا؟ کیا اس زمانے میں وہ جسمانی ضروریات محسوس نہیں کرتا؟ کیا اس مادّی زندگی کے تاثرات اُس کے تحت شعور میں جگہ نہیں پاتے، اور کیا ان تاثرات کا

اثر اس کے کردار و گفتار پر نہیں پڑتا؟

شاعری اور بالخصوص غزل میں (جس میں ہر شعر بجائے خود ایک حیثیت انفرادی Independent unit رکھتا اور ایک نئے مفہوم کا حامل ہوتا ہے) یہ بالکل ضروری نہیں کہ ہر شعر تصوف ہی کے لئے وقف ہو، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ پیرایۂ اظہار بھی صوفیانہ مضامین کے بیان کے لئے ناموزوں ہو۔

میں یہ بھی ماننے کے لئے تیار ہوں کہ ریاضؔ کو زندگی میں شراب و شاہد سے کوئی واسطہ نہ پڑا تھا۔ میرے اس خیال کی تائید میں داخلی شہادت ملاحظہ ہو۔

حسینوں کے حنا آلود ہاتھ اس سے کہیں اچھے
کہ موقع پاکے بھی دستِ ادب معذور رہتا ہے

سینکڑوں آئے سوتے میں کب میرے دستِ شوق؟
دھوکا دیا تجھے ترے پھولوں کے ہار نے!

دیکھنے کی چیز تھا محفل میں ساقی کا شباب
بے پیئے سو بار مجھ کو نشۂ صہبا ہوا

چلتے ہیں جب ریاضؔ تو کچھ جھومتے ہوئے
جیسے کوئی پیئے ہوئے مستِ شراب ہو

پی بھی یوں جیسے میں نے پی ہی نہیں
منہ سے میرے کبھی لگی ہی نہیں

مری میخواریاں ہیں گو مگو میں
مرا پینا بھی اک رازِ نہاں ہے

مگر میں یہ نہیں مان سکتا کہ اگر اپنے کلام میں وہ ان چیزوں کا تذکرہ کرتا ہے تو اس سے اُس کا مقصد صرف تصوّف اور روحانیت کو مجازی پیکر میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اُسے اس بہروپ بھرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی وہ تصوف اور روحانیت کو اُن کے اصلی رنگ میں پیش کرکے اپنے کلام میں زیادہ اثر پیدا کر سکتا تھا۔ (میں اُس کے وہ اشعار بھی پیش کرونگا جن کو روحانی کیفیات کا حامل ماننے میں کسی کو تامل نہیں ہو سکتا۔ اور اُن کو پڑھکر میرا مطلب واضح ہو جائیگا۔)

میں یہ بھی نہیں مان سکتا کہ محض ادبی ورثہ اور روایت کے طور پر وہ شراب و شاہد کا استعمال اپنے کلام میں کرتا ہے۔ ادبی روایت کا اثر ایک حد تک ہر شاعر کی زبان اور خیالات پر ضرور ہوتا ہے۔ مگر اُس کی اپنی انفرادیت بھی تو ہوتی ہے جو باوجود تمام بندشوں کے اُبھر کر رہتی ہے۔ اشعار کے ذریعہ شاعر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے، جلے پھپھولے پھوڑتا ہے، اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے آخر یہ کیوں نہ تصوّر کر لیا جائے کہ ریاضؔ اگر زندگی میں مجازی شراب و شاہد سے بیگانہ رہا تو تحت الشعور میں اُن کی آرزو لئے ہوئے تھا، تاکہ اُس کے کلام کا بیشتر حصّہ جو انھیں کے ذکر سے بھرا پڑا ہے واقعیت سے قریب اور زیادہ مُوثر ہو جائے اور اُس کے کلام سے لوگ قرار واقعی حظ اُٹھائیں۔

جب بڑے سے بڑا گنہگار تائب ہو کر پارسا بن سکتا ہے اور اس کے برعکس بڑے سے بڑا زاہد اور عابد

لغزش کر سکتا ہے، جب یہ مسلّم امر ہے کہ یزداں و اہرمن ہر انسان میں پائے جاتے ہیں (عام اس سے کہ وہ نیک ہو یا بد) تو کیا وجہ کہ ہم ایک صوفی کے تحت الشعور کو اس کلیہ سے مستثنیٰ قرار دیں؟ ریاض اپنے شعوری افعال کے اعتبار سے ایک نیک انسان سہی لیکن اُس کے تحت الشعور کے بارہ میں کون حکم لگا سکتا ہے؟ مخصوصاً جب وہ خود کہتا ہے:۔

دل کے بدلے مرے پہلو میں ریاض — اِک حسیں اچھے سے اچھا چاہیئے
خداوندا نہ میرا گھر حسینوں سے رہے خالی — اُدھر جائے کوئی چھم سے اِدھر آئے کوئی چھم سے
بے موت کی یہ موت ہے، اللہ کی پناہ — بچنا پڑا شباب میں ہم کو گناہ سے!
بڑے پاک طینت، بڑے صاف باطن — ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں
وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے — بڑی حسرت سے لب پر ذکرِ گورکھپور آتا ہے

یا پھر یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

لوٹے مزے حیا کے، اُٹھائے ادا کے لطف — پہروں سے مجھ کو آج تصور کسی کا تھا

کیا یہ شعر میرے اس خیال کی تائید نہیں کرتا کہ (زندگی میں نہ سہی، مگر) شراب و شاہد ریاض کے تحت الشعور پر چھائے ہوئے تھے؟ ورنہ تصور ہی میں "حیا" اور "ادا" کے لطف اُٹھانا کیا معنی؟

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اربابِ طریقت کی اصطلاح میں "حیا" اور "ادا" کسی خاص معنی میں مستعمل ہیں، مگر میرے خیال میں شاہدِ حقیقی کے لئے ان الفاظ کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اردو شاعری میں اگر عشقِ حقیقی کو عشقِ مجازی کی مروجہ اصطلاحات سے آزاد کر دیا جائے تو صوفیانہ شاعری کہیں زیادہ اثر انگیز اور بلند ہو جائے۔ عشقِ حقیقی بجائے خود اتنی بلند چیز ہے کہ اُس کے بیان کے لئے مجازی تشبیہات اور استعارات کی مدد لینا خود عشقِ حقیقی کی توہین کرنا ہے۔ عشقِ حقیقی کے بیان کے لئے اُس کی اپنی اصطلاحات ہونی چاہئیں۔

یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ صوفی بھی انسان ہوتا ہے اور خواہ وہ زندگی سے کتنا ہی گریز کیوں نہ کرے زندگی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ زندگی اتنی وسیع ہے کہ صرف تصوف ہی اُسے محیط نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر ایک صوفی کے کلام میں بھی اس زندگی کی دلفریبیوں کے نقوش نظر آئیں تو تعجب نہ کرنا چاہیئے۔

میں ریاض کے "گرم" اشعار کو ایک پاک صاف زندگی بسر کرنے والے "رند" کے تحت الشعور کا آئینہ سمجھتا ہوں۔ میں نے اُس کے اس قسم کے اشعار کا جو انتخاب کیا ہے (اور جو ذیل میں درج ہیں) اُن میں مجھے کوئی "تصوف نما" بات نظر نہیں آتی۔ اگر ان کو بھی تصوف کے رموز کا حامل سمجھا جائے تو میرے خیال میں عقلِ سلیم، آرٹ، شاعری اور خود شاعر پر ظلم ہو گا۔ مثلاً اسی شعر کو لیجئے:۔

وہ پیاری پیاری شکل وہ نازک سے ہاتھ پاؤں
ہم جانتے تھے اُن سے ستایا نہ جائے گا

یہ شاہد حقیقی تو ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ شکل و صورت اور ہاتھ پاؤں سے متصف کرنا ہی کسی "شاہد" کو مجازی بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ یہ حواس خمسہ کی شاعری ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایسے Sensuous (حواس خمسہ کو محظوظ کرنے والے) اشعار اردو کے کسی اور شاعر نے نہیں کہے۔ اب یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ہم جام مے کے بھی لب تر چوستے نہیں
چسکا پڑا ہوا ہے تمھاری زبان کا

لٹ گئی شب کو وہ شے جس کو چھپاتے تھے بہت
ان حسینوں سے کوئی پوچھے کہ کیا جاتا رہا

وہ راتیں یاد آتی ہیں، وہ باتیں یاد آتی ہیں
مرا کھل کھیلنا ظالم ترا محجوب ہو جانا

قیامت ہے وہ تیرا ناز سے انگڑائیاں لینا
ستم ہے کافر آنکھوں کا تری مخمور ہو جانا

چھپتا نہیں چھپانے سے عالم ابھار کا
آنچل کی تہ سے دیکھ نمودار کیا ہوا!

بگہ شرم سے دبتے رہے سرکش جوبن
کام آیا خم گردن کا نگہباں ہونا

وہ تصویر آج تک محفوظ ہے چشم تصور میں
ترے بچپن سے جب اٹکھیلیاں کرتا شباب آیا

دبے گا ہر گلعذار اس سے، دبے گا سب ابھار اس سے
دبے گا جوش بہار اس سے، یہ جوش پر ہے شباب تیرا

کسی محرم سنبھالے گی نہ دہرا لے ہوئے آنچل
رہیں گے وہ نہ قابو میں کسی کے بھی جواں ہو کر

ابھرے ابھرے سخت جوبن عکس افگن ہیں ریاض
کیوں وہ بیٹھے چوڑ کرنے لے کے پتھر آئینہ؟

آج محفل میں انھیں شرم نے اٹھنے نہ دیا
اپنے جوبن کی طرح تھے جو ابھرنے والے

وصل کی رات مرے منہ میں ذرا رہنے دیں
وہ زباں جس سے مکرتے ہیں مکرنے والے

آڑی ہیکل کو چوم لے گی
وہ چیز جو کچھ اٹھی اٹھی ہے

جوبن یوں ہی گدگدا رہا تھا
اس پر انگڑائیاں سحر کی

ہائے تری سرمہ بھری چشم ناز
ہائے ترے بال سنوارے ہوئے

گدگداتا ہو جنھیں جن کا شباب
ایسے معشوقوں کو چھیڑا چاہیئے

چل گیا مسکی ہوئی محرم سے کام
اے نگاہ شوق اب کیا چاہیئے؟

ابھرے جوبن پہ نہیں مسکی ہوئی محرم ریاض
مسکراتی ہے جوانی جوش پہ آئی ہوئی

آنچل ڈھلا رہا مرے مست شباب کا
اوڑھا گیا کبھی نہ ڈوپٹہ سنبھال کے

برگ گل رکھ لیں گے کچھ مسکی ہوئی محرم کی شرم
اپنے سینے پہ گلے کا ہار رہنے دیجئے

وہ سوتے ہیں سونے کی ادا اور ہی کچھ ہے
اے بند قبا قصد مرا اور ہی کچھ ہے

اُبھرے جوبن کے لئے آپ کو آخر نہ بلا   غم گردوں کے سوا اور نگہبان کوئی؟

اُبھرے اُبھرے سخت جوبن، مسکی ہوئی محرم، عالم اُبھار کا، کسی محرم، ڈھلکے ہوئے آنچل! ان سب کے باوجود نہ معلوم کس طرح لوگ ان اشعار میں روحانیت ڈھونڈھ نکالتے ہیں؟

ریاض کے یہ اشعار قطعی طور پر عشق مجازی اور رغبت جنسی سے متعلق ہیں۔ اگر اس حقیقت کا اعتراف کرکے ریاض کے ان اشعار کو پرکھا جائے تو ریاض کی قدر و قیمت اور اُس کے کلام کی دلآویزی (جو نقادوں کی عنایت بیجا کے باعث تصوّف کی برفانی سلوں کے نیچے دب کر رہ گئی ہے) کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے، اور اُس کی شخصیت کے ہر دلعزیز اور محبوب پہلو ناظرین کے سامنے آجاتے ہیں۔ مجھے ریاض خیرآبادی سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا، لیکن جب میں اُسے اُس کے کلام میں ڈھونڈتا ہوں تو وہ مجھے ایک عجیب و غریب شخصیت کا مالک نظر آتا ہے۔ اور یہ تصویر اُس تصویر سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو اُس کے نقاد پیش کرتے ہیں۔ میرے ذہن میں اُس کی شخصیت کا جو نقش قائم ہے وہ کچھ کچھ ان اشعار میں بھی جھلکتا ہے:۔

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش   سُن کر جو پی گئے یہ ترا معلسی کا تھا

حسیں انجمن میں بیٹھ گیا رونق آگئی   کچھ آدمی ریاض عجب دل لگی کا تھا

ان اشعار کو پڑھکر نظیر اکبرآبادی یاد آجاتا ہے...... وہی آزادی، وہی قلندرانہ بےفکری، وہی "سن کر پی جانے کا مزا"!

خواہشات جنسی کی تشفی سے مترتب کیف و سرور اور ان سے متعلق مختلف جذباتی کیفیات اور ذہنی ردِّ عمل دیکھنا ہو تو مندرجہ ذیل اشعار پڑھیئے:۔

جب یاد آگئی ہم نے بھی منہ چوم ہی لیا   ایسا مزا ریاض کسی کی نہیں میں تھا

وہ پوچھتے ہیں "شوق تجھے ہے وصال کا"   منہ چوم لوں جواب ہے یہ اس سوال کا

یہی ہے اُن کی نزاکت تو حال کیا ہوگا   مجھے یہ ڈر ہے کہ وقت وصال کیا ہوگا؟

جو ہیں دستِ گستاخ اپنے سلامت   تو جھوٹا ہی وعدہ وفا ہے کسی کا

لب شیریں سے وہ کوسیں ہمیں سو بار ریاض   ہم نے لوٹا ہے مزا اُن کی مسیحائی کا

کنار شوق میں آکر حسیں نکل نہ سکے   اثر خدا نے دیا ہے ہمارے پیار میں کیا

رنگ وہ ہار کے پھولوں کا بدلنا شب وصل   بلے مجھ سے چھڑ کے وہ زلفوں کا پریشاں ہونا

کلام سے کام، جگانا ستانا شب بھر   نہ پریشاں اُنھیں کرنا نہ پریشاں ہونا

بار ہوتا نہ شب وصل نزاکت کو تری   لب مرا شکل تبسم ترے لب پہ ہوتا

رہے گا یاد انھیں بھی، مجھے بھی، وصل کی شب
وہ اُن کے ہار کی کلیوں کا مسکرا دینا

لئے ہیں گن گن کے بوسے میں نے، دیئے ہیں گن گن کے داغ تو نے
برابر اُترے گا دیکھ لینا، حساب میرا حساب تیرا

کیا وصل کی شب ہائے بگڑتی ہے بنی بات
کہتا ہوں کچھ اُن سے تو وہ کہتے ہیں بُری بات!

روٹھے ہوئے لیٹے ہیں، نہ مانیں گے مری بات
لطف آئے جو چُپ چُپ یوں ہی ہو جائے کوئی بات

وہ مزے وصل کے، وہ مینھ کا برسنا رِم جھِم
اُف رِی برسات کی رُت ہائے رِی برسات کی رات

کہہ اُٹھے "چپ ہو کیوں؟" وصال کے بعد
خود ہی شرمائے اِس سوال کے بعد

کوئی مُنہ چوم لے گا اِس "نہیں" پر
شکن رہ جائے گی یوں ہی جبیں پر

دھری رہ جائے گی یوں ہی شبِ وصل
"نہیں" لب پر، شکن اُن کی جبیں پر

شامِ شبِ وصال مری بے قراریاں
ان کا دبی زبان سے کہنا "ابھی نہیں!"

ستم کی راتیں ہیں یارب یہ وصل کی راتیں
ستانے والے بھی کیا کیا ستائے جاتے ہیں

مُنہ چوم کر بتائیں گے انکار کا مزا
مُنہ سے ابھی نکالی ہے اُس نے "نہیں" کہاں!

آنکھوں میں شرارت ہے کہ رو کے نہیں رُکتی
شوخی ہے کہ بیچین ہے آغوشِ حیا میں

ہم ہیں تبوں کی گھات میں، دن میں ملیں کہ رات میں
لطف ہو اُن کی بات میں، لطف ہے اُن کے پیار میں

یہ سیدھے جواب زلفوں والے ہوئے ہیں
ہمارے ہی سب بَل نکلے ہوئے ہیں

کُھل کے کہنے نہیں دیتا مجھے آنکھوں کا حجاب
شرم کی بات ہے میں شمع بجھا لوں تو کہوں

وصل میں پوچھنے بیٹھے ہو تم افسانۂ ہجر
میں ذرا تم کو گلے آج لگا لوں تو کہوں

آتشِ شوق بھڑک اُٹھتی ہے موقعہ پاکر
ہجر کی بات، لگی دل کی بجھا لوں تو کہوں

چُوم لیتے ہیں مُنہ کبھی ہم بھی
جب حسیں کہہ کے کچھ مُکرتے ہیں

کہنا کسی کا ہائے وہ جھُنجھلا کے ناز سے
"کمبخت ہاتھ چھوڑ، کوئی دیکھتا نہ ہو!"

نزاکت اُن کی ہے معلوم دل کو بھی شبِ وصل
خدا کرے کہ یہ کمبخت بیقرار نہ ہو

بڑھنے لگے تھے دستِ ادب بن کے دستِ شوق
ظالم نے آج تھام لئے مسکرا کے ہاتھ

آفت ہیں کم سِنی کی ادائیں شبِ وصال
کیسے وہ خوش ہیں ہاتھ سے میرے چھڑا کے ہاتھ

مجھ کو لینا ہے ترے رنگِ حنا کا بوسہ
دستِ رنگیں کا ملے یا کفِ پا کا بوسہ

کیا مزا دیتی ہے بجلی کی چمک مجھ کو ریاضؔ
مجھ سے لپٹے ہیں مرے نام سے ڈرنے والے

حیا جو، اُف شبِ وعدہ وہ ادائیں تیری — اُف وہ بگڑے ہوئے گیسو نہ سنورنے والے

سینے میں شرم کے پتلے شبِ وصل — حیا آنکھوں میں ہے نیچی نظر ہے

الٰہی، دیکھنے کو روز مل جائیں — وہ آنکھیں جن میں کچھ خوابِ سحر ہے

پیوستہ نہیں مرا لبِ شوق — تیرے لب پر تری ہنسی ہے

چہرے کا رنگ دیکھو تو رکھ کے آئینہ — بوسے سے دوڑ جانے کی سرخی شہاب کی

وصل ہو پہلے پہل جس میں وہ دن اچھا ہے — جس میں آغازِ جوانی ہو وہ سال اچھا ہے

پا کے موقع سے کوئی چھوڑ دے اُس کو کیونکر — دو گھڑی کے لئے نظارہ کا ملال اچھا ہے

نہ بنے کام تو کس کام کی نازک شکلیں — نازک اچھے نہ حسینوں کی نزاکت اچھی

منہ میں جب بات رکی چوم لیا پیار سے منہ — دمِ تقریر کسی شوخ کی لکنت اچھی

دیکھتے ہی کسی کا نرکو بگڑ جاتی ہے — میں جو چاہوں بھی تو رہتی نہیں نیت اچھی

شرارت وصل کی یاد آ گئی کیا؟ — وہ کچھ شرما گئے چینِ جبیں سے

لئے بے گنتی بوسے اس ادا پہ — شبِ وصل اُس نے "توبہ کی" "نہیں" سے

مزا شب کا ابھی بھولے نہیں ہیں' — ٹپکتا ہے نگاہِ شرمگیں سے

کہتے ہیں "جاں پڑ گئی آفت میں" وقتِ وصل — "دل مَل کے رکھ دیا مجھے، اچھا یہ پیار ہے!"

کیوں تجھ سے چھپاؤں ترا ارماں شبِ وصل — "قربان ترے، چور مرے دل میں نہیں ہے"

شرم جھپکے پھر نگاہِ ناز سے — ایک بوسہ پھر اُسی انداز سے

وہ سوتے میں چوری چھپے ہاتھ رکھنا — وہ کہنا کسی کا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

صبح ہوتے بات جو ہونا تھی وہ تو ہو چکی — اب لئے بیٹھے رہو تم آنکھ شرمائی ہوئی

نیم عریاں کچھ نمائش حسن کی تھی وصل میں — چھیڑنے کو رات حیلہ اُن کی انگڑائی ہوئی

وہ بھی گھبرائے ہوئے تھے بات بھی تھی شرم کی — رہ گئی ہونٹوں میں دب کر ہونٹ تک آئی ہوئی

ہم نے منہ چوم لیا رخ سے ہٹا کر آنچل — منہ چھپائے ہوئے نکلا تھا اِدھر سے کوئی

ریاض یاد ہے ان کا وصال میں کہنا — خدا کے واسطے چھوڑو زبان سوکھ گئی

اس طرح کر گفتگو کوئی جیا جھجک کا ڈر نہ — جب حرم سے چلیں گود میں چپکے سے اُٹھا لے

بیٹھے آغوش میں یوں ہی کبھی آ جا تو بھی — جس ادا سے تری آنکھوں میں حیا آئی ہے

وہ مرے گھر رہے مہمان بڑی مشکل سے — رات نکلے مرے ارمان بڑی مشکل سے

ماں یقیناً مشکل سے بھی مشکل کوئی بات — کبھی آسان سے آسان بڑی مشکل ہے
بے شبِ وصل یہ انداز نکلتے ہی نہیں — زلف ہوتی ہے پریشان بڑی مشکل سے
کچھ صدا ہے لطفِ وصل کی، ظالم شبِ وصال — کلیاں بھی کھل گئیں ترے پھولوں کے ہار کی
وصل میں جان نکلتی تھی ہر ارمان کے ساتھ — رات کس لطف سے ارمان ہمارے نکلے
صبحِ شبِ وصال مجھے منفعل کیا — تو نے تو کیا، تری نگہ شرمسار نے
گدگداتی ہے جوانی کچھ تجھے بھی بہرِ وصل — مسکراتی ہے کلی تیرے گلے کے ہار کی؟
رہیں سوئے میں لپٹیں زلفوں کی یوں ہی رخ پر — نہ ہٹائے نہ چھوئے زلفِ پریشاں کوئی
بے جبیں کے کوئی بوسے نہ کہیں سوتے میں — چن لے ہونٹوں سے سب آنچلِ افشاں کوئی
دور سے کیا نگہِ شوق نے چھیڑا ہے انہیں — اپنی زلفوں کی طرح کیوں ہے پریشاں کوئی
چھیڑے گا، گدگدائے گا، تم کو ستائے گا — یہ دستِ شوق کیسا کوئی دستِ سوال ہے

ان اشعار کو پڑھکر "جسم" کی عظمت و تقدیس معلوم ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

"جسم ہے روح کی عظمت کے لئے زینۂ نور
منبعِ کیف و سرور!"
(ن۔م۔ راشد)

مگر ہمارے نقاد چونکہ ربابِ جسم و روح کے نغموں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں اس لئے وہ اس کو کیا سمجھیں

نارسا آج بھی ہے شوقِ پرستارِ جمال — اور انساں ہے کہ ہے جادہ کشِ راہِ طویل

اس "جسمانی" شاعری کے محرکات اور اجزائے ترکیبی یہ ہیں:- فطرت کا جوشِ نمو، تقاضائے زندگی اشتیاق اور خواہش، جوشِ شباب اور مستی، مسرت افزا خود فراموشی، اس دنیا کے ہر غم و اندوہ پر فتح! اور اس شاعری کی اہمیت سے انکار کرنا خود زندگی سے انکار کرنا ہے۔ ناظرین کو اختیار ہے کہ وہ اس کو "اظہارِ شباب" سمجھیں یا "حسرتِ اظہارِ شباب"!

ریاض کو یوں تو امیر مینائی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا ے

مستِ مینا ہوں، پیا ہے میں نے — جام امیر احمد مینائی کا

اور بقولِ خود وہ امیر مینائی کے بعد میر تقی میر اور مصحفی کا تتبع اختیار کئے ہوئے تھا۔

کچھ کچھ ہے ریاض میر کا رنگ — کچھ شان ہے ہم میں مصحفی کی

لیکن اس کے کلام کو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جرأت اور داغ سے غیر شعوری طور پر بہت کافی متاثر

ہوا تھا۔ اکثر غزلیں تو گویا داغ کی غزلوں کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہیں، مثلاً:۔

قیامت کی خلش کیوں ہر گھڑی ہے — وہ تم سے قد میں کم، سن میں بڑی ہے
وفائے عہد کا اچھا ہے موقع — کہ سب کو حشر میں اپنی پڑی ہے
نگاہِ شوق، یہ شوخی تجھے کیا، — ارے کس سے لڑی؟ ان سے لڑی ہے
قیامت پہ نہ رکھ وعدۂ وصل — قیامت تو مرے آگے کھڑی ہے
غضب دن ہے، غضب سن ہے، غضب تن — غضب تم پر جوانی پھٹ پڑی ہے
تمنا کو تم اپنی منع کر دو، — ہماری جان کے پیچھے پڑی ہے
بلائیں لی ہیں تاروں نے شبِ وصل — ترے بالوں سے جب افشاں جھڑی ہے
یہی ہے کیا شبِ وعدہ عدو کی؟ — یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے؟

داغ کی امتیازی خصوصیات ...... بے پناہ شوخی اور شرارت، صنفِ نازک کو نہ صرف چھیڑنا بلکہ تنگ کرنا اور ستانا.... ریاض کی شاعری کی بھی جان ہیں، دیکھئے:۔

تھی آج ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہوئی — موقع بہت بُرا یہ تری بے بسی کا تھا
اندازِ تبسم نہ ہو غماز کسی کا — ڈرتا ہوں نہ کھل جائے کہیں راز کسی کا
کیا مجھ سے چھپے گا کوئی آغوشِ عدو میں — لاکھوں میں تو چھپتا نہیں انداز کسی کا
کیا آرزوئے مرگ میں اب جان پڑے گی — باتیں نہ بنا لے لبِ اعجاز کسی کا
مزا دے جائے ہم کو خوابِ غفلت — مزا آ جائے تم غافل ہو، ہم ہوں!
وہ خود چاہتے ہیں کوئی اب ستائے — ستانا مزا دے گیا ہے کسی کا
کیا ہوا، کیوں ہم سے شرماتے ہو تم؟ — کیا ہوا، کیوں تم سے شرماتے ہیں ہم؟
بیٹھا ہوں میں یہاں سے مجھے کوئی کیوں اٹھائے — دشمن کے گھر کی راہ ہے، ان کی گلی نہیں
وہ ستاتا ہے، ستاتے جو نہیں تم مجھ کو — دھوکے دیتا ہے بُری طرح تو تم مجھ کو
یہ بھی شوخی ہے کوئی، شرما گیا وہ شوخ کب — جب مروت آنکھ میں بے اختیار آنے کو تھی
اُٹھے فتنے نگاہِ شرمگیں سے — گلے ملتے ہوئے چینِ جبیں سے
وہ شب کا خواب ہم کو یاد آئے — تمہاری بات کہہ دیں گے تمہیں سے
ریاض ان کو کہیں چھیڑا ہے تم نے، ہم نہ مانیں گے — وہ تم کو کوستے ہیں جب تمہارا نام آتا ہے
کیا شکل ہے وصل میں کسی کی — تصویر ہیں اپنی بے بسی کی

منہ ہم نے ہنسی ہنسی میں چھپا — جو ہوگئی بات تھی ہنسی کی
یوں بھی تو چلا نہ کام اپنا — دشمن سے بھی ہم نے دوستی کی
کوئی دیکھے تو خوشی غیر کے گھر جانے کی — شام سے پہلے وہ بن کر شفق شام چلے
نگاہِ شوق نے سوتے میں کیا اُٹھا رکھا — یہ کام کر گئی اپنا، تمھیں خبر بھی ہے؟
بات دل کی زبان پہ آئی — آفت اب میری جان پر آئی
دن رات کی بلاؤں سے گھبرا گیا ہے جی — ہم کوچۂ رقیب میں اب گھر بنائیں گے
پاسباں خاک تری آنکھ میں جھونکی سب نے — رات کوچہ میں کئی یہ نقش قدم اور بڑے ہے!
نگاہِ شوق تم سے کہہ چکی اب میں بھی کہتا ہوں — زباں پر حرفِ مطلب آج بیتابانہ آتا ہے

ریاض کی شوخی کی زد میں نہ صرف معشوق بلکہ رقیب اور پاسبان بھی آجاتے ہیں، اور ہرچند اُس کے اشعار میں مومن کی وہ لطافت پیدا نہیں ہوسکی ہے جس کی مثال اس شعر میں موجود ہے:-

ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

لیکن پھر بھی اُس نے جو شعر کہہ دیئے ہیں وہ اپنی جگہ لاجواب ہیں:-

غم مجھے دیتے ہو دشمن کی خوشی کے واسطے — کیوں بُرے بنتے ہو ناحق تم کسی کے واسطے
عدو کی موت کا شاید پریشاں خواب دیکھا ہے — نہ اب زلفوں میں شانہ ہے نہ اب آنکھوں میں سُرمہ ہے
نگاہِ غیر کو ظالم مُبارک — ہم آغوشی تری چین جبیں سے
گیسو سنوارنے کی ادا کہہ رہی ہے کچھ — دشمن کے گھر کی بات کہاں تک بنائے زُلف
پارسائی کا یقیں غیر کو دلواتے ہوں — اور بھولے سے جو آجائے تبسم مجھ کو
کیا ہوا بزمِ عدو میں، لے میں صدقے کیا ہوا؟ — ہنس رہا ہے آج کچھ دامن ترا مَسکا ہوا
چھُپ کے راتوں کو کہیں آپ نہ آئے نہ گئے — بے سبب نام ہوا آپ کا روشن کیسا؟
گلی میں کچھ جھجک بھی، رات اندھیری بات چوری کی — ہمیں بڑھ کر لیا جس نے وہ اُن کا پاسباں ہوگا
بہت ہی خیر گذری ہوتے ہوتے رہ گئی اُس سے — جسے میں غیر سمجھا ہوں وہ اُن کا پاسباں ہوگا

مگر اس انتخاب سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ریاض کے کلام میں سوائے چھیڑ چھاڑ، ساز باز، رقیبانہ چشمک و رشک، بدگمانی، پاسباں سے جل ہے پ وغیرہ کے اور کچھ نہیں۔ حُسن و عشق کے خارجی پہلوؤں سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو کچھ اشعار عجیب (داخلی) کیفیات لئے ہوئے ملیں گے، مثلاً

تارے نکل کے ڈوب گئے آسمان پر — عالم وہی ہے میری شبِ انتظار کا!

کون کشتہ نہ تری تیغ ادا کا نکلا؟ نازسے کام لیا، نام قضا کا نکلا!
مرگِ غربت نہ کہیں مجھ کو لئے جاتی ہو وہم اُلجھتا ہے مرا عزمِ سفر سے کیا کیا
دیوانگی نے میری مجھے کیا مزا دیا اُن کو بھی میرے ساتھ تماشا بنا دیا
تم کیا مٹا سکو گے ایسے دل کا داغ ہے نقشِ قدم، نہیں جسے تم نے مٹا دیا
کوئی گود میں حرم سے آ ہی گیا ہے تصوّر ہمیں جب بندھا ہے کسی کا
دیا ہو تو دیا ہو کچھ پیامِ شوق آنکھوں نے مرے لب پہ تو حرفِ مدعا اب تک نہیں آیا
کچھ سے کچھ ہو گئی حالت دل کی اب نہیں کام شکیبائی کا
مری جان پہ رات بن بن گئی ہے مرا حال کچھ ہم نشیں جانتے ہیں
لُطف بھی بھر کے اُٹھا لیتے ہیں بیباکی کا ہم تصور میں ترے اور مزا پاتے ہیں
میں وہ مانوسِ قفس ہوں جو قفس سے جاؤں انتظار آپ سے آجانے کا صیاد کریں
درد بھی اُن کی طرح آج چمک کر اُٹھا آفریں او مرے پہلو میں اُبھرنے والے
تم نہ ہمارے ہوئے، مجبور تھے ہائے یہ ہم کیوں نہ تمھارے ہوئے
آگے قدم بڑھائیں تو منزل کو ہو گُریز ہم پاؤں توڑے بیٹھے ہیں منزل کے سامنے
دیکھ لیتا ہوں سوئے چرخ عجب حسرت سے کبھی مقبول کسی کی جو دعا ہوتی ہے
آتی ہے تو لے آتی ہے یہ ساتھ کسی کو آآکے ستاتی ہے بہت یاد کسی کی
دیکھنا ہم کو چڑھا لائی کہاں جت کے کمند آس اک چیز ہے دُنیا میں اگر ٹوٹ نہ جائے
دل میں آباد تھی ارمانوں کی دنیا کیسی اب تو بھولے سے بھی آتا نہیں ارماں کوئی
اب وہ شبِ وصال نہ روزِ وصال ہے دن ہو کہ رات، میں ہوں کسی کا خیال ہے

اور اب اُس کے وہ اشعار سُنیئے جن کو صُوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے روحانی کیفیات کا حامل ماننے میں کسی کو تامّل نہیں ہو سکتا۔

ریاضؔ ادھر ہی رنگ میں مست ہیں آپ سنا ہے پیالہ پیا ہے کسی کا
قید کعبے کی نہ بُت خانے کی شوق ہے ناصیہ فرسائی کا
لگی آگ میرے جگر میں یوں، نہ لگے کسی کے بھی گھر میں یہ نہ تو لَو اُٹھی، نہ چمک ہوئی، نہ شرر اُٹھے، نہ دھواں اُٹھا
کوئی مستِ میکدہ آگیا، مجھے بے خودی وہ پلا گیا نہ صدائے نعرۂ دیر اُٹھی، نہ حرم سے خروشِ اذاں اُٹھا
ادا شناس کی اپنے ادا سمجھتے ہیں کہے نہ کہے وہ مرا مدعا سمجھتے ہیں

یہ بھی الٹا ہے کوئی مل کے کیا گم مجھ کو　　ایک اس ساری خدائی میں ملے تم مجھکو
تیرے نظارے نے مجھکو نہ کہیں کا رکھا　　جلوۂ یار کہاں تو نے کیا گم مجھکو!

حشر تک رہے جائے لذت پیماں یوں ہی　　دل چاہتا ہے وعدۂ فردا وفا نہ ہو
بخش دیتے ہیں اگر مجھ سے خطا ہوتی ہے　　منفعل کرنے کو اچھی یہ سزا ہوتی ہے

ریاض کے خمریات کو تصوف سے ہم آہنگ بتایا گیا ہے، لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس شراب کا مجازی یا عارفانہ ہونا صرف اندازِ بیان پر منحصر ہے۔ میں صرف ان اشعار کو پیش کر دیتا ہوں، ناظرین خود اندازہ کر لیں کہ کس شعر میں کس قسم کی شراب بھری ہے۔ اُس کے کلام کی نمایاں خصوصیت یعنی (Sensuousness) (اہتزازِ حواسِ خمسہ) خمریات میں بھی موجود ہے اور عجب لُطف دیتی ہے:-

کس مزے کی ہوا میں مستی ہے　　کہیں برسی ہے آسمان سے آج
بھر گیا آنکھ میں شراب کا رنگ　　ظالم اُف رے ترے شباب کا رنگ

جیسے ساقی تری ہنستی ہوئی تصویرِ شباب　　ہم نے دیکھا ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کو!
چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی　　تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی
تو نے جھوٹی جو مئے ناب مجھے دی ساقی　　وہ یوں ہی تیز تھی، اب ہوش ربا اور ہوئی
کیا چھلکتا یہ کوئی جامِ شراب آتا ہے　　اے میں قربان، مرا عہدِ شباب آتا ہے
آئے ہمارے آگے وہ ساغر شراب کا　　ساقی نے جس میں رنگ بھرا ہو شباب کا

"شراب" و "شباب" کا اس سے بہتر امتزاج کہیں اور نہیں مل سکتا، کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں:-

ٹپکا دے بوند بھر کوئی منھ میں ریاض کے　　دم میکدے میں توڑ رہا ہے پڑا ہوا
چشمِ ساقی کی طرح ہے اثر انداز لے شیخ　　بعد توبہ کے چھلکنا بھرے پیمانوں کا
پارسا بن کے ریاض آئے ہیں میخانے سے　　آپ بیٹھے ہیں بچائے ہوئے دامن میلا
ریاض چھانٹ لیا اُس نے مجھ سے بوڑھے کو　　کوئی بھی دخترِ رز کو جواں نہیں ملتا
پی گئی روح کسی مست کی آکر شب کو　　مے تو مے آج سبو میں نہیں باقی تلچھٹ
کمر سیدھی کرنے ذرا میکدے میں　　عصا ٹیکتے کیا ریاض آ رہے ہیں؟
اتنی اُبلے کہ درِ دیر و حرم تک پہونچے　　خُم میں منھ ڈال کے کہدو جو کوئی بات کہیں
ریاض بعد توبہ کے بھی پھینکا نہیں جاتا ہم سے　　ہم لئے بیٹھے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے کو
مالک مرے، میں نے میکشی کی　　لیکن یہ خطا کبھی کبھی کی

جھجک جھجک کے لیا ہوگا ہاتھ میں ساغر 　 جو پی بھی ہوگی تو دوڑ دوڑ کے ہم نے پی ہوگی
شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی 　 میکدے سے اب پرانی جائے گی
پینے آئیں تو فرشتہ ہو ریاضؔ 　 حور کے دامن میں چھانی جائے گی
جس دن سے حرام ہو گئی ہے 　 مے خلدِ مقام ہو گئی ہے

ریاضؔ کا کل کلام پڑھکر محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو سے بخوبی واقف تھا، اور یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ جملہ اصنافِ سخن میں غزل سے بڑھکر کوئی اور صنف ایک شاعر کی شخصیت اور ذہنی اور جذباتی رُجحانات کو بروئے کار لانے اور واضح کرنے کے لئے موزوں نہیں۔ غزل کے مخالفین اس صنفِ سخن کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ لاتے ہیں کہ اس میں چونکہ ہر شعر ایک جُداگانہ مفہوم کا حامل ہوتا ہے اس لئے اس میں "لِرک" کی وحدت (LYRICAL UNITY) باقی نہیں رہتی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ردیف و قوافی کی سخت پابندیوں کے باوجود غزل کی مخصوص خوبی اور اُس کی مقبولیت کا راز مضامین کے اِس تنوع ہی میں مضمر ہے۔ شاعر غزل کے ذریعہ اپنے مختلف خیالات، جذبات، محسوسات، اور ذہنی اور جذباتی ردِّ عمل کے مختلف پہلو بیک وقت پیش کر دیتا ہے، جن سے ہم کو شاعر کی اصلی شخصیت سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

ریاضؔ نے غزل ہی کو اپنا ذریعۂ اظہار وارداتِ قلب بنایا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کی شخصیت کا ہر پہلو اُس کے کلام میں نظر آتا ہے .... صرف روحانی پہلو" ہی ہر وقت آنکھوں میں نہیں سمایا رہتا!

ریاضؔ کی زبان نہایت صاف ستھری، نرم و نازک، شیریں اور کوثر کی دھلی ہوئی" ہے۔ روزمرہ اور محاورہ پر اُس کو حیرت انگیز قدرت حاصل ہے، مگر کہیں کہیں اُس پر "پورب" کا اثر صاف نظر آجاتا ہے۔ مثلاً:

دن رات ہم ہیں اور تصور ہے یار کا 　 حاصل سمجھ لئے ہیں اسے زندگی کا ہم

"ہم حاصل سمجھ لئے ہیں" صوبۂ بہار میں مستعمل ہے، ہم لوگ اِس مفہوم کو یوں ادا کریں گے "ہم نے حاصل سمجھ لیا ہے۔"

لیکن یہ صرف ماحول کا اثر ہے، ویسے میں خود فن کار کو زبان کے معاملہ میں خود مختار سمجھتا ہوں، کیونکہ زبان فن کار کی تابع ہوتی ہے، فن کار کسی کا تابع نہیں ہوتا۔ زبان کے متعلق یہ بحث اُٹھانا فنی اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے بالکل غیر ضروری ہے۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ فن کار جب کوئی نامانوس چیز پیش کرتا ہے تو عوام کو اُس سے خوگر ہونے میں کچھ عرصہ لگتا ہے۔ ریاضؔ کی قادر الکلامی مسلّم الثبوت ہے، اور اُس نے اردو زبان کی جتنی خدمت کی ہے اُس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

شہنشاہِ اکبر

(از علی اشرف صاحب اڈیٹر تنظیم، حیدر آباد دکن)

اے شہِ ہندوستاں اے شہِ عالی مقام
آج تک تازہ ہے جو تو نے دیا تھا پیام

اے کہ تیری ذات تھی باعثِ صد افتخار
اے کہ تیرا نام تھا مرکزِ صد احتشام

تیری نواؤں میں تھا دردِ نہاں کا سُرور
تو نے پیے اور پلائے سب کو محبت کے جام

تیرے عزائم سدا وقفِ بلندی رہے
تیری نگاہوں میں تھا زیست کا سچا نظام

تو نے دکھایا ہمیں جادۂ خود آگہی
تو نے بتایا ہمیں رازِ حیاتِ دوام

تیری ادائیں جمیل، تیری نگاہیں جواں
تجھ سے دوبالا ہوئی عظمتِ ہندوستاں

تیری ہر آواز تھی، ایک پیامِ حیات
تیرے جہان میں نہ تھی لذتِ خوابِ گراں

تیری نگاہِ کرم، عشرتِ سرمد کا راز
لطف تیرا بے حدود، تیری عطا بیکراں

ایک ہی رشتے میں سب جوڑ دیئے تو نے دل
رازِ کُھرِ دینِ کُفر، تیری نظر پر عیاں

حریتِ فکر کا درس تجھی سے ملا
تیری سیاست میں تھا حُسنِ صداقت نہاں

ہندوستانی سیاسی تحریکوں کا مطالعہ

(از مسٹر گوری سرن لال سریواستو ایم۔ اے (علیگ)

کہتے ہیں کہ حق تلخ ہوتا ہے لیکن اس کے اعتراف سے مفر نہیں، کہ ہماری ساری تحریکیں جس میں سیاسی تحریک بھی شامل ہے محض مشرقی اور مغربی تمدن کے تصادم کا نتیجہ ہیں، اور یہ تصادم بڑی حد تک انگریزوں کے اس ملک میں آنے کا رہین منت ہے۔ انگریزوں کے ورود نے تعلقات باہمی پیدا کئے اور وہ یہاں تک بڑھے کہ بعض معاملات میں مشرق و مغرب کا امتیاز بھی باقی نہ رہا، اور انھوں نے کپلنگ کے مشہور مقولے کی کہ "مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق، یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے" تکذیب کی۔

سیاسی تحریک کی تاریخ کا بارہا اعادہ کیا جا چکا ہے، ہندوستان کے متعلق کوئی مستند کتاب ان واقعات کے بیان سے خالی نہ ملے گی اس لئے اس مضمون میں انھیں نظر انداز کر کے اس کے مختلف رجحانات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے یہ ثابت ہوگا کہ یہ ایک زندہ قوم کی تحریک اور قوت نامیہ کے فیوض سے بہرہ اندوز ہے۔

(۱)

غدر کے بعد تعلیم کو روز افزوں فروغ ہوا اور یونیورسٹیوں کی داغ بیل پڑی، انگریزی تعلیم پھیلنے سے قومی تحریک نے ترقی پکڑی، ابتدا میں بنگال میں برہمو سماج کی بنیاد پڑی، اسی وقت ایشور چند ودیا ساگر نے عقد بیوگان کا مسئلہ اٹھایا، مائیکل مدھوسودن دت نے اپنے اشعار اور گیتوں کے ذریعہ تمدنی اصلاح میں بہت کچھ ہاتھ بٹایا۔ بنکم چند چٹرجی کے ناولوں نے نہ صرف لٹریچر کی بڑی خدمت کی بلکہ سماج کی آنکھیں کھول دیں ستی کی رسم کو مٹانے میں ان کی کوشش قابل داد ہے۔ یہ سب کچھ بنگال ہی میں نہیں ہو رہا تھا بلکہ دوسرے صوبوں میں بھی اس کا اثر پھیل چکا تھا۔ چنانچہ سر سید احمد خاں نے شمالی ہندوستان میں اور سر مادھو راؤ نے ٹراونکور میں بہت سے سوشل اور تعلیمی کام کئے۔

اس طرح ہماری سیاسی تحریک کے بانی راجہ رام موہن رائے ہیں، اسی وجہ سے انھیں "ہندوستان کا پیشوا" کہا جاتا ہے۔ ایک صدی سے زیادہ کی بات ہے کہ انھوں نے پریس کی آزادی کے لئے تحریک کرتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ "میں مانتا ہوں کہ انگریزی حکومت کے قائم ہونے سے ہندوستان کی بھلائی ہوگی لیکن مجھے گورنمنٹ کی ان کارروائیوں پر سخت افسوس ہے جو وہ بغیر ہندوستانیوں کے مشورے کے کرتی اور جن سے ان کے

جذبات کو ٹھیس لگاتی ہے، حکومت کو اتنا تو سوچنا چاہیئے کہ نصف صدی تک برطانیہ کے زیر سایہ رہ کر ہندوستانیوں میں بھی آزادی اور مساوات کا جذبہ پیدا ہو گیا ہو گا۔"

یہی نہیں بلکہ راجہ صاحب موصوف جب سنہ ۱۸۳۰ء میں انگلستان گئے تو اپنے ہموطنوں کے حقوق کے لئے انھوں نے سخت جد و جہد کی۔ ۱۸۶۶ء میں دادا بھائی نوروجی نے لندن میں "ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن" قائم کی جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی ضروریات کا انگریزوں پر بخوبی انکشاف ہو جائے۔ علاوہ اس کے دادا بھائی نے سول سروس کے امتحان میں اصلاح کی بہت سی صورتیں بتائیں۔ یہ مسئلہ کچھ نیا نہ تھا بلکہ اس وقت سے درپیش تھا جب یونیورسٹیوں کی بنیاد بھی نہ پڑی تھی۔

(۲)

یونیورسٹیاں قائم ہونے کے بہت عرصہ بعد "انڈین نیشنل کانگریس" کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس درمیان میں جو زمانہ گزرا وہ ملک کے لئے بہت اہم تھا کیشب چندر سین نے برہمو سماج کی تحریک میں بہت زور پیدا کر دیا۔ انھوں نے انگلستان جا کر وہاں کے لوگوں میں اس مذہب کی اشاعت کی۔ سوامی دیانند نے متھرا سے نکل کر بجلی کی طرح "آریہ دھرم" کا سارے ہندوستان میں پرچار کیا۔ سوامی رام کرشن نے راز حق کی تلاش میں بارہ برس تک مسلسل ریاضت کی۔ ہندوستان کے ان مذہبی تجربات سے یورپ اور امریکہ تک مستفید ہوئے۔ سوامی رام کرشن کے جانشین سوامی وویکانند نے اپنے گرو کی رکھی ہوئی بنیادوں پر ایک عالی شان عمارت تیار کی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہونے لگے اور معزز پیشوں میں بھی ہندوستانیوں کی اچھی تعداد نظر آنے لگی۔ چنانچہ وکیلوں، بیرسٹروں، ڈاکٹروں اور انجینیروں کی کمی نہ رہی اب حکومت کی سمجھ میں یہ بات آنے لگی کہ ہندوستان میں ترقی کرنے کی اہلیت ہے۔ اس کا جسم بے روح نہیں ہے۔ البتہ سُن ہو گیا۔ اگر انھیں حکومت میں شریک کیا جائے تو وہ بھی انگریزوں کی طرح کامیابی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو سکیں گے۔ غدر کے بعد برٹش گورنمنٹ نے حکومت کی باگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے لے لی۔ گورنمنٹ اور پبلک میں ربط ضبط بڑھ گیا۔ لیکن مغربی تاثرات کا ایک بُرا اثر یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کی ذہنیت غلامانہ ہونے لگی اور وہ "مغرب پرست" ہو گئے۔ پڑھے لکھے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ محض مغربی باتیں اچھی ہیں اور ہندوستان میں جو کچھ بھی ہے بُرا ہے۔

یہ یاد رہے کہ کانگریس سے پہلے بھی آزادی اور مساوات کا چرچا چھڑ چکا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۱ء میں دیوان رنگاچارلو نے میسور میں "نمائندہ اسمبلی" کی بنیاد ڈالی جس سے یہ ہوا کہ حکومت کے معاملے میں پبلک کی آواز بھی سُنی جانے لگی۔ دیوان موصوف نے ایک معمولی حیثیت سے بمراتب ترقی کی تھی اس لئے ان کے

دل میں پبلک کا درد تھا۔

اب برطانیہ حاکم ہوا، اور تعلیم مساوات سے بہرہ یاب ہندوستانی محکوم ہوئے اس لئے ان میں تصادم ہونا لازمی تھا۔ کمپنی کے دور حکومت میں جو برائے نام اختیارات ملے انہیں غریب ہندوستانیوں نے غنیمت جانا۔ ملکہ وکٹوریہ کے اعلان میں بھی سوائے "نظرے خوش گذرے" کے اور کچھ نہ تھا۔ البتہ لارڈ رپن کا زمانہ زریں تھا۔ لارڈ رپن جو طرز عمل اختیار کرنا چاہتے تھے اُسے "نفسیاتی" حیثیت سے درست اور "اخلاقی نقطۂ نظر" سے حق بجانب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن لارڈ لٹن نے ہندوستانیوں کو ملازمت کا سبز باغ دکھا کر ایک ایسی ذہنیت پیدا کر دی تھی کہ لارڈ رپن کی مخلصانہ کوششوں سے بھی اس کا ازالہ نہ ہو سکا۔

لیکن کوئی بیرونی حکومت کسی محکوم قوم کو آئین مساوات نہیں سکھا سکتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں نہ کبھی ایسا ہوا ہے اور نہ ہوگا یہی وہ تلخ حقیقت ہے جس کا انکشاف پہلے پہل البرٹ بل کے گرما گرم بحث مباحثوں میں ہوا چنانچہ اسی حقیقت سے متاثر ہو کر انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔ کانگریس کے اغراض و مقاصد واضح تھے۔ اس کی صدارت نہ صرف ہندوستانیوں نے کی بلکہ انگریزوں نے بھی کی۔ اے۔ او۔ ہیوم۔ اور ویڈر برن کو کانگریس کی صدارت کا شرف حاصل ہوا۔ ہیوم تو کانگریس اور اس کے تخیل کے بانی تھے۔

(۳)

کانگریس کی پہلی نشست سے تقسیم بنگالہ تک بیس سال کا وقفہ درمیان میں ہے۔ اس عرصہ میں سیاسی تحریک کہیں کی کہیں پہنچ گئی۔ کانگریس مرکزی تحریک تھی اور اُس کے ذیل میں اور بہت سی تحریکیں تھیں، ہندوستان کے بہترین دماغوں نے اسی جماعت کی نشوونما کی۔ کانگریسی تحریک کو سمجھنے کے لئے اُس وقت کے ماحول کو سمجھنا ضروری ہے۔ اُس زمانہ میں مذہبی اصلاحات بہت وسیع پیمانہ پر ہو رہی تھیں۔ اسی دوران میں پروفیسر میکس مولر ایسے وسیع العلم اور بلند خیال لوگ ہندوستان آئے اور یہاں کے قدیم جواہر پارے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکال رہے تھے۔ جن کی اشاعت سے یورپ میں ہندوستان کی عظمت کا چرچا ہونے لگا۔ پال ڈوسین نے اپنشدوں کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ مغربی ممالک میں بہت مقبول ہوا اور مغرب کے بڑے بڑے فلسفی اس بات کے قائل ہو گئے کہ ہندوستان کا فلسفہ سب سے بڑھا چڑھا ہوا ہے۔ سوامی ویویکانند عرصہ تک شکاگو (امریکہ) میں دھرم کا پرچار کرتے رہے جس کی بدولت ہندوستان اور امریکہ میں ایک طرح کا تعلق پیدا ہو گیا ان احباب کی مساعی کی بدولت مغرب و نئی دنیا میں ہندوستان کے متعلق معلومات کا اضافہ ہو رہا تھا۔

اسی زمانہ میں مذہبی اصلاح کا دوسرا دور شروع ہوا جس کی ابتدا مہادیو گوبند رانا ڈے جیسے عالی دماغ اور بلند خیال شخص سے ہوئی [illegible] کی جانفشانی محنت اور عالی حوصلگی کا نتیجہ تھا کہ یہ تحریک پروان چڑھی یہی زمانہ تھا جب ملکی

ادبیات کے مردہ قالب میں بھی نئی جان ڈالی گئی۔ بنکم چندر چیٹر جی نے اپنے ناولوں کے ذریعہ بنگالی زبان کو بول چال کی زبان بنا دیا، اور روز بروز اس کی شاعری اور ادب کو فروغ حاصل ہوتا گیا۔ یہ زبان اتنی وسیع اور سرسبز ہوئی کہ رفتہ رفتہ اسے ہندوستان کی مہذب زبانوں میں ایک وقیع مرتبہ حاصل ہو گیا۔ انھیں بنیادوں پر رابندر ناتھ ٹیگور نے شاندار عمارت اٹھا کر اس زبان کو چار چاند لگائے۔ مرہٹی زبان جسے صدیوں میں کوئی صدمہ نہیں پہونچا تھا اب خوب پھل پھول رہی تھی۔ نئے نئے الفاظ کے اختراع نے اسے اس قابل بنا دیا کہ نہ صرف روزمرہ کی بات چیت کا کام دے بلکہ بیش بہا ادبی خزانے بھی پیدا کرے۔ راناڈے، تلنگ اور تلک نے اس زبان کو اپنی تحریر اور تقریر دونوں کے لئے انتخاب کیا۔ تلگو زبان نے بھی بڑی ترقی کی، جس کی وجہ سے ہندوستان میں اسے اطالوی زبان کا ہم پلہ سمجھا جاتا ہے۔ خصوصاً اس کے گیت بہت دلکش ہیں۔ تلگو کا سب سے مشہور شاعر راس لنگم پن ٹولو ہے جس کے کلام کا ہندوستان کی بعض دیسی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ تامل زبان بیرونی اثرات سے ہمیشہ محفوظ رہی ہے۔ لیکن اس دور میں اس پر بھی مختلف رجحانات کا گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ سندرپلائی کی مشہور تصنیف "منومانیم" اور سمبندم مدلیار کے ڈرامے اس کے شاہد ہیں۔

اسی زمانہ میں تجارت کو بہت فروغ ہوا، اور مغرب سے بہت سے تاجر آ کر ہندوستان میں مقیم ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ملک میں طرح طرح کے اقتصادی سوالات پیدا ہو رہے تھے جن کے حل کے لئے ویلبی کمیشن بٹھایا گیا اور بعد میں کرلسنی کمیٹی کی نشست ہوئی، جس کا کم از کم یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان کی اقتصادی حالت کا صحیح اندازہ کیا جانے لگا۔ بہت سے ہندوستانیوں نے دیسی ریاستوں میں رہ کر تدبّر اور ملکی نظم و نسق میں کمال حاصل کیا۔ ان میں رنگا چارلو اور کے بشستادری کے نام بہت ممتاز ہیں۔ ان اصحاب کی بدولت میسور میں دستکاری اور زراعت کو بہت ترقی حاصل ہوئی، اور پانی سے برقی طاقت حاصل کرنے کا کارخانہ قائم ہوا اور سونے کی کھدائی شروع ہوئی۔ میسور کی مثال سامنے رکھکر بڑودہ، کوچین، اور ٹراونکور نے بھی بڑی ترقی کی۔ ان ریاستوں کی ترقی کی وجہ فقط یہ تھی کہ ان کے دیوان یا وزیر قابل حضرات تھے۔

(۴)

ایسی فضا میں سیاسی مسائل کی اہمیت بھی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ بڑے دن کی چھٹیوں میں ملک کے بہت سے قانون داں اور قابل حضرات کانگریس کے سالانہ اجلاس میں جمع ہوتے تھے۔ ادھر انگریز افسروں کے نزدیک کانگریس محض تقریر اور تحریر کا بے معنی مجموعہ تھی، وہ اسے "مشین کا دود کش" کہتے تھے جس میں دھواں آتا اور نکل جاتا ہے۔ انگریز مدبر اور سیاستی کانگریس کی اہمیت اس سے بھی کم سمجھتے تھے۔ بدقسمتی سے بعض مخالف خیال اصحاب بھی اس جماعت میں شامل ہو گئے تھے، لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ ان کی دال نہیں گلتی تو آخر دیر سے کنارہ کش ہو گئے

تحریک کانگریس روز افزوں ترقی کرنے اور اس کے خیالات میں شدت پیدا ہونے لگی، تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ دونوں طبقے مطالبۂ حقوق کرنے لگے، اور جاہل تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ ساتھ ہو گئے۔ رفتہ رفتہ کانگریس کی شاخیں مختلف صوبوں کے شہروں و دیہاتوں میں قائم ہو گئیں۔ یہی نہیں بلکہ لندن میں بھی کانگریس کمیٹی نے اہم خدمات انجام دیں اور ہندوستان کی آزادی کے لئے تمام برطانیہ اور یورپ میں پروپیگنڈا کیا۔ اس کام کی اہمیت کا اس بات سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کانگریس کی بُنیاد رکھے جانے کے تھوڑے ہی دنوں بعد دادا بھائی نوروجی دارالعوام (House of Commons) کے ممبر ہو گئے۔

کانگریس کے بعد جس نے سیاسی کام میں سب سے زیادہ ہاتھ بٹایا ہے وہ اخبارات ہیں۔ ہندوستان کے قریب قریب سب مشہور لیڈر چاہے وہ مذہب سیاست اور ادب یا کسی اور تحریک کے رہنما رہے ہوں صحافت سے ضرور وابستہ تھے۔ انہیں وجوہ سے اس فن کو بڑی ترقی ہوئی۔ کانگریس کی کامیابی میں بھی اخبارات کا ہاتھ رہا ہے۔

اس پولیٹیکل بیداری کا پہلا اہم نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۲ء میں حکومت کی اصلاح ہوئی۔ کونسلوں میں پبلک کے منتخب کئے ہوئے ممبر شریک ہونے لگے۔ اس موقع سے ہندوستانیوں نے خوب فائدہ اُٹھایا۔ اس زمانہ کے کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح بنرجی، سنہا، مہتہ اور گوکھلے نے اس میدان میں وہ کام کئے جس کی کبھی توقع نہ کی جا سکتی تھی ان کے کارناموں نے یہ ضروری بات واضح کر دی کہ جنگ آزادی کے لئے نہ تو نو آموز لوگوں کی ضرورت ہے اور نہ ایسے لوگوں کی مدد درکار ہے جو ہر وقت فکر معاش میں منہمک رہتے ہیں اور اوقاتِ فرصت میں تفریحاً ملک کی خدمت کرنے کے آرزومند ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ راناڈے بھی تو سرکاری ملازم تھے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شخص راناڈے کی سی اہلیت کا مالک نہیں ہے جن کے وسیع علم اور لیاقت کا مقابلہ ہر ملک اور ہر زمانے کے لوگ نہیں کر سکتے۔ لیکن تعجب تو یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوئے جو لیاقت میں اگر راناڈے کی ہمسری نہیں کر سکتے تو اُن سے کچھ ہی کم ہیں۔ راناڈے نے اقتصادی انجمن (Economic Society) اور گوکھلے نے انجمن خادمانِ ہند Servants of India Society کی بنیاد ڈالی۔ ان اداروں نے ملک اور قوم کی بڑی خدمت کی اور بہت سے محبِ وطن پیدا کئے ہیں۔

ان سرگرمیوں کے دوران میں حکومت کی روش میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ اپنی روایاتِ قدیمہ پر نہایت مضبوطی سے چلتی رہی۔ البتہ لارڈ کرزن کا زمانہ حکومت و نیز ہندوستانیوں کے لئے نہایت اہم ثابت ہوا۔ اُن کی عجیب وسیع و ہمہ گیر شخصیت نے ہندوستان میں اپنا غیر فانی اثر چھوڑا ہے۔ اُنھوں نے روایات قدیمہ کا دفتر درہم برہم کر کے نظامِ حکومت کی از سرِ نو شیرازہ بندی کی۔ ان کا قول تھا کہ میں ایسے لوگوں پر حکومت کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں

جو اپنے لئے کچھ نہیں کرسکتے' وہ خود کو ہندوستانیوں کا "آقا" سمجھتے تھے۔ اُن کے رنگ و نسل کے امتیاز نے تحریک قومی کی بنیادوں کو اور مضبوط کر دیا۔ اب تک ہندوستانی خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتے رہے تھے لیکن لارڈ کرزن کی تحریک تقسیم بنگالہ نے آخر کار سارے ملک میں بیداری کی لہر دوڑا دی' اور آسودگانِ خواب غفلت کو جگا کر سرشار بادۂ وطن پرستی کر دیا۔

(۵)

تقسیم بنگالہ کے بعد سیاسی تحریک نے ایک نئے اور شاندار دور میں قدم رکھا جس کا دامن جنگ عظیم کی ابتدا سے وابستہ ہے۔ اس کو بخوبی سمجھنے کے لئے ان اثرات کو سمجھنا ضروری ہے جو اس کی تنظیم و تشکیل میں کارفرما تھے۔ جب وقت آیا تو یہ دبی ہوئی چنگاریاں جل اُٹھیں۔

قومی تحریک کے ترقی کرتے ہی مذہبی اور تمدنی تحریکیں ماند پڑ گئیں۔ لیکن ان کا خاموش اثر قائم رہا۔ اب دو فرقے پیدا ہو گئے۔ ایک وہ جو علانیہ اپنے آپ کو مغرب پرست کہتا تھا۔ دوسرا وہ جو قدامت پرستی کی طرف مائل تھا۔ اس لئے مغرب پرستی کے ساتھ قدامت پرستی بھی ایک طرح کا فیشن ہو گیا۔ مغرب پرستوں نے مذہب اور تمدن کے تمام مسائل کو بالائے طاق رکھ دیا اور قدامت پرستوں نے مذہبی اصلاح کو "گناہ کبیرہ" تصور کیا اس لئے لامحالہ مذہبی تحریک کے سُر مدھم پڑ گئے۔ اب سوائے اس کے کہ دونوں پارٹیاں سیاست کی طرف متوجہ ہوں ان کے لئے اور کوئی میدان عمل نہ تھا۔ اس اتحادِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بال گنگادھر تلک ایسے مایہ ناز لیڈر پیدا ہوئے۔ تلک نے مادر ہند پر تن من دھن سب کچھ وار دیا۔ ان کی سیاست سرکار سے صلح و مصالحت کی قائل نہ تھی۔ ادھر بنگال میں ایک انقلابی جماعت پیدا ہوئی۔ اس تحریک کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کی بنیاد مذہب اور فرقہ پرستی کی مخالفت پر رکھی گئی تھی۔

۱۸۹۶ء میں طاعون کی وبا پھیلی جس نے چند سال میں لاکھوں جانیں ضائع کر دیں اور قوم کو اپنی بے دست و پائی کا احساس کرا دیا۔ محکمہ صحت نے اس مہلک وبا کے دفع کرنے کا کوئی معقول انتظام نہ کیا۔ چند افسروں کی غلطی سے ایک ایسی عالمگیر بے اطمینانی پھیل گئی کہ گورنمنٹ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہی غم و غصے کی آگ تھی جو تقسیم بنگالہ کے وقت بھڑک اٹھی۔ مہاراشٹر نے بھی بنگال کا ساتھ دیا۔ انتہا پسند فرقہ کا زور بڑھنے لگا لیکن کانگریس نے یہ ریزولیوشن پاس کر کے کہ اس کا مقصد انگریزی حکومت میں رہ کر آزادی حاصل کرنا ہے یہ بات بخوبی ثابت کر دی کہ اس پارٹی کا کانگریس میں گذر نہیں ہے۔ انقلابی جماعت کے خیال میں تقریر و تحریر ہی کی آزادی کافی نہیں ہے بلکہ آزادی کا انتہائی تصور حاصل کرنا لازمی ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس پارٹی کے کسی ذمہ دار لیڈر نے کبھی قتل یا سازش کی اجازت و ہدایت تلقین کی تھی لیکن یہ صحیح ہے کہ اس پارٹی نے ہندوستان کی

تاریخ میں پہلے پہل "تشدد" کو سیاسی آزادی حاصل کرنے کا آلہ کار بنایا گیا۔

کرزن کی "رسوائے عالم" حکومت کے بعد لارڈ منٹو (Minto) کی حکومت شروع ہوئی۔ ادھر انڈیا آفس میں جان مارلے کا تقرر بعہدۂ وزیر ہند ہوا۔ ان لوگوں نے بڑی ہوشیاری سے قومی تحریک کا مقابلہ کیا۔ تشدد پسندوں پر خاص طور سے نظر تھی۔ بالآخر انھوں نے اسے کچل ہی ڈالا۔ لیکن یہ بھی محسوس کیا کہ سانپ ابھی مرا نہیں، کہیں پھر نہ اُٹھے اس لئے انھوں نے یہ کوشش کی کہ برطانیہ کا جو اعتبار ہندوستانیوں کے دل میں ہے وہ قائم رہے۔ چنانچہ دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ مارلے نے صاف الفاظ میں کہا:۔

"مجھے اُمید ہے کہ بنگال اور پنجاب میں ان دنوں جو شورش بپا ہے وہ بہت جلد رفع ہو جائیگی۔ اس وقت ہمیں جس تشویش اور ہیجان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس سے ہمیں یہ سبق لینا چاہئیے کہ ہندوستان کے معاملہ میں فراخ دلی سے کام لیں۔ یہ سب سمجھتے ہیں کہ انگریزی افسروں کا اثر ہندوستانیوں پر روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ افسر اور ماتحت میں ایک طرح سے اجنبی کا سا تعلق ہے اسی وجہ سے نہ سرکار کو رعایا سے ہمدردی ہے اور نہ رعایا کو سرکار سے۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ گزشتہ چند سالوں سے حکومت سختی کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچ رہا ہے، حکومت اگر سختی نہ کرے تو اس کے مقبول ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ یہ مستند سیاست دانوں کی رائے ہے، ہر وہ نظام اچھا ہے جس میں رعایا پر ظلم نہ ہو۔"

اِس تقریر کے چار برس بعد جب ہندوستانیوں کو وزیر ہند کی کونسل میں جگہ ملی تو اُنھوں نے پھر ایک معرکۃ الآرا تقریر کی جس کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:۔

"ہندوستان میں جو ہیجان، بغاوت، بے اطمینانی اور جرائم پیشگی کی کیفیت برپا ہے اس کی وجہ سیاسی نہیں بلکہ تمدنی ہے۔ یہ نہ صرف میری خیال ہے بلکہ ان لوگوں کی رائے ہے جو مدتوں ہندوستان میں رہ چکے ہیں۔ سیاسی شکایات تو آسانی سے دور کی جا سکتی ہیں لیکن تمدنی شکایات کا دور کرنا تو درکنار ان کا سمجھنا بھی مشکل ہے۔ ایک قوم کے دوسرے پر حکومت کرنے کے اثرات اتنے بُرے نہیں ہوتے جتنے کہ حاکم کا محکوم سے اجتناب کرنے کی بدولت ہوتے ہیں۔ لہذا میری غرض اس گفتگو سے یہ ہے کہ کسی طرح انگریزوں اور ہندوستانیوں میں قومی تفریق باقی نہ رہ جائے۔ اور اب سے جو افسران ہندوستان جائیں وہ ہندوستانیوں سے ایسا بھائی چارے کا برتاؤ کریں کہ وہ یہ اچھی طرح سمجھ جائیں کہ سرکار کی نظروں میں ہندوستانیوں کی بھی وقعت ہے۔ ہندوستانی چاہے چھوٹی جگہ پر ہو یا بڑی جگہ پر بہرحال انگریزوں کا فرض یہ ہے کہ انھیں ترقی یافتہ اور مہذب بنانے کی کوشش کریں۔ یہ سب کچھ محض زبانی نہیں بلکہ عملی طور پر ہونا چاہیئے۔"

دوسرے سال اُنھوں نے انڈین سول سروس ایسوسی ایشن کی ایک دعوت کے بعد یہ الفاظ کہے:-

"ہمارا سب سے پہلا فرض ملک میں امن و امان قائم رکھنا ہے، اسے اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے، اس سے انکار کرنا ہماری کوتاہ اندیشی ہے اور مجھے یقین ہے کہ کوئی اس کا مرتکب ہونا پسند نہیں کرے گا کہ مستقبل میں انگریزی حکومت کے خلاف شور و شر پیدا کرنے کا مرتکب ٹھیرایا جائے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم ہندوستانیوں کو وہی حقوق دیں جس کے لئے ہم دنیا میں صدیوں سے جنگ کر رہے ہیں، اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو مہذب دنیا میں ہمارا مذاق اُڑایا جائے گا۔ اگر ہم ضد اور غرور سے کام لیں گے تو ہماری بربادی ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ اگر ہندوستان نے ہماری مخالفت کی تو ہمارے تدبّر کا خاتمہ ہو جائیگا، اگرچہ آج تک دنیا کی کسی طاقت سے ایسا بن نہ پڑا۔"

لارڈ مارلے کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو ایسے آئینی حقوق دیئے جائیں کہ پھر شکایت کی گنجائش نہ رہ جائے۔ ادھر تقسیم بنگال نے سخت بے چینی اور بد دلی پھیلا رکھی تھی، اور علاوہ بم بازی اور قتل و غارت کے سیکڑوں امن سوز تحریکیں جاری تھیں، سودیشی کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس تحریک کا انگریزوں کی تجارت پر جو کچھ بھی اثر ہوا ہو بہر حال اس کے ذریعہ بہت زیادہ بیداری پھیلی۔ اب یہ بات واضح ہو گئی کہ ہندوستان برطانیہ کی اطاعت کو اپنے لئے ذلت کا باعث سمجھتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ لارڈ مارلے نے ہاؤس آف لارڈس میں کھری کھری تقریریں کیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنا دوست بنایا جائے دشمن نہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے پاس فوجی اور مادّی قوت کی کمی نہیں ہے کمی ہے تو اخلاقی قوت کی۔ ان سے بہت پہلے ہندوستان کے ایک مشہور بہی خواہ مسٹر جان برائٹ نے کہا تھا کہ "ہم ہندوستان کو چھوڑنا جانتے ہی نہیں، اس لئے اس پر قبضہ جمائے رکھنے کے لئے ہمیں رعایا کی بہبود مدّ نظر رکھنا چاہیئے۔"

"مارلے منٹو اصلاحات" نے حالات حاضرہ پر بہت اثر ڈالا، ہندوستانیوں کو گورنروں کی اگزیکیٹو کونسل میں جگہ ملنے لگی، وائسرائے اور وزیر ہند کی کونسل بھی ان سے خالی نہ رہی۔ مارلے جانتا تھا کہ اس میں حکومت کی بھلائی ہے۔ اِن اصلاحات کی کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے بڑی قدر کی۔ دوسرا اثر یہ ہوا کہ تقسیم بنگالہ کا زخم مندمل ہو گیا۔ مختلف سرکاری محکموں میں ترقی کی تدبیریں سوچی جانے لگیں۔

یہ دور عموماً گوپال کرشن گوکھلے کا دور کہا جاتا ہے، تمام ملک نے ان کو اپنا لیڈر تسلیم کیا، اُس وقت لارڈ ہارڈنگ وائسرائے تھے جو اپنے پیش روؤں کیننگ، رپن اور منٹو کی طرح بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھے، ان کی فراخ دلی بھی ان کی ہمت اور قابلیت کی طرح ضرب المثل بن گئی تھی۔ اُنھوں نے آتے ہی تقسیم بنگالہ

کے پریشان کن مسئلہ کو حل کیا۔ فضا اچھی تھی اس لئے گوکھلے بھی اپنے مشن میں کامیاب ہوئے، اُن کی اسکیم چار گونہ تھی یعنی:- (۱) ابتدائی تعلیم، (۲) ضلع کی حکومت، (۳) مالی مسائل، اور (۴) سمندر پار رہنے والے ہندوستانیوں کا مسئلہ۔

تعلیم کے متعلق پہلی زبردست تحریک لارڈ رپن کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ کرزن کی تعلیمی پالیسی زیادہ تر یونیورسٹیوں کی اصلاح سے متعلق تھی جس کے ضمن میں کالجوں کی اصلاح بھی شامل تھی۔ اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے لئے اب زیادہ امکان ہوگیا تھا اور عام تعلیم نیز ٹکنیکل تعلیم کی بھی زیادہ مانگ ہونے لگی۔ لیکن تمام ملک کی تعلیم بحیثیت مجموعی بہت کم تھی ابتدائی تعلیم کے عام کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ انگریزی کی قدر بڑھ رہی تھی، آبادی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ اس بڑھتی ہوئی آبادی کو تعلیم یافتہ بنانے کے لئے قانون کی ضرورت تھی چنانچہ گوکھلے نے مفت اور جبریہ تعلیم کی تجویز پیش کی جس کی تمام ملک نے حمایت کی۔

ضلعوں کا انتظام ڈسٹرکٹ بورڈوں کے اور شہروں کا انتظام میونسپلٹیوں کے سپرد تھا۔ اِن اداروں کے ذریعہ ہندوستانی اپنے بھائی بندوں کی بہت خدمت کرسکتے تھے۔ لیکن یہ تجربہ کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوا۔ اس زمانہ میں ڈسٹرکٹ بورڈوں کا چیرمین کلکٹر ضلع ہوتا تھا، بورڈ کے ممبر زیادہ تر بڑے بڑے مہاجن اور زمیندار ہوتے تھے جنھیں سرکار نامزد کرتی تھی، انھیں رعایا سے براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا، اس لئے وہ کوئی بہت مفید کام نہ کرسکے۔ کلکٹر ممبروں کے اختیارات میں دخل در معقولات کرتے تھے حالانکہ کونسل میں عام تعلیم اور محکمہ صحت و مسائل وغیرہ کیلئے الگ الگ ممبر تھے۔

میونسپلٹی میں البتہ کچھ زیادہ جمہوریت کے عناصر تھے، کیونکہ اس کے ممبروں کا باقاعدہ انتخاب ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں پڑھے لکھے لوگ اسی کو قومی خدمت کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ یہ جماعت ایک طرح کی تعلیم گاہ بن گئی تھی جہاں مبتدی سیاسیات کا سبق لینے آتے تھے۔

لیکن سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ انگریز ہندوستانیوں کو برابری کا مرتبہ نہ دیتے تھے، اور سول سروس اور لوکل سلف گورنمنٹ کے شعبوں میں بھی قدم قدم پر گورے اور کالے کا امتیاز تھا۔ گوکھلے نے اس میں اصلاح کی ایک مفصل اسکیم تیار کی تھی لیکن حکومت نے اس پر توجہ نہ کی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کو جبریہ بنانے کی جو تجویز پیش کی تھی اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں کسانوں اور مزدوروں کو تعلیم دی جائے۔ اگر گوکھلے کی یہ اسکیم منظور ہوجاتی تو آج کے بہت سے مسائل حل ہوچکے ہوتے اس قسم کے قومی کاموں کے لئے روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن حکومت کے تیار کردہ بجٹ میں اس مد کی کوئی گنجائش نہ تھی، حالانکہ رعایا پر روز بروز ٹیکس کا بار بڑھتا جاتا تھا اور قحط یا جنگ کا نام و نشان

ہونے پر بھی رعایا پر نئے ٹیکس لگائے جاتے تھے۔ اگرچہ جبریہ ابتدائی تعلیم کی اسکیم منظور نہیں ہوئی پھر بھی گوکھلے کی مساعی سے اتنا ضرور ہوا کہ تعمیری کاموں میں زیادہ روپیہ صرف ہونے لگا: جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے قومی تحریک کو مزید تقویت پہونچی۔

اسی زمانہ میں ایک اور نہایت اہم سوال پیدا ہوگیا تھا جس نے ہند اور برطانیہ کے تعلقات پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ یہ ہندوستان سے دور سمندر پار رہنے والے ہندوستانیوں کا مسئلہ تھا۔ سب سے پہلے لارڈ ہارڈنگ کے زمانہ میں اس پر توجہ کی گئی اور انھوں نے سرکار برطانیہ سے سفارش کی کہ دوسرے ملکوں میں رہنے والے ہندوستانیوں کو جس قدر ہوسکے مراعات دی جائیں۔ اس کا اثر بڑا اچھا ہوا، ہندوستان والے حکومت سے خوش ہوگئے، اور جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو ہندوستانیوں نے دل کھول کر فوج اور سرمایہ سے سرکار کی مدد کی۔

ہماری سیاسی تحریک میں لارڈ مارلے، لارڈ ہارڈنگ، اور گوپال کرشن گوکھلے کا زمانہ نہایت شاندار اور دلچسپ ہے۔ مارلے نے حکومت کی زنگ آلود تلوار کی صفائی کی، اور گوکھلے نے اس پر جلا دی۔ یہ زمانہ مشکلات اور دشواریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس طوفان عظیم میں کشتی چلا کر ساحل تک پہنچا دینا ایسے ہی ناخداؤں کا کام ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد حالات بدل گئے۔ جنگ کے بعد سیاسی فضا میں انقلاب پیدا ہوگیا اور قومی تحریک کی باگ دوسرے لیڈروں کے ہاتھ میں آگئی۔

ہم نے اس مضمون میں غدر سے لیکر جنگ عظیم تک کی سیاسیات پر نہایت مختصر سا تبصرہ کردیا ہے۔ ان ساٹھ برس کے عرصہ میں ہزاروں لاکھوں واقعات ہوئے اور بے شمار مشہور ہستیاں عالم وجود میں آئیں جن کا ذکر ایک مختصر سے مقالہ میں کرنا ناممکن تھا، اس لئے محض رجحانات کا ذکر کیا گیا اور ان میں بھی صرف انھیں رجحانات کا جو زیادہ نمایاں ہیں۔ جنگ عظیم اور اس کے بعد کی سیاسیات زیادہ اہم ہیں۔ اس دور میں آزادی اور مساوات کے لئے جو قربانیاں کی گئی ہیں وہ اپنی جگہ پر ایک مفصل داستان ہیں اس لئے ہم اس کا ذکر آئندہ کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں یہ کہدینا کافی ہے کہ جنگ سے پہلے ہندوستانیوں کا نصب العین صرف یہ تھا کہ سرکاری نوکریوں میں ہندوستانیوں کو زیادہ حصہ ملے، کونسلوں میں بذریعہ انتخاب ممبر لئے جائیں، اور ہندوستانیوں کو زیادہ جگہیں دی جائیں۔ بعض ایسی اصلاحات ہوں جس سے ملک کی تعمیری ترقی ہو لیکن جنگ کے بعد آزادی کا مطالبہ ہونے لگا، یہاں تک کہ آج ایک ایسا دور آگیا ہے جب برطانیہ سے قطع تعلق کی صدائیں بلند ہورہی ہیں۔

فتنۂ مجبور

(حضرت اقبال ماہر الہ آبادی)

ہے یاد ابھی تک مجھے اس رات کا منظر
برسات سے سہمے ہوئے دیہات کا منظر

فطرت کی میں بے چین ادا دیکھ رہا تھا
دروازے سے باہر کی فضا دیکھ رہا تھا

مہتاب کے چہرے پہ تھیں تاریک ردائیں
نظروں میں شجر تھے کہ سیہ پوش بلائیں

دنیا نظر آئی مجھے گہوارۂ ظلمت
بارش تھی کہ گردوں سے اتر آئی تھی آفت

ہیبت سے تھے سہمے ہوئے تاریک نظارے
بجلی جو چمکتی تھی برستے تھے شرارے

وہ رعد، وہ برق، اور وہ ہنگامہ، وہ شورش
وہ منظرِ پُر ہول، قیامت کی وہ بارش

طائر جو نشیمن میں تھے گھبرائے ہوئے تھے
دل سینوں میں بیتاب تھے تھرائے ہوئے تھے

تھا آج سرِ شام ہی سے عالمِ طوفاں
ہر ذرہ تھا اس رات کے دامن میں پریشاں

اِک میں بھی تھا دیہات کی اس رات کا مہماں
طوفان سے بپھری ہوئی برسات کا مہماں

مقبول مگر ہوگئیں خاموش دعائیں
خود ہونے لگیں دُور یہ تاریک بلائیں

جب ختم پہ آئی یہ پریشان کہانی
کچھ شور بھی کم ہوگیا رُکنے لگا پانی

بدلا شبِ تاریک نے اب دوسرا پہلو
پھر لیلیٔ فطرت کے سنورنے لگے گیسو

ہونے لگیں خاموش زمانے کی فضائیں
مائل بہ کرم ہوگئیں فطرت کی ادائیں

وحشت کا جہاں زور، حکومت تھی جنوں کی
آنے لگی دنیا کو وہاں نیند سکوں کی

کچھ دُور پہ ناہید نے کی نغمہ سرائی
اِک گیت کی آواز مرے کان میں آئی

وہ کوک تھی کوئل کی، پپیہے کا ترانہ،
جیسے ہو کوئی درد سے لبریز فسانہ

تصویرِ حیا، حسنِ صفا، ناز سراپا
عنوانِ تماشائے نظر، جانِ تمنا

وہ حسن کی دیوی تھی، وہ تھی ناز کی تصویر
کاشانۂ الفت کے حسیں خواب کی تعبیر

کھڑکی سے لگی دیکھتی تھی رات کا منظر
طوفانِ بلاخیز میں برسات کا منظر

تھا سامنے نظروں کے مرے حور کا پیکر
یا ملگجی ساری میں تھا اِک نور کا پیکر

زلفوں کی سیاہی میں تھیں برسات کی راتیں　　پیشانی شفاف میں نظروں کی نجاتیں
سلمیٰ کا حسین جسم تھا، پر بھا کی نگاہیں　　تھیں حسن کے سانچے میں ڈھلی نور کی باہیں
تکتی تھی کھڑی راہ، کسی سوچ میں تھی گم　　ہونٹوں پہ تھا لرزا ہوا ہلکا سا ترنم
اقرارِ وفا اس کا ہے جس مردِ جواں سے　　پردیس گیا ہے وہ بہت دور مکاں سے
اس نازِ سراپا نے بہت ضبط کیا ہے،　　اک سال یونہیں بیٹھے ہوئے کاٹ دیا ہے
ہے خشک لبوں پر کبھی قسمت کی شکایت　　رونا کبھی، کہنا کبھی یہ غم کی حکایت
"کیا غم مجھے ہر سمت جو طوفانِ بلا ہے　　اک حشرِ الم خود مرے سینے میں بپا ہے
تم جب سے گئے چھوڑ کے مجھکو مرے ہمدم　　اٹھتا ہے مرے سینے میں اک درد سا پیہم
میں تم سے بہت دور پڑی برہ کی ماری　　مدت سے کھڑی دیکھتی ہوں راہ تمھاری
تاکید تھی میری کہ سجن جلد ہی آنا　　پردیس تو جاتے ہو مجھے بھول نہ جانا
تم نے تو کیا تھا یہاں جلد آنے کا وعدہ　　روتے ہوئے دل کو مرے بہلانے کا وعدہ
تم آؤ تو بالوں میں نئے پھول لگاؤں　　پیراہنِ گلرنگ کو خوشبو سے بساؤں
جذبات کی میں از سرِ نو بزم سجاؤں　　جو شمع بجھی ہے میں اسے پھر سے جلاؤں
یہ صبح نہیں ہے یہ مری شام نہیں ہے　　تم بن یہاں اک پل مجھے آرام نہیں ہے
اچھی نہیں لگتی مجھے یہ فصلِ بہاری　　رہ رہ کے ستاتی ہے مجھے یاد تمھاری
کس کو میں دکھاؤں دلِ بیتاب کی حالت　　یہ دیدۂ پُر جوش میں سیلاب کی حالت
ہے کون یہاں جو مرے جذبات کو سمجھے　　جذبات میں ڈوبے ہوئے نغمات کو سمجھے
اب کل نہیں پڑتی مجھے تم بن مرے ساجن　　کیا ایسے اکیلے ہی گذر جائے گا ساون"
یہ کہہ کے لگی پھر وہ دُرِ اشک پرونے　　کھڑکی کی سلاخوں سے لپٹ کر لگی رونے
یہ منظرِ ظلمات، یہ غمناک حکایت　　کچھ میں ہی سمجھتا ہوں کہ ہوں شاعرِ فطرت
دیہات کی یہ رات غم انگیز سماں ہے　　اک فتنۂ محبوب یہاں محوِ فغاں ہے
جو محوِ تبسم تھی کبھی، آج ہے رنجور　　یہ وقت کی خوبی ہے کہ مختار ہے مجبور
ہونے لگیں پُر نم مری بیتاب نگاہیں　　آ آ کے تڑپنے لگیں لب پر مرے آہیں

ماہر کو یہ برسات سدا یاد رہے گی
دیہات کی یہ رات سدا یاد رہے گی

قیدی

(از جناب کیلاش ورما شایق ہنگامی، بی۔اے)

"چور، چور!" دفعتہً شور مچ گیا۔

چور کے پاؤں کہاں۔ آواز سنتے ہی دُم دبا کر بھاگا۔ بگٹٹ دوڑ رہا تھا کہ ٹھوکر لگی، دھڑام چت گرنے کی آواز سُن کر لوگ اُس کی طرف لپکے، اور چاروں طرف سے اسے گھیر لیا۔ چوٹ بہت نہ آئی تھی لیکن زمین پر پڑا ہوا ہائے ہائے کر رہا اور ہانپ رہا تھا۔

پہلے اُس کی پیٹھ پر لات بازی، گھونسے بازی، اور ڈنڈے بازی کی خوب مشق کی گئی، پھر پکڑ کر تھانے لے گئے وہاں سے تھوڑی بہت آؤ بھگت کے بعد عدالت میں حاضر کیا گیا۔ اُس نے بیدھڑک اقبال جرم کر لیا۔

منصف نے حکم دیا "چوری کے جرم میں دو سال کی قید سخت"۔

(۲)

اس نے دریچہ سے باہر جھانک کر دیکھا، صبح ہونے میں ابھی بہت دیر تھی، تارے باہم رخصت ہونے کے لئے الوداعی سلام کر رہے تھے۔ چاند اپنی سرد ضیا کو اپنے میں سمیٹ رہا تھا۔ بادِ سحر ایک نئی زندگی کا پیام لے کر مستانہ چل رہی تھی۔

اچانک اُسے اپنے لڑکے کا کہنا یاد آ گیا، اُس نے کہا تھا "کھلونا نہ لادو گے، باپو جی؟" اور اُس نے اس کا منھ چوم کر کہا تھا "کیوں نہیں، تمھیں کو لا کر نہ دوں گا تو پھر کس کے لئے لاؤں گا؟ ذرا ہاتھ میں دو پیسے آنے دو۔" لڑکا اس کی بات نہ سمجھ سکا اور چُپ ہو گیا، لیکن اُسے اُمید تھی کہ کھلونا بہت ہی جلد آئیگا۔

اُس نے بہت کوشش کی مگر چار پیسے جمع نہ کر سکا۔ وہ اپنا دل مار سکتا تھا، بیوی کے ارمانوں کا خون کر سکتا تھا، مگر اپنے لال کا دل کیونکر میلا ہونے دے۔ جب اُس کے لال نے کہا تھا "باپو جی لال کھلونا! ربر کا، اس کا منھ ٹین ٹین میرے منھ سا ہو۔" تب وہ کانپ اُٹھا تھا، نہ جانے لال کھلونا کتنے میں آتا ہے؟ لیکن کتنے ہی میں کیوں نہ آتا ہو اُس نے اپنے لال کو نراس کرنے کی ہمت نہ کی۔ اُسے اپنے لال کا کہنا یاد تھا لیکن اُسے پورا کیونکر کرے۔

جب وہ گھر آتا اُس کا لال چلّا اُٹھتا "لال کھلونا، باپو جی" یہ سُن کر اُس کا دل بیٹھ جاتا گویا اس کے سینے پر کسی نے سِل رکھ دی ہو۔ اس وقت اس کی بے بسی سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا اور افلاس کی تصویر

آنکھوں میں پھر جاتی۔ وہ اپنے بیٹے کے بے چین دل کا مطالعہ کر سکتا تھا، لیکن خود اُس کے اپنے درد اور ناامیدی کا سمجھنے اور جاننے والا کون تھا؟

"منّا، پیارا منّا" وہ گنگنا اُٹھا "میرا منّا نہ معلوم کیسا ہوگا؟" اس خیال نے اُسے تڑپا دیا، اُس کی ماں تو بیمار ہی تھی، اور بیماری بھی ایسی ویسی نہ تھی کہ جس سے جلد چھٹکارا پا سکے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا "ہوا بدلنے کے لئے کسی پہاڑ پر جاؤ" لیکن اُس کے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ اگر اس کے پاس پہاڑ پر جانے کو پیسے ہوتے تو وہ آپ یہاں مل میں کیوں پستا۔ اُف خون کی وہ دھارا!...... منہ سے کلیجہ نکلا پڑتا تھا بچنے کی اُمید تو تھی نہیں، گھبرا گئی ہوگی بیچاری، کتنے دن ہوئے ہونگے اُسے مرے؟ وہ اپنی اُنگلیوں پر دن گننے لگا۔ "ایک۔ دو۔ تین! ہاں مر گئی ہوگی وہ، لیکن نہیں، وہ مر کیسے سکتی ہے۔ خدا بچانے والا ہے۔ لیکن خدا بھی تو غریبوں کا نہیں، اُسے تو اپنے مالدار بندوں کی خیر خبر سے فرصت نہیں!...... تو وہ مر ہی گئی ہوگی چلو اچھا ہوا بہت دُکھ اُٹھاتی۔ دُکھوں سے تو پیچھا چھوٹ گیا ہوگا۔ لیکن ہاں، میرا منّا کہاں ہوگا؟ ننھا بھولا بھالا، میرا وہ منّا! گلا پھاڑ پھاڑ کر کھلونے کے لئے.... دودھ کے لئے، روتا ہوگا، ناآشنا تُتلا کر وہ کس سے اپنے دل کی بات کہتا ہوگا۔ اور اُسے کون سمجھاتا ہوگا؟ کہیں کوئی اُسے اُٹھا نہ لے گیا ہو! جھنگو کی ماں! شاید اُسی بڑھیا نے اس کی دیکھ بھال کی ہو"۔ وہ چپ چاپ بیٹھا تھا اُس کے دل و دماغ میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے لیکن وہ اُنھیں سمجھ نہ سکتا تھا۔

منّا کی یاد نے اُسے پھر بے چین کر دیا "کھلونا نہ لا دو گے۔ بابو جی...." جیسے اس کے کانوں میں کوئی کہہ رہا ہو۔ اُس نے نظر اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا، کہیں کوئی نہ تھا۔

نہ جانے کتنے دنوں میں وہ کچھ پیسے جمع کر سکا "اتنے میں کھلونا مل جائے گا" کی اُمید میں وہ شہر کی طرف دوڑ پڑا۔ لیکن منّا کی ماں کے لئے دوا خریدنی تھی، اس کے کھانے کے لئے سامان خریدنا تھا۔ پھر کھلونے کے لئے پیسے کہاں سے آتے؟ نہیں تو وہ اپنے بچے کی خواہش کو پورا نہ کرتا۔ منّا کے لئے بھی دودھ لینا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ماں کا دودھ نہ پلاؤ۔ شہر پہنچنے میں اُسے دیر نہ لگی۔

دوکان رنگ برنگ کے کھلونوں سے بھری پڑی تھی، وہ چھانٹ کر کوئی کھلونا لینا چاہتا تھا، کبھی ادھر جاتا کبھی اُدھر۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون سا کھلونا لے یکایک اُسے یاد آیا، کیا کہا تھا منّا نے؟ "لال کھلونا، اس کا منہ میرا ایسا لال لال ہو"۔ یہی لے لوں، اس کا منہ ویسا ہی ہے۔ اور اُس نے دوکاندار سے پوچھا "کتنے کا ہے؟"

"پانچ آنے کا!"

"کچھ کم نہ کرو گے؟"

"ایک پائی بھی کم نہ کروں گا، لینا ہو تو لو، نہیں تو گھر جاؤ۔"

"اچھا، دیدو بھائی" کہہ کر اُس نے ہاتھ بڑھایا، اور دوکاندار نے اُس کے ہاتھ میں کھلونا پکڑا دیا۔ اُلٹ پلٹ کر اُسے دیکھا کیسا خوبصورت ہے؟ اس کا اور مُنّا کا مُنھ ایک ہی سا ہے۔ یہ ہنس رہا ہے، لیکن جب دیکھو تب رویا ہی کرتا ہے، اُس نے اپنی جیب سے، جس میں میلے کپڑے کے پیوند تھے اور سفید تاگے کی دوہری سیون، پیسے نکالنے کو ہاتھ ڈالا، جیب ٹٹولتے ہی کلیجہ کانپ اُٹھا، پیسے نکال کر اُس نے دیکھا، کُل چار ہی پیسے بچے تھے، چونّی کیا ہوگئی؟ راہ میں کہیں گر تو نہیں گئی؟ بار بار اُس نے جیب میں ڈھونڈھا، اُلٹ پلٹ کر دیکھا لیکن چونّی نہیں ملی۔ اُس کے منہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"دوکاندار جھلّا اُٹھا" پیسے پاس نہیں اور آ گئے کھلونا لینے۔"

وہ چُپ ہو گیا، دل ذلّت سے بُجھا ہوا، افلاس سے بے چین۔

"چار پیسے کا" ہمت کر کے اُس نے کہا "کوئی کھلونا نہیں ہے؟"

"نہیں ہے، بھاگو۔ چلدو۔ چار چار پیسے کی چیزیں ہم نہیں بیچتے۔"

اور اپنا سا مُنھ لیکر وہ چل پڑا، راہ میں خیال آیا کچھ نہ لے گیا تو مُنّا روئے چلّائے گا، اس لئے کچھ نہیں تو چار پیسے کی مٹھائی ہی سہی۔"

جب وہ مُنّا کو مٹھائی دینے لگا تو وہ مچل کر پیچھے ہٹ گیا "میرا کھلونا نہیں لائے" کہہ کر اُس نے مُنھ پھیر لیا، اور رُوٹھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا، کتنی دیر کے بعد وہ راضی ہوگا، اب اُسے کون اور کیسے منائے؟

رات کا وقت تھا، اندھیرا بڑھ رہا تھا، نیند تھپکیاں دے دے کر آہستہ آہستہ سلا رہی تھی۔ شہر میں جوہری کی ایک دوکان تھی، جوہری اُسی پر سو رہا تھا، ایک بُڑھا سنار دوکان میں بیٹھا ہتھوڑے سے کچھ پیٹ رہا تھا ٹھک، ٹھک، ٹھک! اُس نے ایک لمحہ ٹھہر کر دیکھا جی للچایا، لیکن کرتا کیا؛ مجبور تھا۔ جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی لوٹ پڑا۔ اُس کی آنکھوں نے ساری دوکان چھان ڈالی لیکن کچھ نظر نہ آیا، غور سے پھر دیکھا، الماری کے پٹ کھُلے تھے، اس میں سونے چاندی کے زیور چمک رہے تھے، وہ پھر لوٹ پڑا اور اُسی گلی میں گھومنے لگا۔ خیال ہوا کسی نے پکڑ لیا "یہ بہت بُرا کام ہے! اس سے تو بھوکوں مرنا اچھا ہے۔" لیکن بھوکوں مر کر بھی صبر کہاں مُنّا کو کھلونا بھی تو دینا ہے، کتنا ضد کرتا ہے۔" اور وہاں کھلونے کے بعد جو بچے گا، اُس سے اُس کی ماں کا علاج کروں گا، دونوں ہی کام ضروری ہیں، ٹلائے نہیں جا سکتے، اب دیر کرنا ٹھیک نہیں۔" ہمّت کر کے وہ آگے بڑھا پھر پیچھے ہٹ گیا "چوری! پاپ، مہا پاپ" اُس کا دماغ چکرانے لگا۔" لیکن کوئی اور جتن بھی تو نہیں: بیوی

کی بیماری اتنی بڑھ گئی ہے کہ پل بھی نہیں جا سکتا، بیچاری مر ہی جائے گی، دوا نہ ملی تو زیادہ دن نہ جیئے گی۔ وہ بچائی جا سکتی ہے..... لیکن چوری ....“

اُس نے پھر ہمت کی اور دوکان کی طرف بڑھا، اب وہ دوکان کے سامنے ٹہل رہا ہے، بوڑھے سنار کی آنکھ بچا کر دبے پاؤں دوکان میں گھس گیا، الماری سے ایک پیالا زیور لیا اور کود کر بیٹا تو ٹوٹ جا گا۔ بڈھے سنار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، وہ زور سے چلّا اُٹھا ”چور، چور“ پاس پڑوس کے لوگ سب دوڑ پڑے۔ کچھ لوگوں نے پیچھا کیا، کسی چیز سے اُس کا سر ٹکرا گیا، شاید پتھر سے۔ اس کے بعد مُکّا..... لات.... گھونسہ۔ جوتا۔ لاٹھی!

(۳)

ایک بوڑھا قیدی، لمبے لمبے بال، جھاڑو کی سی داڑھی لئے بُری طرح بڑھی ہوئی مونچھیں اس کے پاس آیا اور کہنے لگا ”تمہارے چھوٹنے کی تاریخ کل ہی تو ہے نا؟“

”ہاں کل ہی ہے“ کچھ سوچ کر وہ بولا۔

”چھٹی ہو تو کسی دن میرے گھر بھی جانا، میرا حال کہہ دینا۔ بھائی تمہارا بڑا گُن مانوں گا، نہ معلوم میں کب چھوٹوں؟ بچپن تو جیل ہی میں مرنے کے سے ہیں۔“

”ہاں کہہ دوں گا۔“ اُس نے جواب دیا۔

بوڑھا خوش ہو کر جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی چلا گیا، وہ بیٹھا ہی رہا، کل وہ چھوٹنے گا، جیل کی دیوار اُسے کاٹے کھاتی تھی، وہ بے چین ہو رہا تھا، اُس کی زندگی کا کتنا بڑا حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرا، دنیا کیا سے کیا ہو گئی، دو سال کیا کم ہوتے ہیں۔ تیس تیس دن کے چوبیس مہینے، دنیا تو ایک ہی دن میں کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، یوں تو سیکڑوں دن ہیں، ”میرا جی گھبرا گیا ہے، لیکن کچھ لوگ یہاں رہ کر بھی کتنے خوش ہیں۔ جیل تو جیل ہی ہے۔ کل نہ معلوم اس وقت کہاں ہوں“ اُس نے آفتاب کی طرف دیکھا ”ابھی تو ایک پہر دن باقی ہے؟ یہ گھنٹے کی آواز ہے، تو ٹھیک چار بج گئے.... گھر جا کر کیا کرونگا، دنیا کی نظروں میں چور ہوں، پاپی ہوں، نکما ہوں، شریر ہوں، کسی کو کیسے مُنہ دکھاؤں، منّا کھلونا مانگے گا تو کیا کہوں گا؟ اور اس کی ماں؟ وہ تو مجھی کو قصوروار ٹھہرائے گی۔ سچ ہے، میں ہوں بھی، کیا اب تک دن نہ کٹتے تھے؟ اگر جاتا ہی نہیں تو پکڑا کیسے جاتا سب ہنسیں گے، کرنی بھرتی۔ کچھ دن کی سزا اور بڑھ جاتی تو کیسا ہوتا؟ کسی طرح بڑھ سکتی ہے؟ نہیں بڑھے گی کیا سزا بڑھ جائے گی؟ یہاں اور زیادہ ٹھہرنا نہیں چاہتا، جی اُکتا گیا، سزا تو بڑھ جائے، پر منّا جو ہے، کہیں اسکی ماں مر گئی ہو تو؟ جانا ہی اچھا ہوگا؟ اس نے مغرب کی طرف نگاہ دوڑائی ”ابھی شام ہونے میں بہت دیر ہے۔ آج کیا دن بہت بڑا ہو گیا؟ پوس کے مہینے میں اتنا بڑا دن، منّا سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہوگا، اُسے کون دودھ

دیتا ہوگا۔ جھنگو کے ایسے ہی بہت سے بچے ہیں، وہ دودھ بھی پیتے ہونگے اور نہ جانے کیا کیا کھاتے ہونگے، اور میرا پیارا منّا، وہ للچائی آنکھوں سے ٹک لگائے دیکھتا ہوگا۔ وہاں جاکر اُسے خوب کھلاؤں گا۔

جیسے جیسے رات بھیگتی تھی اُس کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ وہ پاگل ہوا جارہا تھا۔ وہ سوچتا "کیا لوگ مجھے بھی چور کہیں گے؟ کیا میں سچ مچ چور ہوں؟ دنیا میں کوئی اور چور نہیں؟ انھیں کی طرح میں بھی اپنی زندگی کے دن بسر کرونگا۔ ایک بار جھنگو بھی تو پکڑا گیا تھا، اور بھولا نتھوا...... میں نے تو چوری نہیں کی۔ کیا چوری پر مجبور کرنے والا کوئی اور نہیں ہے؟ پیٹ کی آگ بجھانے کی چنتا منّے کا کھلونا، بیوی کی وہ بیماری! بدن پر کپڑے اور نہ پیٹ میں ایک دانہ، اُس کے منھ سے خون کی دھارا..... منّا کا رونا، کس کا دل اُس دکھ کو اٹھا سکتا ہے۔ میں پاپ کے گڑھے میں گرا پر گرا، مگر کیوں گرا، اسے دنیا کیسا سمجھے گی؟"

وہ جیل سے باہر آچکا تھا، دنیا اُسے نئی معلوم ہوتی تھی، خرچ کے لئے کچھ آنے پیسے ملے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا "گھر جانے سے پہلے منّا کے لئے کھلونا لے لوں، تو وہ بہت خوش ہوگا۔" وہ شہر کی جانب روانہ ہوا، اُس کے پیر آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے، کہیں اُسے کوئی چور نہ کہہ دے۔

رات ہوگئی، وہ کھلونا لیکر گھر کی طرف چل پڑا۔ آہستہ سے مکان کے سامنے پہونچا، ڈرتے ڈرتے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی "کون ہے؟"

اُسے یہ آواز اجنبی نہ معلوم ہوئی۔

"منّا جاگ رہا ہے؟" اُس نے کوشش کرکے پوچھا، اس کا سینہ دھک دھک کر رہا تھا۔

اندر کانا پھوسی ہوئی "منّا کا باپ معلوم پڑتا ہے" دروازہ کھلا، وہ اندر داخل ہوا۔ کچھ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ جھنگو کی ماں نے منّا کو اٹھایا۔ آنکھیں ملتے ہوئے اُس نے دیکھا، کوئی خوفناک آدمی سامنے بیٹھا ہے۔

اُس نے منّا کی طرف کھلونا بڑھا دیا، اور پیار سے بولا "لو منّے، یہ اپنا کھلونا لو۔"

منّا چلا اُٹھا "باپ رے!" اور دور بھاگ کھڑا ہوا۔

(ایک ہندی افسانہ کا آزاد ترجمہ)

گرانی

از حضرت طالب چکوالی بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ راولپنڈی

گرانی کی ہے ہر زباں پر کہانی — گرانی سے ارزاں ہوئی زندگانی
گرانی ہر اک چیز پر چھا گئی ہے — گرانی کی ہے آج کل حکمرانی
غنیمت سمجھ لو اگر ہیں میسّر — ہوا سانس لینے کو، پینے کو پانی!
ہے نایاب کپڑا تو کمیاب آٹا — کٹے بھی تو کیسے کٹے زندگانی
مکاں کا کرایہ فزوں سے فزوں تر — ہیں مالک مکانوں کے قارون ثانی
ہیں بیگانہ اخلاق و قانون سے وہ — نہ مانیں گے اِس کی نہ اُسکی ہے مانی
کرایہ بڑھانے کے ہیں ڈھنگ ایسے — کہ شیطاں کو بھی جن سے یاد آئے نانی
ضمیر اپنا بیچیں گے پیسوں کے بدلے — یہ ہیں بھول بیٹھے کہ دُنیا ہے فانی
یہ فرعونیت چند روزہ ہے بھائی — مری جان دُنیا تو ہے آنی جانی
مصیبت ہوا رہنا، کھانا، پہننا — قیامت ہے آئی، قیامت ہے آنی
خدائی خدائی نے ہے رنگ بدلا — زمیں آسماں اور ہے آگ پانی
سرِ طورِ سرمایہ کہتا ہے منعم — غریبوں کے حصہ میں ہے "لن ترانی"
کسے ذکر و فکرِ حسیناں کا سودا — گرانی سے کس کو نہیں سرگرانی
کہاں ذوق و شوقِ محبت کی باتیں — کہاں جذبۂ عشق کی ترجمانی
گرانی سے بے کیف و بے رنگ ہے دل — گرانی کی ہے نذر اپنی جوانی
ہے جنسِ وفا کیوں گرانی میں ارزاں — ہے اس کے لئے وقت ناقدردانی
یہ جنگ و جدل شغلِ سرمایہ داراں — گرانی بھی ہے اُن کی اک مہربانی
گرانی سے نالاں ہیں مزدور و مفلس — مگر کون سنتا ہے اُن کی کہانی

زمانہ ہے سرمایہ داروں کا طالب
نہ کر جرأت عرضِ سودِ تہانی

رفتارِ زمانہ

جنگ کے ہر محاذ سے اتحادیوں کے فتوحات کی خبریں آ رہی ہیں اور انجام کا آغاز نظر آنے لگا ہے۔ اٹلی میں فسطائیت کا چراغ گل ہو چکا ہے اور مسولینی اب حکومت کا قیدی ہے۔ جرمنوں کو بھی اب اس امر کا احساس ہونے لگا ہے کہ فتح کا خیال محض سراب ہے، اور فیوہرر کے بلند بانگ دعوے اب پورے نہ ہو سکیں گے۔ ہمبرگ کا شہر اور بندرگاہ اتحادی بمباری سے بالکل تباہ و برباد ہو چکے ہیں، برلن اور دوسرے بڑے شہر خالی کئے جا رہے ہیں اور امکان ہے کہ برلن کو کھلا ہوا شہر قرار دے دیا جائے۔ روس میں بھی جرمنوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے، اوریل اور بائیلگوروڈ جرمنوں کے قبضہ سے نکل چکے ہیں اور خارکوف کے خالی کرنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ سسلی میں قتانیا اتحادیوں کے قبضہ میں آ چکا ہے اور جرمن لائن دو ٹکڑوں میں کاٹ دی گئی ہے، جرمن فوج سسلی خالی کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔ سویڈن نے اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ ۲۰ اگست ۱۹۴۳ء کے بعد جرمن فوجیں سویڈن کے راستہ ناروے نہ جا سکیں گی۔ فنلینڈ علیحدہ صلح کرنے کی کوشش میں ہے، فرانس میں نازیوں کے خلاف مظاہرے ہو رہے ہیں، بحری جنگ کا نقشہ بھی نازیوں کے خلاف ہے۔ جنوبی مغربی بحرالکاہل میں جاپان کو شکست پر شکست ہو رہی ہے۔ اگر واقعات کی رفتار کی یہی صورت رہی تو گمان غالب ہے کہ ابھی جاڑے میں جرمنی گھٹنے ٹیک دیگا۔ مختلف محاذوں کے مختصر تفصیلات حسب ذیل ہیں :-

روس | بعض لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ اتحادی کسی نہ کسی جگہ یورپ پر حملہ کرنے والے ہیں، اس لئے ہٹلر امسال روس پر حملہ نہ کرے گا، مگر یہ خیال غلط نکلا اور ہٹلر نے بائیلگوروڈ سے بیکر اوریل تک ۱۴۰ میل کے محاذ پر ۵ جولائی کو حملہ کر ہی دیا۔ اس شدید حملہ میں ہٹلر نے فوج کی بہت بڑی تعداد سے کام لیا جس کی مدد پر ٹینک اور ہوائی جہاز بھی تھے۔ روسیوں نے بھی نہایت بہادری اور پامردی سے ان حملوں کا مقابلہ کیا، مگر بائیلگوروڈ کے محاذ پر دشمن روسی مورچوں میں رخنہ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا، اگرچہ بعد میں جوابی حملے کر کے روسیوں نے حملہ آوروں کو ہٹا دیا۔ کرسک کے محاذ پر بھی جو بائیلگوروڈ اور اوریل کے درمیان واقع ہے یہی حال ہوا۔ الغرض بائیلگوروڈ، کرسک، اور اوریل کے محاذات پر جرمنوں نے انتہائی شدومد کے ساتھ حملے کئے، مگر باوجود شدید نقصانات برداشت کرنے کے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ دس دن تک حملوں کا زور رہا اس کے بعد جرمن سرگرمیاں سرد پڑ گئیں اور روسیوں نے جارحانہ پوزیشن اختیار کر لی، اور اب یہ حال ہے کہ روسیوں نے اوریل پر چاروں طرف سے حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ روسیوں نے آگے بڑھ کر بائیلگوروڈ و نیز دوسرے مقامات بھی جرمنوں سے چھین لئے ہیں۔ روسی فوجیں اب برائنسک اور خارکوف کی طرف بڑھ رہی ہیں جرمن خارکوف خالی کر کے پیچھے ہٹنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ خارکوف کے روسیوں کے قبضہ میں آ جانے سے یوکرین پر جرمن خطرہ ختم ہو جائیگا۔

لینن گراڈ سے تقریباً تیس میل مشرق میں بھی سخت جنگ ہو رہی ہے یہاں روسی فوجیں مقام مگا پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں اگر اس مقام پر روسیوں کا قبضہ ہو گیا تو پھر لینن گراڈ کا محاصرہ ٹوٹ جائیگا۔ روسیوں نے جزیرہ نمائے کاریلیا کے محاذ پر فنلینڈ کے مورچوں کو بھی توڑ دیا ہے۔ اس وقت موسم ٹھیک نہیں ہے بارشیں ہو رہی ہیں، فوجوں اور سامان جنگ کے نقل و حمل میں دقتیں پیدا ہو گئی ہیں، پھر بھی روسی فوجیں کچھ نہ کچھ پیش قدمی کرتی ہی جاتی ہیں، اور اس واقعہ کو خود جرمن خبر رساں

تازہ ترین اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ مسولینی ایک آمدہ کشتی میں غرق ہو گیا ہے۔

ایجنسی بھی تسلیم کرتی ہے۔ بہرحال اب روس کے محاذ پر پانسہ پلٹ گیا ہے، ایک ہفتہ میں تیس ہزار جرمن ہلاک ہوئے پانسو ٹینک تباہ یا ناکارہ کردیئے گئے اور سات سو ہوائی جہاز برباد ہوئے۔

سسلی | شمالی افریقہ کی مہم سر ہونے کے بعد ہر طرف قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کہ دیکھئے اب اتحادی یورپ پر کب اور کہاں حملہ کرتے ہیں۔ بالآخر ۱۰۔ جولائی کو چاندنی رات میں اتحادیوں نے جزیرہ سسلی کے مغرب اور جنوب مشرق میں اپنی فوجیں اتار دیں محوری فوجوں نے کسی قدر مزاحمت ضرور کی مگر وہ مزاحمت مغلوب کرلی گئی۔ اس حملہ میں برطانوی، امریکن اور کناڈا کی فوجوں نے حصہ لیا، بعد میں کچھ فرانسیسی فوج بھی شریک ہوگئی، اور اس حملہ میں اتحادیوں کی بری بحری اور ہوائی فوجوں نے نہایت جاں فشانی کے ساتھ اشتراک عمل کیا۔ ۱۱۔ جولائی کو اتحادیوں نے آتراگونہ، کانیکٹی اور رغاتہ پر قبضہ کرلیا۔ دوسرے روز سائراکیوز آموله، گیلا اور پاچینو پر قبضہ ہوگیا۔ ۱۳ جولائی کو راگوسہ، فلوریڈیا اور آگسٹا فتح ہوگئے۔ ۱۴۔ جولائی کو برطانوی لشکر نمبر ۸ قطانیہ کے قریب پہونچ گیا جہاں دشمن نے سخت مقابلہ کیا۔ ۱۶۔ جولائی تک اتحادیوں نے کومیسو، لبسقادی، کانی کھٹنی، باگو وٹینی، وتوریہ، کانڑ بیلو، پالمہ، ڈیلیونٹی جیارہ، فورٹینو بوڈیکا ورزی پر قبضہ کرلیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ تقریباً تمام سسلی پر اتحادیو کا قبضہ ہوگیا ہے۔ جزیرہ کا دارالحکومت پالرمو بھی فتح کرلیا گیا ہے اور تازہ ترین خبر یہ ہے کہ قطانیہ کے محاذ پر بھی برطانوی لشکر نمبر ۸ نے جس میں زیادہ تر ہندوستانی عنصر ہے جرمن صفوں کو توڑ کر شہر پر قبضہ کرلیا ہے۔ اب سسلی کا صرف شمال مشرقی گوشہ محوریوں کے قبضہ میں باقی رہ گیا ہے، ایک ہفتہ میں یقیناً وہ بھی فتح ہو جائیگا اور اس کے بعد پھر خود اٹلی کی باری ہے۔

مسولینی کا زوال | اٹلی میں خوف و ہراس اور ظلم کا جو دور ۲۱ برس ہوئے اکتوبر ۱۹۲۲ء سے شروع ہوا تھا وہ ۲۶۔ جولائی ۱۹۴۳ء کو ختم ہوگیا۔ یعنی بنیٹو مسولینی اور اس کی فشیطی وزارت نے استعفا دیدیا۔ اور مسولینی کی جگہ مارشل بادوگلیو کو وزیر اعظم اور سکریٹری آف اسٹیٹ مقرر کردیا گیا۔ مسولینی کا زوال اس قدر اچانک کیوں ہوا؟ اس کے بارہ میں مختلف روایتیں ہیں۔ جرمن روایت تو یہ ہے کہ شمالی افریقہ کی مسلسل شکستوں نے مسولینی کا دماغ خراب کردیا تھا، اور وہ کشتیٔ حکومت کی ناخدائی کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اس لئے وہ خود مستعفی ہوگیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ پچھلے دنوں مسولینی اور ہٹلر کی جب ملاقات ہوئی تھی اس وقت ہٹلر نے مسولینی سے کہا تھا کہ جنوبی اٹلی سے فوجیں ہٹالی جائیں کیونکہ وہاں اتحادیوں کے سامنے جمنا مشکل ہوگا۔ اس کے بعد کوہستان ایپی نائن میں مورچہ بندی کی جائے۔ مسولینی نے واپس آکر جب یہ تجویز وار کیبنٹ میں پیش کی تو اس نے نامنظور کیا اور اس کے بعد شاہ اٹلی کے سامنے تجویز رکھی گئی اُس نے بھی پسند نہ کیا۔ اس لئے مسولینی کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خود مستعفی ہو جائے۔ اور آخری شکست کی ذمہ داری سے خود کو بچالے۔ دونوں روایتیں اپنے اندر کچھ وزن ضرور رکھتی ہیں اپنے ابتدائی عہد حکومت میں مسولینی نے اٹلی کی نئی تنظیم کی اور تمام سلطنت کو اپنی مٹھی میں لے لیا، ابتدا میں اٹلی کی پالیسی جرمنی کے خلاف تھی اور چانسلر ڈولفس کے قتل کے بعد محض مسولینی کی مخالفت کی وجہ سے ہٹلر کو اسوقت آسٹریا پر قبضہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی لیکن جنگ حبشہ میں انگلستان و فرانس کی پالیسی نے اٹلی کو جرمنی کے اتحاد پر مجبور کردیا اور رفتہ رفتہ صورت حال یہ ہوئی کہ مسولینی ہٹلر کی محض آواز بازگشت ہو کر رہ گیا۔ حبشہ کی فتح (۱۹۳۵ء) اور البانیہ کا الحاق (۱۹۳۹ء) مسولینی کی پیشانی پر سب سے زیادہ بدنما داغ ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ہٹلر اور مسولینی کی ہی ذات سے اسپین میں خانہ جنگی شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین میں فرانکو کی ڈکٹیٹرشپ قائم ہوگئی۔ موجودہ جنگ کے ابتدائی دور میں مسولینی ہوا کا رخ دیکھتا رہا۔ لیکن ۱۹۴۰ء میں جب اُس نے دیکھا کہ فرانس کی کمر ٹوٹ گئی ہے تو اس نے مال غنیمت میں حصہ لینے کے لئے ۱۰۔ جون ۱۹۴۰ء کو فرانس و برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ یہیں سے مسولینی کے اقبال کو زوال شروع ہوگیا۔ اپنی بڑھی ہوئی طاقت کے گھمنڈ میں مسولینی نے ۱۹۴۰ء میں یونان پر حملہ کردیا، لیکن یونانیوں نے اطالوی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیکر صرف

اپنے ملک سے نکال دیا بلکہ وہ البانیہ میں گھس گئے۔ اگر اس وقت ہٹلر یونان پر حملہ کرکے اٹلی کی مدد نہ کرتا تو اطالوی فوج کا صفایا ہوگیا ہوتا۔ سنہ ۱۹۲۲ء سے سنہ ۱۹۴۳ء تک اٹلی نے مسولینی کی بدولت جو نقصانات اُٹھائے ہیں، اُن کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ تمام مشرقی افریقہ، اطالوی صومال، ارٹیریا، حبش اور لیبیا اٹلی کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں اور بحیرۂ روم کے جزیرے بھی ایک ایک کرکے نکلے چلے جارہے ہیں۔ افریقہ، یونان، اور یوگوسلافیہ کی لڑائیوں میں سات لاکھ اور روس کے محاذ پر پونے دو لاکھ اطالوی افسر و سپاہی ضائع ہوچکے ہیں، اور اب سسلی میں ضائع ہورہے ہیں، سلطنت اطالیہ کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ ہاتھ سے نکلے ہوئے ملکوں کا رقبہ تیرہ لاکھ چھ ہزار، ۲۲۷ مربع میل اور آبادی ایک کروڑ چالیس لاکھ نفوس ہے۔ اٹلی کے یہ تمام مصائب مسولینی کی خودغرضی، نافہمی اور ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہیں۔

اٹلی کی پوزیشن | مسولینی کے زوال کے بعد اب اٹلی کی پوزیشن جرمنی اور اتحادیوں دونوں کے لئے ایک خاص اہمیت کی حامل ہوگئی ہے۔ نیپولین کی طرح ہٹلر بھی یہ سمجھتا ہے کہ اگر اٹلی غیر جانبدار رہیگا تو اُس کی طرف سے دغابازی اور غداری کا ہر وقت کھٹکا لگا رہے گا، اگر دوست رہیگا تو تباہی کا موجب ہوگا، اور اگر دشمن ہوگا تو وہ لقمۂ تر ہے۔ ہٹلر یہ چاہتا ہے کہ اٹلی اتحادیوں اور جرمنی کے درمیان ایک "بفر اسٹیٹ" بنا رہے اور اگر ضرورت پڑے تو میدان جنگ بن جائے، تاکہ اٹلی کی سرزمین پر لڑکر جرمنی کو محفوظ رکھا جاسکے۔ دوسری طرف اتحادی یہ چاہتے ہیں کہ اٹلی بلاشرط ہتھیار ڈال دے اور وہ اٹلی کے ہوائی اڈّوں سے کام لے کر جرمنی پر بمباری کرسکیں۔ لیکن مارشل باڈوگلیو بلاشرط ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں ہے۔

اٹلی کی تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے، یعنی ایک طرف تو اطالوی فوج کے بیس ڈویژن بلقان اور دیگر محاذوں پر اپنے ملک سے دور جرمنی کے رحم و کرم پر پڑے ہوئے ہیں، اور دوسری طرف تمام شمالی اٹلی پر جرمن فوجیں چھا گئی ہیں، جینیوا، فلورنس، میلان اور تریسته میں جرمن فوجیں مورچہ بند ہوگئی ہیں۔ سوئزرلینڈ کی ایک اطلاع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اٹلی نے جرمنی اور اتحادی دونوں سے یہ درخواست کی ہے کہ وہ اٹلی کو غیر جانبدار رہنے دیں، اور اطالوی نظم و نسق کی نگرانی تا اختتام جنگ غیر جانبدار سلطنتوں کے نمائندوں کی ایک مخلوط جماعت کے سپرد رہے۔ لیکن اتحادیوں کو یہ بات منظور نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں وہ اٹلی کی طرف سے جرمنی پر حملہ نہیں کرسکیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مارشل باڈوگلیو گفت و شنید کرنے کے بعد ہتھیار ڈالنا چاہتا ہے تاکہ وہ اتحادیوں سے نرم اور اپنے موافق شرطیں طے کرے۔ لیکن یہ بات اتحادیوں کو منظور نہیں ہے اور انھوں نے تاکید کردی ہے کہ یا تو اٹلی جلد سے جلد بلاشرط ہتھیار ڈالدے ورنہ سسلی کے بعد خاص اٹلی پر حملہ کردیا جائیگا اور ہوائی بمباری سے اطالوی شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائیگی۔

اٹلی کے اخبار "پوپولو ڈی روما" سے معلوم ہوا ہے کہ اتحادیوں کی طرف سے اٹلی کو حسب ذیل شرطیں پیش کی گئی ہیں:۔ (۱) اطالوی فوج اور بحری بیڑہ مزاحمت بند کردے، (۲) جرمنی سے تعلقات منقطع کرلئے جائیں۔ (۳)، البانیہ، یونان، یوگوسلافیہ اور فرانس سے تمام اطالوی فوجیں فوراً طلب کرلی جائیں۔ (۴) تمام جنگی سامان نقصانات پہونچائے بغیر اتحادیوں کے حوالہ کیا جائے، (۵) جب تک جنگ ختم ہو، اٹلی میں برطانیہ، امریکہ و روس کی مشترکہ فوجی حکومت قائم رہیگی (۶) تمام مجرمین جنگ کو گرفتار کرکے حوالہ کیا جائے (۷)، اٹلی کے قبضہ میں جتنے اتحادی قیدی ہیں سب چھوڑ دیئے جائیں۔

سوئزرلینڈ کے ایک اخبار کی یہ اطلاع ہے کہ جرمنی نے جنوبی و وسط اٹلی سے اپنی فوجیں ہٹا لینے کی آمادگی ظاہر کی ہے بشرطیکہ اٹلی اس امر کی گارنٹی کرے کہ اتحادی اٹلی کو بطور اپنے Base کے استعمال نہ کریں گے۔

سویڈن اور جرمنی | ایک معاہدہ کی رو سے جرمنی اپنی فوجیں اور سامان جنگ سویڈن کی سرزمین سے گذار کر روس اور فنلینڈ

… سکتا تھا لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ سویڈن نے یہ معاہدہ منسوخ کردیا ہے۔ ۱۵۔ اگست کے بعد جرمنی کا سامان جنگ اور ۲۰۔ اگست کے بعد جرمنی کی فوجیں سویڈن سے نہیں گذر سکیں گی۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب جرمنی کا رعب ہمسایہ ملکوں سے اُٹھ گیا ہے اور سویڈن کو اب جرمن حملہ کا خوف باقی نہیں رہا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ جرمنی سے جو کوئلہ اور کوک سویڈن جاتا ہے وہ بند کردیا جائے یا سویڈن سے جو مال جنوبی امریکہ جاتا ہے اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کردی جائیں۔ لیکن اس کے جواب میں سویڈن اپنے یہاں سے کچا لوہا بھیجنا بند کرسکتا ہے جس کی جرمنی کو سخت ضرورت ہے۔ اب جبکہ اتحادیوں کی طرف سے ناروے پر حملہ کا ہر وقت اندیشہ ہے، شمالی ناروے کو جرمن فوجوں کا بھیجنا بہت مشکل ہو جائیگا۔

دوسرے محاذات | اراکان اور برہما کے محاذ پر کوئی خاص بات واقع نہیں ہوئی۔ البتہ اتحادیوں کے ہوائی جہاز اکیاب، رنگون، مانڈلے اور برہما کے دوسرے اہم مقامات پر بمباری کرکے جاپانیوں کو سخت نقصان پہونچاتے رہتے ہیں۔ اس محاذ پر برسات ختم ہونے تک تمام جنگی سرگرمیاں سست رہینگی۔

چین کے صوبہ مغربی ہونان پر وادی دریائے ساکوین کی طرف سے جاپانیوں نے نیا حملہ شروع کیا تھا اور کسی قدر پیش قدمی بھی کی تھی، مگر اب چینیوں نے اس پیش قدمی کو روک لیا ہے۔ چین کے پریسیڈنٹ ڈاکٹر لنسین کا ۸۳ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا ہے۔

مغربی بحرالکاہل میں جزیرہ نیو جارجیہ کے مقام منڈہ کو اتحادی فوجوں نے فتح کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ ہوائی جہازوں سے جاپانی اڈوں، سمندری جہازوں اور مورچوں پر بمباری کرکے روزمرہ سخت نقصان پہونچایا گیا ہے۔

ہندوستان | سیاسی اعتبار سے ہندوستان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ البتہ اقتصادی لحاظ سے ہندوستان کی مصیبتوں میں روزافزوں اضافہ ہوتا جارہا ہے، غلہ اور کپڑے کی سخت کمی محسوس ہورہی ہے۔ خصوصاً ہندوستان کے مشرقی اور جنوبی علاقوں کی حالت بہت زیادہ خراب ہے۔ صوبہ مدراس کو حکومت نے خود ہی قحط زدہ علاقہ قرار دیدیا ہے۔ بنگال کی یہ حالت ہے کہ لوگ بھوکوں مر رہے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کی حالت اور بھی زیادہ خراب ہے اگر فاقوں سے تنگ آکر عورتیں نوکری چاکری کرنے کا ارادہ کرتی ہیں، تو تن پوشی کے لئے کافی کپڑا نہیں ہے جس کی وجہ سے گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ گداگری اور جرائم ترقی پذیر ہیں۔ بعض شہروں میں لوگوں نے فاقوں سے تنگ آکر خودکشی کرلی بعض مقامات سے ایسی خبریں بھی آئی ہیں کہ ماؤں نے فاقوں سے تنگ آکر اپنے ننھے ننھے بچوں کا گلا گھونٹ دیا، اور پھر خودکشی کرلی اڑیسہ اسمبلی میں حکومت نے خود تسلیم کرلیا کہ بہت سی موتیں فاقہ کشی سے واقع ہوئی ہیں۔ کلکتہ میں گداگروں کی لاشیں پڑی پائی جاتی ہیں جنھیں پوچھنے والا کوئی نہیں ملتا۔ کلکتہ کارپوریشن میں اس پر بحث بھی ہو چکی ہے۔ اڑیسہ کے بعض علاقوں میں لوگ درختوں کے پتے کھاکر گذر کررہے ہیں۔ بہار میں بہت سے لوگ پیپل کے پھل اور مہوے کھاکر پیٹ بھر رہے ہیں، مگر وہ جلد ہیضہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غریب عورتیں جب نیم عریاں حالت میں بھیک مانگنے یا محنت مزدوری کرنے نکلتی ہیں تو دیکھنے والے شریف آدمیوں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ کلکتہ میں حکومت اور ریلیف کمیٹی کی طرف سے لنگر خانے جاری کئے گئے ہیں جہاں ہزاروں آدمیوں کو مفت کھانا کھلایا جاتا ہے۔

وائسرائے کی تقریر | ۲۔ اگست ۱۹۴۳ء کو لارڈ لنلتھگو نے کونسل آف اسٹیٹ اور مرکزی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس میں الوداعی تقریر کی اور اپنے ۷ سالہ عہد حکومت پر تبصرہ کیا۔ اپنی تقریر کے دوران میں لارڈ لنلتھگو نے لارڈ ویول کی تعریف کی اور ہندوستان کی جنگی ساکھ کو سراہا اور اجناس خوراک کی قلت کا سرسری طور سے ذکر کیا اور اس پر اظہار افسوس کیا کہ باوجود ان کی کوششوں کے ہندوستانی لیڈر باہم مل جلکر جمود کو دور نہ کرسکے اور فیڈریشن کے قیام کو جسکی تجویز گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں کی گئی ہے ہندوستان کے لئے بہترین

بتلایا، اور ہندوستان نے بین الاقوامی معاملات میں جو ترقی کی ہے اس پر اظہار اطمینان کیا اور فرمایا کہ صوبوں میں تجربہ اطمینان بخش ثابت ہوا ہے، اور ہندوستانی پریس کے تعاون کی تعریف کی۔ لیکن لارڈ لنلتھگو نے تصویر کا فقط روشن رخ پیش کیا، اور اپنی تقریر میں اس کے دوسرے رخ کی طرف کوئی توجہ نہیں دلائی۔ لارڈ لنلتھگو نے کانگریس اور مسلم لیگ کے ساتھ جو مختلف سلوک کیا اس سے اُن کے دعوے کی کہ انہوں نے ملک میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، تردید ہو جاتی ہے۔ فیڈریشن قائم نہ ہونے کی ذمہ داری گورنمنٹ و نیز والیان ریاست پر بھی ہے، صوبوں میں Political autonomy کی حقیقت ان واقعات سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے جو اجناس کی فراہمی کے سلسلہ میں و نیز دیگر معاملات میں کئی صوبوں میں دیکھنے میں آئے، اور سندھ میں آنجہانی مسٹر اللہ بخش اور بنگال میں مسٹر فضل الحق کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اُس سے لارڈ لنلتھگو کے بیان کی قلعی کھل جاتی ہے۔ اُن کے ہی عہد حکومت میں ہندوستانی پریس پر علانیہ و خفیہ پابندیاں و قیود عائد کئے گئے۔ ہندوستان کی بین الاقوامی معاملات میں جو ترقی نظر آتی ہے وہ محض نمائشی ہے اور اسکی کوئی اصلیت نہیں۔ اسکے برعکس لارڈ لنلتھگو کے عہد حکومت میں ہندوستان میں انگلستان کے خلاف جو جذبہ پیدا ہو گیا ہے اسکی نظیر اسکے پیشتر نظر نہیں آتی ہے اور اگر لارڈ لنلتھگو کے تمام دعوے صحیح بھی مان لئے جائیں تو انکی یہ کارگذاری بڑی قیمت پر حاصل کیگئی ہے اور یقیناً مہنگی ہے۔ کوئی بھی مدبر اس قیمت کو ادا کرنے پر کبھی تیار نہ ہوتا یعنی کہ ان ہندوستانی لیڈروں کو بھی جو کسی پارٹی سے منسلک نہیں ہیں اور جو کسی پہلو سے بھی غیر ذمہ دار نہیں کہے جا سکتے اور جو برطانوی تعلق کے حق میں ہیں لارڈ لنلتھگو کی پالیسی کی مذمت کرنا پڑتی ہے۔ کوئی منصف مزاج شخص کانگریسی لیڈروں کو ان پر مقدمہ چلائے بغیر ایک سال تک جیل میں بند رکھنے کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لارڈ لنلتھگو نے اپنے کو محض برطانیہ کا ایجنٹ تصور کیا اور ہندوستانیوں کے حقوق کے تحفظ کی پروا نہیں کی، چنانچہ "مانچسٹر گارڈین" نے اس تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لیڈ اڈیٹوریل میں لکھا ہے کہ ایک سیاسی دماغ کی حیثیت سے تو وائسرائے کی تقریر ایک شاہکار ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی تقریر اس ڈھنگ سے مرتب کی کہ اسمیں اس بات کا ذکر تک نہیں آیا کہ گاندھی جی اور دوسرے کانگریسی لیڈر جیلوں میں ہیں، ان سے ملنے کی کسی شخص کو اجازت نہیں ہے، اور نہ گاندھی جی آزاد لیڈروں سے خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ اس طریقہ سے ہم لوگ کب تک کام چلا سکتے ہیں؟ وائسرائے نے یہ بھی کہا ہے کہ جنگ کے بعد کا زمانہ قریب تر آتا جا رہا ہے، جیوں جیوں یہ زمانہ قریب تر آتا جائیگا کیا ہم ان کانگریسیوں کو شکنجے میں ہی کستے رہیں گے؟ اگر یہی مقصود ہے تو پھر ایسے دلکش الفاظ کہنے سے کیا فائدہ کہ ہندوستان کے لیڈر ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ جائیں اور وہ پرائیویٹ طور پر گفت و شنید کریں۔"

سیلاب سے تباہی | ہندو سبھا اجمیر کے پریسیڈنٹ کنور چاند کرن شاردا نے اطلاع دی ہے کہ اجمیر میرواڑہ میں تالابوں کے بند ٹوٹ جانے سے کھاری ندی میں سیلاب آ گیا اور اسکے کنارے کے تمام مواضعات دریا برد ہو گئے۔ ریلوے پل ٹوٹ جانے سے ٹرینوں کی آمد و رفت بند ہو گئی ہے۔ تقریباً دس ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔ بیجے نگر اور ملحقہ علاقہ کے تمام دیہات بہہ گئے۔ حکومت، آریہ پرتی ندھی سبھا، اور باشندگان اجمیر و بیاور و نصیرآباد کے باشندوں کی بھی ہوئی پارٹیاں مصیبت زدگان سیلاب کی امداد کر رہی ہیں۔ اسی سلسلہ میں سرکاری ذریعہ سے جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں اُن سے معلوم ہوا ہے کہ بیجے نگر میں ۳۰ جولائی کو جو سیلاب آیا تھا اُس سے تمام شہر غرق ہو گیا۔ ایک ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔ بیشمار مویشی اور دوسرے جانور ہلاک ہو گئے بہت سے مکان گر پڑے۔ بیجے نگر اجمیر سے ۴۴ میل جانب جنوب واقع ہے اور صوبہ اجمیر میرواڑہ کا ایک ضلع ہے اور ریاست مارواڑ کی سرحد پر واقع ہے۔

مسٹر ساورکر کا استعفیٰ | متواتر چھ سال تک ہندو مہاسبھا کی رہنمائی کرنیکے بعد مسٹر ساورکر مہاسبھا کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ انکے زمانۂ صدارت میں مہاسبھا نے کافی ترقی کی۔ تاہم مہاسبھا اور ملک کے حق میں انکا مستعفی ہونا برا نہیں ہے۔ مسٹر ساورکر کا مطمح نظر بھی جنگجو قوموں کی طرح محدود تھا اور انمیں تعمیری تدبر کی کمی تھی۔ محض ہندوؤں کی حالت سے متاثر ہو کر وہ دوسرے فرقوں کو نظر انداز کر جاتے تھے اور یہ بھول جاتے تھے کہ ہندوؤں کی قسمت مسلمانوں کے ساتھ وابستہ ہے اور ہندوستان کبھی اپنی منزل کو نہیں پہونچ سکتا ہے جبتک اس امر کا پوری طور سے احساس نہ کر لیا جائے کہ وہ ایک مشترکہ میراث ہے۔ عملی پالیٹکس میں خفیف مراعات کو حاصل کرنیکے لئے وہ بڑے اصولوں کو قربان کرنے کیلئے تیار ہو جاتے تھے۔ اگر خبر صحیح ہے تو وہ کرپس اسکیم کو قبول کر لینے کے حق میں تھے حالانکہ ملک کی دیگر جماعتیں اسکے خلاف تھیں۔ اسیطرح صوبوں کو لیگی وزارت بنانے کے حق میں انکی پالیسی حالات کے مطابق بدلتی رہتی تھی۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی بطور انکے جانشین بہت خوش قسمت [illegible]

فہرست مضامین زمانہ جلد نمبر ۸۰ جنوری لغایت جون سنہ ۱۹۴۳ء

تصاویر (۱) منشی دیا نراین نگم (۲) منشی دیا نراین نگم ہمراہی مسٹر چند ہوشن سنگھ، و مسٹر قریشی۔ (۳) منشی دیا نراین نگم سنہ ۱۹۰۳ء (۴) منشی دیا نراین نگم و مسٹر قریشی (۵) منشی دیا نراین نگم (سنہ ۱۹۰۳ء)

(حصۂ نثر)

حصۂ نظم

THE ZAMANA, SEPTEMBER 1943 REGD. No. A. 147.

زمانہ

بیادگار منشی دیا نراین صاحب نگم مرحوم

جلد ۸۱ | ستمبر ۱۹۴۳ء | نمبر ۳

فہرست

تصویر:- حضرت روش صدیقی

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

(جملہ حقوق محفوظ)

عقلمندی تو یہ ہے

کہ آپ آنیوالے خطرات سے ہوشیار رہیں۔ کون جانتا ہے کبھی کسی کا یونہی چلتے چلتے پاؤں پھسل جاوے۔ کہیں دروازے میں ہاتھ آ جاوے۔ چاقو سے زخم ہو جاوے یا کہیں کانٹا لگ جاوے یا معمولی سی رگڑ بھی زہریلی ثابت ہو۔ مچھر مکھی سبھڑ۔ بچھو۔ وغیرہ کا ڈنک لگ جاوے۔ آگ وغیرہ سے کوئی حصہ جسم کا جل یا جھلس جاوے۔ کچھ کھانے پینے کی غلطی سے اچانک کہیں باہر ہی پیٹ درد ہو جاوے۔ جی متلا دے یا دست قے لگ جاویں۔ کہیں گرمی ہو یا جاگنے سے دردِ سر ہو۔ دانت درد۔ کان درد۔ نزلہ۔ زکام وغیرہ ہو ایسے وقت کے واسطے ہر ایک کو ضروری ادویات رکھنی ہی چاہئیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر وقت اتنا سامان کون رکھ سکتا ہے مگر شکر ہے خدا کا کہ اس کی مہربانی سے لاہور کے مشہور و معروف وید **پنڈت ٹھاکر دت شرما وید** نے ایک ایسی چیز **امرت دھارا** ایجاد کردی ہے جو ان تمام حادثات و امراض بلکہ اور بھی چھوٹی بڑی امراض اندرونی و بیرونی کو کھانے و لگانے سے دُور رکھتی ہے اور اس کی چھوٹی سی شیشی جیب کے ایک کونے میں رہ سکتی ہے **عقلمندی اسی بات میں ہے** کہ آپ ہمیشہ اس کو پاس رکھیں بہت سے خرچ تکلیف تشویش سے آپ کو بچاویگی امیر و غریب سب رکھیں **قیمت** بھی بہت نہیں چھوٹی شیشی صرف آٹھ آنے۔ نصف شیشی ایکروپیہ چار آنہ اور بڑی شیشی دو روپیہ آٹھ آنے۔

کفایت شعاری اِس میں ہے

کہ آپ اصلی چیز کو خریدیں کیونکہ اصل چیز کی بوند وہ کام کر سکتی ہے جو نقل کی ۱۰ بوند کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات نہ کریں۔ امرت دھارا کی مشہوری دیکھکر کئی لوگ اس کی معمولی نقلیں بیچ رہے ہیں کوئی تو غلطی سے ان کو خرید لیتے ہیں مگر کوئی کم قیمت کے باعث بھی کفایت شعاری کے خیال سے خرید لیتے ہیں۔ یہ ان کی **بھول** ہے یہ غلط کفایت شعاری ہے دھوکا کھانا ہوگا اس واسطے خریدتے وقت اچھی طرح سے امرت دھارا کا نام اور پنڈت جی کا نام و تصویر دیکھکر خریدیں ملتے جلتے نام سے دھوکہ میں نہ آجاویں کوئی دھوکہ باز چوری چھپے یہی نام رکھکر بھی بیچتے سُنے گئے ہیں ہوشیار رہئے! ایسے لوگوں کی اطلاع بھی آپ ہم کو دے سکیں تو مہربانی ہوگی امرت دھارا سب بڑے شہروں میں ملتی ہے۔ آپ چاہیں تو سیدھے بھی ہم سے منگوا سکتے ہیں۔ مگر دو اڑھائی آنہ کی ہو یا پانچ روپیہ کی کُل ۸ آنہ اوپر ڈاک خرچ آجاتا ہے۔

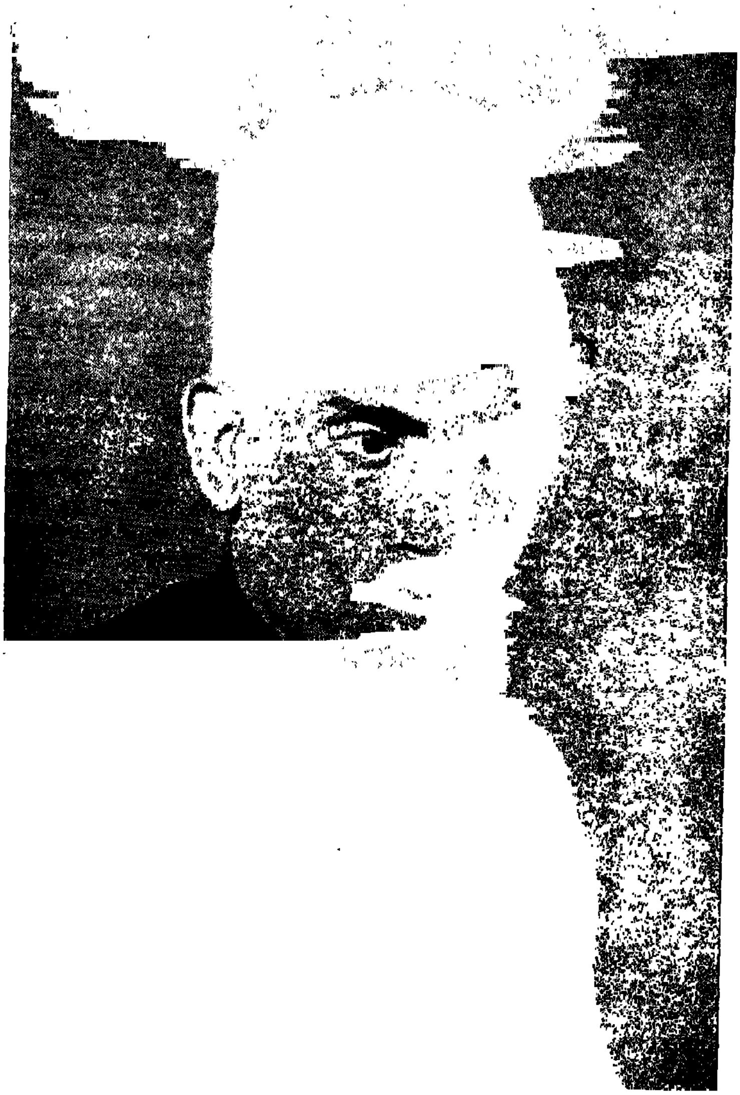
(نوٹ)

میسرز مھیسہ اینڈ سنز جاگل پور امرت دھارا کے سول ایجنٹ ہیں۔ ایجنسی کے واسطے خط و کتابت یا بات چیت ان سے بھی کی جا سکتی ہے۔

المشتہر

مینجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

خط و کتابت و تار کا پتہ :- **امرت دھارا نمبر ۱۴۰ لاہور**



حضرت روش صدیقی

زمانہ

جلد ۸ — ستمبر ۱۹۴۳ء — نمبر ۳

شامِ جاوداں

(جھیل ڈل کے ساحل پر)

(از حضرت روشن صدیقی)

ملی ہے حضرتِ یزداں سے ڈل کے ساحل کو
وہ ایک شام، کہ جس کی سحر نہیں کوئی
بس ایک قافلۂ شام ہے رواں ہر سو
برائے صبح یہاں رہگذر نہیں کوئی

غروبِ مہر کا احساس ہو کسے کہ یہاں
ہزار رُخ سے ہزار آفتاب پیدا ہیں
شبِ بہشت، حریمِ طرب، نسیمِ وصال
ہر اک سوال کے صدہا جواب پیدا ہیں

یہ تیرگی، یہ ضیا، یہ جہانِ ظلمت و نور
فروغِ کاکل و رخ کو بہانۂ ابدی

یہ شب نژاد چنار اور شمع ساز کنول
ہیں صبحِ غم کے لئے تازیانۂ ابدی

فلک نے روشنی مہر میں یہاں اکثر
عجیب منظرِ حیرت مقام دیکھا ہے
سکونِ روح لئے گیسوؤں کے سایہ میں
عروسِ شام کو مستِ خرام دیکھا ہے

نہیں ہے شام، مگر ایک شاہدِ خوباں
ملاحتوں کے "نگار آفریں" حجابوں میں
وہ بجلیاں جو رہیں چشمِ طور سے پنہاں
چھپی ہوئی ہیں یہاں سُرمئی نقابوں میں

یہ کشتیاں، یہ شکارے، یہ کاروانِ جمال
ہیں خواب جنتِ عمرِ رواں کی تعبیریں
غرورِ بتکدۂ دہر جن پہ نازاں ہے
یہ شام کھینچ رہی ہے عجیب تصویریں

ادائے شاہدِ معصوم جس میں پاتا ہوں
روش! وہ خوابِ محبت کی رازداں ہی یہی
دیا ہے جس نے مجھے اک تصورِ ابدی
دیارِ ناز کی وہ شامِ جاوداں ہے یہی

مغربی ممالک میں علم ریاضی کا ابتدائی دور

طلوس اور فیثاغورس

از مفتاح الدین ظفر، بی۔ایس۔سی۔ایل۔ٹی۔گورنمنٹ ہائی اسکول فتح گڑھ

آج کل علم سائینس نے عموماً اور علم ریاضی نے خصوصاً اس قدر ترقی کر لی ہے کہ تعجب ہوتا ہے انسان کس طرح پہاڑوں کے بیچ سے سیدھے خطوط کھینچکر ضرورت کے لئے سرنگیں بنا سکتا ہے، لیکن یہ امر بھی قابل غور ہے کہ آج سے ہزاروں برس پہلے جبکہ ریاضی نے اس قدر ترقی نہ کی تھی مصر والوں نے اہرام جیسے محیر العقول کارنامے دنیا کے سامنے کس طرح پیش کئے ہونگے۔ اہرام مصری دیکھ دیکھ کر اب بھی سائینس داں اور ماہران انجینیری دنگ رہ جاتے ہیں۔ ایک مربع چبوترے کے کونوں پر سے اس قسم کے خطوط کھینچے ہوئے ہیں کہ وہ سیکڑوں فٹ کی بلندی پر مربع چبوترے کے بیچ میں ایک نقطہ پر آ کر مل جاتے ہیں! واقعہ یہ ہے کہ اہرام مصری زمانۂ قدیم کے علوم و فنون کے کمال کا ایک نمونہ ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانے کی تہذیب آج کل کی تہذیب سے کسی صورت میں بھی کم تر نہ تھی، اور اُس زمانہ میں بھی علم ریاضی اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا۔

ظاہر ہے کہ اہرام مصری کو تعمیر کرنے کے لئے کافی ریاضی کی ضرورت ہے تاکہ اس کا صحیح نقشہ مرتب ہو سکے تاریخ کی ورق گردانی اُس زمانے کے اس زبردست ریاضی داں کے حالات پر روشنی نہیں ڈالتی، ہاں اتنا پتہ چلتا ہے کہ یونانی سیاحوں نے ایک بادشاہ سیوستر (Sesostris) کا ذکر کیا ہے جس کے زمانہ میں علم ریاضی کافی ترقی پر تھا، چنانچہ اس بادشاہ نے "اپنی زمین تمام اہالیان مصر میں اس طریقہ سے تقسیم کر دی تھی کہ ہر شخص کو ایک قطعہ ملا ہوا تھا جس پر کچھ لگان واجب الادا ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اگر دریائے نیل کسی کی زمین کو ہڑپ کر جاتی تھی تو بادشاہ اور سیروں کو بھیجکر معلوم کرا لیتا تھا کہ کتنی زمین کم ہو گئی ہے اور اُسی کے تناسب سے زمیندار کو کم لگان دینا ہوتا تھا۔" فلاطون نے اپنی ایک کتاب میں مندرجۂ ذیل عبارت تحریر کی ہے:۔

"مصری شہر ناکریٹش میں ایک شخص رہتا تھا جس کا نام تھیوٹ تھا، وہ آئی بس (قراقل) نامی پرندے کو متبرک خیال کرتا تھا۔ اس نے بہت سے علوم و فنون ایجاد کئے چنانچہ علم الحساب، علم ہندسہ، علم نجوم وغیرہ کا وہ موجد تھا

Thales *

اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ مانا جاتا ہے کہ اُس نے حروف ایجاد کئے۔"

حکیم ارسطو کا خیال ہے کہ مصر کے پجاریوں نے علم ریاضی ایجاد کیا کیونکہ ان کے پاس کافی وقت تھا کہ وہ اس کام میں صرف کرسکیں۔ اس قول کی تصدیق ایک عجیب وغریب طریقہ سے ہوتی ہے۔ ارسطو کی تحریر سے دو ہزار برس بعد مصر میں ایک پتھر پر کچھ نقوش کندہ ملے جن کو احمس نامی ایک پجاری نے لکھا تھا جو مسیح سے تقریبًا سترہ سو سال پہلے رہتا تھا۔ احمس کی اس تحریر کا نام ہے "تاریکی میں پوشیدہ باتیں معلوم کرنے کا قاعدہ" اور اس میں علم حساب اور علم ہندسہ کے مسئلوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ زیادہ تر اس قسم کے مسئلوں پر بحث کی گئی ہے کہ ایک خاص قسم کی کسور کو (مثلاً $\frac{۲}{۲ن+۱}$) چند ایسی کسور کے مجموعہ میں کیسے تبدیل کیا جائے جن میں سے ہر ایک کا نسب نما ا کائی ہو۔ ہرچند ہمارا علم ریاضی بہت کچھ ترقی پر ہے لیکن پھر بھی ہم جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ آسان نہیں ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل نتیجہ پر پہونچنا کافی دقت طلب ہے:۔

$$\frac{9}{29} = \frac{1}{24} + \frac{1}{58} + \frac{1}{174} + \frac{1}{232}$$

اس قدر تمہید کا مقصد صرف اتنا ہے کہ پُرانے زمانے میں علم ریاضی زیادہ تر مصر میں نشوونما پاتا رہا۔ اہالیان مصر کو فنِ مساحت میں کافی مشق تھی، زمین کو ناپنے والے اشخاص اپنے ساتھ ایک رسّی رکھتے تھے جس پر برابر برابر فاصلہ پر چند گرہیں لگی ہوتی تھیں، اس رسّی کے ذریعہ سے وہ ایک زاویہ قائمہ والا مثلث بنا سکتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ تین ایسی رسیاں لینے سے جن پر ایک ہی لمبائی کے فاصلہ سے دو تین اور چار گرہ لگی ہوں (یعنی رسیاں ۳۔۴۔ اور ۵ کی نسبت سے لمبی ہوں) تو ان سے ایک زاویہ قائمہ والا مثلث بن سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ بات مصر کے لوگوں کے علاوہ مشرقی ممالک کے باشندوں کو بھی معلوم تھی لیکن یہاں صرف اس امر پر زور دینا ہے کہ دوسرے ممالک کی بہ نسبت مصر میں لوگ علم ہندسہ کے بہت ماہر تھے۔ وہ نہ صرف مثلثوں سے واقف تھے بلکہ مربع اور ۵۔۶۔۷۔ اضلاع والی شکلوں سے بھی بخوبی علم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک دائرہ کے خط کو چھ برابر حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس کو پانچ برابر حصّوں میں بھی بانٹ سکتے تھے، یہی نہیں بلکہ سات حِصّوں میں بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بہت مشکل تھا لیکن زمانۂ قدیم میں مصری ان سب باتوں سے واقف تھے، اہرام اس کا ثبوت ہیں کہ جو مسائل آج بھی مشکل اور اہم تصور کئے جاتے ہیں اُن پر مصریوں کا ریاضی حاوی تھا۔

اِس سلسلہ میں ایک بات یاد رکھنا ضروری ہے، علم ریاضی کے مسائل دو طریقوں سے حل ہوسکتے ہیں۔ ایک عملی طریقہ سے یا صرف نظری طریقہ یعنی کتابی معلومات کے ذریعہ سے۔ مصر کے باشندے عملی طریقہ سے ریاضی

کی گتھیاں سُلجھانے میں ماہر تھے۔ کاغذ اور پنسل کے ذریعہ سے ریاضی کو فروغ دینے کا سہرا یونانی حکما کے سر ہے۔ اُنھوں نے اپنی جدّت اور ذہن کی رسائی سے ریاضی کو چار چاند لگا دیئے۔

یونان سے اکثر سوداگر تجارت کی غرض سے مصر آیا کرتے تھے، آج کل کے سوداگروں کی طرح سے وہ صرف تجارت ہی نہ کرتے تھے بلکہ علم کے شیدا بھی ہوتے تھے، اور ہر ممکن طریقے سے علم حاصل کرنے میں لگے رہتے تھے۔ چنانچہ اُس زمانہ میں جبکہ مصر میں علم ریاضی نے کافی ترقی کر لی تھی اور مصر والوں نے عملی طور پر ریاضی کی فتوحات دنیا کے سامنے پیش کر دی تھیں تو اہالیانِ یونان کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں، اور اُنھوں نے کوشش کی کہ وہ علم ریاضی کی خوبیاں معلوم کریں اور اُس کی اندرونی کیفیات سے آگاہ ہوں، انھیں کی کوششوں اور بے پایاں شوق کی بدولت یونان علم ریاضی کا گھوارہ بن گیا تھا۔

اُن سوداگروں میں جو یونان سے مصر میں تجارت کرنے آیا کرتے تھے، ملیٹس شہر کا ایک امیر سوداگر تھیلیس (Thales) بھی تھا جو ۶۴۰ سے ۵۵۰ ق۔م تک زندہ رہا۔ تجارت کے سلسلہ میں اُس کو بہت سے مُلکوں میں جانا پڑتا تھا۔ آدمی ذہین اور علم کا شایق تھا، دوران سفر میں جو کچھ بھی وہ دیکھتا تھا اُس سے اپنی معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کرتا تھا۔ وہ اس قدر عقلمند تھا کہ یونان کے اکثر لوگ اُس کا شمار اپنے ملک کے سات مشہور حکما میں سے کرتے ہیں اس کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں جن سے اس کی ذہانت و فہم و فراست کا پتہ چلتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ نمک سے لدے ہوئے کچھ خچر اپنے ساتھ لئے جا رہا تھا۔ راہ میں دریا پار کرنے کا اتفاق ہوا تو ایک خچر کا پیر پھسل گیا اور وہ پانی میں گر پڑا، جب وہ کھڑا ہوا تو بہت سا نمک پانی میں گھُل چکا تھا اور اُس کا بوجھ کم ہو چکا تھا جب تھیلیس دوسری ندی پر پہونچا تو وہ خچر دانستہ پانی میں گر پڑا، تیسری مرتبہ اُس نے پھر یہی حرکت کی تھیلیس بہت پریشان ہوا لیکن اُس نے خچر کو سزا دینے کی ترکیب فوراً سوچ لی، اُس پر اُس نے روئی لاد دی خچر جب پانی میں گرا تو روئی میں پانی بھر گیا اور اُس کو اپنے کئے کی سزا مل گئی۔

تھیلیس کو تجارت میں کافی دستگاہ حاصل تھی۔ وہ تجارت کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھا۔ ایک مرتبہ اُس کو احساس ہوا کہ آئندہ سال زیتون اچھا پیدا نہ ہوگا، چنانچہ اُس نے سبز زیتون کی پیداوار اپنے قبضہ میں کر لی اور اگلے سال کافی منافع حاصل کیا۔

ایک بڑا تاجر اور رئیس آدمی ہونے کے باوجود تھیلیس کو علم ریاضی اور علم فلسفہ کا بہت شوق تھا۔ دورانِ سفر میں اُس نے اپنی معلومات میں کافی اضافہ کیا۔ خصوصاً مصر کے پجاریوں سے اُس نے علم ریاضی میں بہت کچھ سیکھا۔ وہ بہت بڑا ریاضی داں ہی نہ تھا بہت بڑا نجومی بھی تھا۔ اُس نے ۵۰۰ ق۔م میں

سورج گہن کی صحیح تاریخ و وقت بتادیا تھا۔اس واقعہ کے بعد وہ علم نجوم کا ماہر مانا جانے لگا تھا۔مشہور ہے کہ ایک مرتبہ وہ آسمان پر تارے دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ ایک کھائی میں گر پڑا۔ اُس وقت اُس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی، کہنے لگی "تو آسمان کی کیا خبر لاسکتا ہے کہ وہاں کیا ہورہا ہے جب تجھے یہی دکھائی نہیں دیتا کہ تیرے پاؤں کے پاس کیا ہے۔"

اِن باتوں کو اتنا عرصہ گذر گیا اور اس عرصہ میں علم ریاضی نے اس قدر ترقی کرلی ہے کہ جب ہم اِن مسائل کے متعلق سوچتے ہیں جو زمانۂ سلف کے حکمار کے غور و فکر کے مرہون منت ہیں تو ہم کو کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوتی، اور نہ ہم کو حیرت و استعجاب ہوتا ہے۔ ہم اِن مشکلات کا اندازہ نہیں کرسکتے جو اس زمانے کے اصحاب کو علم ریاضی کے چھوٹے چھوٹے سے نکات معلوم کرنے میں پیش آئی ہونگی علم ریاضی کے چھوٹے چھوٹے مسائل مثلاً دائرہ کو قطر دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے، یا یہ کہ مثلث مساوی الساقین کے دو زاویے آپس میں برابر ہوتے ہیں یا یہ کہ نصف دائرہ کے اندر مثلث کا ایک زاویہ ہمیشہ ایک زاویہ قائمہ کے برابر ہوتا ہے یا یہ کہ ایک سے مثلثوں میں اگر دو زاویے آپس میں برابر ہوں تو ان زاویوں کو بنانے والے خطوط میں بھی ایک نسبت ہوگی۔ یہ سب باتیں اور اسی قسم کی صدہا اور باتیں تھیلیس نے معلوم کی تھیں۔ ہر چند یہ سب معلومات کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں لیکن ان سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ قدیم کے یونانی حکمار نے مصر والوں کی عملی معلومات سے علم ریاضی کے اہم مسائل مرتب کئے اور ان پر اس علم کی عمارت کی بنیادیں قائم کیں، ایسی بنیادیں جن پر آئندہ چلکر ایک مضبوط اور غیرفانی عمارت قائم ہوگئی۔

تھیلیس کو یونانی فلسفہ، نجوم اور ریاضی کا باوا آدم مانا جاتا ہے، اس کو علم ریاضی ہی میں کمال حاصل نہ تھا بلکہ وہ حکمت اور نجوم میں بھی کامل دستگاہ رکھتا تھا۔ اس نے علم نجوم کو ایک مستقل علم کی صورت بخشی اور اس کے علاوہ یونانیوں کے دماغ کو معمولی دماغوں سے بہتر بنادیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ پرانے خیالات کو دماغوں سے نکال دینا بہت مشکل امر ہے اور اسی وجہ سے تھیلیس کا کارنامہ معمولی کارنامہ نہیں سمجھا جاتا۔ اس کا مقولہ تھا کہ انسان کو واقعات پر غور نہ کرنا چاہیئے بلکہ واقعات کی وجوہ پر، یعنی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ معمولی باتوں پر غور کرنا اور اُن کے وجوہ کے اسباب کو معلوم کرنا انسان کی زندگی کا مقصد ہونا چاہیئے اس سے تھیلیس کے فلسفے پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ہم کو یہ نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ تھیلیس نے عملی باتوں کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کی، جہاں وہ ایک بڑا فلسفی اور ریاضی داں تھا وہاں اُس نے عملی طور پر اس قسم کی باتیں بھی معلوم کرنے کی ترکیبیں دنیا کے سامنے پیش کیں کہ سال میں کتنے دن ہوتے ہیں یا یہ کہ فاصلے پر کے کسی جہاز کی دوری کیسے معلوم کرسکتے ہیں۔

تھیلس کا عقیدہ تھا کہ دنیا میں سب چیزیں پانی ہیں، یعنی یہ کہ دنیا میں کوئی بات مشکل نہیں ہے۔ اس کے نظریہ کی صداقت کا ثبوت ہم کو اس امر سے ملتا ہے کہ اُس کے نزدیک کوئی بات مشکل نہ تھی، وہ کوئی بات دیکھتا تھا تو اُس پر غور کرتا، جو سوالات اُس کے دل میں پیدا ہوتے اُن کے تسلی بخش جوابات کی جستجو میں رہتا اور پھر ان جوابات کو معلوم کر کے وہ ان قوانین کو دریافت کرتا جن پر وہ واقعہ مبنی ہوتا۔ اس طرح جب کسی واقعہ کو صورت پذیر ہوتا دیکھتا تو اسکے اصولوں کو معلوم کرکے دنیا کے سامنے پیش کر دیتا۔

تھیلس نے سب کچھ مصر کے پجاریوں سے سیکھا تھا اور ہمیشہ اُن کے گُن گاتا رہا۔ جب بہت بوڑھا ہوگیا تو اُس نے اپنے شاگرد رشید فیثا غورس کو نصیحت کی کہ مصر جا کر ان پجاریوں سے ضرور ملے۔ فیثا غورس نے اپنے اُستاد کی نصیحت پر عمل کیا اور مصر کی سیاحت کے دوران میں وہاں کے پجاریوں سے ملاقات کر کے اُن سے علم ریاضی میں مزید معلومات حاصل کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے اُستاد تھیلس سے بھی زیادہ مشہور ہوا اور علم ریاضی کا استاد مانا جانے لگا۔ فیثا غورس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ساموس کا باشندہ تھا، اُس کا زمانۂ حیات ۵۸۰ ق۔م سے ۴۹۵ ق۔م تک مانا جاتا ہے۔ اُس نے جنوبی اٹلی کے مشہور شہر کروتونا میں بود و باش اختیار کر کے فلسفہ اور علم ریاضی پر لکچر دینا شروع کر دیئے تھے۔ اُس کے لکچر میں ہر قسم کے لوگ شریک ہوتے تھے اور ہر چند اُس زمانے کا قانون عورتوں کو عام مجلسوں میں شریک ہونے سے منع کرتا تھا، اس کے لکچروں میں اُس کے ایک میزبان کی نوعمر اور حسین لڑکی تھینو بھی شریک ہوتی تھی۔ اس لڑکی سے فیثا غورس نے آخر میں شادی کر لی تھی، کہا جاتا ہے تھینو نے اپنے شوہر کی سوانح عمری بھی لکھی تھی لیکن افسوس وہ معدوم ہو گئی۔

فیثا غورس کے شاگرد تعداد میں بڑھتے گئے، ان لوگوں نے ایک مجلس قائم کی، اس مجلس میں وہ لوگ علم ریاضی کی گتھیاں سلجھاتے تھے، فلسفہ کے اہم مسائل پر گفتگو کرتے تھے اور نئی نئی باتیں دریافت کرنے میں لگے رہتے تھے۔ ان لوگوں نے آپس میں عہد و پیمان کر لیا تھا کہ وہ اپنے عقائد کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ان کی برادری کے ایک فرد ہپیاسس نامی نے جب اپنا عہد توڑا اور گولے کے متعلق کچھ راز دنیا پر منکشف کر دیئے تو فوراً ہی اس کو اس کی سزا مل گئی، یعنی وہ سمندر کے اندر ڈوب کر مر گیا۔

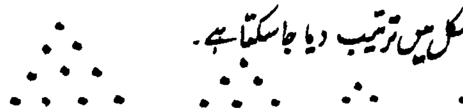
فیثا غورس کے شاگردوں کی برادری کا نشان ایک پچکونیا ستارہ (✯) تھا۔ یہ لوگ حکمت میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے بھی ان کی برادری کا نشان جو تندرستی کا نشان مانا جاتا ہے، درست نشان تھا۔ ان لوگوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھی تھیں ان میں سے اکثر کتابیں افلاطون کے ہاتھ لگی تھیں اور ان سے دنیا کو علم ریاضی و فلسفہ وغیرہ وغیرہ کے متعلق بیش قیمت معلومات حاصل ہوئیں۔

فیثاغورس کی برادری نے علم ریاضی میں بہت ترقی کی خاصکر جبر و مقابلہ اور علم حساب میں۔ فیثاغورس کے شاگردوں کا دستور تھا کہ جب کوئی نئی بات معلوم کرتے تھے تو اس کو اپنے اُستاد کے نام سے موسوم کر دیتے تھے۔ اسی وجہ سے یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ جو باتیں فیثاغورس کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں وہ دراصل اسی حکیم کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہیں یا اُس کے کسی شاگرد کی۔ بہرحال یہ ضرور ہے کہ فیثاغورس کی شخصیت ہر موقعہ پر کام کرتی تھی اور ہر عالمانہ جستجو میں اس عظیم الشان شخصیت کا اثر کام کرتا تھا۔

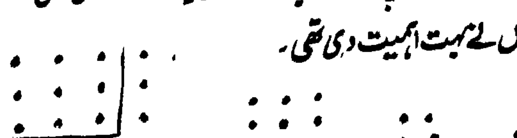
فیثاغورس اور اُس کے شاگردوں نے علم ریاضی میں وہ سب باتیں دریافت کیں جو آج کل کالج میں داخل ہونے سے پہلے ایک طالب علم پڑھ لیتا ہے۔ علم الحساب اور جبر و مقابلہ میں بھی اُنھوں نے بہت ترقی کی نہ صرف یہ بلکہ ان لوگوں نے علم نجوم میں بھی کافی معلومات حاصل کیں۔ یہ سب باتیں بہت آسان اور معمولی سہی لیکن قابل غور یہ ہے کہ ان کو آج سے ہزاروں برس پہلے دریافت کیا گیا تھا جبکہ علم ریاضی کی شروعات ہی تھی۔ ہم لوگوں نے ہزارہا برس بعد اب علم ریاضی کا معیار اس قدر بلند کر دیا ہے تو کون سی حیرت کی بات ہے؟

مضمون ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور قابل ذکر ہے۔ اس زمانے میں درس و تدریس کا مشغلہ آج کل کی طرح بند کمروں میں نہیں ہوتا تھا بلکہ کھلے مقامات میں، درختوں کے سایہ تلے یا موسم سرما کی دھوپ میں استاد اپنے شاگردوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ اس طرح سے فیثاغورس کے مدرسے کے طلبا اپنا درس حاصل کیا کرتے تھے۔ درختوں یا مکانوں وغیرہ کے سایے جب زمین پر پڑتے تھے تو ان سے وہ لوگ عجیب و غریب نتائج اخذ کرتے تھے۔ ایسے نتائج جو معمولی دماغوں کی پہونچ سے باہر ہوتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ فیثاغورس کا مشہور مسئلہ، جو زاویہ قائمہ والے مثلث کی نسبت ہے کہ زاویہ قائمہ کے سامنے والے ضلع پر کا مربع باقی دونوں اضلاع کے مربعوں کے مجموعہ کے برابر ہوتا ہے، اسی طرح معلوم کیا گیا تھا۔

کہتے ہیں کہ فیثاغورس نے معمولی معمولی باتوں سے متاثر ہو کر ایسے اعداد معلوم کئے جن کو ایک خاص طریقہ سے ترتیب دیا جا سکتا ہے، مثلاً ۱۔۳۔۶۔۱۰۔ وغیرہ اعداد کو تکونے اعداد کہا گیا کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک مثلث کی شکل میں ترتیب دیا جا سکتا ہے۔



ان اعداد کے علاوہ "مربع اعداد" بھی دریافت کئے گئے۔ ان میں یہ خوبی تھی کہ اگر کوئی اس قسم کا عدد معلوم کرنا ہے تو اس سے پہلے کے "مربع عدد" میں ایک " ـــا " کی شکل کا کنارہ لگا دیا جائے۔ اس بات کو ان لوگوں نے بہت اہمیت دی تھی۔



کی شکل کے کنارہ کو وہ لوگ "نومن" (Gnomon) کہتے تھے جس کے معنی ہیں بڑھئی کا پیمانہ۔ ان لوگوں نے یہ بھی معلوم کیا کہ ہر ایک طاق عدد (۳۔۵۔۷۔ وغیرہ) کسی نہ کسی مربع عدد کا "نومن" ہے۔ مثال کے طور پر ۷ کا ہندسہ ۳ کے مربع کا "نومن" ہے کہ اس کی مدد سے ۴ کا مربع بن جاتا ہے۔

فیثاغورس نے علم موسیقی میں بھی بہت سی باتیں دریافت کی تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس نے موسیقی کے سر دریافت کئے تھے۔ اس نے یہ معلوم کیا تھا کہ ایک مرتعش تار کی لمبائی اور اس سے پیدا ہونے والی آواز کی بلندی میں کیا نسبت ہے۔ اپنی اس تفتیش سے وہ اس قدر محظوظ ہوئے کہ اس کو کل کائنات کا وجود صرف اعداد کی بدولت نظر آنے لگا۔ اُس کے اُستاد طالیس کو دنیا کی تمام چیزیں پانی نظر آتی تھیں مگر وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے نزدیک ۳ کے ہندسے کی حقیقت یہ نہ تھی جو تین بلیوں یا تین کتابوں یا تین اور چیزوں کے ساتھ وابستہ ہے، نہیں بلکہ وہ کہتا تھا کہ صرف اعداد کی بدولت ہی دنیا قائم ہے۔ علم ہندسہ میں اس نے ایک کے عدد کو نقطہ سے تشبیہ دی دو کو خط سے، تین کو سطح سے اور چار کو ٹھوس سے۔ ہرچند آج کل کے نقطۂ نظر سے اس کا یہ نظریہ قابل اقتدا نہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑی حد تک ایسا کرنے میں حق بجانب تھا۔

فیثاغورس نے سات کے ہندسے کو بہت اہمیت دی تھی۔ وہ اس کو اپنی دیوی ایتھین مانتا تھا۔ اسکا قول تھا کہ سات کے نہ تو ٹکڑے کئے جاسکتے ہیں اور نہ وہ ٹکڑوں سے بنتا ہے۔ پانچ کے ہندسے کو وہ شادی کا نشان سمجھتا تھا۔ کیونکہ جب پہلا جفت نمبر پہلے طاق نمبر سے ملتا ہے تو پانچ کا ہندسہ بنتا ہے۔ ایک کے ہندسہ کو وہ وجہ سے تشبیہ دیتا تھا اور دو کو رائے سے۔ مثلاً وہ کہا کرتا تھا کہ فلاں غیر مستقل مزاج شخص دو ہے۔ یعنی اس کو خود اپنی رائے کا پتہ نہیں ہے۔ اسی طرح سے وہ چار کو انصاف سے موسوم کرتا تھا کہ وہ مربع ہے اور ایک سا۔ یہ سب باتیں عجیب معلوم ہوتی ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ خود ہمارے زمانے کے سب سے بڑے ہندوستانی ریاضی داں راما نجن نے اعداد کو بہت اہمیت دی تھی۔ وہ ہمیشہ ثباتی اعداد کو اپنا دوست کہا کرتا تھا۔ یہ سب باتیں فلسفہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ فلسفی کا تخیل جب پرواز کرتا ہے تو ایسی ایسی باتیں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے کہ ان کو سُن کر نہ صرف حیرت ہوتی ہے بلکہ بے اختیار دانتوں میں انگلی دبا لینی پڑتی ہے۔

جذبات بسمل

خدا گواہ کہ پھر لطف زندگی ہی نہیں
خودی جو ہے تو حقیقت میں بیخودی ہی نہیں

زمانہ دوست مرا، دوست میں زمانے کا
جہانِ عشق و محبت میں دشمنی ہی نہیں

مرے خیال میں ہے نام بندگی کا فقط
جو بندگی ہو غرض کی وہ بندگی ہی نہیں

بسمل الہ آبادی

اے بانسری والے!

(از جناب سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔ اے، ایل ایل بی)

اے جگ سے انوکھے مرے، اے جگ سے نرالے
بنسی میں ذرا پریم کا رس اور ملا لے
اے بانسری والے

ہم جیتے تھے اُمید پہ، تھے آس کے پالے
کیوں دُور ہوئے ہم سے اُمیدوں کے اُجالے
اَے بانسری والے

کیوں منڈھ دیے مایوسیوں نے خوف کے جالے
کیوں بھر دیے خود غرضیوں نے خون کے تھالے
اے بانسری والے

تو چاہے تو سنسار کے دُکھ درد کو ٹالے
ہو جائیں گھرانے تری اُلفت کے شوالے
اے بانسری والے

ہو ساتھ مدد تیری تو ہٹ جائیں ہمالے
پھندے جو بنے تھے وہ نہیں پھول کے مالے
اے بانسری والے

یہ دیس تری یاد سے لیتا ہے سنبھالے
اِس دیس کو مایوسیوں کے دُکھ سے بچا لے
اے بانسری والے!

جے پور میں اُردو کا تدریجی ارتقا

(از محمد عبد المغنی ایم۔اے، منشی فاضل، صدر شعبۂ اُردو و فارسی، مہا راجہ کالج جے پور)

نوعیتِ مضمون کا تقاضا ہے کہ دائرۂ تحقیقات کو صرف انہیں اسباب تک محدود نہ رکھا جائے جن کا اہل قلم وعلم سے واسطہ ہے بلکہ اُس میں اِن تمام باتوں کو بھی داخل کرلیا جائے جو باوجودیکہ اس تحریک میں شریک غالب تھیں مگر فضاؤں میں گونج کر اور دلوں پر اثر ڈال کر کے اپنی ہستی حوالۂ فنا کر چکیں اور اب ان کے اثرات ہی ان کے وجود کی شہادت دے سکتے ہیں۔ دراصل اگر مورخ ان مبادیاتِ معدوم سے اعراض کر کے کسی بعد کی منزل سے بحث شروع کرے گا تو اس کی تصنیف وصفِ تکمیل سے عاری ہوگی۔ اس مضمون کی نسبت جامعیت کا دعویٰ نہیں کیا جاتا، یہ صرف ایک خاکہ ہے جو بعد میں آنے والوں کے لئے سنگِ راہ نما کا کام دیگا، اور اسی خیال سے حتی الوسع تمام ممکن ماخذ یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

۱۔ صوفیائے کبار اور اُن کا اثر:۔ تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب وتمدن اور ثقافت کا رواج عام طور پر بے نفس مخلص اور ایثار پسند مبلغوں عالموں اور صوفیوں کے فیوض کا منت کش ہے۔ اِن مقدس ہستیوں نے اپنے اعلیٰ کردار اور عمدہ اخلاق سے عوام کو متاثر کر کے دلوں میں گھر کرلیا اور تالیفِ قلوب جس سے سیف وسنان عاجز ہیں ان کے ارشادات کا کرشمہ تھی۔ دہلی میں غلام خاندان کا سنگِ بنیاد اسلامی تہذیب اور ثقافت کے علمبردار حضور خواجہ غریب نواز معین الدین حسن سنجری چشتی کی اجمیر تشریف آوری کے بعد رکھا گیا اور اجمیر سے آپ کے مرید ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ اس طرح ریگ زار راجپوتانہ کو آپ کی مہر فیض نے منور کیا۔ آپ کی آمد کے بعد خود سلطان علاء الدین خلجی قلعہ رنتھمبور کے فتح کرنے کے سلسلے میں عرصہ تک راجپوتانہ میں مقیم رہا مگر اس کے اثرات کی وسعت کا دامن تنگ تھا، صرف چند قندھاری پٹھان ایک قصبہ کھنڈر آباد کر کے راجپوتانہ میں رہ پڑے یا خلجی پور کے نام سے ایک موضع آباد ہوگیا۔ اور بس۔

۲۔ شیخاوت خاندان اور اُس کی روایات:۔ امیر تیمور کے حملے سے کچھ پہلے جبکہ دہلی کے تخت پر تغلق خاندان حکمراں تھا تاریخ راجپوتانہ دو اہم واقعات پر روشنی ڈالتی ہے جن سے ریاست جے پور میں اسلامی تہذیب اور ثقافت کے رائج ہونے کی ابتدا کا پتہ چلتا ہے۔ کرنل ٹاڈ اپنی تصنیف تاریخ راجستان میں لکھتے ہیں۔ شیخاوت سرداروں کا سلسلۂ نسب راجہ اودے کرن آمیری کے تیسرے لڑکے بالوجی تک پہنچتا ہے۔ راجہ اودے کرن آمیر کی گدی پر

سنہ ۱۳۰۱ء میں بیٹھے موکل جی، پسر تاجی کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ ان ایام میں شیخ برہان الدین عرف بابا برہان رح (آپ کا مزار اجرول سے چھ میل کے فاصلہ پر موضع تالہ میں ہے) اُس علاقہ میں جواب شیخاواٹی کہلاتا ہے دورہ فرما رہے تھے۔ شیخ برہان نے موکل جی سے کچھ دودھ مانگا، اتفاق سے اُسکی بھینس کے تھنوں میں دودھ بالکل نہ تھا، شیخ کی کرامت سے اس بھینس کے خشک مرجھائے ہوئے تھنوں سے دودھ کی دھاریں جاری ہوگئیں۔ یہ دیکھکر موکل جی شیخ کا نہایت مخلص معتقد بن گیا، اور اُن سے درخواست کی کہ اُسکے لئے خدا سے اولاد کی دعا فرمائیں بابا برہان کی دعا سے اُس کے کئی لڑکے ہوئے، سب سے بڑے لڑکے کا نام شیخ جی رکھا گیا، اس کی اولاد شیخاوت کہلائی اور یہ خطہ شیخاواٹی کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اس واقعے کو تقریباً پانسو سال ہوگئے مگر آج بھی شیخاوت خاندان کے غیر مسلم افراد اس کی یادگار کو اس طرح زندہ رکھے ہوئے ہیں کہ سور کو حرام خیال کرتے ہیں اور اُس کا شکار نہیں کرتے اور جب تک کسی جانور میں سے خون نہیں نکل جاتا اُسے نہیں کھاتے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُسکو بدھی پہنائی جاتی ہے اور اکثر وہ شیخ ہی کے مزار پر اُتاری جاتی ہے، شیخ کی ہدایت کے مطابق نیلا کرتا اور ٹوپی پہناتے ہیں، اور کلمہ پڑھکر بکرا ذبح کرتے اور اس کا خون اُس پر چھڑکتے ہیں۔ شیخاواٹی کے دس ہزار مربع میل کے وسیع رقبے میں اس نسل کے افراد اس رسم کو پوری پابندی کے ساتھ ادا کرتے اور فروگذاشت کو سخت منحوس تصور کرتے ہیں۔ شیخاوتوں کے قومی جھنڈے پر بھی نیلا رنگ شیخ ہی کی یادگار ہے، یہ لوگ شراب سے بھی پرہیز کرتے ہیں جس کا ذکر ٹاڈ سے رہ گیا ہے۔

۳۔ قائم خانی خاندان اور اسلامی نوابیاں :۔ دوسرا واقعہ مولوی عطا محمد خاں قائم خانی اپنی تصنیف "واقعات قوم قائم خانی" میں لکھتے ہیں، کہ موٹا رائے چوہان حاکم ددریرہ یا ددریوا کے تین بڑے بیٹے جے چند جے سنگھ اور کرم سنگھ جب جوان ہوئے تو برضا و رغبت مسلمان ہوگئے اور ان کے اسلامی نام بالترتیب زین الدین خان، جبر الدین خاں اور قائم خاں ہوئے، یہ فیروز شاہ تغلق کا زمانہ تھا کرم سنگھ نے ۱۳۸۹ء میں اسلام قبول کیا اور اُسکا اسلامی نام قائم خاں رکھا گیا، یہ سید ناصر وزیر اعظم کے زیر تربیت رہا اور حضرت قطب الاقطاب شیخ نور الدین خلیفہ اعظم حضرت گنجشکر نے اس کو صاحب منصب اور مالک حصار ہونے کی دعا دی۔ سید ناصر کی وفات کے بعد یہ وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہوا۔ اس قائم خاں کا ذکر تاریخ فرشتہ میں بھی ہے۔ قائم خاں کے پوتے نواب فتح خاں ابن تاج خاں نے ۱۴۰۰ء میں شہر فتحپور کی، جو سیکر میں آجکل ایک موضع ہے بنیاد رکھی۔ یہ ریاست فتحپور براہ راست مغلیہ سلطنت سے تعلق رکھتی تھی اس کے علاوہ مسلمان نوابوں کی اور ریاستیں قائم ہوئیں جن کی راجدھانیاں جھنجھنوں، نرڑ بڑ، بڑواسی، جھاڑوپٹی اور کیڑ تھیں۔ آئین اکبری جلد دوم میں لکھا ہے "خدیو عالم در چہل کروہے دسی کروہے دار الخلافہ آگرہ عشرت شکار فرمودے خاصہ بازی سیاوی و آلا پید

و حصار و سنام و بھٹنڈہ و بھٹیر و پٹن و پنجاب و فتحپور و جھنجھنوں و ناگور و میرٹھ و جودھپور و آمیر و سرنابن و دیگر جاہائے دور دست ایں صیدگاہ اساس یافتہ بود۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فتحپور اور جھنجھنوں جودھپور اور آمیر کے ہم پلہ تھیں، فتحپور کا قلعہ آج بھی موجود ہے اور اس کے کچھ محلات بھی باقی ہیں، زنانہ محلات کے صدر دروازہ کے مشرقی کونہ میں یہ کتبہ کندہ ہے:۔

عجب عمارتے بارونقے و لمعانی ‌‌ بنائے محکم بادوشاد ماں بانی
بحکم دولت خاں شیر بن الف خانی ‌ شدست ظاہر تاریخ "جنت ثانی"

(الدولکانی)

فتح خاں کے بیٹے جلال خاں نے جلال سرآباد کیا اور چوبیس (۲۴) میل کے گرداگرد رفاہ عام کی نیت سے ایک بیڑ چھوڑ دیا جو اب تک وقف چلا آتا ہے اور اس زمانہ سے اس علاقہ کی تمام رعایا اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ شہر جے پور اور ریاست کے علاقہ میں مقبروں، باؤلیوں، مسجدوں حتیٰ کہ ہندو عمارتوں میں بھی فارسی کتبے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

۴۔ **جے پور کا فارسی دفتر:۔** جے پور کا سلطنت مغلیہ کے ساتھ جو خلوص اور وفاداری کا تعلق رہا ہے اُس پر عام کتب تواریخ شاہد ہیں اس وجہ سے اُس کا ذکر تحصیل حاصل ہوگا۔ البتہ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہاں کے قدیم دفتر میں تمام شاہی ریکارڈ فارسی میں ہے۔ مہاراجہ مان سنگھ کے وقت تک کا ریکارڈ تو امتداد زمانہ کی چیرہ دستی سے نذر فنا ہوگیا، مگر بعد کے کاغذات سب محفوظ ہیں۔ مرکزی حکومت سے ذریعہ مراسلت فارسی تھی، ریاست کی طرف سے دربار شاہی میں خبر نویس اور وقائع نویس رہا کرتے تھے جو دربار شاہی کی خبریں "اخبار معلیٰ" کے نام سے پرچوں میں لکھکر بھیجتے تھے اور اس طرح دربار شاہی کی روزانہ خبریں مرتب کی جاتی تھیں۔ یہ پرچے غیر مرتب طور پر سرکاری "پوتھی خانہ" میں موجود تھے، حال ہی میں ان کو تاریخوار مرتب کیا گیا ہے اور عالمگیر کے عہد کے پرچوں سے سرجادو ناتھ سرکار نے ایک حد تک استفادہ کیا ہے۔ ۱۹۲۲ء تک جے پور ہر حیثیت سے آئین اکبری میں لکھے ہوئے طرز حکومت کا نہایت مکمل نمونہ پیش کرتا تھا۔ اس ریاست کا قدیم ریکارڈ ہندوستان کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کے لئے ایک بے مثل ذخیرہ رکھتا ہے۔

۵۔ **ہندوؤں کے کارنامے:۔** مرکزی حکومت سے خصوصی تعلق کی وجہ سے تہذیب تمدن اور علم میں یہ ریاست ہمیشہ اپنے زمانہ میں ممتاز رہی ہے یہاں کے مہاراجہ نہایت روشن خیال تعلیم یافتہ اور مردم شناس تھے اور اکثر ہندو خاندان اکتساب علم فارسی کے لئے ممیز و ممتاز تھے۔ عہدۂ میر منشی زیادہ تر کایستھوں کی ملک رہا کچھ عرصہ قبل تک کایستھ خاندانوں میں نجی خط و کتابت فارسی میں ہوا کرتی تھی اور شادی بیاہ کے رقعے تو اب بھی کہیں کہیں فارسی میں لکھے جاتے ہیں۔ جے پور میں فارسی اور اردو زبانوں کی خدمت میں کایستھوں اور دیگر ہندو اصحاب

کی مساعی کا کافی حصہ ہے۔ منوہر سنگھ بانی قصبہ منوہرپور فارسی زبان کا اچھا شاعر تھا۔ سلطنت مغلیہ کے عمال میں سے اکثر کایستھ جے پور آ گئے۔ منشی تلسی رام نے دیوان حافظ کا ترجمہ بھاشا میں کیا جو اب بھی ان کے خاندان میں قلمی کتاب کی صورت میں موجود ہے۔ منشی کنول نین اتھر محافظ دفتر نیمصاحبت جے پور نے ماہاین مہابھارت اور سینھر جی کی کتھا کا لفظی ترجمہ اُردو نظم میں کیا ہے۔ جو اُن کے خاندان میں منشی موہن لال ہیڈ ماسٹر کے پاس محفوظ ہے۔ منشی رام جی داس مشہور میر منشی فارسی کی اچھی خاصی قابلیت رکھتے تھے اور اُن کی اولاد میں منشی چاند بہاری لال صبا اب بھی میرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی کے جانشین ہیں، اور ان کی ودیعت شاعرانہ ادب اُردو کی خدمت میں مصروف ہے۔ منشی رام جی داس مذکور اور راول بیری سال کو میرزا غالب سے سلسلہ خط و کتابت کا فخر حاصل تھا۔ منشی ہردیو پرشاد سریواستو سابق سب جج نے ایک مثنوی فارسی زبان میں علم تصوف پر لکھی ہے۔ منشی رنگی لال سپرنٹنڈنٹ مردم شماری نے کریما کا ترجمہ ہندی نظم میں کیا ہے، منشی رام جیون بھارگو نے نادر الحساب اُردو زبان میں تالیف کی ہے۔

۶۔ فارسی اُردو اور مقامی بولیوں کا میل جول: جے پور کی خاص خاص بولیوں میں برج بھاشا مارواڑی، جھاڑ شاہی یا ڈھنڈاری شامل ہیں، ان تینوں بولیوں میں فارسی کے الفاظ کثرت سے داخل ہو گئے ہیں، حال تااِیں " ابھی تک" کے معنوں میں اُردو تو رائج نہیں مگر ان بولیوں میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔ مارواڑی بولی جنسی جذبات کے اظہار میں خاص قدرت رکھتی ہے اگرچہ شاعری کی اور خوبیاں اسمیں کم ہیں تاہم حسن مارواڑ اس بولی کی اس خصوصیت پر سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے اور مقامی خوش گلوئی کیف و سرور کے لئے شراب سہ آتشہ سے بھی زیادہ بیخودی پیدا کر دیتی ہے۔ غالباً اسی کیفیت سے متاثر ہو کر منشی امیرالدین خاں شوخ سکریٹری اسلامی پنچایت فرماتے ہیں۔ شعر

رنگینیوں میں ڈوبی جاتی ہو دیکھنا تو حسن مارواڑ کو جے پور آ کے دیکھ

جے پور کی مخصوص بولی جھاڑ شاہی کے الفاظ اور فارسی ملا کر اکثر شاعری کی گئی ہے، مثلاً

ہندو زن زرگر چہ عجب روپ دھرے چھے بر وقت سخن گفتن او پھول جھرے چھے
گفتیم کہ یک بوسہ لب لعل تو گیریم گفتا کہ ارے رام ترک کائیں کرے چھے

منشی متھرا پرشاد سابق سردار اپیل اور منشی شیو نراین سابق سب جج نے اُردو اور دیسی بولیوں کی مخلوط نظمیں کثرت سے لکھی ہیں۔

۷۔ جے پور کے اہل قلم کی تحریری خدمات: اہل تصنیف علما اور شعرا کی جنھوں نے جے پور میں اُردو اور فارسی کی خدمت کی ہے اتنی کثیر تعداد ہے کہ ان کو پوری طرح اہل ذوق سے روشناس کرانے کے لئے

ایک ضخیم کتاب کئی جلدوں میں لکھی جا سکتی ہے۔ ایک مختصر سے مضمون میں بجز چند نام گنا دینے کے اور کیا ہو سکتا ہے سینکڑوں فارسی اور اُردو کی قلمی تصنیفات اور دواوین مصنفوں کے دستوں اور ورثا کے پاس موجود ہیں جن کی زیارت سے علمی دنیا محروم ہے اور موجودہ بے توجہی سے ان کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے اس کثیر ذخیرہ میں سے چند ناموں کا ذکر "گلے از گلزارے" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اس لئے صرف ایک نہایت مختصر سی فہرست اسمایہاں کے اہل قلم کی پیش کی جاتی ہے جس سے ممکن ہے جے پور کی علمی خدمات کا ایک دھندلا سا خاکہ شایقین اُردو کے سامنے آسکے۔

۸۔ مہاراجہ اورنٹیل کالج جے پور:۔ سرکاری دفاتر میں اُردو زبان کی سب سے قدیم تحریر ۱۷۲۵ء کی ہے۔ ۱۸۴۰ء کے بعد سے ریاست کے دفاتر باقاعدہ اُردو میں ہو گئے۔ ۱۸۴۴ء میں ایک سرکاری مدرسہ اُردو فارسی عربی انگریزی کی تعلیم کے لئے قائم ہوا اور اسی مدرسہ نے رفتہ رفتہ موجودہ مہاراجہ کالج کی حیثیت اختیار کر لی، اور اس کالج کے مشرقی شعبہ "اورنٹیل کالج" میں جب سے پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی ۱۹۰۶ء تک برابر عربی اور فارسی میں مولوی فاضل اور منشی فاضل تک کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تمام راجپوتانہ اور وسط ہند کے کل کالجوں میں صرف یہی کالج ایسا ہے جو آج تک ایم۔ اے تک فارسی پڑھاتا ہے۔ علوم مشرقی کی اشاعت میں اس کالج نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ مہاراجہ اورنٹیل کالج کو تو بند ہوئے ایک عرصہ ہو گیا مگر تقریباً بیس سال سے اس کا کام مسلمانوں کا ایک غریب عسیر الحال ادارہ مدرسہ تعلیم الاسلام انجام دے رہا ہے۔ اس کی صدر مدرسی کے فرائض مولانا مفتی محمد قدیر بخش کے سپرد ہیں اور صرف مولانا ہی کی ذات سے جے پور میں دینیات اور عربی زبان کی تعلیم وابستہ ہے اور عجیب لطف یہ ہے کہ منشی محمد ہدایت علی خاں بانی مدرسہ کے استغنا نے ابھی تک ریاست کا ایک حبہ اس کے صرف میں نہ آنے دیا اور اس کو سرکاری اثر سے ہمیشہ آزاد رکھا۔

۹۔ کالج کے اساتذہ اور طلبا کی خدمات:۔ مہاراجہ کالج کے فارغ التحصیل طلبائے جے پور نے ہندوستان کی مشہور درسگاہوں میں درس و تدریس کی خدمتوں میں اپنی طویل عمریں صرف کر دیں، ان کی معرکۃ الآرا تصانیف سے اُردو ادب میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے، مثال کے طور پر ان طلبا میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

شمس العلماء مولانا حاجی عبدالرحمٰن صاحب مصنف مرآۃ الشعر سابق صدر شعبۂ اُردو و عربی و فارسی دہلی یونیورسٹی جن کو گورنمنٹ ہند نے ۱۹۲۸ء کی آل ورلڈ اورنٹیل کانفرنس میں شرکت کے لئے ہندوستان کا نمائندہ بنا کر انگلینڈ بھیجا تھا۔ مولوی محمد بقا صاحب مؤلف کتب درسیہ سابق صدر شعبۂ اُردو و فارسی مہاراجہ کالج۔ مولوی محمد حمید اللہ خاں یوسف زئی مترجم لسان مطالعہ لسان (ترجمۂ وہٹنی) سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج اجمیر مولوی سید مرتضیٰ حسین سابق پروفیسر عربی و فارسی خالصہ کالج امرتسر۔ قاضی مولوی ممتاز حسین سابق پروفیسر

اور نیٹیل کالج و مؤلف کتب درسیہ۔ ڈاکٹر زبید احمد ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی الہ آباد یونیورسٹی۔ مولوی ولی محمد خاں لکچرار اُردو و فارسی سینٹ جونس کالج آگرہ۔ منشی گیندی لال سریال وغیرہ۔ یہاں ایک مبارک چشمک کا لطیفہ بھی لطف سے خالی نہ ہوگا۔ مولوی سید اعجاز حسین اور مولوی سید الطاف حسین ایک مرتبہ ایک دوسرے سے ناراض ہوگئے، مولوی الطاف حسین نے اُن کی ضد پر ایک مقامی ہندو کو عربی پڑھانا شروع کیا اور بہت قلیل عرصے میں ایسا تیار کیا کہ ان کے ہونہار شاگرد منشی گیندی لال سریال نے ۱۹۰۲ء میں مولوی فاضل پاس کر لیا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہ اول دہلی میں ہندو کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے اور بعد میں ملتان چلے گئے اور اپنی تمام عمر عربی اور فارسی کالجوں میں پڑھانے ہی کے لئے وقف کر دی۔ بڑی مبارکباد کے قابل یہ بات ہے کہ مہاراجہ اورنیٹیل کالج کے سب سے پہلے گریجویٹ منشی ظہور محمد وکیل ہائیکورٹ جے پور جنھوں نے ۱۸۹۹ء میں منشی فاضل پاس کیا تھا آج بھی ہم میں موجود ہیں۔ اس وقت بھی کالج میں جو سلطان علمی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ اسی مہاراجہ کالج کے فارغ التحصیل طلباء اور سب جے پور ہی کے ہیں۔

جے پور کالج کے اساتذہ میں مولوی رشید الدین فاروقی فائز و متنظر۔ مولوی سلیم الدین عثمانی تسلیم مولوی کرامت علی فاروقی اعجاز۔ مولوی مبارز الدین۔ مولوی سید اعجاز حسین۔ مولوی سید اکبر حسین مولوی عبدالرحمٰن نارنولی۔ مولوی میر حیدر حسن یکتا زکی۔ مولوی سید الطاف حسین خاص شہرتوں کے مالک ہوئے ہیں۔ مولوی رشید الدین فاروقی فائز و متنظر نے تصنیفات میں دیوان فارسی، دیوان اردو بہار شاداب۔ حاشیہ شرح خفینی اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ مولوی سلیم الدین عثمانی تسلیم نے خواجہ الطاف حسین حالی کے مشہور مسدس "مدوجزر اسلام" کے جواب میں عظمت اسلام ثابت کرنے کے لئے ایک مسدس "حدیقۃ المذہب" نظم فرمایا۔ ان کی تصنیف تشریح القرآن کا قلمی نسخہ بخط مولوی سلطان الدین مبین ہمارے مخطوطات میں محفوظ ہے۔ میر حیدر حسن یکتا زکی خوشنویس فارسی کے اتنے بلند پایہ شاعر تھے کہ ایران کے بادشاہ مظفر الدین شاہ قاچار کی تخت نشینی پر ایک قصیدہ لکھا جس کے اکثر اول مصرعوں سے ناصر الدین کی وفات اور دوسرے مصرعوں سے مظفر الدین کی تخت نشینی کی تاریخیں نکلتی تھیں، ایک شعر یہ ہے:۔

چوں ناصر الدین برحمت حق پیوست
بر تخت عجم مظفر الدین بنشست

ان کے قصیدہ کو مظفر الدین شاہ نے بہت پسند کیا اور ایران طلب کیا تھا، مگر قناعت عناں گیر ہوئی اور بذریعہ رزیڈنٹ جے پور یہ شعر لکھکر ایران بھیجدیا:۔

قرارے کردہ ام من خود نخواہم رفت زیں درگہ سر اینجا سجدہ اینجا بندگی اینجا قرار اینجا

۱۰۔ **مولوی سلیم الدین تسلیم اور اُن کے ہمعصر**:۔ حضرت ضیاء الدینؒ اور مولانا مسکین شاہ، علوم و فنون کی ترقی کے دو مرکز تھے۔ ان کے علاوہ مولوی سلیم الدین عثمانی تسلیم نے علاوہ مدرسہ کے گھر پر بھی درس و تدریس کا فیض جاری کر رکھا تھا، اس زمانہ کے چند مشاہیر جو ادبیات اردو پر اپنا نقش چھوڑ گئے ہیں، اسما یہ ہیں:۔ مولوی جلال الدین رامپوری، جلالی، قاضی فرزند علی، میر حیدر حسن یکتا زکی۔ آغا سنجر طہرانی۔ شیخ نظام بخش عیش۔ شیخ عطا حسین شور میرزا محمد بیگ محوی۔ منشی محمد علی جویا۔ میرزا محمد تقی بیگ مائل۔ خواجہ قمر الدین خاں راقم شاگرد و غیرہ غالب۔ سید ظہیر الدین حسن ظہیر۔ سید امراؤ مرزا انور شاگردانِ استاد ذوق۔ سید احمد مرزا آگاہ تلمیذ مرزا غالب۔ منشی شگفتہ تلمیذ رشک لکھنوی۔ حکیم محمد سلیم خاں خستہ۔ منشی عطاء اللہ خاں عطا۔ منشی چاند خاں عطا۔ منشی کنہیا لال منشی منسا رام ہاتفی۔ منشی شام لال طالب وغیرہ۔ سب سے پہلے جو ادبی انجمن "مسو سائٹی" کے نام سے قائم ہوئی وہ مولوی سلیم الدین تسلیم ہی کی ذوق علمی کی منت کش تھی شعرائے شیریں مقال یہاں آکر اپنی فارسی میں نغمہ سنجیوں کی داد لیا کرتے تھے۔ اس انجمن کے سرگرم کارکن ڈاکٹر عبدالرحیم طبیب خاص مہاراجہ صاحب بہادر کے زیر اہتمام مہاراجہ سری سوائی رام سنگھ جی بہادر نے ایک مشاعرہ اردو ڈیوڑھی محل میں سینچری کے چوک میں منعقد فرمایا۔ شعرا کا استقبال منشی کشن لال چیلہ کے سپرد تھا "قرار ہوا" "خار ہوا" طرح تھی۔ خود مہاراجہ صاحب بہادر بہ نفس نفیس رونق افروزِ مشاعرہ ہوئے اور خود بدولت نے غزل ارشاد فرمائی لیکن اب وہ غزل نہیں ملتی

۱۱۔ **شعرائے مابعد اور عصر جدید**:۔ ظہیر۔ انور۔ راقم وغیرہ کے شاگردوں سے جے پور کے شعرا کا دوسرا دور وجود میں آیا تیسرا دور جدید مغربی رُجحانات کا رہونِ منت ہے، اس دور کی ابتدا مولوی سید سراج الدین کنتوری سے ہوئی۔ یہ ادیبانِ لکھنؤ کے صحبت یافتہ تھے اور مٹیا برج کلکتہ کی آخری علمی مجلسیں دیکھی تھیں، تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا

۱۲۔ **مصنّف مقرّا اور خوشنویس**:۔ بہ سبیل تذکرہ چند صاحبانِ تصنیف کے نام بھی پیش کئے جاتے ہیں منشی شاکر حسین نقوی نے کئی جلدوں میں تمام دنیا کی ایک مبسوط تاریخ "محیط التواریخ" کے نام سے تصنیف فرمائی ہے حال ہی میں اس کا صرف تھوڑا سا حصہ جو واقعاتِ کربلا پر محتوی ہے "مجاہد اعظم" کے نام سے اُن کے سعید فرزند سید طاہر حسین نقوی اسسٹنٹ پروفیسر اسعد عربی۔ فارسی مہاراجہ کالج نے شائع کیا ہے۔ حافظ محمد یوسف عزیز نے جو مشہور واعظ بھی ہیں کئی کتابیں لکھی ہیں، بعض کے نام یہ ہیں، سیرت صدیق، نظام الادب، خلاصۃ القواعد منشی عبدالوہاب خاں عاصم کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ خالد بن ولید اور عمر خیام کی سوانح عمریاں بطرز ڈرامہ ہیں۔ مولوی ہدایت علیخاں کی متعدد تصانیف موصوف کے رہ نورد جادۂ سلوک ہونے پر شاہد ہیں۔ ان میں سے معیار السلوک اور خلاصہ مکتوبات مجدد الف ثانی زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ منشی حامی الدین خاں اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ مہاراجہ کالج جے پور کا شبدیزِ قلم بارہا میدانِ تاریخ میں اپنی جولانیاں دکھا چکا ہے۔ منشی امیر الدین خاں سکریٹری

اسلامی پنچایت کے اصلاحی آدبی مزاحیہ وتاریخی مضامین کثرت سے "روشنی" اور دیگر پرچوں میں شائع ہوتے ہیں۔ اُن کی شعر ونظم کا مجموعہ کافی ہے۔ مسٹر تسلیم جعفری جن کے مضامین اکثر "زمانہ" کانپور میں فنِ لسانیات پر نکلتے رہتے ہیں۔ بخوفِ طوالت اس مختصر پر اکتفا کی گئی ہے۔ جن اصحاب کے اسمائے گرامی نظرانداز کر دیئے گئے ہیں، اُمید ہے کہ وہ اسے سوءِظن پر محمول نہ فرمائیں گے۔

جے پور کے خوشنویسوں میں منشی بہاری لال تلمیذ جناب سید محمد امیر پنجہ کش رضوی دہلوی نستعلیق کے اُستاذ الاساتذہ تھے۔ اُن کے نامور شاگرد منشی ہیرالال مونس (مالک ہیرالال پریس جے پور) نے اُن کی تاریخ وفات "اللہ بخشاید سش" لکھی ہے۔ ایک اور بے مثل کاتب منشی رام دھن شاگرد آغا مرزا بھی عرصہ تک جے پور میں مقیم رہ چکے ہیں، ممدوح ہفت قلم تھے، خطِ نسخ میں اس عہد میں حضرت مولانا مسکین شاہ بڑے نامور گزرے ہیں۔ خطِ شفیعہ (شکست) میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ راجہ مہیش داس اپنے وقت کے ممتاز کاتب تھے۔ بعد کے دور میں منشی پنالال ناظم، و منشی عبدالغنی و منشی میر حیدر حسن یکتا ذکی خطِ نستعلیق میں قابلِ ذکر ہیں۔ میر حیدر حسن ذکی نسخ بھی لکھتے تھے۔ اسی طرح منشی ہیرالال مونس نسخ و شفیعہ و طغرا و غبار میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ منشی ہیرالال مونس نے اس فن کی جیسی خدمت کی، اُن کے معاصرین سے بن نہ آئی، اور آج بھی اُن کے تلامذہ کی بدولت جے پور میں اس فن کا نام زندہ ہے۔ ان کے نامور شاگردوں میں منشی ظہور الحسن و حافظ عبدالکریم، منشی محمد عبدالرحیم مالک رحیمی پریس جے پور و منشی رام چندر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۴۔ اخبار اور رسالے: جے پور میں ماہواری رسالے اور اخبارات بھی کافی شائع ہوئے ہیں۔ مختصر فہرست درج ذیل ہے:۔

۱۔ البیان	زیر ادارت	مولوی احتشام الدین	رسالہ ماہانہ تھا بند ہوگیا
۲۔ نیرنگِ خیال	"	مولوی سید سراج الدین احمد کنتوری و مولوی محمد بقا مضطر	"
۳۔ المعلومات	"	قاضی ولی محمد اور میر ولایت احمد	"
۴۔ تفریحِ احباب	"	منشی مضطر کاکوروی (مولوی محمد بقا)	"
۵۔ راح الارواح	"	منشی امیرالدین خاں	"
۶۔ ذکر الحبیب	"	منشی سراج الحق	"
۷۔ جوہرِ سخن	"	مولوی سید نظیر حسن سخا	"
۸۔ الکمال	"	حکیم سید احمد علیخاں مسیح اور منشی عبدالحمید اخگر	"
۹۔ المصباح	"	منشی سید محمد عبدالسلام خیال اور منشی عبدالحمید اخگر	"

۱۰۔ شادمان	زیرِ ادارت	حکیم نورالحسن صدیقی	رسالہ ماہانہ تھا بند ہوگیا
۱۱۔ بزم راجستان	"	منشی محمد طاسین ذہین	"
۱۲۔ جام سخن	"	"	"
۱۳۔ قوم	"	مولوی اساس الدین تسنیم	رسالہ اور اخبار دونوں تھے بند ہوگئے
۱۴۔ الاخلاق	"	"	"
۱۵۔ شمشیر راجستان	"	حکیم نورالحسن صدیقی	ہفتہ وار اخبار تھا بند ہوگیا
۱۶۔ اقبال	"	منشی بدرالدین گوئل	ہفتہ وار پرچہ ہے جاری ہے
۱۷۔ روشنی	"	منشی سعید حسین خاں	ماہانہ رسالہ ہے جاری ہے
۱۸۔ مہاراجہ کالج میگزین	"	منشی سید طاہر حسین نقوی	گذشتہ سال ہی جاری ہوا۔ سال میں صرف دوبار شائع ہوتا ہے۔

۱۵۔ راجپوتانہ کے جدید کلیہ میں اسلامی ثقافت اور تاریخ کا شعبہ: یہ مختصر سا خاکہ جے پور میں اردو کے منازلِ ارتقا پر روشنی ڈالتا ہے۔ اردو دوست حضرات معاف فرمائیں اگر ان کی تسکین نہ ہوسکی ہو۔ موجودہ حکومت جے پور یونیورسٹی قائم کر رہی ہے چنانچہ اس کی کوشش کی جائیگی کہ اگر جدید یونیورسٹی قائم ہو تو اس میں اسلامی ثقافت اور تاریخ کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا جائے۔ تاکہ ریاست کی قدیم روایات رواداری اور ادب نوازی کا ایک اور ثبوت اوراقِ تاریخ میں ثبت ہو جائے۔

ارشادات

از سید تقی احمد خاں ارشاد فاطمی بی۔اے (آنرز)

حجابِ ناز ہیں یا نازشِ ادا ہیں ہم — بتا دے اے دلِ فطرت کہ ہیں تو کیا ہیں ہم
نوائے یاس ہیں یا آہِ نارسا ہیں ہم — غرض کہ ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہیں ہم
ہر ایک سانس ہے فریادیِ فراقِ حبیب — جو دیکھئے تو سراپا اک التجا ہیں ہم
غضب ہوا جو زباں آشنائے آہ ہوئی — ہزار حیف کہ شرمندۂ وفا ہیں ہم
جگہ نہ کیوں ہمیں احباب دیں نگاہوں میں — غبار ہو کے بھی خاکِ کربلا ہیں ہم

کٹی ہے لالہ رخوں میں یہ عمر اے ارشاد
نہ متقی نہ کوئی ایسے پارسا ہیں ہم

ایک آرزو

(از جناب ڈی۔ آر۔ خوشتر جنالی)

میں اپنے اشکوں کی زندگی کو درازیِ صد حیات دے دوں،
میں اپنی حسرت زدہ نظر کو فریبِ صد التفات دے دوں
مَیں اپنی مجبوریوں کو رنگِ لطافتِ اختیار بخشوں
میں اپنی رعنائیٔ تمنّا کو درسِ ذوقِ ممات دے دوں
میں اپنی بیکس حقیقتوں کو نیاز مندِ مجاز کر لوں
میں اپنی افسردہ آرزو کو نگاہِ حُسنِ ثبات دے دوں
مَیں ذرّہ ذرّہ کو کر دوں تاباں، مَیں قطرہ قطرہ کو کر دوں دریا
مَیں اپنے جلووں میں آپ گم ہو کے "بیخودی" کو نجات دے دوں
مَیں اپنی ہر جنبشِ نظر سے سکونِ دل کے بہاؤں دریا
مَیں چاہوں خوشتر تو ایک ذرہ کے ہاتھ میں کائنات دے دوں

سماج کی اخلاقی بنیادیں

(از مسٹر منو صوبیدار ایم - ایل - اے، بار ایٹ لا)
(مترجمہ مولوی محمد یعقوب خاں صاحب کلام، بی - اے)

آجکل جبکہ ہر طرف عسکریت کا دور دورہ ہے، جنگ و جدل اور خون خرابے ہو رہے ہیں، ہر شخص کی توجہات نتائج کی طرف خواہ مخواہ منعطف ہو رہی ہے جو فوجی طاقت کے ذریعہ سے حاصل ہونگے۔ جدھر دیکھو جنگی تیاریاں نظر آئیں گی، دوسری باتوں کو آج کل ثانوی حیثیت حاصل ہے، گویا مسائل زندگی کی حل کرنے والی واحد چیز اگر کوئی ہے تو وہ قوت بہیمیہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ عالمگیر جنگ جیسے تنازعہ میں تمام نوع بشر کے مستقبل کا فیصلہ اسلحہ کے ماہرانہ استعمال پر منحصر ہے۔ ہر شخص اس امر کا خواہاں ہے کہ طاقت میں اُسی کا پلہ بھاری رہے۔

اندریں حالات ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حیات انسانی کی اخلاقی بنیادوں پر زور دیا جائے، ایک مرتبہ دنیا کو پھر بتایا جائے کہ عالم البشری کے معلمین اخلاق کیا کہہ گئے ہیں۔ یعنی انکسار و پرہیزگاری کی اہمیت اور اخوت انسانی کی ضرورت پھر جتائی جائے۔ دونوں فریق متحارب اس بات کے دعویدار ہیں کہ وہ آئندہ دنیا کی ایسی تنظیم عمل میں لائیں گے جس سے انسان کی زندگی زیادہ عمدگی کے ساتھ بسر ہوگی۔ نازیوں اور جاپانیوں کے دعوے میں تو نسلی امتیاز کی جھلک صاف نظر آ رہی ہے اور ان کے دعووں میں دوسری اقوام کی غلامی پنہاں ہے، اتحادیوں کے دعوے میں بھی بہت سے لوگوں کو سامراج کا سلسلہ قائم رہتا دکھائی دیتا ہے۔ اگر اتحادیوں کے سر فتح و ظفر کا سہرا رہا تو اقوام عالم کی درجہ بندی کر دیجائیگی جس میں اینگلو سیکسن نسل کی قوم افضل سمجھی جائیگی اور اس کے ماتحت دوسری قوموں کو مختلف درجوں تک آزادی دے دی جائیگی جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہی ہیں کہ دوسری اقوام کے لئے مختلف درجات میں غلامی قائم رہیگی۔

اہل امریکہ کے دل واقعی جمہوریت کے صحیح جذبات سے معمور ہیں، اور وہ اس بات کا صاف لفظوں میں اظہار بھی کر چکے ہیں، بایںہمہ "اٹلانٹک چارٹر" (سند اوقیانوس) نسلی و جغرافیائی اعتبار سے محدود ہے۔ ڈیموکریسی اچھی چیز ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کے مفہوم میں مساوات بھی داخل ہو اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ مساوات کے معنی تمام لوگوں کے لئے آزادی ہوں، خواہ وہ آزادی سیاسی ہو یا اقتصادی۔

ہر ملک میں تھوڑے بہت آدمی ایسے ضرور ہیں جن کے قلب وسیع اور روحیں بلند ہیں، سلطنت متحدہ برطانیہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، ان لوگوں کے دل بیقرار ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ رنگین نسلوں پسماندہ قوموں، نوآبادیوں اور سلطنت کی رعایا کا خیال کرتے ہوئے ہمیں اپنے مقاصد جنگ کی صاف لفظوں میں وضاحت

کو دینا چاہیئے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ رنگین قوموں اور نوآبادیوں وسلطنتوں کی رعایا میں جس قدر ہیجان اس جنگ نے پیدا کر دیا ہے، ایسا دنیا کی تاریخ میں کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان لوگوں میں یہ خواہش شدت اختیار کر چکی ہے کہ وہ آزاد و خود مختار ہوں، اپنے ملک کا نظم ونسق بلا روک ٹوک اور مداخلت غیر سے خود چلائیں، اور اعلیٰ طاقت و اعلیٰ ساز و سامان کے پرستار نہ ہوں، جنھوں نے آج تمام ممالک عالم کی حکومتوں کی سرگرمیوں کو جذب کر رکھا ہے۔

اس زمانہ میں معمولی زندگی پر "جنگل کے قانون" کا اطلاق نہیں ہوتا، یعنی اکل الکثرین نہیں رہا۔ اب ہمیں صرف اپنی ہی نہیں بلکہ اپنے بچوں اور اپنے بوڑھوں کی پرورش وحفاظت کرنی پڑتی ہے، ہم تنہا نہیں رہ سکتے ہمیں ان کی پرورش اور مدد کرنی پڑتی ہے جو صنف نازک ہونے کے باعث یا کبرسنی یا ناقص الاعضاء ہونے کے باعث اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے۔ ہم اس بات کے حامی ہیں کہ بیماروں اور صحیح الاعضا بیکاروں کی زندگی کا بیمہ کیا جائے۔ جب کسی جگہ سے سیلاب یا زلزلہ آنے کی خبر آتی ہے تو ہمارے دل ان مصیبت زدوں کے لئے ہمدردی سے معمور ہو جاتے ہیں۔ ایسے طبقوں کی جیسے کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور، دکانداروں کے معاون ملازم، خدمتگار اور مزدور، جنھیں اجتماعی طور پر معاملہ کرنے کا موقع نہیں ملتا، بھلے آدمی انفرادی طور پر مدد کرتے ہیں، اور وہ ریاست اجتماعی طور پر مدد کرتی ہے، جسے ان طبقات کے حقوق کے تحفظ کا بذریعہ قانون سازی اختیار حاصل ہے۔ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے مطالبات سے ہم پہلے ہی واقف ہیں۔ حتیٰ کہ طوائفیں اور سنگین جرائم میں سزا یافتہ مجرم بھی ریاست اور نیک خیال لوگوں کی توجہ وہمدردی کے مستحق ہیں اور ان سے کی بھی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ زندگی اس کے معنی نہیں ہیں کہ کسی شخص یا جماعت سے جو فی الوقت کمزور ہے، اس کی کچھ یا تمام ملکیت چھین لی جائے زندگی کی بنیاد حمیت انسانی پر قائم ہے، تمام مذاہب نے خیر خیرات کو نیکیوں میں اول درجہ دیا ہے، ہمارے یہاں بہت سی انجمنیں ہیں، بچوں اور جانوروں کی حفاظت کے لئے بھی انجمنیں ہیں، ہمارے یہاں اور بھی بہت سی جماعتیں ہیں جن میں ہزاروں مرد عورت رفاہ عام اور اصلاح معاشرت کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ منظم اور باقاعدہ جماعت انسانی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ طاقت اور تشدد کی بہیمی جبلت کی روک تھام کرے، اور جس حد تک کوئی جماعت ان جذبات بہیمیہ کی انسداد میں کامیاب ہوگی اتنا ہی بڑا مرتبہ اس کا تہذیب وتمدن میں ہوگا۔

جب ہم یہ جانتے ہیں کہ سماج کو انھیں بیشمار اور مسلمہ حقائق کی روشنی میں چلنا چاہیئے اور عملاً چلائی بھی جاتی ہے یعنی طاقت کے اصول پر نہیں بلکہ داد وستد کے منصفانہ اصول پر چلائی جاتی ہے، تو پھر اس گڑبڑ کی کیا وجہ ہے جو ہم آجکل بین الاقوامی سیاسیات کے میدان میں دیکھ رہے ہیں اور جو تمدن وتہذیب کے بہترین کارناموں کو فنا کے گھاٹ اتارے دے رہی ہے؟ طاقت کے ذریعہ سے حق وصداقت کا فیصلہ کرنا صاف غلطی ہے، کیونکہ جو فریق

حق پرست ممکن ہے کہ فریق کے موافق طاقتور نہ ہو اور مغلوب ہو جائے۔ دنیا کی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ لیکن مدبرین، سیاست والوں نے، زرپرست سرمایہ داروں اور موجودہ طرز معاشرت کے ساز و سامان نے جس کی بنیاد پرائیویٹ کاروبار پر قائم ہے اب تک تاریخ کے ان اسباق سے چشم پوشی کی بلکہ ان کو چھپایا، تاکہ یہ ظاہر کر دہ دنیا کا کاروبار، مکر و فریب اور سازش و غدر کے لطیف امتزاج سے چلا سکتے ہیں۔ بین الاقوامی طاقت کو کچھ حاکم کرنے کے لئے جب کبھی کوئی انتظام کیا گیا، ان لوگوں نے اپنے سامراجی اغراض و مقاصد کو فروغ دینے کی غرض سے اس کا غلط استعمال کیا، اور اس انتظام کو بے اعتبار بنا دیا۔ اگر ۱۹۳۱ء میں جبکہ جاپان نے چین میں پہلا جارحانہ قدم اٹھایا تھا مجلس اقوام کی برطانیہ نے بھی اسی طرح امداد و حمایت کی ہوتی جیسے کہ ولایات متحدہ امریکہ کی خواہش تھی، تو موجودہ جنگ ہرگز رونما نہ ہوتی۔ مگر اس وقت برطانیہ نے فوری فائدہ کے سامنے مستقل مفاد کا خیال نہ کیا، اسی کا نتیجہ موجودہ گڑبڑ ہے۔

ایک کامیاب جارحانہ اقدام کی پہلی مثال سلطنت متحدہ برطانیہ نے قائم کی جس نے ہر جگہ مقبوضات حاصل کرکے وسیع سلطنت قائم کرلی۔ دوسری مثال جاپان نے پیش کی، جس نے جرمنی کو بھڑکایا اور آمادہ کیا کہ وہ بھی یورپ میں وہی "جنگلی قانون" اور وہی لوٹ کھسوٹ کا آئین نافذ کر دے جس پر دنیا کے پانچ براعظموں میں یورپ کی سلطنت قائم ہے، اگر کوئی قوم اپنی گذشتہ غلطیوں کو تسلیم کرلے تو اس کی عظمت میں ذرہ بھر فرق نہیں آئیگا بایں ہمہ موجودہ خون خرابہ کو چار سال ہونیوالے ہیں، کوئی فریق اپنی غلطی کو تسلیم، اور ان باتوں کی درستی کرنے پر آمادہ نہیں ہے جن کی اصلاح فوراً ہو سکتی ہے۔ یہ بات دنیا کے ان صحیح الخیال مردوزن کے لئے نہایت مایوس کن اور افسوسناک ہے جو بین الاقوامی معاملات پر بھی انھیں اخلاقی اصول کو اثر انداز دیکھنا چاہتے ہیں جنھیں وہ عالم بشری پر اثر انداز دیکھتے ہیں۔ وہی عالم بشری جس کے اجزاء خاندان، اقارب و بلاد اور ممالک و اقالیم ہیں۔ خواہشات انسانی کی معراج قومیت نہیں ہے بلکہ اخوت و محبت انسانی ہے جسے یہ درجہ حاصل ہے۔ یہ ایک کلید ہے جس سے منصفانہ بنیادوں پر حیات انسانی کے تمام عقدے کھولے جا سکتے ہیں۔ جتنی کوششیں آجکل حاسدانہ طور پر تخریب و تباہی کے لئے کی جا رہی ہیں اگر وہ تعمیری و رفاہی مقاصد کے لئے وقف کر دی جاتیں تو آج نہ معلوم نوع بشر کی کیا حالت ہوتی؟

بہت سے حضرات ایسے ہیں جو اس قسم کی بحث و تمحیص پسند نہیں کرتے، کیونکہ انھیں ان فوری نتائج سے زیادہ تعلق خاطر ہے، جو موجودہ جنگ سے پیدا ہونے والے ہیں، لیکن راقم الحروف کی طبیعت کو مستقل نتائج سے زیادہ لگاؤ ہے۔ خصوصاً جہاں تک ان نتائج کا اثر نوع انسانی پر پڑتا ہے اور اسی وجہ سے صحیح مردوزن کی توجہ ان امور کی جانب منعطف کرائی جاتی ہے۔ جو لوگ اس وقت بقید حیات ہیں وہ بہت کچھ اپنے آباؤ اجداد

سے ورثہ میں پا چکے ہیں۔ ان لوگوں کا فرض ہے کہ جب وہ چند سال بعد اپنی جان شیریں جان آفریں کو سونپیں تو وہ یہ آبائی ورثہ بجنسہ اور ایسی پاک صاف حالت میں چھوڑ جائیں جن میں تشدد اور طاقت کا کوئی دخل نہ ہو کیونکہ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی بدولت وہ بین الاقوامی دنیا میں اتنی ہی بُری نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں جتنا کہ اندرِ حدودِ ریاست ایک پرائیویٹ شہری کی حالت میں دیکھے جاتے ہیں۔

دوسرے زاویۂ نظر سے یا دوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب ہے کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانا زیادہ اچھا ہے۔ آزاد روی کے مقابلہ میں ضبط نفس حیات انسانی کی خصوصیات میں زیادہ مفید ہے، نیز آنکہ بعض افراد کی ابن الوقتی کے منھ میں عارضی طور پر لگام دیدینے سے تمام نوعِ انسانی کے لئے زیادہ پائدار فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، اور آخری اور اہم ترین بات تو یہ ہے کہ جس چیز کی اس وقت دنیا کو سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ رواداری اور باہمی ربط وضبط ہے۔ دنیا میں رقابت وعداوت کا ایک سلسلہ ہے جن کی بنیاد حرص وآز اور غلط روایات پر قائم ہے۔ اس سلسلہ کی کڑیاں منتشر کردینا چاہیئے، جذبات وخیالاتِ انتقام کی مذمت کی جائے اور اگر کہیں ٹے یا بڑے دو گروہ مردمان کے درمیان کوئی خلیج نفاق حائل ہو تو اُسے پاٹ دینا چاہیئے۔ خطاروں کو اندیشہ ہے کہ کہیں فریق ثانی طاقتور ہو کر انتقام نہ لے، کمزوروں کو اندیشہ ہے کہ طاقتور ان پر حملہ نہ کر بیٹھیں، اور جو طاقتور ہیں اُنھیں یہ ڈر ہے کہ جلبِ منفعت یا دوسروں کا خون چوسنے کے جو مواقع اُنھیں مدتوں سے حاصل ہیں، کسی نہ کسی دن وہ ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ سیاست دانوں کے سامنے جو فوری مقاصد ہیں اُنھیں کے حصول کے لئے وہ پروپیگنڈا کرتے ہیں، لیکن جو لوگ انسانیت کے دلدادہ ہیں، نیز وہ حضرات جنھیں فوری اسباب ونتائج سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ جو ان مستقل اسباب ونتائج سے تعلق خاطر رکھتے ہیں جو عالمِ انسانیت پر اثر انداز ہونگے، انھیں لازم ہے کہ وہ زندگی کی اخلاقی بنیادوں کو مضبوط کریں اور حیات انسانی پر دروس اخلاق کی حکمرانی کا اعلان کردیں۔ جارحانہ کارروائیوں کا، جہاں کہیں بھی کی جائیں اور خواہ کسی پردہ میں کی جائیں، سدِّ باب ہونا لازم ہے۔ یہ کہنا کہ فلاں ملک، قوم، یا نسل میں دُنیا بھر کی بُرائیاں ہیں، اتنا ہی غلط جتنا کہ یہ کہنا کہ فلاں ملک، قوم یا نسل جملہ اوصافِ حمیدہ کا مجسمہ ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ بنی نوعِ انسان کی بہتری اوصافِ حمیدہ سے وابستہ ہے۔ خواہ کسی ملک، قوم یا نسل میں ہوں۔ کسی شخص کے لئے اچھا شہری ہونا کافی نہیں ہے بلکہ ہر شخص کے لئے بھلا آدمی بننا ضروری ہے اور ہر ملک میں انھیں بھلے آدمیوں کو لازم ہے کہ وہ اپنے ملک کی زندگی پر اثر انداز ہو کر اس کو منزلِ مقصود کی راہ پر لگادیں۔ وہ منزلِ مقصود ایک ہی ہے جس کی طرف ہر نبی وپیغمبر رہنمائی کرتا آیا ہے۔ ان ہادیوں نے یہ نہیں کیا کہ کسی سے نجات کا وعدہ کیا اور کسی سے انکار کردیا۔ دنیا کا ہر نظام جس میں کامل مساوات، مکمل آزادی اور عام حصہ داری نہ ہوگی اس اعلیٰ معیار پر صحیح نہیں اُترے گا۔

براڈکاسٹنگ کی بیہودگیاں

(مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے)

براڈکاسٹنگ کی بیہودگیوں کا ذکر کرتے ہوئے مجھے کچھ تامل محسوس ہوتا ہے۔ میرے خیال میں براڈکاسٹنگ کی بیہودگیوں کا اعتراف ہی خود سب سے بڑی بیہودگی ہے۔ بہرحال اب تو یہ فتنہ جگایا جا چکا۔ اب اس کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑیگا۔ چاہے آپ اسے منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی" سمجھئے یا کچھ اور۔ اب یہ داستانِ غم آپ سے کہنی پڑے گی۔

براڈکاسٹنگ میں دو چیزیں کام کرتی ہیں، مشین اور آدمی، گو اکثر اوقات ان دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی ایک حامی ہونے کی وجہ سے میرے ذہن میں ان دونوں اشیا کا وجود الگ الگ ہے براڈکاسٹنگ میں آئے دن جو بیہودگیاں ہوتی رہتی ہیں انھیں دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہیں، اس لئے براڈکاسٹنگ کی بیہودگیوں کو بآسانی دو قسموں میں الگ کیا جا سکتا ہے۔ (۱) مشینی بیہودگیاں (۲) انسانی بیہودگیاں۔ لیکن ایک اور ——— تیسری قسم کی بیہودگی بھی ہے جو مشینوں اور انسانوں کے میل جول سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جسے ہم ریڈیو کی اصطلاح میں "مشینی اور انسانی بیہودگیوں کا "ملا جلا پروگرام" کہہ سکتے ہیں۔

براڈکاسٹنگ کی مشینی بیہودگیوں سے تو آپ واقف ہوں گے۔ ابھی آپ جناب ریاض کا لکھا ہوا ہولناک ڈرامہ "نیلی لکیر" سن رہے تھے، اور عین اُس مقام پر پہونچے ہیں کہ جہاں ڈرامے کی ہیروئن کشتی کے چپوؤں کی آواز اور لہروں کی ہلکی ہلکی موسیقی کے ساتھ ایک پرنور گیت سنا رہی ہے، کہ یک لخت ایک کرخت گھراڑ کے ساتھ ریڈیو بند ہو جاتا ہے اور پھر ایک عرصے تک ریڈیو میں سے کوئی آواز نہیں آتی، آپ چاہے اُسے سو بار مروڑیئے، جھنجھوڑیئے لیکن آواز ندارد، آپ حیران ہوتے ہیں "یا الٰہی مٹ نہ جائے درد دل" یہ ماجرا کیا ہے؟ کیا کسی نے ہیروئن کا گلا گھونٹ دیا، کیا ہیرو نے کشتی کا چپو اٹھا کر ہیروئن کے سر پر دے مارا، یا کشتی ہی دریا میں اُلٹ گئی، کچھ پتا نہیں چلتا۔ اب آپ نا اُمید ہو کر کسی دوسرے اسٹیشن کا پروگرام سننے کی تیاری کرتے ہیں، کہ ہٹا اناؤنسر کی آواز آتی ہے "ہمیں افسوس ہے کہ کل پرزوں کی خرابی کی وجہ سے آپ جناب ریاض کا ڈرامہ "نیلی لکیر" تین منٹ تک نہ سن سکے" یہ کل پرزوں کی خرابی آپ کئی بار بیٹھے ریڈیو پر سن چکے ہیں، کسی دلکش گیت کے دوران میں، کسی دلچسپ تقریر کے درمیان کسی کرکٹ میچ کے تبصرے کے آخر میں کہ جب سننے والوں کا جوش کرکٹ میچ دیکھنے والوں کی طرح انتہا پر ہوتا ہے

یک لخت ریڈیو کی آواز بند ہو جاتی ہے' اور آپ کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے' اور پھر ایک لمبے عرصے کے بعد اناؤنسر یعنی معلن کی صدا سنائی دیتی ہے "ہمیں افسوس ہے کہ کل پرزوں کی خرابی......." یہی مشینی بیہودگی ہے' بعض اوقات یہی مشینی بیہودگی ایک لطیفہ بن جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے' ایک بار ایک ڈرامے کے دوران میں کل پُرزوں کی خرابی اس قدر بڑھی کہ ڈرامہ کے شروع سے لے کر اختتام تک مسلسل خاموشی رہی' اور ڈرامے کا ایک لفظ بھی نشر کیا جا سکا۔ اس ڈرامے کا نام "خاموشی" تھا! چنانچہ پورے بائیس منٹ خاموشی رہی اور ڈرامہ نگار اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔

لیکن بسا اوقات اس قسم کی بیہودگیاں محض مشینی نہیں ہوتیں' بلکہ جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا مشینی اور انسانی بیہودگیوں کا ملا جلا پروگرام ہوتی ہیں۔ ایک بار کا ذکر ہے' کوئی نو بجے کا عمل ہوگا' لوگ باگ تازہ خبریں سننے کے لئے ریڈیو کھولے بیٹھے تھے' ٹائم سگنل ہوا' اس کے بعد معلن کی آواز سنائی دی' اب آپ آل انڈیا ریڈیو سے ہندوستانی میں خبریں سنئے' یہ خبریں دلی' کلکتہ' بمبئی' مدراس' لاہور' لکھنؤ' ترچناپلی' ڈھاکہ اور پشاور سے ایک ساتھ سنائی جا رہی ہیں۔ اس کے بعد ایک خفیف سے جھٹکے کی آواز سنائی دی' اور پھر اس کے بعد جو دھماکوں کی آوازیں ریڈیو سے نکلنا شروع ہوئیں تو یار لوگوں نے سمجھا کہ شاید سٹوڈیو میں سانڈ ٹکریں مار رہے ہیں' کچھ عرصہ کے بعد سانڈوں کی لڑائی ختم ہوئی اور معلن نے اظہار افسوس کرنے کے بعد خبریں سنانا شروع کیں۔

دراصل اسٹوڈیو میں سانڈ نہیں گھُس آئے تھے' کیونکہ اسٹوڈیو کے پہرے دار کسی ایسے جانور کو اندر نہیں گھُسنے دیتے جس کے پاس اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب کا اجازت نامہ نہ ہو۔ ہوا یہ کہ نو بجے کے قریب معلن صاحب خبریں سُنانے کی تیاری کر رہے تھے۔ جب ٹائم سگنل ختم ہوا تو آپ نے تعارف شروع کیا' خبروں کے تعارف کے دوران میں آپ کو معلوم ہوا کہ جہاں وہ بیٹھے ہیں وہاں روشنی کافی نہیں' آپ نے ہاتھ آگے بڑھا کر بجلی کے ٹیبل لیمپ کو اپنے قریب لانا چاہا' بدقسمتی سے لیمپ اسٹینڈ میں اُس وقت بجلی کی رَو چل رہی تھی۔ اُنھوں نے جونہی لیمپ اسٹینڈ کو ہاتھ لگایا اور اُنھیں دھکّے محسوس ہونے لگے' آواز میں لُکنت آگئی' دل و دماغ پر رعشہ طاری ہونے لگا۔ چند لمحوں کے بعد حالت یہ ہوگئی' کہ وہ تو بجلی کے لیمپ کو چھوڑنا چاہتے ہیں لیکن بجلی کا لیمپ اُنھیں نہیں چھوڑتا' اب کیا تھا گھگھی بندھ گئی' نہ خبریں پڑھی جاتی ہیں' نہ لیمپ چھوڑا جاتا ہے۔ نہ کرسی سے ہلا جاتا ہے' اتنے میں ایک اور صاحب وہاں بھاگے بھاگے آئے کہ دیکھیں یا الٰہی ماجرا کیا ہے؟ نہ جانے دردِ دل یہ ماجرا کیا ہے؟ Control Room کے انجینئر صاحب بھی وہاں پہونچ گئے' اور آخر بجلی کا بٹن بند کر کے اُن کی جان خلاصی کرائی۔

اس لئے اگر آپ آئندہ کل پُرزوں کی خرابی کا ذکر ریڈیو پر سُنیں تو اسے محض مشینی بیہودگی پر محمول نہ کیجئے بلکہ اُن جاں گسل' صبر آزما لمحات کا بھی اندازہ کیجئے جو اس اعلان کو دہرانے میں اکثر پیش آیا کرتے ہیں۔

انسانی بیہودگیوں کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں سب سے پہلے اُن انسانوں کا ذکر کرنا پڑتا ہے جو کسی براڈ کاسٹنگ سٹیشن پر کام کرتے ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن پر کئی قسم کے انسان کام کرتے ہیں، ان کا ذکر میں پھر کبھی کرونگا، اس وقت میں صرف اُن لوگوں سے آپ کو متعارف کرانا چاہتا ہوں جن سے آپ لوگوں کا اکثر واسطہ پڑتا ہے۔ اگر آپ کبھی کسی براڈکاسٹنگ اسٹیشن پر تشریف لے گئے ہوں، تو آپ نے اکثر اس مخلوق کو دیکھا ہوگا۔ یہ لوگ دن میں دفتر سے اسٹوڈیو اور اسٹوڈیو سے دفتر کے کمرے تک گھومتے رہتے ہیں، اور گنگناتے رہتے ہیں، میرے لئے جہاں ہیں چین نہیں، قرار نہیں، اِن کے سر پر ہیٹ نہیں ہوتا، کاندھوں پر کوٹ نہیں ہوتا، گلے میں ٹائی نہیں ہوتی، البتہ ایک ہاتھ میں سُرخ رنگ کی پنسل ضرور ہوتی ہے، جسے وہ بھوک لگنے پر چبا چبا کر کھاتے رہتے ہیں، اور جب یہ پنسل ختم ہو جاتی ہے تو چائے کی پیالی اور سگرٹ کے بچے کھچے ٹکڑوں پر قناعت کرتے ہیں۔ یہ لوگ دس بجے سے پانچ بجے تک دفتر میں کام کرتے ہیں، اس کے بعد اسٹوڈیو میں چلے جاتے ہیں، اور جب آپ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب اپنا ریڈیو بند کر کے ایک جمائی لے کر بستر پر دراز ہو جاتے ہیں، اس وقت ان غریبوں میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ اسٹوڈیو سے اٹھ کر اپنے بستر پر دراز ہو سکیں، کیونکہ ان کا بستر اس وقت اسٹوڈیو سے قریباً ڈھائی تین میل دُوری پر ہوتا ہے۔ چنانچہ کئی ایک تو وہیں اسٹوڈیو سے باہر شبنمی گھاس پر پیکرِ تخ لبتہ بن جاتے ہیں، اور دوسرے جو ترے بستر پہ مری جان کبھی، ترے بستر پہ مری جان کبھی، کی لذتِ موہوم سے آشنا ہونا چاہتے ہیں، اور اس کوشش میں بنا لیتے ہیں اپنے ذہن کو دلدل کسی ویرانے کی۔ وہاں سے لڑکھڑا کر چل پڑتے ہیں اور رینگتے رینگتے صبح ہوتے گھر پہونچ جاتے ہیں۔ راستے میں وہ اپنے پروگراموں کے متعلق سوچتے رہتے ہیں، وہ کیا سوچتے ہیں؟ اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں جانتا، کیونکہ براڈکاسٹنگ اسٹیشن پر آجانے کے بعد وہ گھر، سیر، تماشا، بیوی، بچے، دوست، کتابیں، ہر چیز کو خیرباد کہہ دیتے ہیں، گویا دنیوی لذتوں سے ایک طرح مکمل نروان حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے فقیر منش لوگوں سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اسے بیہودگی نہ سمجھنا چاہیئے، بلکہ ایک صوفیانہ لغزش! یہ لوگ جب تک دفتر میں رہتے ہیں تو اپنے اپنے ناموں سے پکارے جاتے ہیں، لیکن جب اسٹوڈیو میں جاتے ہیں تو سسندبائی، تارابائی، دلشادبائی وغیرہ کی رعایت سے سٹینڈبائی کہلاتے ہیں۔

جس طرح ایک سٹینڈبائی (stand by) کی بیہودگیاں بیشمار ہیں، اسی طرح ان کے فرائض بھی بیشمار ہیں۔ پروگرام چلانا، پروگرام بند کرنا، مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا، مہمانوں کو باہر نکالنا، آرٹسٹوں کو چیک پیش کرنا، چیک روک لینا، رسید پر دستخط کرانا، ایک آنہ وصول کرنا، نہ کرنا، بیک وقت چار پروگراموں کو سننا، سارنگی اور طبلے کا فاصلہ ٹھیک کرنا، جلترنگ کے پیالوں میں پانی ڈالنا، آرٹسٹ کو ہاتھ روم کا راستہ بتانا، اسٹوڈیو کے باہر لگی ہوئی سُرخ، سبز، اور نارنجی بتیوں پر نگاہ رکھنا، کونسی بتی کس وقت بجھ جاتی ہے

کس وقت روشن ہو جاتی ہے، اور پھر اس بجھنے اور روشن ہونے کے درمیانی وقفے کو اپنی ڈائری میں نوٹ کرنا۔ اس قسم کے درجنوں کام سٹینڈ بائی کے سپرد ہوتے ہیں، پھر اُس کے دل بہلانے کے لئے اُس کے کمرے میں ایک ٹیلیفون بھی لگا دیا گیا ہے، یہ ٹیلیفون متواتر کام کرتا رہتا ہے، اس ٹیلی فون کا اسٹینڈ بائی سے وہی رشتہ ہے جو سندباد سے پیر تسمہ پا کا تھا، اس ٹیلیفون کو عجیب عجیب آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

(ٹیلی فون کی گھنٹی)

کیوں جی اب وقت کیا ہو گا؟

ساڑھے سات بجے ہیں،

لیکن میری گھڑی پر تو ابھی دو منٹ باقی ہیں،

گھڑی درست کر لیجئے۔

اوہ، خوب یاد دلایا شکریہ،

(ٹیلی فون کی گھنٹی)

آل انڈیا ریڈیو۔

اے ..... اے کیا آپ ریڈیو اسٹیشن سے بول رہے ہیں،

جی ہاں،

تو سنیئے، میرا نام رشیدی بیگم ہے، میں کل عورتوں کے پروگرام میں ایک گیت گاؤنگی، میں اس وقت پیانو پر بیٹھی مشق کر رہی ہوں، لیکن اس گیت کا آخری بند مجھے اس وقت یاد نہیں "پریت کی ریت انوکھی" آپ کو یاد ہو گا، خدا بتا دیجئے۔

مجھے یاد نہیں،

آپ کو یاد نہیں؟ پریت کی ریت انوکھی، ابھی پنکج ملک نے گایا ہے!

مجھے یاد نہیں،

کں، ہاں، پنکج ملک نے نہیں، پہاڑی سانیال نے "بوڑھی دیدی" میں۔

جی میں نے بوڑھی دیدی نہیں دیکھی۔

آپ نے بوڑھی دیدی نہیں دیکھی، کیا آپ کو فلمیں دیکھنے کا شوق نہیں۔

جی مطلق نہیں،

آپ بوڑھی دیدی ضرور دیکھئے، بڑا اچھا فلم ہے، بڑی اچھی تصویر ہے، بڑا اچھا گایا ہے، بڑی اچھی ادا کاری ہے

بڑا اچھا.......

(ٹیلی فون کی گھنٹی)

ریڈیو اسٹیشن!

جی ہاں، میں ابھی عرض کر چکا ہوں،

دیکھیے، میں نواب خاں جنگی سے بول رہا ہوں، یہ اس وقت کون گا رہا تھا،

جی بنّے خاں شدھ سارنگ کا خیال سنا رہے تھے،

شدھ سارنگ کا خیال؟ اجی حضرت، آپ کن گھامڑ لوگوں کو پروگرام دیتے ہیں، شدھ سارنگ کا خیال تو اس طرح گایا جاتا ہے، گگری موری پھوڑ، توڑ، چھوڑ۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ آ۔ نی۔ پا۔ ما۔ گا۔ دھا۔ گگری موری آ۔ آ۔ آ۔...

(ٹیلی فون کی گھنٹی)

میں نے کہا، جی، یہ فرنٹیئر میل لاہور کے بجے جاتی ہے؟

ریلوے کے دفتر سے پوچھیے، یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔

ہلو۔ ہلو۔ ہلو۔ ہلو۔

ایک آفت ہے یہ ٹیلی فون کی گھنٹی۔ کسی کو گانے کا بند دیا رہا ہو، کسی کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہو، کسی کی بیوی بھاگ گئی ہو، وہ سیدھا ریڈیو اسٹیشن کو ٹیلی فون کرتا ہے۔ بسا اوقات یہ آوازیں سن کر شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ براڈکاسٹنگ اسٹیشن ہے یا مچھلی منڈی!

ٹیلی فون کی گھنٹی سٹینڈ بائی کی مصروفیت ثابت کرنے کے علاوہ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ براڈکاسٹنگ کی بیہودگیوں میں ان لوگوں کا بھی بہت بڑا حصہ ہے جو ریڈیو سنتے ہیں، ریڈیو میں دلچسپی رکھتے ہیں اور کبھی کبھی ریڈیو اسٹیشن پر پروگرام کرنے کے لئے بھی آجاتے ہیں، پھر ایک تعداد ان لوگوں کی بھی ہے، جو گاہے گاہے ریڈیو والوں کو خط لکھا کرتے ہیں، یہ خط بالعموم بہت دلچسپ اور براڈکاسٹنگ کے سمجھنے کے لئے بے حد مفید ہوتے ہیں، چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:۔

(الف) "جناب والا، منیجر ریڈیو صاحب بہادر، پرسوں میرے چھوٹے بھائی کی شادی ہے، آپ دلشاد بیگم کو گانے کے لئے بھیج دیجئے، نیز ایک سہرا بھی بھیج رہا ہوں ازراہ عنایت اسے ریڈیو پر سنا دیجئے۔"

(ب) "میں فلاں رئیس ابن رئیس ابن رئیس۔ پرسوں فلاں نواب صاحب کو گارڈن پارٹی دے رہا ہوں، شہر کے سب رؤسا اس پارٹی میں شریک ہونگے۔ فلاں اصحاب کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مہربانی کرکے اس خبر کو براڈکاسٹ کر دیجئے۔"

(ج) "میں ماہر جوتشی ہوں۔ ٹیوہ اور برش چل بہت عمدہ بناتا ہوں، میرا اعلان ریڈیو پر سُنا دیجئے، اس کے صلے میں
میں ریڈیو والوں کی جنم پتریاں مفت دیکھنے کو تیار ہوں۔"

(د) ۴۔ دسمبر کو دلفگار ڈے ہندوستان بھر میں منایا جائیگا۔ جناب دلفگار ملتانی ایک بے مثال شاعر ہونے کے علاوہ
اپنے شہر کے بہترین جلد ساز بھی تھے، اُن کا دیوان ناسازگاریِ زمانہ سے معدوم ہوگیا ہے لیکن جلد باقی رہ گئی ہے،
بسیار تلاش کے بعد پانچ شعر دستیاب ہوسکے ہیں، بطور تبرک انھیں ریڈیو پر سُنا دیجئے۔

(ہ) ۴۔ دسمبر کو شری یت اودے چندر تاماگن کی آٹھ ہزارویں برسی ہے، یہ کوی بھارت ورش کے پہلے ترقی پسند شاعر تھے
انھوں نے دھات اور پتھر کے زمانے سے پہلے وفات پائی انھوں نے گھوڑے اور مچھلی پر دو شاندار نظمیں لکھی ہیں،
جو اجنتا کے غاروں میں کندہ ہیں لیکن اب پڑھی نہیں جاتیں۔ صرف گھوڑے اور مچھلی کی تصویروں کی خارجی کیفیت
سے ان نظموں کا داخلی حال معلوم ہوسکتا ہے۔ از راہ کرم ۴۔ دسمبر کو براڈکاسٹنگ اسٹیشن سے ان کے متعلق ایک
خاص پروگرام رکھیے۔

ہندوستانیوں کی بزرگ پرستی تو مشہور ہے، اس لئے ہر ڈاک میں اس قسم کے خط اکثر آتے رہتے ہیں، چونکہ رائے عامّہ کا احترام واجب ہے اس لئے براڈکاسٹنگ اسٹیشن پر اس قسم کی "برسیاں" اکثر منائی جاتی ہیں، اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا ہے کہ اُردو۔ ہندی بلکہ ہر ایک صوبجاتی زبان کے اُن تمام بڑے کیسے کویوں اور شاعروں اور ادیبوں کی یاد تازہ ہوگئی ہے جو مدت ہوئی مرکھپ چکے جن کی نہ اپنے زمانے میں کوئی وقعت تھی نہ اب ہے، نہ آئندہ ہونے کی اُمید ہے۔ اسی قسم کی سرگرمیوں ہی سے تو اکثر براڈکاسٹنگ اسٹیشن پر بارہ مہینے نوحہ خوانی ہوتی رہتی ہے، یہی کوشش ہوتی ہے کہ مُردوں کو یاد کر کے، رویا اور رُلایا جائے، جو زندہ ہیں اُنھیں ہنسانے کی تدبیر کوئی نہیں سوچتا۔

پروگرام کرنے والوں کی بیہودگیوں کے سلسلے میں بے شمار واقعات یاد آتے ہیں۔ وہ معصوم بچے جو یہاں بچوں کے پروگرام میں حصہ لینے کے لئے آتے ہیں، اور اسٹوڈیو کی دیواروں پر پنسل سے کارٹون بنانے اور اپنے اُستادوں کے چہرے مُہرے درست کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ وہ معزز خواتین جو اپنی تقریر کے دوران میں نہایت بھولے پن سے مائیکروفون کے قریب لگے ہوئے بٹن کو محض اس لئے دبا دیتی ہیں کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے، ہوتا کیا ہے سارا پروگرام غائب غلّہ ہوجاتا ہے! وہ علّامۂ دہر جو تقریر کرتے ہوئے یکایک قریب کھڑے ہوئے معلن سے پانی کا گلاس مانگ لیتے ہیں اور پھر اُن کی یہ آواز بھی ریڈیو پر نشر ہوجاتی ہے۔ اور ریڈیو کی بیہودگی پر محمول کی جاتی ہے۔ یہ ایک تلخ داستان ہے اور اس کا تذکرہ فضول۔

اور پھر وہ بزرگ ہیں جو غریب سٹینڈرمائی سے کہیں بلند و بالا ہیں، لیکن اُن کے کارنامے بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے، اور کاغذ کم ہے۔ وہ لوگ سٹینڈرمائی کی منزل سے بہت دُور ہمالیہ ایسی بلندیوں پر

رہتے ہیں، اُن کے چہرے ہمیشہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں، وہاں سورج کی چمک اور دھوپ کی مسکراہٹ شاذ ہی دکھائی دیتی ہے، ورنہ اکثر ایک میلا کُہرہ ہر وقت چھایا رہتا تھا، وہاں تیز و تند ہوائیں چلتی ہیں اور برفیلے طوفان آتے رہتے ہیں، وہاں تک پہونچنا جان جوکھوں کا کام ہے، آج تک کئی مہمات بھیجی جا چکی ہیں لیکن حاتم طائی والے قصے کے کوہ ندا کی طرح جو شخص ایک دفعہ وہاں گیا پھر کبھی واپس نہیں آیا!

غزل

(از حضرت جالب مراد آبادی)

اِک لمحہ بارِ غم سے سُبک زندگی نہیں
اللہ رے ظرفِ چشم کہ پھر بھی نمی نہیں

پہلی سی گرمِ انجمنِ زندگی نہیں،
جلتا تو ہے چراغ مگر روشنی نہیں

یوں پوچھتے ہیں کیوں ترے لب پر ہنسی نہیں
جیسے مذاقِ غم سے اُنھیں آگہی نہیں

حسنِ ستم ظریف کہ لب پر ہنسی نہیں
کیا اب بھی دادِ جذبِ محبت ملی نہیں

عالم کی ہر کتاب کو حل کر لیا مگر
شرح بیاضِ عشق کسی سے ہوئی نہیں

مطرب کی ہر صدا ہے محبت کا اِک پیام
محفل میں کوئی گوش بر آواز بھی نہیں

پیشِ نگاہ حُسنِ دو عالم رہا، مگر
یہ آنکھ وہ ہے تیرے سوا جو اُٹھی نہیں

ہر لحمہ ہے مذاقِ مسرت کا پُر فریب
یہ بھی شعاعِ غم ہے لبوں پر ہنسی نہیں

اُن کے وداع ہوتے ہی جالب یہ کیا ہوا
از عرش تا بفرش کہیں روشنی نہیں

یہ گھٹائیں، یہ فضائیں، اور اپنا جھولنا

(از حضرت شائق وارثی بریلوی، بی۔اے)

یہ گھٹائیں، یہ فضائیں، اور اپنا جھولنا
لیکے انگڑائی لچکتی ڈالیوں کا جھومنا
ڈال کے بانھوں میں بانھیں، منھ سے منھ کو چومنا
یہ سہانا وقت، یہ دنیا کا الٹا گھومنا
یہ نشیلی، سانولی فطرت کا پھلنا پھولنا
یہ گھٹائیں، یہ فضائیں، اور اپنا جھولنا

لہلہاتے باغ کے دھندلے نظاروں کی قسم
کیف میں ڈوبی ہوئی، اودی بہاروں کی قسم
آسماں سے نشہ برساتی پھواروں کی قسم
مستیوں میں یاد ہے سارے جہاں کو بھولنا
یہ گھٹائیں یہ فضائیں، اور اپنا جھولنا

شری رمن مہرشی

از "آنند"

ہندوستان کی تاریخ میں کوئی ایسا زمانہ نہیں جس میں رشی، منی، مہاتما اور مہا پُرش موجود نہ ہوں بعض ان میں سے اپنے کو ظاہر کرتے ہیں اور خلق اللہ کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں، بعض روپوش رہ کر گوشۂ عافیت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان روحانی بزرگوں کے وجود سے دنیا کو اخلاقی اور روحانی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ یہی وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جو مآل اندیش انسانوں کو عارضی دنیا کے گوناگوں مخمصوں، اُلجھنوں اور تکلیفوں سے نجات دلاتی ہیں، معرفت الٰہی کا راستہ دکھاتی اور بقائے دوام کے حصول کی تلقین کرتی ہیں۔

اُنیسویں صدی کے رُبع آخر میں احاطۂ مدراس کے قصبہ تریچولی ضلع رامنڈ میں ۳۰۔دسمبر ۱۸۷۹ء کو رمن مہرشی کا جنم ہوا۔ سری سندر ایئر آپ کے والد ماجد کا نام تھا جو اس قصبہ کے ممتاز پلیڈر تھے۔ ان کے تین لڑکے ہوئے ان میں دو غیر معروف رہے مہرشی کا اسم گرامی وینکٹ رمن تھا۔ کچھ عرصے تک آپ نے تریچولی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، بعدہٗ مدورا کے اسکاٹش مشن مڈل اسکول اور امریکن مشن ہائی اسکول میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ اسی دوران میں مہرشی کے ایک عزیز ارونا چلم پہاڑ کی تیرتھ جاترا سے واپس آئے تھے اُن سے آپ نے دریافت کیا کہ تم کہاں گئے تھے، جواب ملا "ارونا چلم گیا ہوا تھا۔ اس متبرک نام کو سُنتے ہی مہرشی کے دل پر ایک خاص قسم کا اثر ہوا، اور باطنی جذبات میں عجیب طرح کی بیداری محسوس کی، اس واقعہ کو کچھ عرصہ گذر گیا۔ اس درمیان میں اکثر وہ خاموش زندگی بسر کرنے لگے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ یکایک بیٹھے بیٹھے اُن کے دل میں موت کا خیال پیدا ہوا تھوڑی دیر تک یہ محسوس کیا کہ ملک الموت نے ان کی روح قبض کر لی ہے۔ اسی حالت میں اُنھیں اس امر کا یقین ہو گیا کہ انسان صرف جسم کا نام نہیں بلکہ روح بھی اس کی زندگی کا اہم اور لافانی جز ہے، درحقیقت روح ہی اصلی انسان ہے جس کو فنا نہیں اور جو ہر زمانے میں قائم بالذات رہتی ہے۔ اس روحانی بیداری کے تجربہ نے مہرشی کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس گیان کے بعد اُنھیں کسی عارضی اور ظاہری شے میں دلچسپی باقی نہیں رہی۔ کھیل، کود، لہو ولعب، سیر و تفریح سب سے کنارہ کش ہو گئے۔ اسی زمانہ میں اسکول ماسٹر نے انھیں بطور سزا یہ حکم دیا کہ ہجے کی گرامر

کے چند صفحات تین بار نقل کر کے لاؤ۔ گرامر کے اس حصّے کو نقل کرتے کرتے اُن کو اس امر کا یقین ہو گیا کہ وہ اپنے وقت عزیز کو بیکار صرف کر رہے ہیں۔ اس لئے اس کام کو بند کر کے حسب معمول اپنے دھیان میں مصروف ہو گئے۔ آپ کے بڑے بھائی نے بار بار انھیں اس حالت میں دیکھکر طنزاً کہا کہ اگر تم کو دھیان گیان میں زندگی بسر کرنی ہو تو کسی جنگل کا راستہ لو۔ اور تعلیمی زندگی کو خیرباد کہو۔ خود انھوں نے بھی محسوس کیا کہ جب ان کا دل دُنیاوی کاروبار میں نہیں لگتا تو ان کے لئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں کہ وہ گھر بار کو ہمیشہ کے لئے ترک کر کے کسی گوشۂ عافیت میں جاگزیں ہو جائیں۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اَرُوناچلم کی یاد دل میں تازہ ہو گئی۔ دوسرے روز دوپہر کو اُن کے بڑے بھائی نے یہ کہا کہ تم ہائی اسکول جاتے وقت میرے بکس سے پانچ روپیہ لیکر میری فیس دفتر میں جمع کر دینا۔ چنانچہ اس رقم کو لیکر بجائے اسکول جانے کے وہ سیدھے ریلوے اسٹیشن پر جا پہونچے۔ اَرُوناچلم جانے کے لئے تروناملیہ اسٹیشن کا ٹکٹ خریدا۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت پانچ روپیہ میں سے صرف تین روپیہ اپنے پاس رکھے، باقی دو روپیہ ایک کاغذ میں لپیٹ کر مع ایک رقعہ کے بھائی کے کمرہ میں ایک نمایاں جگہ پر رکھدیئے۔ اس رقعہ میں یہ مضمون درج تھا کہ "میں اپنے خالق حقیقی کی تلاش میں ترک وطن کر کے جا رہا ہوں۔ قضا و قدر کے اس فیصلے میں کسی کو دخل نہیں۔ میری جستجو میں وقت اور روپیہ صرف کرنے کی ضرورت نہیں"۔ ظاہر ہے کہ وینکٹ رمن کی مفرودی کا حال پڑھکر ان کے بھائی اور ماں پر کیا گذری ہو گی، ان کی تلاش میں کئی جگہ آدمی دوڑائے گئے، مگر کہیں پتہ نہ چلا، مایوس ہو کر گھر والے خاموش ہو رہے۔

اس وقت ان کی عمر ۱۵ سال کی تھی، نا واقفیت کی وجہ سے وینکٹ رمن کو ٹرین کا صحیح وقت معلوم نہ تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ ریل کا کرایہ کس قدر ہے اور کس اسٹیشن پر انھیں اُترنا ہے۔ اسٹیشن پر پہونچکر اُنھوں نے غلط مقام کا ٹکٹ خریدا اور روانہ ہو گئے۔ بدقّت تمام شبانہ روز کا سفر طے کرتے ہوئے اپنی منزل مقصود پر یکم ستمبر ۱۸۹۶ء کو جا پہونچے۔ اُس روز سے آج تک آپ اَرُوناچلم پہاڑ کے دامن میں جاگزیں ہیں۔

ہندو روایات کے مطابق اَرُوناچلم پہاڑ کی اس وجہ سے تعظیم کی جاتی ہے کہ اس کو شیوجی کا مَروپ سمجھتے ہیں۔ بعض راویوں کا بیان ہے کہ یہ پہاڑ ہمالیہ سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ اس تقدّس کی بنا پر اس پہاڑ کے قریب کئی عالی شان مندر بنائے گئے ہیں جن میں دُور دُور سے ہندو جاتری آ کر درشن اور عبادت کرتے ہیں۔ نوجوان وینکٹ رمن اسٹیشن سے سیدھے یہاں کے سب سے بڑے مندر کے اندر جا داخل ہوئے اور کئی روز تک وہیں بیٹھے دھیان میں مصروف رہے۔ استغراق کا یہ عالم کہ تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ کئی دن کے بعد نوجوان تارک مندر سے باہر نکل کر اَرُوناچل پہاڑ کے مختلف غاروں میں قیام کرتا رہا۔ چونکہ یہاں پہونچتے ہی انھوں نے مون دھارن (خاموشی) کر لیا تھا اور دنیا و مافیہا [illegible] بہت

کم تھی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے لوگوں کا رجحان آپ کی طرف بڑھتا گیا۔ کئی سال کے بعد جبکہ آپ وِرُدپاکشا گپھا میں مقیم تھے اُس وقت اس تعلقے کے ایک معمولی افسر کو آپ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا جس نے بہ اصرار آپ سے آپ کا نام و پتہ دریافت کیا چونکہ آپ مُونی (چپ) تھے اس لئے کاغذ پر اپنا نام وسکونت اور جائے پیدائش وغیرہ لکھکر دیدیا، اُس وقت لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ یہ نوجوان سوامی کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں، اس وقت لوگ اُنھیں برہمن سوامی کہتے تھے۔ شدہ شدہ آپ کے وجود و قیام کی خبر آپ کے اعزا کو پہونچی۔ اس وقت آپ کی والدہ جو آپ کے فراق میں غمگین رہا کرتی تھیں اپنے بڑے بیٹے کو ہمراہ لیکر آپ کی تلاش میں اروناچلم آئیں اور اپنے لخت جگر کو بیراگی کی شکل میں دیکھکر بہت مغموم ہوئیں۔ طرح طرح سے ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ وطن چل کر قیام کریں مگر برہمن سوامی نے اپنی ماں اور بھائی کی منت وسماجت کا مطلق خیال نہ کیا اور ایک روز کوئلے سے زمین پر یہ لکھکر دکھا دیا کہ قضا و قدر کو جو کچھ منظور تھا وہ ہوا۔ مشیّتِ ایزدی میں کسی کو دخل نہیں، میں اپنے سلک سے باز نہیں آ سکتا، اس لئے آپ لوگ میرا خیال ترک کردیں۔ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد ان کی والدہ اپنے بڑے لڑکے کے ہمراہ مدورا واپس چلی گئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر ان سے ملنے آئیں اور برہمن سوامی کے ساتھ اسی گپھا میں رہنے لگیں۔

رفتہ رفتہ آپ کی شہرت اور مقبولیت عام ہونا شروع ہوئی۔ گنپتی شاستری جو اپنے زمانے کے سنسکرت کے عالم متبحر اور بڑے ممتاز پنڈت سمجھے جاتے تھے اور جن کے بہت سے شاگرد ویلور شہر میں موجود تھے وہ ایک دن مہرشی سے ملنے آئے۔ آپ کی یکسوئی، استغراق، بے تعلقی اور روحانی عظمت کا شاستری جی پر بڑا اثر ہوا۔ شاستری جی نے بالاعلان اس امر کا اقرار کیا کہ باوجود علم وفضل اور شاستر کے گیان کے، میں حقیقی معرفت اور شانتی سے ابتک محروم رہا۔ مگر اب برہمن سوامی کے رحم وکرم سے صحیح معنوں میں گیان سے سرفراز ہوا۔ شاستری برہمن سوامی کی روحانیت سے اِس قدر متاثر ہوئے کہ اونھوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں سے یہ کہا کہ "برہمن سوامی خدا رسیدہ اور بڑے اہل اللہ ہیں۔ آپ کو جو قربت الٰہی اور جو معرفت حاصل ہے وہ میں نے کسی اور درویش میں نہیں دیکھی چونکہ آپ کا روحانی درجہ بہت بلند ہے آپ کو مہرشی کے لقب سے مخاطب کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اسی زمانے سے لوگ بجائے وینکٹ رمن یا برہمن سوامی کے مہرشی کے لقب سے یاد کرنے لگے۔

سب سے پہلا انگریز ایم۔ ایچ۔ ہمفریس آپ سے ملنے آیا۔ اور طرح طرح کے روحانی اور فلسفیانہ سوالات کئے اور خوش ظن ہو کر واپس گیا۔ مہرشی کی شہرت کا اب یہ عالم ہوگیا کہ لوگ جوق جوق آپ کے درشن کے لئے آنے لگے۔ چند معتقدین نے آپ سے بہ اصرار اس امر کی درخواست کی کہ وہ بجائے اروناچل پہاڑ

کی چوٹی کے غاروں میں قیام کرنے کے اس مقدس پہاڑ کے دامن میں نیچے آکر مقیم ہوں تو لوگوں کو ملنے جلنے اور درشن کرنے میں چنداں سہولت ہو گی۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء سے موجودہ آشرم کا انعقاد ہوا اور اس میں کئی جھونپڑیاں ڈالی گئیں اور مکانات تعمیر کئے گئے جس میں مہرشی، اُن کی والدہ، اور چھوٹے بھائی آکر آپ کے ہمراہ رہنے سہنے لگے۔ اسی طرح دیگر معتقدین بھی آپ کی صحبت سے مستفید ہونے لگے۔ اور خلق اللہ کے رجحان میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔ مہرشی کے قدیم معتقدین میں راما سوامی اور رگھوچاری بھی تھے اور اچامل ایک خاتون تھیں جو ابھی تک زندہ ہیں اور ابھی تک روزانہ اپنے گھر سے کھانا پکا کر مہرشی کے لئے لاتی ہیں۔ اچامل ایک ستم رسیدہ اور مصیبت زدہ بیوہ ہیں جن کے شوہر، بیٹا، بیٹی، اور تمامی اہل خاندان نے داغ مفارقت دیا جس وقت سے کہ اچامل کو مہرشی کی قربت اور درشن نصیب ہوئے پوری شانتی حاصل ہوئی، اور اقرا کے مفارقت کے بارغم سے ان کا دل ہلکا ہو گیا۔ اس وقت سے ابتک وہ روزانہ آشرم میں حاضری دیتی ہیں اور مہرشی کی خدمت سے مستفید ہوتی ہیں۔

وِرُوپاکشا گپھا کے دوران قیام میں ششتا دری سوامی نے آپ کی سب سے زیادہ رفاقت کی، اور آپ کو چند بدنفس سادھوؤں کے ناروا برتاؤ اور ناجائز حملوں سے محفوظ رکھا۔

۱۹۲۲ء میں آشرم کے قائم ہونے کے بعد ۲۶۔ جون ۱۹۲۴ء میں ۱۲ بجے شب کو چند چور اور لٹیرے آشرم میں اس اُمید پر گھس آئے کہ آشرم میں بہت دولت جمع ہے جسے وہ لوٹ کر لے جائیں گے کنج سوامی اور دستان شاہ جو مہرشی کے خاص بھگتوں میں تھے اُنھوں نے جس وقت چوروں کی آواز سنی، مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے مگر مہرشی نے منع کیا، خود خواب استراحت سے اٹھکر کھڑے ہو گئے اور اپنے کمرے سے نکل کر چوروں سے کہا کہ "تم کو پوری اجازت ہے جو کچھ چاہو اور پڑا پاؤ اُٹھالے جاؤ۔" ان میں سے ایک چور نے آشرم کے ایک کتے پر حملہ کیا اور ایک لکڑی زور سے ماری اس کی چوٹ مہرشی کے پاؤں پر لگی۔ آشرم والے اس حرکت پر سخت ناراض ہوئے اور ان پر حملہ کرنا چاہا مگر مہرشی نے ان کو سختی سے روکا اور کہا کہ "ہم سادھو ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر طرح کی مصیبت اور سختی صبر و شکر سے برداشت کریں اور کسی سے انتقام نہ لیں"۔ وہ تین گھنٹے تک چور آشرم کے جھونپڑوں کو ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر اور لوگوں کو مار پیٹ کر چلے گئے۔ ان ناخوشگوار واقعات کے باوجود مہرشی کے چہرے پر بل نہ آیا، وہ سب تماشا خاموشی سے دیکھتے رہے۔

چند حیوان بھی مہرشی کے ہمنشین رہتے ہیں جن کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ مہرشی ان حیوانوں کے ساتھ ویسی ہی شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتے ہیں جیسی انسانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ آشرم میں ایک گائے ہے جس کا نام مہرشی نے لکشمی رکھا ہے اس کی عمر ۱۵ سال کی ہے۔ ہفتہ میں ایک دن جمعہ کے روز وہ اپنے تھان

سے دوڑ کر مہرشی کے کمرہ میں آموجود ہوتی ہے اور ان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیتی ہے، مہرشی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اُسے کچھ پھل پھلاری کھلا دیتے ہیں، ہر روز بلا ناغہ چند گلہریاں مہرشی کے پاس دوڑ کر آجاتی ہیں اور اُن کے ہاتھ سے لے لے کر کاجو وغیرہ کھاتی ہیں۔ اسی طرح چند مور بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں جن کو وہ اپنے ہاتھ سے کچھ کھلا دیتے ہیں، چند کتے اور بندر بھی اُن سے بہت مانوس ہیں

رمن آشرم کی روزانہ زندگی کا دستور یہ ہے کہ مہرشی ۳ بجے صبح اٹھ کر اپنے ہال میں بیٹھ جاتے ہیں، اور طالبانِ حق اور آپ کے حلقہ بگوش آ کر آپ کے سامنے بیٹھکر دھیان اور عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں، ساڑھے سات بجے مہرشی تھوڑا سا ناشتہ کرتے ہیں اور ارونا چل پہاڑ پر تھوڑی دیر سیر کر کے اپنے استھان پر واپس آکر سمادھی لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی حالت میں ۱۲ بجے تک بیٹھے رہتے ہیں۔ ۱۲ بجے آپ غیر برہمنوں کے ساتھ بیٹھکر کھانا کھاتے ہیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آپ پھر ہال میں بیٹھ جاتے ہیں۔ شام تک درشن کرنے والوں اور معتقدین کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے صبح شام دونوں وقت بلا ناغہ ویدوں کا پاٹھ ہوتا ہے اور پرارتھنا کی جاتی ہے۔ مہرشی خود سے نہ کسی سے کچھ بولتے ہیں نہ تعلیم و تلقین کرتے ہیں، ہاں اگر کوئی شخص سوال کرتا ہے تو مختصراً جواب دیدیتے ہیں۔ امیر و غریب، برنا و پیر، برہمن غیر برہمن، ہندو، مسلمان، عیسائی پارسی، یہودی، غرضکہ ہر قوم اور ملت و مذہب کے لوگ مہرشی سے ملنے اور اُن کے درشن کرنے آتے ہیں۔ اکثر والیانِ ریاست اور حکام بالا دست بھی یہاں آچکے ہیں۔ مگر آپ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ہیں ان میں سے نہ کسی کو فضیلت دیتے ہیں نہ برتری، اور نہ کسی کی زیادہ آؤ بھگت کی جاتی ہے نہ کم۔ وہ سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں، مستحق اور غیر مستحق ہر شخص کے لئے آپ کا چشمۂ فیض جاری ہے، آپ بالمشافہ زبانی تعلیم و تلقین کسی کو نہیں کرتے بلکہ باطن کے ذریعہ روحانی تعلیم دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں، رفتہ رفتہ خود بخود آپ کے باطنی روحانی فیض سے مستفید ہوتے ہیں۔ انسان خواہ کسی عقیدے یا مسلک یا طرز عبادت کا پیرو ہو اُس کو اُسی کے طریقے کے مطابق روحانی فائدہ پہنچتا ہے اور اُس کی چشم بصیرت وا ہوتی ہے۔

مہرشی کی تصانیف مختصر اور معدودے چند ہیں، پہلا مختصر رسالہ جو مہرشی کے نام سے شائع کیا گیا وہ "میں کون ہوں؟" ہے جس کو مہرشی نے کامل خاموشی (مون) کے زمانے میں اپنے دست مبارک سے کاغذ کے پرزوں پر تحریر فرما کر "شیو پرکاشم پلے" کو ۱۹۰۱ء میں عنایت فرمایا۔ دوسری "ست درشن بھاشیہ" میں مہرشی کی فلسفیانہ تعلیمات درج ہیں۔ تیسری "شری رمن گیتا" ہے اس میں گنپتی شاستری نے جو سوالات مہرشی سے کئے تھے ان کے جوابات بالترتیب درج ہیں۔ چوتھی "ست دویا" ہے اسمیں ادھیاتم ودیا

کے بنیادی اصول جو مہرشی کے ذاتی افکار کا نتیجہ ہیں یکجا کر کے شائع کئے گئے ہیں۔ پانچویں وہ کتاب ہے جس میں سری اروناچلم کی مدح و ثنا میں مہرشی نے تامل زبان میں جو پانچ مبسوط نظمیں لکھی تھیں ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں شائع کیا گیا ہے۔ آپ کی ان چند مختصر کتابوں کا جن میں آپ کا روحانی فلسفہ درج ہے۔ انگریزی کے علاوہ جنوبی اور شمالی ہند کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ نرسنگھ سوامی نے مہرشی کے سوانح حیات اور تعلیمات کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا ہے اس کا انگریزی نام Self Realization یا خود شناسی ہے ڈاکٹر پال برنٹن نے مہرشی کے حالات اور پیغام کئی سال ہوئے انگریزی زبان میں شائع کئے تھے۔ مہرشی کی حقیقی روحانی تعلیم کا لب لباب صرف اس قدر ہے کہ انسان خدا کی معرفت اسی وقت حاصل کر سکتا ہے جب اپنی حقیقت کو پہچانے۔ مٹی کے برتن کی طرح جسم ایک مادی شے ہے اسمیں شعور ذات ممکن نہیں۔ لیکن ہم تو قائم بالذات روح (آتما) کی حیثیت سے گہری نیند کی بھی خبر رکھتے ہیں جس کیفیت میں جسم کا شعور تک باقی نہیں رہتا لہذا "میں" جسم سے مختلف ہے تو پھر "میں" کون ہوں؟ کہاں سے ہوں؟ اس سوال کی تحقیق جو کوئی تیز نظر باطن کے ذریعے اصل ذات میں مستحکم قیام کے ساتھ مسلسل کرتا رہتا ہے اسی کے قلب میں نور حق، خود شاعر، خود منور اور بے عیب کمال کی حیثیت سے اپنی حیثیت دکھلاتا ہے۔ جب تک محسوسات کی خواہش نفس میں پوشیدہ رہتی ہے "میں کون ہوں" کی تحقیق جاری رکھنا ضروری ہے جس وقت خیالات پیدا ہوں اسی دم تحقیق تلاش حق کے طریقے سے ان کی بیخ کنی اسی مقام پر کر دینی چاہئیے جہاں سے کہ وہ پیدا ہوئے ہوں۔ اچھے اور برے دو قسم کے نفس نہیں ہوتے، نفس تو ایک ہی ہوتا ہے۔ البتہ نفس کے رجحانات دو طرح کے ہوتے ہیں اچھے اور موافق اور برے اور ناموافق۔ جب اچھے رجحانات کے ساتھ نفس کا تعلق ہوتا ہے تو اچھا کہلاتا ہے اور اسی طرح برے رجحان کے ساتھ برا۔ انسان خواہ کتنا ہی برا نظر آئے اس سے نفرت کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ رغبت اور نفرت، دونوں یکساں ترک کے قابل ہیں۔ زندگی کے کاروبار میں نفس کو یک لخت پھنسا دینا مناسب نہیں۔ انسان کو چاہئیے کہ وہ اپنے نفس کی تحلیل کرے اور خود اپنے آپ سے دریافت کرے کہ میں کون ہوں؟ اس طریق عمل سے اس پر رفتہ رفتہ یہ امر منکشف ہو جائیگا کہ وہ یہ خاکی جسم نہیں نہ حواس خمسہ اور دل و دماغ، اس کا حقیقی آتما ان تعینات سے برتر ہے۔ انسان روح مطلق ہے جو ان عارضی غلافوں میں ڈھکا اور تعینات میں بندھا ہوا ہے جب انسان غور و فکر سے دل کو یکسو کر کے اپنے باطن کی طرف رجوع ہوتا ہے تو اسکی حقیقت خود بخود اس پر ظاہر ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں انانیت حقیقی ہوں نہ کہ شخصی۔ اور اس انانیت کا تعلق اس ذات پاک سے ہے جو ہر شے میں جاری و ساری ہے، جو لافانی اور قائم بالذات ہے، اور جو عالم ظاہر کا حقیقی باعث ہے۔ اور جس کی وجہ سے تمام عالم قائم ہے۔

غلط فہمیاں

(از سید اختر علی تلہری)

ایک بت گر کو حرم کا پاسباں سمجھا تھا میں
رہزنِ ملت کو میرِ کارواں سمجھا تھا میں

جو نہیں تھا محرمِ اسرارِ عشقِ پاک ذوق
بد نصیبی سے اُسے پیرِ مغاں سمجھا تھا میں

وہ تو نکلا اور بھی اوہام کے زیرِ نگیں
جس کو میرِ مجلسِ دانشوراں سمجھا تھا میں

ایک بجلی ایک آندھی سے جو بچ سکتے نہ تھے
اُن خس و خاشاک کو آرامِ جاں سمجھا تھا میں

الاماں، یہ ذوقِ عرفاں کی مری کوتاہیاں
ارضِ کعبہ ہی کو اُس کا آستاں سمجھا تھا میں

اللہ اللہ یہ فریبِ وہم کی عشوہ گری
خاکدانِ دہر کو اپنا مکاں سمجھا تھا میں

اب جو دیکھا تو جہاں کی وسعتوں کی حد نہ تھی
چار دیوارِ عناصر کو جہاں سمجھا تھا میں

بال و پر جب ہو گئے بیکار تب آنکھیں کھُلیں
"وائے نادانی قفس کو آشیاں" سمجھا تھا میں

اپنے دل کو خود فریبی سے طریقِ عشق میں
کامیاب و کامگار و کامراں سمجھا تھا میں

چند نوحے نکلے اس کے زمزموں کی کائنات
عندلیبِ خوش نوا کو شادماں سمجھا تھا میں

غور سے دیکھا تو نکلے خار بھی جانِ چمن
لالہ و گل کو متاعِ گلستاں سمجھا تھا میں

تھی وہ اپنے ہی نظر کے ذوق کی جلوہ گری
جس کو رنگینیِ روئے دلبراں سمجھا تھا میں

اپنی جانب موڑ لی آخر مشیت کی عناں
دل کی ہمت کو زبون و ناتواں سمجھا تھا میں

اب کھُلا اختر کہ یہ بھی ارتقا کا جوش تھا
روح سے تن کے تعلق کو زیاں سمجھا تھا میں

تاثرات

(از جناب فاروق محشر بدایونی)

خوشی بھی بیکراں، غم بھی بکثرت لے کے آیا ہوں
میں اس کوتاہ دل میں کتنی وسعت لے کے آیا ہوں
بہر داماں متاعِ اشکِ حسرت لے کے آیا ہوں
ترے دردِ جدائی کی امانت لے کے آیا ہوں

ابھی تک ہر بھری محفل میں ٹھکرایا گیا جن کو
وہ امیدیں بامیدِ عنایت لے کے آیا ہوں

اگر کچھ تو سہارا دے تو پھر اٹھکر وہیں پہونچوں
جہاں سے غم بعنوانِ مسرت لے کے آیا ہوں

تھا بے خوشبو و بے نکہت سا میرا دامنِ ہستی
میں اس دامن میں اب اک گل کی نکہت لے کے آیا ہوں

زمانے کی ہواؤں سے بچا تا حدِ منزل تک
بڑی مشکل سے اک شمعِ محبت لے کے آیا ہوں

جنھیں روحِ محبت کہیئے جانِ آرزو کہیئے
وہ گھڑیاں حاصلِ تسکین و راحت لے کے آیا ہوں

لپٹ کر رہ گئی ہے یوں مرے دامانِ ہستی سے
میں اپنے ساتھ جیسے شامِ فرقت لے کے آیا ہوں

میں وہ اک خوں کا قطرہ ہوں دل کی تہ میں اے محشر
جب آنسو بن کے اٹھا ہوں قیامت لے کے آیا ہوں

رفتارِ زمانہ

جہاں تک جنگ کا تعلق ہے گزشتہ ماہ سب کی نظریں اطالوی محاذ پر لگی رہیں۔ آخرکار اٹلی کو ہتھیار ڈالنے ہی میں خیریت نظر آئی، اور اتحادیوں کے اٹلی خاص میں قدم رکھنے کے بعد چارہ کار ہی کیا تھا۔ چنانچہ بتاریخ ۳ ستمبر ۱۹۴۳ء اٹلی اور جنرل آئزن ہاور کے درمیان التوائے جنگ کی شرطیں طے ہوکر ان پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔ یہ شرائط اولاً اس خیال سے صیغۂ راز میں رکھے گئے کہ جرمنی ان سے باخبر ہوکر فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن بالآخر ۸ ستمبر کو یہ شرطیں دنیا کے سامنے آگئیں۔ ان میں سے چند اہم شرائط یہ ہیں:۔

(۱) اٹلی کی جانب سے مسلح مزاحمت فوراً بند کی جائے۔ (۲) اٹلی اس بات کی ہر امکانی کوشش کریگا کہ جرمنوں کو کوئی سہولت نہ پہونچے لیکن اتحادیوں کو ہر قسم کی امداد ملے (۳) اتحادیوں کے جتنے قیدی اٹلی کے قبضہ میں ہیں وہ فوراً رہا کر دئے جائیں گے (۴) اطالوی سمندری اور ہوائی جہازوں کو ان بندرگاہوں اور اڈوں میں بھیج دیا جائے جہاں کے بارہ میں اتحادیوں کے کمانڈر انچیف ہدایت کریں گے۔ (۵) تمام تجارتی بیڑہ اتحادیوں کے حوالہ کر دیا جائیگا (۶) کارسیکا اور دوسرے اطالوی جزائر اور مقامات کی اطالوی فوجیں فوراً اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈالدیں (۷) تمام اہم اطالوی مقامات جرمنی کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے لئے اتحادیوں کے حوالے کئے جائیں گے۔ (۸) تمام اطالوی بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں کو آزادانہ استعمال کرنے کا حق اتحادیوں کو حاصل ہوگا (۹) تمام اطالوی فوجیں جو اس وقت دوسرے محاذات پر متعینات ہیں فوراً واپس بلالی جائیں (۱۰) گارنٹی دی جائے کہ تمام شرائط کی مکمل پابندی کی جائیگی اور پابندی کی تعمیل میں ضرورت ہوئی تو فوج سے بھی کام لیا جائیگا۔ (۱۱) جنگ کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے ضروری ہوگا کہ اٹلی اپنے اندرونی نظم و نسق کو بھی اتحادی کمانڈر انچیف کی ہدایت کے موافق رکھے (۱۲) اتحادی کمانڈر انچیف کو اختیار ہوگا کہ جس طرح چاہے اطالوی دستہ کو غیر مسلح کر دیں اور جب چاہے اطالوی دستہ کو کسی مقام سے نکال دیں۔ (۱۳) جب اتحادی کمانڈر انچیف اجازت نہ دے معاہدہ خفیہ رہیگا (۱۴) معاہدہ انگریزی و اطالوی دونوں زبانوں میں ہوگا لیکن بصورت نزاع انگریزی زبان کا معاہدہ مستند سمجھا جائیگا۔ (۱۵) مزید شرطیں بعد میں پیش کی جائیں گی۔

یعنی ہتھیار ڈالنے کے بعد بھی اطالیہ کی سرزمین میدان کارزار بنی رہیگی اور جرمنی اور اتحادیوں کے درمیان زور آزمائی کے علاوہ وہاں خانہ جنگی کا بھی امکان نظر آتا ہے کیونکہ جرمنی نے اٹلی کے شمالی حصہ پر بزور قبضہ کر لیا ہے اور مسولینی کو قید سے رہا کرکے وہاں ایک فسطائی حکومت قائم کر دی۔ روم کا شہر اور نیپلز کی بندرگاہ بھی جرمنی کے قبضہ میں ہیں۔ اتحادی فوجیں برابر آگے بڑھ رہی ہیں۔ پانچواں اور آٹھواں لشکر اب متحد ہو گئے ہیں۔ مارشل بادوگلیو جو مسولینی کے زوال کے بعد اٹلی کے وزیراعظم مقرر ہوئے تھے مع شاہ وکٹر ایمانویل اسوقت غالباً اٹلی کے باہر سسلی میں پناہ گزین ہیں۔

اٹلی کے ہتھیار ڈالنے کا سب سے بڑا فائدہ اتحادیوں کو یہ پہنچا ہے کہ اطالوی بحری بیڑہ کا بیشتر حصہ اتحادیوں کے بندرگاہوں میں پہنچ گیا [illegible] اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اعداد سے [illegible] اٹلی کا بحری بیڑہ [illegible] اتحادیوں [illegible]

میں تھے جنھیں غیر مسلح کر دیا گیا ہے۔ کئی طیارہ بردار جہازوں کے علاوہ بہت سی اطالوی ڈبکنی کشتیاں بھی اتحادیوں کے قبضہ میں آ چکی ہیں جنکی تفصیلات معلوم نہیں ہوئیں لیکن اطالوی بیڑہ جاپان کے خلاف بھیجے جانیکے قابل نہیں ہے کیونکہ یہ صرف بحیرۂ روم کے محدود سمندر میں کام کر سکتا ہے۔ بحرِ ہند یا بحر الکاہل جیسے وسیع سمندروں میں کام نہیں دے سکتا۔

علاوہ اس کے اب اتحادی اٹلی کے تمام ہوائی اڈے استعمال کر سکیں گے اور اس طور سے جرمنی کی وسطی و جنوبی آبادیاں شدید بمباری سے محفوظ نہ رہ سکیں گی۔ اٹلی کی جنگ سے علیحدگی کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اب البانیہ اور یونان پر آسانی سے بحری حملہ کیا جا سکے گا اور اتحادی اپنی فوج یہاں بآسانی اتار سکیں گے، کیونکہ اب بحیرۂ روم کا مشرقی حصہ دشمن سے پاک ہو گیا ہے۔

اس مہینے میں مشرقی محاذ پر روسی افواج نے شجاعت و بہادری کے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ماہ اگست میں ہم نے روسی فوجوں کو خارکوف کا دروازہ کھٹکھٹاتے دیکھا تھا، آج ہم دیکھتے ہیں کہ روسی افواج کے سیلاب کے سامنے نہ صرف خارکوف ہی ٹھہر نہیں سکا ہے بلکہ اس کی رَو شمال مغرب اور جنوب مغرب دونوں سمتوں میں بہت دور تک بڑھتی چلی گئی ہے۔ بحیرۂ آزوف پر روستوف اور ماریوپول دو اہم بندرگاہیں جرمنوں کے قبضہ و اقتدار میں تھیں، روستوف تو دشمنوں سے پار سال چھین لیا گیا تھا، ماریوپول پر امسال قبضہ کر لیا گیا۔ اس اہم فتح کا نتیجہ بہت دور رس ہوگا یعنی نہ صرف یوکرین کے مشرقی پھاٹک کھل جائیں گے بلکہ دشمن کی جو فوجیں کریمیا میں ہیں، ان کا راستہ بھی خشکی کی طرف سے بند ہو گیا ہے۔

خارکوف پر قبضہ کرنے کے بعد سرخ فوجوں کی یلغار کے سامنے دشمنوں کے ہر طرف پاؤں اکھڑتے گئے۔ سرخ فوجوں نے شہر سومی پر بھی قبضہ کر لیا جو خارکوف کے شمال مغرب میں ایک بہت اہم جرمن مستقر تھا۔ اس کے علاوہ جنوب کی سمت جو یلغار کی گئی تو دشمن کو ٹاگنروک خالی کرنا پڑا۔ اس علاقہ میں روستوف، ٹاگنروک اور ماریوپول تینوں مقامات اہم ترین پوزیشن کے حامل ہیں ان تینوں پر اب روسیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ شمال میں ان روسی فوجوں کے جن کا رخ اسمولنسک کی طرف ہے آگے بڑھ جانے سے بہت سی جرمن فوجیں گھرتے گھرتے بچ گئیں اور انھیں مجبور ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس طرح سرخ فوجوں نے بہت سی روسی بستیوں کو دشمن کے پنجہ سے نجات دلا دی ہے۔ اس وقت روسی فوجوں کا رخ براہ راست اسمولنسک اور کیف کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اگر روسی بہادر ان دونوں شہروں کو واپس لینے میں کامیاب ہو گئے تو پھر روس میں جرمن فوج کا قدم نہیں جم سکتا۔ اس سلسلہ میں اس قدر بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ماسکو اسمولنسک ریلوے لائن پر ایٹموومک نامی ایک اہم ریلوے اسٹیشن پر روسیوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ ۷ ستمبر کو خبر آئی کہ روسی فوجوں نے کونوٹاپ پر قبضہ کر لیا ہے جو ایک اہم ریلوے جنکشن ہے اور ۹ ستمبر کو اطلاع ملی کہ روسی فوج ظفر موج نے آگے بڑھکر شہر باخماش پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ اسی طرح شمال کی طرف گومیل کو جانیوالی ریلوے لائن کاٹ دینے کے بعد ۱۹ ستمبر تک روسی فوجیں اس قدر پیش قدمی کر چکی تھیں کہ شہر نیز ہین چران کی توپوں کی زد پڑنے لگی تھی۔ اب روسی فوجوں کی یلغاریں اس قدر ترقی کر چکی ہیں کہ نہ صرف شہر کیف جو یوکرین کا صدر مقام ہے خطرہ میں پڑ گیا ہے بلکہ وہ ریلوے لائن بھی جو مرکزی اور جنوبی محاذوں کی جرمن فوجوں کے درمیان سلسلۂ تعلقات قائم رکھتی تھی۔ اب براہ راست خطرے میں پڑ گئی ہے۔ بلکہ بعض بعض جگہ سے تو لائن کاٹ بھی دی گئی ہے۔

لیکن سب سے زیادہ قابل قدر فتح جو روسی فوجوں کو اس دوران میں حاصل ہوئی ہے وہ جنوبی محاذ پر ہوئی ہے۔ یعنی ۸ ستمبر کو روسی فوجوں نے شہر اسٹالینو پر قبضہ کر کے جو آگے بڑھنا شروع کیا تو وہ سیتیل نکو دو کی طرف بڑھتی چلی گئیں، اگر یہ ریلوے جنکشن لے لیا گیا تو پھر نیپر و پیٹرو وسک تک کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہیگی۔ اور زاپوروژیا و میلیٹوپول زد میں آ جائیں گے۔ الغرض اس وقت روسی محاذ پر ہر طرف سرخ افواج کی فاتحانہ پیش قدمی جاری ہے اور شمال میں اسمولنسک

سے لیکر جنوب میں ساحل بحیرۂ اصعف تک تقریباً دس لاکھ جرمن فوجوں کو پیچھے ڈھکیلا جارہا ہے۔

فرانس کے مغربی ساحل پر برابر شدت کی بمباری جاری ہے، فانٹیر جو آبدوز کشتیوں کا ایک اہم اڈا ہے اور آماشیل، یا قسطودٹ اور کا گینک کے ہوائی اڈے ہوائی بمباری کا خاص نشانہ بنائے گئے۔ اس کا مقصد دشمن کی مدافعتی قوت کو کچلنا ہے۔ اور یہ بمباری آیندہ حملہ کا پیش خیمہ ہے۔

بحرالکاہل میں اتحادی برابر جاپان پر غالب آرہے ہیں اور پچھلے ماہ جاپانی بحری اور ہوائی نقصان اتنا کثیر ہوا ہے کہ اس کی آسانی سے تلافی نہیں ہوسکتی ہے۔ جاپان جس قدر سامان جنگ تیار کرسکتا ہے اُس سے کہیں زیادہ اُس کے نقصانات ہورہے ہیں۔ خشکی کی لڑائی میں بھی جاپانیوں کو شکست نصیب ہوئی ہے، چنانچہ لیہ جو نیوگنی میں سب سے بڑا جاپانی ہوائی اڈا تھا جاپان کے قبضہ سے نکل گیا ہے۔ اس کے پیشتر سالاموا پر اتحادیوں کا قبضہ ہوچکا ہے۔ سالاموا میں جاپانی مدافعت کی کمزوری سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاپان کو نہ فقط آدمیوں کی کمی محسوس ہورہی ہے بلکہ اُس کے ذرائع نقل وحمل کو بھی بہت نقصان پہونچا ہے، جس کی وجہ سے اس کو اپنی سپلائی لائن چھوٹی کرنی پڑی ہے۔

امریکن ذرائع سے یہ خبر آئی ہے کہ جنرل ٹوجو وزیر اعظم جاپان اپنے عہدہ سے مستعفی ہونے والے ہیں، ابھی حال ہی میں جنرل ٹوجو وزیر خارجہ نے شہنشاہ جاپان سے جنگی صورت حال کے متعلق گفتگو کی تھی۔ ٹوکیو سے جو سرکاری اعلان شائع ہوا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ خود جاپان میں اندرونی ملکی حالات موافق نہیں ہیں اور سیاسی انقلاب کا خطرہ موجود ہے۔

تین تقریریں | اس دوران میں تین شخصوں کی تقریریں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ مسولینی نے قید سے رہا ہوتے ہی ریڈیو پر ایک تقریر کی جس میں مارشل بڈوگلیو، چند دوسرے اطالوی جنرلوں اور خاص طور پر شاہ اطالیہ وکٹر عمانوئیل اور شاہی خاندان کے خلاف خوب زہر اگلا گیا، اور انھیں اٹلی میں بدنظمی اور جرمنوں کے خلاف پروپیگنڈا کا مجرم قرار دیا گیا۔ مسولینی نے کہا کہ ان لوگوں نے میری بیس سالہ کوششوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں نے بیس سال کی حکمرانی میں اٹلی کو اٹلی بنا دیا تھا، شاہ اطالیہ کو حبش کا شہنشاہ میں نے ہی بنایا تھا، اٹلی کے پاس نہ ذکر کے قابل بحری بیڑہ تھا نہ ہوائی طاقت، میں نے کوشش کرکے اٹلی کو دونوں چیزیں دیں جو اب اٹلی کے دوست نما دشمنوں نے بیک جنبش قلم اتحادیوں کے حوالہ کردی ہیں۔ شاہ اٹلی نے موجودہ جنگ کی قدم قدم پر مخالفت کی تھی، اور وہ اپنا تخت وتاج بچانے کے لئے اتحادیوں کی گود میں چلا گیا ہے۔ ان غداروں سے جواب طلب کیا جائیگا۔ اب اطالوی سپاہیوں کو شاہ اطالیہ یا شاہی خاندان کے کسی ممبر کو سلامی دینے کا حکم نہیں ہے۔

دوسری اہم تقریر ہٹلر کی تھی، جس نے اپنے دلی دوست مسولینی کے فراق میں خوب آہ وفغاں کی اور اتحادیوں کو خوب جی بھر کر برا بھلا کہا۔ ہٹلر نے کہا کہ دشمنوں کو جرمنی میں ایک بھی غدار نہیں ملیگا۔ اگر وہ اس خیال میں ہیں کہ جرمنی میں انقلاب سیاسی برپا کرادیں تو یہ اتحادیوں کی خام خیالی ہے۔ دشمن ابھی تک نازیوں کے نیشنل سوشلسٹ نظام کو سمجھ ہی نہیں سکے ہیں۔ ہٹلر نے یہ بھی کہا کہ اصل جنگ تو اب شروع ہوئی ہے، اب اتحادیوں کے سامنے اطالوی سپاہی نہ ہونگے بلکہ جرمن سپاہی ہونگے جن کی زندگی کا معمولی مشغلہ آگ وخون سے کھیلنا ہے۔ ہٹلر نے کہا کہ اتحادی فوجیں خواہ کتنا ہی زور لگائیں مگر وہ جرمنوں کو اٹلی سے باہر نہیں نکال سکتے۔ آخر میں ہٹلر نے حسب معمول پیشگوئی کی کہ آخری فتح جرمنی کی ہی ہوگی اور وہ ۱۹۴۴ء ہی میں ہوگی۔ [illegible] تو یہ دیکھا جارہا ہے کہ ہٹلر کی فوجیں ہر محاذ جنگ سے سر پر پاؤں رکھے بھاگی جارہی ہیں۔ روسی فوجیں خارکوف، بریانسک، اسمولنسک، پولٹاوہ وغیرہ اہم مقامات فتح کرنے کے بعد اب یوکرین کے صدر مقام کیف کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہیں اور ادھر جنوب کی طرف وادی ڈونیٹز کا اہم ترین شہر [illegible] فتح ہوچکا ہے اور کوئی دن میں فتح ہونے والا ہے۔ اٹلی میں بھی جرمن فوجیں گھر رہی ہیں، کہیں کہیں اطالیوں میں البتہ مقابلہ کر رہی ہیں [illegible]

مسٹر چرچل مسٹر چرچل نے اپنی تقریر میں جنگ کی موجودہ صورت حال پر بسیط تبصرہ کیا ہے جس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ محوری طاقتوں کو اب عرصہ تک [illegible] ہے اور افریقہ اٹلی میں محوری طاقتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اور اب آبدوز کشتیوں اور ہوائی حملوں کا خطرہ بھی دور ہو گیا ہے چنانچہ مسٹر چرچل نے بتایا ہے کہ ۱۰ ستمبر کو ختم ہونے والے چار مہینوں میں کوئی تجارتی جہاز کسی آبدوز کشتی نے شمالی اٹلانٹک میں نہیں ڈبویا اور [illegible] کے پچھلے دو مہینوں میں دنیا کے کسی سمندر کے اندر کوئی اتحادی جہاز دشمنوں کی آبدوز کشتیوں کا شکار نہیں ہوا ہے سمندری معرکہ آرائیوں کا دوسرا پہلو بھی دیکھنے کے قابل ہے یعنی ایک طرف تو امریکن کارخانجات جہاز سازی نے جہاز بنانے میں دنیا کا ریکارڈ توڑ دیا ہے اور دوسری طرف اٹلی کا بیڑہ بھی اتحادیوں کے قبضہ میں آ چکا ہے۔ اس طرح امید ہے کہ ابتدائے جنگ سے [illegible] جہازوں کے سلسلہ میں جو نقصانات اتحادیوں کو پہنچے ہیں وہ بہت جلد پورے ہو جائیں گے، اور سب سے بڑی جیت اتحادیوں کو یہ ہوئی ہے کہ ان کا بحیرہ روم پر کامل قبضہ و تسلط ہو گیا ہے جس سے بحیرہ روم کا اتحادی جنگی بیڑا آزاد ہو کر مشرقی سمندروں میں نبرد آزما ہونے کے قابل ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ دشمن کی آبدوز کشتیوں کی سرگرمیاں سست پڑ جانے کی وجہ سے برطانیہ نے فوجی اشیاء خصوصاً [illegible] کے عظیم الشان ذخیرے جمع کر لئے ہیں جو بقول مسٹر چرچل "اتنے کثیر ہیں کہ ابتدائے جنگ سے اب تک کبھی نہ ہوئے تھے"۔ برطانیہ کا شاہی ہوائی بیڑا اب اس قدر طاقتور اور وسیع ہے کہ اس کے ہوائی جہاز تعداد میں جرمنی کے پچاس فیصدی زیادہ صف اول میں ہو گئے ہیں۔ اگر اس میں روسی اور امریکن ہوائی طاقتوں کو بھی شامل کر دیا جائے جن کی طاقت روز افزوں ہے تو جرمنی کی ہوائی طاقت اتحادیوں کے پاسنگ بھی نہیں رہتی۔ اور سب سے [illegible] واقعہ یہ ہے کہ جرمنی کی ہوائی طاقت اب روبزوال ہے۔ [illegible] ہوائی جہاز جرمنی کے ضائع ہوتے ہیں اتنے وہ تیار نہیں کر سکتا اور اتحادی کارخانے [illegible] زیادہ ہوائی جہاز تیار کر رہے ہیں۔ [illegible] برطانوی امریکن اور روسی ہوائی جہازوں نے شب و روز حملہ کر کے جرمن شہروں پر قیامت برپا کر دی ہے۔ جرمنی کے صنعتی مرکز تہ و بالا ہو گئے ہیں جرمنی کی صلاحیت پیداوار سامان جنگ میں خرابی پیدا کر دی ہے، بڑے بڑے جرمن شہر خالی کر دیئے گئے ہیں حتی کہ حکومت کے دفاتر بھی اب برلن سے دوسرے مقامات کو منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ مغربی جرمنی اور مغربی یورپ کے مقبوضہ ممالک میں جو زبردست ہوائی ڈیفنس جرمنوں نے تیار کی تھی اب اس کے بخیے اڑائے جا چکے ہیں۔

لیکن مکمل اور آخری فتح ہوائی اور بحری جہازوں کی کثرت سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دشمنوں کو خشکی کے میدانوں میں شکست دی جائے۔ یہ مطالبہ اتحادیوں سے [illegible] فوجیں اتار کے یورپ میں ایک دوسرا محاذ قائم کر دیا جائے لیکن اس کا [illegible] کوئی فائدہ نہیں ہوا [illegible] یعنی جرمنوں کو روس کے سامنے سے اپنی فوجیں ہٹانے کی ضرورت نہیں پڑی، اور اس طرح روس کا بوجھ بھی ہلکا نہیں ہو سکا۔ اب ضرورت ہے کہ [illegible] جنوبی فرانس یا مغربی فرانس یا ہالینڈ و بلجیم میں اتحادی فوجیں اتاری جائیں۔ اگرچہ اس نقشہ جنگ نے ابھی تک کوئی عملی صورت اختیار نہیں کی ہے لیکن بقول مسٹر چرچل اس تیسرے محاذ کے زبردست امکانات موجود ہیں اور امید ہے کہ [illegible] پہلے محاذ معرض وجود میں آ جائے۔ اگرچہ مسٹر چرچل نے اپنے بیان میں اس قائم ہونے والے تیسرے محاذ کے متعلق کافی وضاحت نہیں کی ہے لیکن اتنا اشارہ ضرور کر دیا ہے کہ جس روز اتحادی [illegible] مناسب اور ضروری سمجھیں گے اسی دن یہ محاذ بھی قائم ہو جائے گا۔ اسی محاذ کے سلسلہ میں مسٹر چرچل نے یہ بھی کہا کہ "براعظم یورپ پر مغرب اور جنوب دونوں طرف سے ایک ساتھ حملہ شروع ہو گا" یعنی مغربی اور جنوبی فرانس پر بیک وقت حملہ کیا جائے گا۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ حملہ کب ہو گا لیکن اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زیادہ دیر نہیں لگے گی اور جرمنی پر ایک ایسی کاری ضرب ہو گی جس کے [illegible] اور جرمنی کی [illegible] شکست کا قطعی فیصلہ ہو جائے گا۔

مسٹر چرچل کی تقریر کا وہ حصہ خاص طور پر دلچسپ ہے جس میں انہوں نے [illegible] اور [illegible] اٹلی کے متعلق اتحادیوں کے [illegible] کا [illegible] اتحادی فوجیں [illegible] جرمنی کی فوجی [illegible] نکالنے کے [illegible] اٹلی [illegible] جنگ [illegible] اور [illegible] جرمنی کے خلاف [illegible] مسٹر چرچل [illegible] کے [illegible] جرمنی کے خلاف [illegible] اور اس [illegible] مسٹر چرچل نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ [illegible] فوجی طاقت کا استعمال [illegible] تشدد سے [illegible] کریں گے۔

جرمنی کے متعلق مسٹر چرچل نے [illegible] زیادہ وقت [illegible] جاپان کی بحری طاقت [illegible] کر دیا جائے۔ اور [illegible] مشرقی ایشیا کا [illegible]

ظاہر ہوتا ہے کہ جاپانیوں کے خلاف بہت جلد دیسے پیمانہ پر جنگی کارروائیاں ہونے والی ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ برسات کا موسم ختم ہونے کے بعد جب
ندی نالے معمولی پر آ جائیں گے اور فوجوں کی نقل و حرکت اور سامان جنگ و رسد کے نقل و حمل کی دقتیں موقوف ہو جائیں گی تو برما پر پوری
طاقت سے حملہ کر کے چین کو مدد پہونچانے کی کوشش کی جائیگی۔

ہندوستان | جنوبی ہندوستان کے اچھوت اقوام کے لیڈر مسٹر ایم سی راجہ کا انتقال ہوگیا ہے جو نہ فقط پست اقوام کے لئے
بلکہ تمام ہندوستان کے لئے ایک عظیم نقصان ہے۔ مسٹر راجہ کا نقطۂ نگاہ مسٹر امبیدکار سے جداگانہ تھا۔ مسٹر امبیدکار کی طرح آپکی یہ رائے نہ تھی کہ پست
اقوام کی بہبودی فقط ہندوؤں سے علیحدگی میں ہے بلکہ وہ ہندو ریفارمروں سے مل جل کر اچھوتوں کی بہتری کے لئے کوشش کرنا پسند کرتے تھے
مدراس میں کانگریس کے برسر اقتدار ہونے کے قبل مسٹر راجہ کچھ عرصہ تک مدراس میں عارضی گورنمنٹ کے وزیر تھے لیکن مسٹر راجہ گوپال اچاریہ نے انکو
اپنی کیبنٹ میں شامل نہیں کیا تھا۔

مرکزی لیجسلیٹیو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ میں ایک طرف تو ہندوستانیوں کے خلاف جنوبی افریقہ کی گورنمنٹ کی پالیسی کی مذمت کی گئی اور
یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جن کی رو سے ایسے ملکوں کے خلاف جوابی کارروائی کی جا سکے اور اُن سے کوئی تجارتی واسطہ
نہ رکھا جائے۔ دوسری طرف سر شفاعت احمد خاں کی زبانی یہ معلوم ہوا ہے کہ جنوبی افریقہ میں عنقریب ایک ہندوستانی تجارتی کمشنر مقرر
کیا جانے والا ہے جو دونوں ملکوں کی باہمی تجارت کو فروغ دیگا۔ گورنمنٹ ہند کی اس دو فصلی پالیسی سے ہندوستانیوں کے مفاد کی
کوئی بہتری نظر نہیں آتی ہے۔

برطانیہ کے وزیر معلومات نے جو مسٹر چرچل کے ہمراہ کینیڈا گئے تھے اخبارات کے نمائندوں کو بتلایا ہے کہ ہندوستان کا سیاسی
مسئلہ بالائے طاق رکھدیا گیا ہے کیونکہ اس وقت اس کے حل کرنے سے اتحادیوں کے جنگی مساعی کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔
اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ گاندھی جی اور دوسرے لیڈر جاپان سے ہمدردی رکھنے کے باعث قید کر لئے گئے ہیں۔ لیکن حال ہی میں مسٹر
امری نے دار العوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں جاپانیوں کی ہمدردی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے ہیں اور اسی وجہ سے پارلیمنٹ
میں گذشتہ اگست کے فسادات کے متعلق جو وائٹ پیپر پیش کیا گیا تھا اسمیں اسکا ذکر نہیں ہے یہ ضرور ہے کہ لیڈر بھی اس خیال کا مضحکہ
اُڑاتے ہیں کہ ہندوستان میں جاپان کی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے لیکن غالباً وزیر معلومات کا منشا محض یہ تھا کہ ہندوستان میں برطانوی پالیسی
کو حق بجانب ثابت کریں خواہ اسمیں سچائی کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

ہندوستان میں خوراک کا مسئلہ روز بروز زیادہ خطرناک ہوتا جاتا ہے بنگال ہی کا صوبہ اسکا شکار نہیں ہے بلکہ اڑیسہ، مدراس اور مالابار
کی حالت بھی خراب ہے۔ سر جے۔ پی۔ سریواستو ہندوستان کے فوڈ منسٹر مقرر کئے گئے ہیں۔ سر سی۔ پی۔ راما سوامی ایّر نے خوراک کے مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے
موجودہ صورت حال کو صوبجاتی حکومتوں کے جنون کا نتیجہ بتایا ہے یہ بیان حقیقت سے خالی نہیں ہے جبتک کہ صوبوں سے غلہ کی برآمد کو نامناسب
طور سے ممنوع قرار دینے کے اختیارات نہ لیلئے جائینگے اسوقت تک اس مسئلہ کا دیرپا اور اطمینان بخش حل ہونا مشکل نظر آتا ہے کیونکہ بعض صوبوں
نے انتہائی خود غرضی سے کام لیتے ہوئے غلہ کی برآمد کی ممانعت کر رکھی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ غلہ کی نقل و حرکت پر کسی قسم کا کوئی کنٹرول نہ ہونا چاہئے
بلکہ غلہ کی قیمت مقرر ہو جانا چاہئیے اور اسکی نقل و حرکت چند اصولوں کے ماتحت ہونا چاہئیے اور گورنمنٹ ہند کو فوراً قیاس پارلیمنٹ کے ساتھ ساتھ مرکزی
کا بایا پارلیمنٹ بھی قائم کرنا چاہئیے۔

اتحادیوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مشرقی محاذ کا کمانڈر انچیف مقرر کیا ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ابتک مشرقی محاذ پر جنگی اعتبار سے میدان کا
کوئی پروگرام طے نہیں ہوا تھا اسی سلسلہ میں اخبار نویسوں کے بیان کے مطابق جنرل چیانگ کائی شیک اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے درمیان ایک
متفقہ پروگرام طے کرنے کیلئے طویل گفت و شنید کی ضرورت ہوگی۔ اسی اخبار سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ خود برٹش لیڈروں میں اسکے متعلق اختلاف ہے کہ
جاپان کے خلاف کیا قدم اُٹھایا جائے۔ برما سے چین کو جو فوجی سڑک بنائی گئی تھی اسکی اہمیت اب نظر انداز کیجاتی ہے اور برما پر حملے کے متعلق
یہ کہا جاتا ہے کہ موجودہ حالات میں یہ قرین مصلحت نہیں ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ملایا اور سماترا پر بحری حملہ کیا جائے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن
بحری جنگ کے ماہر خیال کئے جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ مشرقی محاذ کو بہترین تصور فرمائیں بہر حال اگر یہ فوج کشی فی الحال ملتوی کر
دی جائیگی تو اس سے یقینی طور پر ہندوستان میں مزید مایوسی پیدا ہوگی۔



رام بالک کا روغن سوکھا

یعنی



بچوں کے سوکھا روگ کی شرطیہ اکسیری دوا

یوں تو دنیا میں ہزاروں بیماریاں ہیں مگر یہ ظالم دشمن جاں سوکھا مسان جسکو سوکھا روگ بھی کہتے ہیں بڑی بلا ہے اس نے لاکھوں ماؤں کی گودیاں خالی کر دیں ہنستے کھیلتے خوبصورت بچوں کو اس دشمن نے خاک میں ملا دیا۔ اس بیماری کا حال اُن غمزدہ دکھیاری ماؤں سے پوچھئے جن کے پیارے بچے سوکھا روگ میں مبتلا ہو کر انکے مامتا بھرے دلوں کو داغ دیجاتے ہیں۔ سوکھا روگ کے واسطے ماں باپ طرح طرح کے کام کرتے ہیں۔ جب بیمار ہو جاتے ہیں بچوں کو دغواتے ہیں سر کی رگ سے خون نکلواتے ہیں پیٹھ پر پان میں دوا ڈالکر پتے نکلواتے ہیں۔ کھیت کے کھیت میں لے جاتے ہیں تالابیں میں نہلواتے ہیں۔ جھاڑ پھونک کرواتے ہیں گلے میں گنڈے ڈلواتے ہیں۔ لالن تیل اور لال تیل ملواتے ہیں اور گدھی کا دودھ پلواتے ہیں۔ چونکہ بہت سے لوگوں کو سوکھا مرض کی پہچان نہیں ہوتی اور ناواقفیت سے طرح طرح کے تدابیر و علاج سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مرض بڑھتا جاتا ہے اسلئے اس مرض کی معمولی علامات درج کی جاتی ہیں تاکہ تشخیص مرض میں آسانی ہو اور جن بچوں میں یہ علامتیں پائی جائیں فوراً روغن سوکھا استعمال کرکے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یہ مرض عام طور سے چیت کے مہینے سے شروع ہو کر ساون بھادوں میں زور پکڑتا ہے اور اگہن کے مہینے تک رہتا ہے۔ اس عرصے میں لاکھوں بچے اس مرض کا شکار ہو جاتے ہیں سوکھا مرض میں بچہ دن بدن سست رہتا ہے حرارت قائم ہو جاتی ہے آنکھیں ہر وقت نڈھال رہتی ہیں بدن کا خون رفتہ رفتہ کم ہو جاتا ہے جسکی وجہ سے بچہ سوکھکر کانٹا ہو جاتا ہے ہاضمہ بالکل بگڑ جاتا ہے اور بدبودار ہرے پیلے دست آنے لگتے ہیں۔ سر کا تالو خالی ہو جاتا ہے کان کو ملنے سے روتا ہیں بچے کے ہاتھ پیر اور گردن پتلی پڑ جاتی ہے اور پیٹ بڑھ جاتا ہے۔ کھانسی آنے لگتی ہے آنکھیں سفید ہو کر گڑھے میں گھس جاتی ہیں چہرہ پر جھریاں پڑ جاتی ہیں بچہ ناک کان کھجلاتا ہے بھوک مرجاتی ہے اور دودھ ڈالنے لگتا ہے جب بچہ متواتر سست نظر آئے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ سوکھا روگ شروع ہو گیا ہے ایسی حالت میں فوراً رام بالک کا روغن سوکھا ملنا چاہیئے کیونکہ یہ تیل اس روگ کو ہمیشہ کیلئے جڑ سے کھو دیتا ہے چاہے بچہ سوکھ کر کانٹا ہی کیوں نہ ہو گئے ہوں اسکے استعمال سے بچے لال لال اور موٹے تازے ہو جاتے ہیں اگر سوکھا مرض نہ بھی ہو اور بچے دبلے پتلے ہو رہے ہوں تو بھی اسکے استعمال سے بچے بہت جلد تندرست اور طاقتور ہو جاتے ہیں۔ سوکھا روگ کیلئے بازاروں میں بہت سے تیل ملتے ہیں جو بدن پر ملنے کیلئے ہوتے ہیں مگر ہمارا روغن سوکھا جسم پر ملا نہیں جاتا بلکہ پلایا جاتا ہے اسلئے اس مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور بچے کے اچھا ہو جانے پر پھر اس مرض کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرض سوکھا دوا سے نہیں جاتا لیکن یہ خیال غلط ہے کیونکہ خدا نے ہر مرض اور دکھ کی دوا پیدا کی ہے اور رام بالک کا روغن سوکھا ہزاروں بار کی آزمودہ مجرب دوا ہے۔ آجتک سوکھا مرض کی اس سے بڑھکر مفید دوا نہیں بن سکی آزمائش کے بعد آپ خود ہی ہماری صداقت کی شہادت دیں گے۔ روغن سوکھا کا اشتہار نفع کمانے کیلئے نہیں دیا جاتا ہے بلکہ اس مہلک مرض سے بے زبان بچوں کی زندگی کی حفاظت مقصود ہے کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جس کا ہر گھر میں رکھنا ضروری ہے اور اسی لئے یہ لاگت ہی کے دام پر ضرورتمندوں کو دیجاتی ہے یعنی ایک شیشی کی قیمت صرف ۱۲ آنے جو قریب ایک مہینہ تک کام آتی ہے باہر سے منگانے والوں کو خرچ پیکنگ و ڈاک خرچ خود دینا پڑیگا ایک سے تین شیشیوں تک محصول ڈاک لگتا ہے ایک شیشی پر بھی یہی خرچ پڑیگا اسلئے کئی شیشیاں اکٹھی منگانے سے ڈاک خرچ میں کفایت ہوتی ہے۔ روغن سوکھا کے لئے ہر جگہ ایجنٹوں کی ضرورت ہے جن کو معقول کمیشن دیا جاتا ہے۔

المشتہر

رام بالک پنساری و عطار بیگم گنج والے نارئیل بازار کانپور برانچ آفس بیگم گنج کانپور

THE ZAMANA, NOVEMBER 1943. Rd. No. A 14

زمانہ

بیادگار منشی دیا نراین صاحب نگم مرحوم

نمبر ۵	نومبر ۱۹۴۳ء	جلد ۸۱

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

روغن جوانی کی واپسی



مشہور تو یہی ہے کہ

آ کر جو نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جا کر جو نہ آئے وہ جوانی دیکھی

لیکن ہماری مایۂ ناز **"معجون شباب آور"** نے یہ نظریہ بڑی حد تک غلط ثابت کر دیا کیونکہ اس سے جاتی ہوئی جوانی ایک دفعہ ٹھہر جانے پر مجبور ہو جاتی ہے اور بڑھاپے کا سیلاب آگے نہیں بڑھتا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ عروس جوانی اپنے رہنے کے لئے ایک آراستہ مکان چاہتی ہے وہ بوسیدہ کھنڈروں میں نہیں رہتی پس انسانی اعضا میں کمزوری اور قویٰ میں فرسودگی پیدا ہوتی ہے تو جوانی اس ویرانے سے گھبرا کر چل دیتی ہے۔ اگر کوئی ایسی تدبیر ہو کہ اعضا کو کمزوری اور قویٰ میں فرسودگی پیدا ہوتی ہے تو جوانی اس ویرانے سے گھبرا کر چل دیتی ہے۔ اگر کوئی ایسی تدبیر ہو کہ اعضا کو کمزوری اور قویٰ کو فرسودگی سے بچا لیا جائے تو جوانی اپنا ارادہ ملتوی کر دیتی ہے اور واپسی پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے "معجون شباب آور" دنیا کی تمام مقوی دواؤں سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی ہے یہ حلق سے اترتے ہی اپنا تعمیری کام شروع کر دیتی ہے اور برباد شدہ نظام کی درستی میں مصروف ہو جاتی ہے اعصاب میں نئی روح پھونکتی ہے اور دل و دماغ اور جملہ اعضائے رئیسہ کو طاقت دیتی ہے معدہ کی اصلاح کرتی ہے جس سے ہاضمہ درست ہو کر خون صالح پیدا ہوتا ہے مادۂ تولید کے خالی ذخیرے رفتہ رفتہ لبریز ہو جاتے ہیں اور وہ شخص جو خواب میں بھی صنفی جذبہ محسوس نہیں کرتا تھا مادہ کی زیادتی اور قویٰ کی بیداری و سرگرمی سے مست و بیخود ہو جاتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ آزمائش سے معلوم کیجئے۔



قیمت فی شیشی (۲۰ خوراکیں) پانچ روپے
نمونہ کی شیشی ایک روپیہ

ہمدرد دواخانہ لال کنواں دہلی

نوٹ: مقامی حضرات ہمدرد، لکھنئو، دہرادون، مونگیر، ناسک، کانپور سے یہ شربت حاصل کریں۔

زمانہ

جلد ۱۷ نومبر ۱۹۴۳ء نمبر ۵

اقبال کے شعر و فلسفہ کا پیام

(از سید اختر علی تلہری، گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہانپور)

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اقبال ہندوستان کے دورِ جدید کے شاعرِ اعظم ہیں۔ انھوں نے اگر ایک طرف تخیل کے لئے نئی نئی فضائیں تلاش کی ہیں تو دوسری طرف اظہار خیال و بیان مطالب کے لئے تازہ بتازہ نو بنو اسلوب اختراع کئے ہیں۔ اقبال کی انھیں صناعانہ نادرہ کاریوں نے اُن کی شاعری میں شوکت و رفعت اور تازگی و شگفتگی پیدا کر دی ہے۔ اُن کی اسی جاذبِ نظر انفرادیت کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں اردو و فارسی کے جو نئے شاعر پیدا ہو رہے ہیں اُن میں سے بیشتر انھیں کے خرمن سے کم و بیش خوشہ چینی کو اپنے ارتقائے شاعری کا مقصدِ کامیاب سمجھتے ہیں۔ کہیں کہیں زبان و محاورہ کے لحاظ سے اقبال کی شاعری میں لغزشِ قلم کی مثالیں نظر آتی ہیں لیکن ان کے عام بلند معیارِ شاعری کو پیش نظر رکھتے ہوئے قابلِ اعتنا نہیں۔ اُن کے شاعرانہ تجربوں کے حکیمانہ پہلو، طرزِ بیان کا جوش، اُن کے استعاروں اور تشبیہوں کا ندرت آفرین شکوہ اور اُن کے شعری لہجہ کا عام ترنم کیونکر نظر انداز ہو سکتا ہے۔ اقبال یقینی طور سے ایک بڑے فن کار ہیں اور ایسے فن کار جو "شعرِ بے مثال" کے مالک ہیں۔ یہ سب اُن کی بلند پایہ شاعری کا اعتراف سہی مگر اقبال کے شعری ذخیرہ پر نظر ڈالنے والے کو اس سے تسلی نہیں ہو سکتی۔ "اقبال" محض شاعر یا شاعر ہی نہیں ہے وہ ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، وہ ہمارے سامنے "محرم رازِ درونِ میخانہ" کی حیثیت سے ایک صاحبِ نظامِ فلسفی کی حیثیت سے، ایک معلمِ انسانیت و پیامبر کی حیثیت سے آتا اور اسی حیثیت سے اپنے کلام پر نظر کی دعوت دیتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے جب علامہ اقبال کی شاعری کا منظم مطالعہ کیا جاتا ہے تو ان کے نظامِ فلسفہ کی فکری معقولیت اور اُن کے اسلامی و انسانی پیام کی عملی افادیت کے متعلق گوناگوں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اقبال اپنی جگہ پر ایک مفکر حکیم سہی، ان کا مغرب و مشرق کے نظامات فلسفہ کا مطالعہ نہایت وسیع سہی، ان کے شاعرانہ تخیلات میں فلسفیانہ تصورات پورے طور سے شریک سہی، اُن کے یہاں تعمیر و تنقیدِ حیات کی بھی افراط سہی، مگر ہمیں اجزا کی انفرادی نوعیت سے بحث نہیں ہے بلکہ بحث اُس مجموعہ کے مزاج سے ہے جو ان اجزا کی ترکیب و ترتیب سے حاصل ہوتا ہے اور اقبال کے اُن عالی مضامین کا ذکر نہیں جو اُن کے ذیل کے غزلیہ اشعار

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا — خطا اس میں بندہ کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا — تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

کو سہل ممتنع اور تغزل کا اعلیٰ معیار قرار دیتے ہیں، وہ اگر اُن کے فلسفہ کے نظام اور پیام کے مزاج کو حکیمانہ تعقل و تفکر کا شاہکار اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کی دنیا و عقبیٰ سنبھالنے کا سیدھا راستہ سمجھتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ درحقیقت یہ سوال کہ اقبال کے فلسفیانہ تصورات کا مجموعہ متضاد عناصر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے کہیں ایک شاعر کا ایسا خواب تو نہیں ہے جس میں اس کی صلاحیت نہ ہو کہ وہ ہمارے لئے کسی واضح و مفید مسلک کی موجودہ تمدنی و اقتصادی حالات کے ماتحت تعیین کر سکے نہایت اہم ہے اور ضرورت ہے کہ اس پر اس شاعرِ اعظم کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر غور و فکر کیا جائے۔

اس طرف میں نے اقبال کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، اور کیوں نہ صاف صاف کہوں کہ اُس کے پڑھنے کے بعد میرے دل میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہوئے، ان کے دُور کرنے کے لئے اس نادرہ گفتار مفکر شاعر کے سخنہائے دلپذیر کے علاوہ بعض وہ مبسوط تصنیفات بھی پڑھیں جو اُس کے شعر و فلسفہ کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں لکھی گئی ہیں۔

روحِ اقبال مصنفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں اقبال کے شعر و فلسفہ پر ایک بسیط کتاب ہے۔ ڈاکٹر یوسف اقبال کے مداح ہی نہیں بلکہ عقیدتمند بھی ہیں۔ انھوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اقبال کے فلسفہ کا تحلیل و تجزیہ معتقدانہ طور سے نہایت دل لگا کر کیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف کی یہ کوشش اپنی جگہ پر قابلِ ستایش ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ وہ اصل اُلجھنوں کے دُور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ یوں تو مجھے اقبال کے مابعد الطبیعیاتی تصورات اور عقل و وجدان اور تخیل مملکت و ریاست کے نظریات کے متعلق بھی بہت کچھ کہنا ہے مگر اُس کے متعلق پھر کبھی مستقل وقت نکالا جائیگا۔ اس صحبت میں تو اس

سوال پر غور کرنا ہے کہ اقبال کے فلسفہ کا مرکزی پیام کہاں تک منطقی حیثیت سے درست اور کراہتی ہوئی انسانیت یا پھر شکار حوادث مسلمانوں کے درد کا درماں بن سکتا ہے۔

اقبال اور نوع انسانی کی عام فلاح کا سوال اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد سب سے پہلے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ایشیا کا یہ شاعر اعظم جرمنی کے فلسفی نیچے (Nietsche) سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ نیچے کے تصورات کا عکس اقبال کے اسلوب فکر میں مختلف منزلوں پر نظر آتا ہے۔ اسی تاثر کے ماتحت انھوں نے کہیں اس جرمن فلسفی کے متعلق یہ کہا ہے:-

از سستی عناصر انسان دلش تپید نگر حکیم پیکر محکم تر آفرید
افگند در فرنگ صد آشوب تازۂ دیوانۂ بکارگہ شیشہ گر رسید

کہیں یہ فرمایا ہے:-

گر نوا خواہی ز پیش او گریز در نئے کلکش غریو تندر است
نیشتر اندر دل مغرب فشرد دستش از خون چلیپا احمر است
آنکہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت قلب او مومن دماغش کافر است
خویش را در نار آں نمرود سوز زانکہ بستان خلیل از آزر است

ان اشعار سے اقبال کی نیچے سے اُس نیچے سے جو نظریۂ عزم للقوۃ کا موجد ہے اور جو رحم و مروت کا شدید ترین دشمن[1] ہے کمال عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے اس شاعر مشرق نے نیچے کے دماغ کو کافر کہا ہے، لیکن اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے۔ اس کی تشریح پیام مشرق کے حاشیہ میں موجود ہے مگر اس کے قلب کو تو مومن کہا گیا ہے۔ یہ خود واضح ایما ہے اس امر کی طرف کہ ہمارے شاعر کو نیچے کے معاشرتی و تمدنی تصورات سے بہت کچھ اتفاق ہے۔ اتحاد خیالات کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اقبال کو اس جرمن فلسفی ہی کے مذاق کی تشبیہیں زیادہ پسند ہیں۔ ہمارے اس مشرقی شاعر نے مسلمانوں کو شاہین و باز وغیرہ ہی کی خصلتیں اختیار کرنے کی زیادہ تر تلقین کی ہے۔ جس کا دوسرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کمزوروں کے شکار کرنے کو برتری حاصل کرنے کا کارنامہ سمجھتا ہے۔ آخر نیچے کی روشن کی ہوئی تمدنی آگ میں اپنے کو جلانے کا منشا

[1] نیچے ایک جگہ لکھتا ہے "رحم ان حسیات و جذبات کی مخالفت کرتا ہے جو انسان کی رفعت خیالی کا باعث ہوتے ہیں۔ رحم انسان کے حوصلوں کو پست کرتا ہے۔ جب آدمی رحم کرتا ہے تو اس کا زور گھٹ جاتا ہے، رحم نشو و نما اور ترقی کے قانون انتخاب کو توڑ دیتا ہے۔ رحم اُن اشیا کی حمایت پناہی کرتا ہے جو موت کے لئے بالکل تیار بیٹھی ہیں۔ رحم اُن لوگوں کے لئے جھگڑا مول لیتا ہے جو محروم الارث اور مردود مقتاب ہیں۔" دوسری جگہ کہتا ہے۔ "کمزور اور خستہ لوگوں کا مر ہی جانا بہتر ہے۔ ایسے لوگوں کا مرنا ہماری انسانیت کی شرط اولین ہے۔ ایسوں کے ساتھ رحم و مروت ہرگز نہ کرنا چاہیے بلکہ اگر موقع ملے تو اُن کے مرنے میں مدد کرنا چاہیے۔"

اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ شاہینی قوت کا حاصل کرنا ہی انسانی زندگی کا نصب العین بنا لیا جائے ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب مصنف "روحِ اقبال" نے بھی اقبال کا یہ رجحان تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ روحِ اقبال صفحہ ۱۰۰ پر لکھتے ہیں:-

"اقبال شاعرِ حیات ہے اُس کے آرٹ اور زندگی کے تصور میں مظہرِ قوت کو خاص اہمیت حاصل ہے، اُس کے نزدیک زندگی کا اعلیٰ ترین اظہار قوت کی شکل میں ہوتا ہے، وہ جہاں کہیں کائناتِ فطرت میں اس مظہرِ حیات سے دو چار ہو جاتا ہے تو وہ فوراً ٹھٹک جاتا ہے۔ یہ منظر اس کے لئے جاذبِ نظر ہے اور اس کے آرٹ کے لئے محرک کا کام دیتا ہے۔ محرکاتِ تخلیقی اس قدر متنوع ہوتے ہیں کہ اُن کا نفسیاتی تجزیہ ممکن نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اقبال کے وجدان اور جذباتِ شعری کو جو چیز سب سے زیادہ متحرک کرتی ہے وہ مظہرِ قوت ہے جو اُسے عالمِ انسانی اور عالمِ فطرت دونوں میں نظر آتا ہے۔ قوت میں اُسے حُسن نظر آتا ہے، قوت اظہارِ حُسن ہی کی ایک خاص شکل ہے، جہاں کہیں اُس کی آنکھ اس مظہرِ حیات پر پڑتی ہے تو وہ جھومنے لگتا ہے۔"

سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان مفکر کے لئے آخر یہ رجحان کیونکر مناسب ہو سکتا ہے؟ جو شخص کم سے کم پانچ وقت "الرحمٰن الرحیم" نہایت خضوع و خشوع سے اپنی زبان پر جاری کرتا ہے، جو قرب و بطحا کے مایۂ ناز پیغمبر کو "رحمۃ للعالمین" دل سے تسلیم کرتا ہے اُس کے لئے قوت کے ہر مظہرِ حیات پر جھومنے لگنا کیونکر درست قرار پا سکتا ہے؟ اسلامی و انسانی افکار و اعمال کے چوکھٹے میں نیچے کے مذاق کی یہ تصویر آخر کیونکر جڑی جا سکتی ہے؟ غور کی نظر نیچے کے معاشرتی تصورات پر عمل پیرا ہونے کا صرف یہی نتیجہ نکال سکتی ہے کہ عملی رجحانات میں جارحانہ پہلو پیدا ہو جائیں، اور اس آگ و خون کے کھیل کھیلنے سے دلچسپی پیدا ہو جائے جسے سیزر و چنگیز وغیرہ اگلے زمانہ میں کھیل چکے ہیں، اور آج اطالیہ و جرمنی کے آمر کھیل رہے ہیں۔ یہ بات بہرحال سمجھ لینے کی ہے کہ قوت سے مسحوریت جس نظامِ فلسفہ کی بنیاد میں داخل ہو اُس پر عامل ہو کر کوئی معاشرہ، سوسائٹی، سماج اپنے لئے مستقل اقدارِ حیات کی تخلیق کیونکر کر سکتی ہے اور اُس کی حقیقی فوز و فلاح کا سامان کیونکر مہیا ہو سکتا ہے؟ اپنے کمزور ہم جنسوں کو طاقت اور اقتدار کے اسلحہ سے برابر کچلتے رہنا خواہ نیچے اور اُس کے ہمنواؤں کی فطرتوں کے لئے کتنا ہی مسرت خیز مشغلہ ہو اور اُس کے جواز کے لئے کتنے ہی عذر تراشے جائیں لیکن سوال یہ ہے کہ آیا مسلمان اس مسلک پر چل کر اپنے اسلامی پر و بال میں طاقت پیدا کر سکتے ہیں اور آیا اس قسم کی سطوت و جبروت پیدا کرنے کا پیام خواہ وہ کتنے ہی دلکش اور شاندار لفظوں میں ترتیب دیا جائے، سرورِ کائنات کی تلقین و ارشاد کی روح کا حامل سمجھا جا سکتا ہے

اقبال کا تضادِ فکر یہ صحیح ہے کہ اقبال نے جہاں نیٹشے کی بارگاہ میں عقیدت کا اظہار کیا ہے وہاں کارل مارکس (Carl Marx) اور لینن (Lenin) سے بھی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ تصوف کے قائدِ اعظم مولانا رومی کے تو وہ خاص طور پر معتقد ہیں مگر بظاہر یہ بات اقبال کے تضادِ فکر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اقبال نے اکتسابِ قوت کا جو مسلسل پیام دیا ہے اور جس بلند لہجہ میں دیا ہے اُس کے منطقی نتائج میں کارل مارکس و لینن وغیرہ کے اقتصادی افکار کی حمایت، وہ مشروط ہی سہی، کہیں سے نہیں کھپتی، یہ زبردستی کا ایک غیر مربوط ضمیمہ معلوم ہوتا ہے، نیٹشے اور مارکس دو متضاد عقیدہ رکھنے والی شخصیتیں ہیں، اُن کے افکار کے مرکزی نقطے ایک دوسرے سے کہیں نہیں ملتے۔ ڈاکٹر یوسف نے اس تضاد کے دُور کرنے کے واسطے ذیل کی سطریں لکھی ہیں:-

> "اقبال "مظہرِ قوت" کا قدردان ہے، چاہے وہ اپنوں میں ملے یا غیروں میں، چاہے عالمِ فطرت میں ہو یا عالمِ انسانی میں، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ہو خالص سونا، ملمع نہ ہو۔ بعض اوقات لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ وہ اس جذبہ کے تحت متضاد خیالات کا اظہار کر جاتا ہے۔ اُس کی محفل میں لینن اور مسولینی نیٹشے اور ٹالسٹائی برگسیوں اور کارل مارکس، مصطفےٰ کمال اور جمال الدین افغانی پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ فکر کا تضاد ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس خیال کی تہ میں لطیف ہم آہنگی موجود رہتی ہے۔ اقبال پیشہ ور فلسفی نہیں جس کے نزدیک تجریدی منطقی واسطوں کو زندگی سے زیادہ اہمیت حاصل ہو، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ زندگی سب کچھ ہے لیکن منطق نہیں۔ زندگی کے مظاہر کی طرح آرٹسٹ بھی منطق کا پابند نہیں ہوتا۔"

ڈاکٹر صاحب کی عبارتِ بالا سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایشیا کا یہ شاعرِ اعظم "مظہرِ قوت" کا غیر معمولی قدردان ہے، صرف شرط یہ ہے کہ وہ خالص سونا ہونا چاہیئے۔ اِس سے کیا یہی نتیجہ نہیں نکلتا کہ اقبال کی نگاہ میں نیٹشے اور مسولینی دونوں ہی سونا ہیں۔ مگر بڑی دقت کی بات یہ ہے کہ ان شخصیتوں کی قوتوں کا رخ بالکل ہی مخالف و متضاد سمتوں میں ہے۔ ایسی حالت میں دونوں قوتوں کو یک وقت سونا کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ تو اہرمن و یزدان، شر و خیر دونوں کے سامنے ایک ہی وقت میں سرِ نیاز خم کرنا ہے۔ آخر دونوں ہی قوتیں ہیں، اور جب مسولینی کی طاقت ملمع نہیں ہے سونا ہے تو پھر اہرمن و شر کو سونا ماننا ہی پڑے گا۔ صرف طاقت میں اشتراک کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کا اقبال کی مظاہرِ قوت کی پرستاری میں لطیف ہم آہنگی ڈھونڈ ھنا لطیف و جدانی چیز سہی مگر عقل و دانش سے بے بنیاد ہے۔ اقبال پیشہ ور فلسفی نہ سہی غیر پیشہ ور فلسفی سہی تاہم تنظیمِ خیالات و تاسیسِ نظامِ فلسفہ کے لئے اس میں منطق سے بے نیازی

کیونکر ہو سکتی ہے؟ اصل انسانی زندگی منطق کے قوانین سے بے نیاز کیونکر ہے؟ اس دعوے کی توضیح کی ضرورت تھی۔ منطق و حکمت کو ڈاکٹر صاحب نے اتنی سطحی چیز کیوں سمجھ لیا ہے؟ سچ پوچھئے تو کوئی زندگی منطق و استدلال کے قوانین کے چکر سے علیحدہ نہیں ہے۔ منطق کی جڑیں انسانی زندگی کی تہوں میں پہونچی ہوئی ہیں۔ منطق کے ڈانڈے اپنے وسیع معنوں میں حکمت سے مل جاتے ہیں جو "خیر کثیر" ہے جو ضالۃ المومن ہے۔ یہ سب سچ ہے کہ انسان کی زندگی متضاد جذبات کا گہوارہ ہے۔ مختلف رجحانات کا نشیمن ہے لیکن یہ سب نفسیاتی سائنس کی حقیقتیں ہیں، اور اس لئے منطق جو واقعیت پسند ہے کسی معنی میں بھی ان نفسی حقیقتوں سے متصادم نہیں ہو سکتی۔ افکار و تصورات کا تضاد بیک وقت منطق کی نگاہ میں البتہ معیوب ہے اور اسے وہ کسی صحیح التفکر انسان کے لئے جائز نہیں رکھتی۔ ایسی حالت میں اقبال کے غیر پیشہ ور فلسفی ہونے کی معذرت اُس کے تضادِ فکر کے سلسلہ میں پیش کرنا کچھ غیر مناسب سی بات ہے۔

اقبال کا فلسفۂ خودی اور مظاہرِ قوت سے مسحوریت

اقبال میں مظاہرِ قوت سے مسحوریت کا جو یہ خطرناک رُجحان موجود ہے اُس کا ذمہ دار بہت کچھ اُن کا نظریۂ خودی بھی ہے جسے اُنہوں نے انفرادیت پسند حکما کانٹ و برگساں و نیٹشے سے اخذ کر کے مشرقی و اسلامی رنگ میں پیش کیا ہے۔ اقبال کے فلسفۂ خودی میں ایگو (انا) میں ہی کے شدتِ احساس کو اقدارِ زندگی کی تخلیق کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔ اُن کے نزدیک زندگی اسی "شدتِ احساسِ انا" کا نام ہے۔

تو کہ از نورِ خودی تابندہٗ — گر خودی محکم کنی پائندہٗ
چوں خبر دارم ز سازِ زندگی — با تو گویم چیست رازِ زندگی
غوطہ در خود صورتِ گوہر زدن — پس ز خلوت گاہِ خود سر بر زدن
زندگی از طوفِ دیگر رستن است — خویش را بیت الحرم دانستن است

آفتابے ہستی یکے در خود نگر — از نجومِ دیگراں تابے مخر
تا کجا طوفِ چراغِ محفلے — زانش خود سوز اگر داری دلے

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید — گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اپنے "انا" "میں" کو بیت الحرم جاننا اور دوسروں کے افکار و اعمال سے اپنے آپ کو اس حد تک

ز بنا لینا کہ دوسروں کے ستاروں سے ایک شعاع بھی حاصل نہ کی جائے بلکہ اپنے سے اگر کوئی
م وجود میں آجائے تو وہ خواہ گناہ اور تمدنی معصیت ہی کیوں نہ ہو اُسے ثواب سمجھا جائے خطرناک
ت کی طرف لے جانے والا ہے۔ کبر و تمکین و نخوت و تمرد کا پیش خیمہ ہے اور اسی کی آغوش میں
ماری کی ذہنیت نشو و نما پاتی ہے۔ اس مقام پر ضمنی طور سے یہ کہدینا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ خود یہ فلسفی
بھی اپنی "خودی" کو اس بے نیازی سے ہمکنار نہیں کرسکا۔ اُس کی زبان پر بھی نیچے، برگسون، گوئٹے،
، وغیرہ سے مستعار لی ہوئی بہت سی باتیں ہیں، اُس کے دل میں بھی دوسروں سے مستعار لی ہوئی آرزوئیں
رہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں غیروں کے مہر و ماہ و انجم سے اُس نے صرف ایک شعاع نہیں بلکہ بہت
عاعوں کا استفادہ کیا ہے۔ اقبال کی یہ باتیں شاعرانہ مبالغہ پر محمول کرلی جاتیں لیکن وہ محض شاعر
ں ہے بلکہ فلسفی بھی ہے۔ ایک فلسفی خواہ وہ پیشہ ور ہو یا غیر پیشہ ور دیدہ و دانستہ اپنے مقصد کے اظہار
اس قسم کا مبالغہ اختیار نہیں کرسکتا جو غلط فہمی پیدا کرے۔ اگر شعریت کے جوش میں احتیاط کی حدود
آگے بڑھ جاتا ہے تو پھر وہ شاعر ہی سہی لیکن اُس کی فلسفیت غیر قابلِ اعتماد ہے۔ مطلب یہ ہے
ب "انا۔ میں" کو اس قدر مرکزیت دے دی جائیگی تو لازماً ان تصورات سے متاثر ہونے کے بعد
رِد انسانی قوت حاصل کرنا ہی اپنا حاصلِ زندگی سمجھے گی اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے راستہ میں
سرے انسانی وحدتوں کے اغراض و مقاصد کے جو سنگِ گراں بھی حائل ہونگے اُنھیں ہٹانا اپنا
سا جانے گی۔ اب خواہ اس میں جلاد و سفاک بن کر لتنا ہی کشت و خون کا کھیل کھیلنا پڑے، شدتِ
ساس خودی کا یہ فلسفیانہ تصور حقیقت میں اخلاقی و معاشرتی قدریں سب بدل دیتا ہے اور اس
ملکوت میں خیر و شر کی کایا ہی پلٹ جاتی ہے۔ انھیں تصورات کی تبلیغ کا براہ راست نتیجہ موجودہ فاشسٹی
ری تحریکیں اور اُن کی دُنیا پر لائی ہوئی موجودہ تباہیاں ہیں۔

اقبال نے "احساسِ خودی" کی لَے کو ضرورت سے زیادہ اونچا لے جانے کے بعد اجتماعی خودی
اہمیت بھی تسلیم کی ہے، اور اسے بھی ضروری قرار دیا ہے، چنانچہ ایک جگہ فرمایا ہے:۔

بجلوت انجمنے آفریں کہ فطرتِ عشق ... یکے شناس و تماشا پسند بسیاری است

کہا یہ جاتا ہے کہ اجتماعی خودی کی اہمیت تسلیم کرکے اقبال نے سوسائٹی کو نراج، عام بدنظمی و انتشار
، محفوظ کرلیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب فرماتے ہیں:۔

"اقبال اگرچہ شعورِ ذات اور حریت کے اصول کا علمبردار ہے لیکن دوسرے انفرادیت پسند مفکروں
کے برخلاف وہ اپنے تصورات کے منطقی حدود سے اپنے دینی و شاعرانہ وجدان کے سہارے بچ کر

نکل جاتا ہے۔ انفرادیت پسندی کے ڈانڈے عمرانی اور سیاسی نقطۂ نظر سے نراج سے جا کر مل جاتے ہیں۔ چنانچہ نیچے کا فلسفۂ فردی عدل و مساوات کے اخلاقی اقدار اور مملکت و معاشرت کی ذمہ داریاں کو ٹھکرا دیتا ہے۔ نیٹشے کی یہ نراجیت اُس کے تصورِ حیات کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا۔ انفرادیت کا قائل انتہائی حریت چاہتا ہے کیونکہ اس کے بغیر فرد کی تکمیلِ ذات ممکن نہیں۔ اقبال نے بھی خودی کی پرورش کے لئے حریت کو ضروری قرار دیا ہے کیونکہ اس کے ساتھ وہ اجتماعی ضبط و آئین اور مساوات کا بھی قائل ہے جس کے بغیر فرد کی صلاحیتیں بروئے کار نہیں آسکتیں۔"

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے اگر اس دعوے کی کہ "دوسرے انفرادیت پسند مفکروں کے برخلاف وہ (اقبال) اپنے تصورات کے منطقی حدود سے اپنے دینی اور شاعرانہ وجدان کے سہارے بچ کر نکل جاتا ہے" مزید تشریح و توضیح کر دی ہوتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔ کیونکہ یہ بات مشکل ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کوئی ایک تصور کا قائل ہونے کے بعد اُس کی منطقی حدوں سے دوسری غیر متعلق چیزوں کے سہارے بچ کر نکل سکتا ہے۔ اگر آپ ایک عقیدہ کا تصور رکھتے ہیں تو پھر اُس کے واقعی منطقی لوازم سے بچ نہیں سکتے اگر آپ کو اپنے دوسرے مختلف تصورات کی وجہ سے وہ لوازم بھیانک معلوم ہوتے ہیں تو آپ اُس نفسیں تصور سے دست بردار ہو جائیے جس کے یہ لوازم ہیں۔ اگر دوسرے سہارے واقعی ایسے ہیں جو عقلی طور سے آپ کو ان لوازم سے بچاتے ہیں تو پھر حقیقتہً یہ لوازم اُس تصور کے علی الاطلاق اصلی لوازم نہیں ہیں جو ہر حالت میں اُس کے لئے ثابت ہوں بلکہ ایسی صورت میں اُس تصور کی منطقی حدیں وہی ہیں جو اِن سہاروں کو ملحوظ رکھنے کے بعد متعین ہوتی ہیں۔ یہ بات تو کسی طرح معقول نہیں معلوم ہوتی کہ "احساسِ خودی" کی لَے کو ضرورت سے زیادہ اُونچا لے جایا جائے اور اس کو غیر معمولی مرکزیت دے دی جائے اور جب اُس کے منطقی نتائج سامنے رکھے جائیں تو "دین" کا سہارا ڈھونڈھا جائے اور وجدان شاعری کی آڑ پکڑی جائے مگر اُس غیر معتدل تصور سے دست بردار نہ ہوا جائے، دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک تصور کو صحیح مانتے ہوئے بھی اُس کے واقعی منطقیانہ نتائج سے محض اس لئے انکار کر دیا جائے کہ وہ ہمارے الگ سے قائم کئے ہوئے دین اور وجدان کے مخالف ہیں۔ اگر فی الحقیقت ہمارا دین اور وجدان صحیح ہے تو پھر اُس تصور کو غلط ماننا ناگزیر ہے جس کے یہ واقعی لوازم ہیں یا اگر وہ تصور صحیح ہے تو پھر یہ دین و وجدان صحیح نہیں ہے۔ اگر دین اور وجدان عقلی حیثیت سے ان لوازم کو اُس تصور سے الگ کر دیتا ہے تب تو صورت دوسری ہے مگر اسے کہیں واضح نہیں کیا گیا ہے ورنہ محض اِن سہاروں کی بنا پر ان نتائج سے انکار کرنا لیکن نفسِ تصور سے دستکش نہ ہونا عجیب و غریب تضاد پسند ذہنیت ہی کا نتیجہ قرار پا سکتا ہے۔

مجھے خطرہ ہے کہ اقبال کے یہاں صورتِ حال یہی ہے کہ وہ ایک تصور کے قائل ہوئے لیکن اس کے منطقی حدود کا بیابانک نقشہ یا تو اُن کی نظر کے سامنے نہیں آیا یا پھر اُن سے نجات پانے کے لئے "دین و جبان" کا سہارا خواہ مخواہ لیا۔ یہ تضادِ فکر خواہ نمرود کی آگ میں بے خطر کود پڑنے والے عشق کا شاندار کارنامہ ہو لیکن حکیمانہ طرزِ عمل بہرحال نہیں ہے۔

اقبال کا نظریۂ خودی اور نزاع | اس مقام پر ایک چیز اور قابلِ غور ہے۔ اقبال نے "اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل" میں فرمایا ہے "اسلام بحیثیت ایک نظامِ سیاست کے اصولِ توحید کو انسانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریقہ ہے۔ اس کا مطالبۂ وفاداری خدا کے لئے ہے نہ کہ تخت و تاج کے لئے اور چونکہ ذاتِ باری تمام زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے اس لئے اس کی طاعت کیشی کا درحقیقت یہ مطلب ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت (اعلیٰ صفات) کی اطاعت کیشی اختیار کرتا ہے۔"

اس خودی کے ساتھ اگر اطاعت کیشی کے اس نظریہ کو ملایا جاتا ہے تو انفرادی و بین الاقوامی نزاع کا خطرہ بہت قوی ہو جاتا ہے۔ معیاری فطرت کے طے کرنے کا حق ایک شخص یا پھر ایک قوم کو دوسری فرد یا دوسری قوم کے لئے نہیں دیا جا سکتا۔ ہر انسانی وحدت اپنی معیاری فطرت اپنے اعلیٰ صفات خود متعین کریگی، اب وہ خواہ ثواب ہو یا گناہ کیونکہ اقبال کے نظریہ کے مطابق تعین اعلیٰ صفات کا جو تصور خودی کے چشمہ سے پھوٹیگا۔ وہ اگر گناہ بھی ہوگا تو ثواب سے بدل جائیگا۔ دوسروں کے بتائے ہوئے اعلیٰ صفات کے سانچہ میں اپنی فطرت کو ڈھال کر غیروں کے "ماہ و انجم" سے شعاعوں کی بھیک اگر مانگی گئی تو یہ تو خود نظریۂ خودی کی روح کے خلاف ہوگا ؎

بر کفش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل نیست اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

ایسی صورت میں نزاع کا خطرہ دُور نہیں ہوتا کیونکہ خودی کی مختلف فطرتوں کے سانچہ میں معاشرتی و تمدنی قوانین کے مختلف نظریات اساسی حیثیت سے ڈھلیں گے اور اُن کے ماتحت مختلف اخلاقی اصول و ضوابط۔ تقویٰ، عفت، پرہیزگاری سبھی کے تصورات ان مختلف نظریوں کے ماتحت بدل جائیں گے ایسی حالت میں یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص یا ایک قوم اپنی معیاری فطرت کی اطاعت کیشی کا یہ تقاضا سمجھے کہ وہ اپنے کو دوسروں سے برتر جانتے ہوئے فطرت کے آفریدہ منابعِ عیش و ثروت سے تمام لذت اندوزیاں اپنا مخصوص حق اور جو اُس کی ان جابرانہ دست درازیوں کے سامنے نہ جھکیں انہیں کچل ڈالنا رموزِ انسانیت کا فریضہ قرار دے۔ اسی طرح دوسروں میں خودی یا انفرادیت کے جوش

کے ماتحت جو معیاری فطرت بنے گی اُس کا بھی تقاضا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اُن افراد و اقوام کو ذلیل و نگونسار کرنے کے لئے شمشیر بکف میدان میں نکل آئیں، جو ان کے شکار کرنے کے حوصلوں کی دل میں پرورش کر رہی ہیں۔ عام طور سے انفرادیت کے جذبہ کو جب نشو و نما دیا جائیگا تو پھر ہر فرد سفاکی میں باز و شاہین ہی بننا چاہیگی۔ اور اپنے شکار کے لئے کنجشک فرومایہ کی تلاش کریگی۔ ایسی صورت میں تصادم ناگزیر ہے۔ نزاع، عام بد نظمی و انتشار اس کے سوا اور کیا ہے؟

اقبال کا فلسفۂ خودی اور صنفِ نسواں

یہاں اس کی طرف اشارہ کر دینا بھی مناسب ہے کہ اقبال نے عورتوں کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی اُن کے فلسفۂ خودی کے سراسر مخالف ہیں اور اُن کی تضاد پسندی پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت علامہ اقبال کا فلسفۂ خودی درست ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ خواتین اپنی خودی کے رجحانات کو اپنے قلب و دماغ کے چشمہ سے نہ پھوٹنے دیں۔ ہمیں اس کا کوئی حق نہیں کہ اُن کی خودی کی بجلیوں کی رَو کے لئے راستے مقرر کریں اور اس کے لئے اصول وضع کریں کہ اُنھیں کس نوعیت سے چمکنا چاہیئے اور کب اور کہاں چمکنا چاہیئے۔ ان باتوں کو اُن کی خودی کا اُبھار اور جوشِ نمو متعین کریگا اگر اُن کی خودی اپنے عروج و کمال کے لئے "مکالماتِ فلاطون" ہی لکھنا پسند کرتی ہے تو کسی دوسرے کو آخر اس کا کیا حق ہے کہ وہ صنف نسواں کو مجبور کرے کہ وہ اپنے "شعلوں" سے "شرر افلاطون" ہی کے ٹوٹنے پر قانع رہیں۔ اگر بالفرض کچھ عورتوں کی صنفی خودی اپنے تحقق و اثبات کے لئے "بار اُمومت" اُٹھانے سے منحرف ہو جائے تو فلسفۂ خودی کے ایک پرستار کے منہ سے یہ بول

این گل از بستانِ ما نارستہ بہ ۔۔۔ داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اقبال نے ایک جگہ یہ بھی فرمایا ہے:-

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر ۔۔۔ غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود
میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک مگر ۔۔۔ نہیں ممکن مگر اِس عقدۂ مشکل کی کشود

اِس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی خودی کی تابش مردوں ہی کے ماہ و انجم کی شعاعوں کی ممنون ہے، اور وہ مردوں کے ایک لطیف و لذیذ ضمیمہ ہی کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن یہ بات فلسفۂ خودی کی روح کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اقبال کے نزدیک خودی کو اپنے ہی فطرت و نفس کے چشمہ سے اُبلنا چاہیئے۔ یہاں اِس خیال کے لئے ایک گوشہ پیدا کیا جا سکتا تھا کہ اقبال اپنے فلسفۂ خودی کو مردوں ہی سے مخصوص سمجھتے اور عورتوں کو اس حریم شرف میں بار نہیں دینا چاہتے ہیں، مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ اس تخصیص فلسفۂ خودی بالکل ہی محدود ہو کر رہ جائیگا جو اس شاعرِ اعظم کے اُس بلند لہجہ کے بالکل خلاف ہے جیسے اُس نے

سفۂ خودی کی تاسیس و تشبیہ یا توضیح و تشریح کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے، اُس کا بھی کوئی محل نہیں رہتا پانی کا قطرہ صرف خودی از بر کرکے جب اپنی "ہستی بے مایہ" کو گوہر بنا سکتا۔ سبزہ اپنی ذات میں لگ کے توت بیدا کرکے جب سینۂ گلشن چاک کر سکتا اور جوئے نرم رو "عیب" تیزروئے زلیست "بہم پہونچا کر قلزم خار" بن سکتی ہے تو آخر عورت نے کیا قصور کیا ہے جو اُسے خودی کے تحقق کی برکتوں سے محروم کر دیا جائے؟ آخر وہ کیوں نہ اپنی خودی کو پرکھے اور اپنے "نگین" کو جھوٹا ہونے کی تہمت سے بچالے؟

جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں　　زمانہ میں جھوٹا ہے اُس کا نگیں

بہر حال ایک طرف عورت کی "مشت خاک" کو شرف میں "ثریا" سے بڑھکر بتانا اُس کی فطرت کو "نگہ دارندۂ تار حیات" قرار دینا، اپنی ارجمندیوں کو اُس کی ارجمندی کا نتیجہ ثابت کرنا لیکن اُسے نظریۂ خودی کے حلقہ سے باہر کر دینا یا اُسے ایک معمولی ضمیمہ کی حیثیت سے شامل رکھنا اور اُس کی اس کوتاہ دستی پر ہمدردی کے چند آنسو بہانا دلچسپ تضاد پسندی کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر یوسف نے اس تضاد کے دُور کرنے کے لئے جو معذرت پیش کی ہے وہ ذرا بھی کار آمد نہیں ہے۔ اقبال عورتوں کی ترقی کے خلاف نہ سہی مگر وہ اس کی ترقی کا راستہ تو خود معین کرنا چاہتے ہیں اور ایسا راستہ معین کرنا چاہتے ہیں جس میں مردوں کے تفوق و اقتدار کی تلوار اُن کے سر پر لٹکتی رہے اور وہ کبھی غلامی کی زنجیر توڑنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ اس باب میں فطرت کے رجحان کا بھی اقبال اور ڈاکٹر صاحب کی طرف سے ذکر کیا گیا ہے مگر اس حالت میں بھی خودی کو اپنے تحقق کیلئے آزاد چھوڑنے کی ضرورت ہے۔ اگر فطرت کے یہ رجحان اتنے ہی قوی اور مستقل ہیں تو خودی عورت میں انھیں کے مطابق خودی کو اپنے تحقق کے لئے راستے بنائیگی۔ اصل تو یہ ہے کہ اگر خودی کا تحقق فی الواقع کوئی اہمیت رکھتا ہے تو پھر اُسے موقع دینا ہی چاہیئے کہ وہ اپنے عروج کا راز ہر گوشہ میں تلاش کرلے۔ اگر فطرت کی حقیقتیں ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اِن میں اپنے حسب منشا ممکن تغیر کرنا چاہتی ہے تو اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے؟ یہ بھی ایک عجیب و غریب لطیفہ ہے کہ عورتوں کے متعلق اُردو کے جن اعاظم شعرا نے اظہار خیال کیا ہے اُن میں اسی قسم کی تفوق پسندانہ ذہنیت کار فرما ہے۔ اکبر۔ اقبال۔ جوش یہ سب شعرا باوجودیکہ خیالات و رجحانات میں ایک نقطہ پر نہیں ہیں، لیکن عورت 'غریب عورت' کے متعلق اِن سب کی ذہنیت قریب قریب یکساں ہے۔ اکبر تو ایک حد تک قدامت پسند تھے۔ اقبال نیچے کے حد سے زیادہ معتقد ہیں اور نیچے کا عورت کے متعلق یہ خیال ہے "کیا تم عورت کے پاس جا رہے ہو۔ خیر اپنا چابک نہ بھولنا"۔ ہٹلر کی عورتوں کے متعلق باورچی خانہ واپس جاؤ" کی تحریک بھی اس نیچے کے خیال کی آواز باز گشت ہے۔ مگر جوش کو کیا کہا جائیگا وہ تو اعتقاداً اشتراکی ہیں اور شعر و ادب کے متعلق ترقی پسندانہ تحریک سے وابستہ۔ یہ تحریک تو خواتین کو اس

فقط نفرت سے نہیں دیکھتی، وہ تو ان کے لئے برابر کے حقوق تجویز کرتی ہے۔ پھر جوش نے کیوں نرم نرم لفظوں اور میٹھی تشبیہوں کے مخملیں لباس میں عورتوں کے جاہل رکھنے، تمدن و تہذیب کی طرف انھیں نہ بڑھنے دینے کے درشت و نازیبا خیالات کو ملبوس کرکے پیش کیا ہے بہر حال یہ تو ایک ضمنی بات تھی اصل یہ ہے کہ اقبال نے ملت اسلامیہ کی بہبود کے لئے جو پیام دیا ہے وہ ان متضاد عناصر کی آمیزش کی وجہ سے نہایت ہی مبہم بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے اس طرف کے اجزا اپنی اپنی جگہ پر تنقید حیات کے صحیح طور سے حامل سہی تاہم اُن کے اجتماع سے کوئی معین مزاج حاصل نہیں ہوتا۔ اور اُن کا پیام عام انسانوں کا تو خیر ذکر ہی کیا مسلمانوں کے لئے بھی کسی واضح مسلک کی تعیین نہیں کرتا۔

اقبال کی مغربی تہذیب و تمدن سے مخالفت

اُن کے پیام میں کسی واضح و معین مسلک کی عدم موجودگی کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کی مخالفت نہایت شد و مد سے کی ہے لیکن ان کے دوسرے نظریات و خیالات سے اسی مغربی اور اسی فرنگی تہذیب و تمدن کی تقدیس و تمجید بھی ہوتی ہے مغربی تہذیب و تمدن کی مخالفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عُریانی و میخواری و افلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

دوسری جگہ اسے اور زیادہ صاف لہجہ میں کہتے ہیں:-

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہی نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

مغربی تہذیب و تمدن کی اس تنقید سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغرب ایک جہنم ہے جس میں روح انسانی کی جلانے والی آگ بھڑک رہی ہے۔ بیکاری و عُریانی و میخواری و افلاس کے سوا فرنگی مدنیت کے فتوحات کے دامن میں کچھ نہیں۔ اس تہذیب سے قلب و نظر کے فساد کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس مدنیت کی روح میں پاکدامنی کا پتا نہیں، وہ پاک ضمیر بلند خیال اور لطیف ذوق سے بالکل تہی داماں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی مکروہ و زشت تہذیب سے وابستگان میں صلاحیت کا ذرہ بھر نشان نہیں مل سکتا۔ لیکن دوسرا اسی سرزمین اسی تہذیب کے ایک آفرنش پروردہ حکیم گوئٹے سے اپنا مقابلہ کرتے ہوئے مشرق کا یہ حکیم شاعر کہتا ہے:-

من رسیدم از زمینِ مردۂ او چمن زادے چمن پروردۂ

او چو بلبل در چمن فردوس گوش من بصحرا چوں جرس گرم خروش

یہاں وہی تہ بے چشمۂ حیوان والا ظلمات" کا چمن بن جاتا ہے' اور اسی برق و کمالات کی سرزمین کا ایک پروردہ چمن زاد عندلیب کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ خود انھیں اقبال کے دوسرے نظریات کی بنا پر بھی مغربی مدنیت اپنی روحانی بیگانگیوں کے باوجود بھی صالح ثابت ہوتی ہے اور اس تمدن کے ذمہ دار نیک افراد قرار پاتے ہیں ؎

حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد

اس وقت دنیا پر تسلط کن قوموں کو ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں مغربی قوموں ہی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں قسمتِ نیکاں کی مصداق وہی قومیں قرار پائی ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب فرماتے ہیں:

"دنیا میں نیابت الٰہی اُن قوموں کو ملتی ہے جو اپنے فکر و عمل در جذب و تسخیر کی اہلیت سے اپنے تئیں اس کا مستحق ثابت کر دیتی ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی غیر مستحق جماعت کو غلبۂ استیلا حاصل ہوا ہو اور اس کو تمکنِ ارضی کی ذمہ داری سپرد کر دی گئی ہو۔"

چند سطروں کے بعد پھر لکھا ہے:-

"اقبال کے نزدیک دنیا کی حکمرانی صالح جماعتوں کے لئے ہے، حق تعالیٰ نے اس جہان چار سو کی جلوہ آرائیاں دیدۂ مومن کے لئے وقف کر دی ہیں جو اپنی زندگی میں صلاحیت کی تمام خوبیاں رکھتا ہے جس جماعت میں جذب و تسخیر کی صلاحیت پیدا ہو جائے' جو اس کے جوشِ عمل کی آئینہ دار ہوتی ہے، تو اس کے غلبۂ تسلط کو دنیا کی کوئی رکاوٹ نہیں روک سکتی۔ وہ اپنے جوہرِ کردار اور اپنے اعمالِ صالحہ سے اپنی تقدیر کے راز معلوم کر سکتی ہے۔

نہ ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

صرف وہی قومیں دوسروں پر تفوق و اقتدار حاصل کر سکتی ہیں جنہوں نے اپنے عملِ صالح سے اپنے آپ کو نیابت الٰہی کا مستحق ثابت کر دیا ہو۔"

ان تمام اقتباسات کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا یورپ نے عام غلبۂ تسلط حاصل نہیں کر لیا ہے اور کیا تمام تفوق و اقتدار اسی کے قبضہ میں نہیں ہے؟ دنیا پر آج یورپ کے سوا حقیقتہً کون حکمران ہے؟ تمکنِ ارضی کی ذمہ داری یورپ کے سوا کس کے سپرد ہے؟ ان اقوال سے اقبال کے مذاق

پر تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یورپ کی جماعتیں "صالح" ہیں، وہ جو تن کردار اور اعمالِ صالحہ کی دولت کی مالک ہیں انہیں اعمالِ صالحہ کی وجہ سے یورپ کی اقوام کو نیابت الٰہی و تمکن ارضی کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔ انہیں کی آنکھوں میں "دیدۂ مومن" کی تیز نگاہیوں کے جلوے ہیں، یہ کون یورپ ہے؟ وہی "خمستانِ فرنگ" میں جس کے متعلق اسی اقبال نے یوں بھی کہا ہے:-

جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل　　عقل بے پروا متاعِ عشق را غارتگر است

در ہوائش گرمیِ یک آہ بیتابانہ نیست　　رند این میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

اقبال کے کلام میں اِن متضاد خیروں کو پڑھنے والا اب اس اُلجھن میں خواہ مخواہ مبتلا ہوگا کہ وہ یورپ کے افعال و اعمال کو اعمالِ صالحہ سمجھے یا نہ سمجھے۔ اُس کے تمکنِ ارضی کو دیکھکر تو خواہ مخواہ اخلاقِ حسنہ کی دولت کا اُسے مالک ماننا پڑتا ہے۔ لیکن اِس یورپ کی تصویر کو جب اقبال کی دوسری عینک سے دیکھا جاتا ہے تو یورپ ایسا ظلمات نظر پڑتا ہے جس میں چشمۂ حیوان کا پتہ نہیں جس کے "جلوے بے کلیم" جس کے "شعلے بے خلیل" ہیں۔ ایسے تیرہ و تار سرزمین کے رہنے والوں میں اعمالِ صالحہ کی روشنی کا کہاں گذر؟ انہیں اخلاقِ حسنہ کی ضو سے کیا واسطہ؟ جن کے پاس پاک ضمیر نہیں جن کے پاس بلند خیال نہیں جن کے پاس لطیف ذوق نہیں اُنھیں صلاحیت سے کیا ربط؟ اقبال کے کلام پر نظر کرنے والوں کا یہ ضروری فرض ہے کہ وہ اِن اُلجھنوں کے کانٹوں سے دامن بچا کر نہ گذر جائیں بلکہ ان کا تجزیہ کریں۔ انھیں کھولیں، دُور کریں خیال و فکر کے اس تضاد کو ایک پُرانے رنگ کے غزل گو کی پریشاں نوائی سمجھ کر نظرانداز کر دیا جاتا مگر اقبال تو "حدیثِ دلبری" ہمیں سنانا نہیں چاہتا۔ وہ تو "رموزِ ملک و دیں" کی باتیں بنا کر ہمیں "شکوہ خسروی" بخشنا چاہتا ہے ایک "دانائے ضمیرِ کائنات" ہونے کا ادعا کرنے والے کے "باطنی آتشِ عشق" میں اگر وہ شعلے موجود نہیں ہیں جو نفسِ انسانی کے "بوالہوسی رجحانات" کے خس و خاشاک جلا سکیں، تو اُس کا پیام کتنا ہی شاندار و دلکش ہو مگر عملی حیثیت سے بیکار ہے۔

رُباعیات

:- از جناب آدیب لکھنوی

(۱)

کیا علم جو دل میں بُردباری نہ ہوئی　　دولت کیسی جو خاکساری نہ ہوئی
ہر شے کے لئے شرط ضروری ہے آدیب　　دل کیا ہے اگر وفا شعاری نہ ہوئی

(۲)

دولت کا اگر غرور آجاتا ہے　　دل میں بھی خلل ضرور آجاتا ہے
پہچانے نہیں جاتے ہیں احباب آدیب　　بینائی میں بھی فتور آجاتا ہے

روزگار یوپی

(از حضرت شائق ہندو)

رُخِ اول

"شامِ اودھ"

فضا میں حُسن، ہواؤں میں کیف، خاک میں مدھ
نظر فروز ہے کتنا فروغِ شامِ اودھ

برس رہا ہے زمیں پر فلک سے نور تمام
ہر ایک خاک کا ذرہ ہے ماہتاب آشام

جدھر بھی جائیے ملتی ہے تازگی ہر سُو
براتِ شامہ چھڑکاؤ کی ہے سوندھی بُو

لگے ہوئے ہیں حسینوں کے جمگھٹے ہر سمت
سجے ہوئے ہیں ہزاروں ہی بتکدے ہر سمت

کھنچی ہے سامنے تصویرِ خلّخ و نوشاد
بنا ہوا ہے مرقّع سا اک "امین آباد"

کھلی زمین پہ راہیں ہیں آسمانوں کی
جہاں فروش ہیں آرائشیں دُکانوں کی

کھڑے ہیں سیکڑوں ہر سو جدید آرٹی سنج
جوابِ وادیِ ایمن بنا ہے "حضرت گنج"

گمان طور کا ہوتا ہے عیش گاہوں پر
نثارِ سلسلۂ کہکشاں ہے راہوں پر

طلوع ہے سر ہر بام ایک مہ پارہ
شبیہِ شقِ قمر "چوک" کا ہے نظارہ

بہکتے پھرتے ہیں ہر سمت مال عیش پرست
متاعِ حُسن یہاں ہے متاعِ روئے دست

خوشا وہ خطۂ دلکش زہے وہ دارِ سُرور
جہاں اُترتی ہو لوگوں پہ روز آیۂ نور

رُخِ دوم

صبحِ بنارس

نمودِ آتشیں صُبح رشکِ لالہ زار ہے
شفق میں مُسکرا رہا تبسمِ بہار ہے

سحر سے برکتیں عیاں ہیں گلشنِ خلیل کی
ہوائے سرد لگ رہی ہے سانس جبرئیل کی

لگے ہوئے ہیں جاتری خدا کے گیان دھیان میں
پیام اور سلام ہیں زمین و آسمان میں

یہ سین اور اس پہ پھر بنارسی لطافتیں
پجاریوں کے نغمے پُجارنوں کی صورتیں

بھجن کے بول بول میں چمک ہے برقِ طور کی
چُبھی سی دل میں جا رہی ہے پھانس ایک نور کی

سما گئی ہے سنکھ کے سُروں میں دل کی داستاں
ہر ایک سانس لگ رہی ہے سیلِ نالہ و فغاں

ملے جُلے کھڑے ہوئے ہیں چار سو شباب و شیب
جہاں بزرگ لوگ ہیں وہیں بتانِ دلفریب

عبودیت کے جوش سے سبھی کی شکل لال ہے
شباب لالہ رنگ ہے تو شیب گل جمال ہے

ہر ایک دل میں ولولہ ہے اک عجیب جوش کا
سوال ہی یہاں نہیں گناہِ چشم و گوش کا

تسلّی

(از جناب اختر ہوشیارپوری)

میری مجبوری پہ یہ آنکھ میں آنسو کیسے میری ناچاری پہ ہر لحظہ یہ رونا کیسا
تجھ کو معلوم ہے سب ہے جو حقیقت دل کی پھر یہ دامن کو سرشکوں سے بھگونا کیسا
اک ترے قرب کی خاطر یہ بکھیڑا ہے تمام
ورنہ مقصودِ دلِ خستہ نہ ساقی ہے نہ جام

یوں ترے عشق میں سو بار بہائے آنسو یوں ترے قدموں پہ سو بار لٹائے ہیں سجود
اے خداوند نظر تیری وفا کی سوگند میری پیشانی کا تھا اور نہ کوئی مسجود
اب مگر کیا دلِ بیمار کی باتیں کیجئے
ایک گرتی ہوئی دیوار کی باتیں کیجئے

اپنی گزری ہوئی صحبت کے فسانے مت چھیڑ اب مجھے دامنِ الفت سے ہوائیں مت دے
مجھ کو جانے دے زمانہ لئے جاتا ہے جدھر عمرِ رفتہ سے یہ کہدے کہ صدائیں مت دے
تو مگر میری جدائی میں گہربار نہ ہو
اے مری نرگسِ بیمار تو بیمار نہ ہو

کیا ہوا آج مقدر نے جو آنکھیں بدلیں گر نہیں آج موافق یہ ہوا بھی نہ سہی
ہوتی آئی ہے کہ دنیا کو رہی عشق سے ضد یہ جہاں والے تو کیا حق میں خدا بھی نہ سہی
تو مگر رنج نہ کر آج بھی تیرا ہوں میں
میری دنیا تو ہے ظلمت تری دنیا ہوں میں

میاں نظیر اکبرآبادی کا دیس پریم

(از نظامی بدایونی)

نظیر اکبرآبادی جن کا نام ولی محمد تھا سنہ ۱۱۴۸ھ مطابق سنہ ۱۷۳۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے، یہ زمانہ وہ زمانہ تھا جبکہ مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا، اور محمد شاہ ثانی کو سید حسین علی اور سید عبداللہ نے جو تاریخ میں بادشاہ گر کے نام سے مشہور ہیں بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھا دیا تھا۔ اسی زمانہ میں دہلی پر نادر شاہ کا حملہ ہوا تھا اور بعدہٗ جب سنہ ۱۱۵۵ء میں احمد شاہ ابدالی نے چڑھائی کی تو نظیر اپنی ماں اور نانی کو لے کر اکبرآباد چلے آئے اور محلہ تاج گنج میں جو تاج محل کے قریب واقع ہے سکونت اختیار کر لی، اور وہیں ۲۶۔ صفر سنہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۲۔ اگست سنہ ۱۸۳۰ء کو وفات پائی۔

کہا جاتا ہے کہ سو سال سے کچھ کم مدت کی زندگی میں نظیر نے دو لاکھ اشعار سے کم سپرد قلم نہیں کئے، لیکن بدقسمتی سے ان کے کلام کا بڑا حصہ تلف ہو گیا۔ کلیات نظیر میں جو کلام ملتا ہے اُس میں بھی چھ ہزار سے کچھ زائد اشعار موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ نظیر ایک پُرگو شاعر تھا اور اسی کے ساتھ اُس کی قادر الکلامی میں بھی شک نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس کے زمانہ کے دوسرے شعرا نے اس کے کلام کی قدر نہ کی اور اُس کی زبان کو مستند نہ مانا، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اُردو کے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں اتنے زیادہ الفاظ جتنے کہ نظیر نے استعمال کئے ہیں نہیں ملتے اسی کو مولانا حالی نے نظیر کے باکمال شاعر ہونے کا معیار قائم کیا ہے۔ نظیر کی شاعری کی قدر گو جیتے جی نہیں ہوئی لیکن مرنے کے بعد اس کا کلام سررشتۂ تعلیم کی کتابوں میں داخل کیا گیا، اور فقیروں کی صداؤں میں آج تک اس کی نظمیں سُنی جاتی ہیں۔

ابھی اس کی وفات کو پورے پچاس برس بھی نہ گذرے تھے کہ ڈاکٹر ایس۔ ڈبلو۔ فیلن جیسے قابل زباندان کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ایک ایسا لغت تیار کریں جس میں انگریزی الفاظ کے معنی ہندوستانی میں دیکھے جائیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے سنہ ۱۸۷۰ء میں انھوں نے فیلن ڈکشنری کی بنیاد ڈالی اور اس کے لئے اُن کو اردو الفاظ کے ذخیرے تلاش کرنے پڑے، اس سلسلہ میں انھیں نظیر کی نظموں سے بہت مدد ملی جس کا اعتراف انھوں نے فیلن ڈکشنری کے دیباچہ میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ صرف یہی شاعر ہے کہ جس کی شاعری

[1] ماخوذ از تاریخ ادب اُردو از رام بابو سکسینہ (صفحہ ۳۴۰، اُردو ایڈیشن)

اہلِ فرنگ کے معیار کے مطابق سچی شاعری ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے یہ سچی بات لکھ دی ہے کہ نظیر ہی ایسا شاعر ہے جس کے اشعار نے عام لوگوں کے دل میں راہ کی ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں " نظیر میں دل و دماغ کی وہ تمام صفتیں موجود ہیں جو فطرتاً نادر کو امتیاز بخشتی ہیں۔ نظیر کو اپنی زبان پر جو قدرت حاصل تھی اُس کا ذکر ڈاکٹر فیلن نے اس طرح کیا ہے:-

" نظیر نے مادری زبان کے خزانوں پر اپنا سکہ بٹھا دیا ہے، اُس نے اُردو کے لئے وہ کام کیا ہے جو چاسر اور شیکسپیر نے انگریزی ادب کے لئے کیا ہے۔ اس نے ہندی الفاظ کو تمام اُن خوشنما ترکیبوں میں ظاہر کیا ہے جن میں وہ ظاہر ہو سکتے تھے۔"

نظیر کے متعلق ڈاکٹر فیلن نے جو کچھ اُنیسویں صدی میں لکھا تھا اُس کا اثر یہ ہوا کہ بیسویں صدی میں جو تذکرے لکھے گئے اُن میں نظیر کے ساتھ وہ بے انصافی روا نہیں رکھی گئی جو بعض متقدمین نے برتی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں رائے بہادر رام بابو سکسینہ نے انگریزی میں ہسٹری آف اُردو لٹریچر" History of Urdu Literature بیسوی صدی کے انگریزی داں نوجوانوں کو اُردو ادب کی خوبیوں سے روشناس کرانے کے لئے لکھی۔ بعد مرزا محمد عسکری نے اُس کو اُردو کا جامہ پہنا کر اُردو داں پبلک کو اُس سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ اس میں قابل مصنف نے نظیر کے کلام کی آزادانہ تنقید کر کے نہایت انصاف سے کام لیا ہے جس سے اس زمانہ کے تعلیم یافتہ گروہ کی صحیح رہنمائی ہوتی ہے۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ " تاریخ ادب اُردو" کی اشاعت کے بعد چند سال ہائے گذشتہ میں اُردو ادب کے نامور رسالوں میں نظیر کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر بحث اور تبصرہ نظر آنے لگا ہے۔ لکھنؤ کے مشہور رسالہ "نگار" نے جنوری ۱۹۴۰ء میں تقریباً سوا سو صفحات کا ایک خاص نمبر نکالا جس میں ملک کے قابل مضمون نگاروں نے نظیر کی سیرت اور اُس کی شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ اسی زمانہ کے لگ بھگ نظیر کے محبوب وطن آگرہ میں " بزمِ نظیر" قائم ہوئی جس کی سرپرستی میں ہر سال " یوم نظیر" منایا جاتا ہے۔ یہی انجمن سوانح نظیر جس میں نظیر کا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل ہوگا " شرابِ کہنہ در جام نو" کے نام سے مرتب کر رہی ہے۔ امید ہے کہ مسٹر حمید تاج علی معتمد انجمن مذکور کی کوششیں اس باب میں کامیاب ہونگی اور دنیا کے سامنے نظیر کے کلام کے پوشیدہ جواہرات جن کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے جلد سامنے آ جائیں گے۔

نظیر کے موجودہ ذخیرے میں جو نظمیں ملتی ہیں وہ گوناگوں مضامین کے لحاظ سے نہایت دلچسپ ہیں۔ اُن میں کہیں نظیر واعظ کے رنگ میں نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سعدی کی روح اُس میں حلول کر گئی ہے کہیں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ کر ایک فلسفی کا بھیس بدلتا ہے کہیں کہیں عشق و عاشقی کا رنگ بھی اُس کے اشعار میں جھلکتا ہے جس سے اُس کی جوانی کی رنگینیوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اُس کے کلام کا بڑا حصہ بنی نوع انسان

کی محبت بلکہ حیوانات اور جانوروں کے ساتھ اُس کی طبیعت کا خاص رُجحان ظاہر کرتا ہے۔ اُس نے ہندوستان کے موسم، ہندوستان کے کھیل، اور ہندوستان کے تیوہاروں پر جو طبع آزمائی کی ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اصلی معنوں میں ملک کا جاں نثار اور دیس بھگت تھا۔ نظیر صوفی مشرب مسلک رکھتا تھا، اُس نے تمام مذاہب پر گہرائی کی نظر ڈالی تھی جیسا کہ ایک ترجیع بند سے جس کا عنوان "فنا و بقا" ہے ظاہر ہوتا ہے:

جھگڑا نہ کرے ملت و مذہب کا کوئی یاں — جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آن

زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآن — عاشق تو قلندر ہیں نہ ہندو نہ مسلماں

کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا — آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا۔

جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کسی مذہب سے اُس کو تعصب نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ وہ ہندو مسلمان دونوں کے تیوہاروں سے یکساں لطف اُٹھاتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ جہاں اس کی کلیات میں عید اور شب برات پر نظمیں پائی جاتی ہیں، اُسی کے ساتھ ہولی، دیوالی، اور بسنت جیسے ملکی تیوہاروں کی چہل پہل کو بھی اس خوبی سے نظم کیا ہے جس سے اُس کی ہمہ دانی اور دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری ظاہر ہوتی ہے۔ اُس نے نہ صرف ہندوؤں کے تیوہاروں پر قلم اُٹھایا ہے، بلکہ اُن کے معتقدات کی تصویر کھینچ کر اپنی وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔ جاڑوں میں متھرا کے قریب بلدیوجی کا میلہ ہوتا ہے، اس میلہ پر جو نظم لکھی ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اسی طرح بھیروں بابا درگاجی کے درشن کی نظمیں ظاہر کرتی ہیں کہ نظیر اپنے ہندو بھائیوں کی رسوم میں کس قدر دلچسپی لیتا تھا۔ اور نظم کے ذریعہ سے اُس نے اُن کے مناظر اس خوبی سے پیش کئے ہیں کہ گویا وہ خود بھی اُن میں شریک رہا ہے۔ رکھشا بندھن کی راکھیوں پر جو نظم ہے اُس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات ایسے شگفتہ تھے جن سے متاثر ہو کر نظیر نے اِن نظموں کو لکھا تھا۔ اُس کی ان نظموں سے ظاہر ہے کہ اُس کا دل تعصب سے پاک تھا، دیس کی محبت اُس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور وہ چاہتا تھا کہ مسلمان اپنے بھائی ہندوؤں کی رسموں سے واقف ہو کر اُن کے ساتھ یگانگت کا برتاؤ کریں اور دیکھیں کہ اس ملک میں رہنے کے اثر سے مسلمانوں کے یہاں ہندوؤں کی شادی غمی کی رسمیں کس حد تک سرایت کر گئی ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ مسلمانوں کے یہاں وہ کچھ صورت بدل کر پہونچی ہیں۔

نہ صرف نظیر کے زمانہ میں بلکہ اُس کے بعد تک مسلمانوں میں گہرے سماجی تعلقات رہے ہیں اس زمانہ کے ہندوؤں میں چھوت چھات موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ کی نسبت بہت زیادہ تھی، لیکن باوجود اس کے ہندو مسلمانوں کی شادی غمی میں اور مسلمان ہندوؤں کی شادی غمی میں شریک ہوتے تھے اور نہ صرف یہ بلکہ اُن کے دوستانہ تعلقات آئندہ نسلوں تک چلتے تھے۔ اگر ہندو مسلم بزرگوں میں دوستی کے سبب

بھائی چارہ قائم ہو جاتا تو اُن کی اولادیں چچا تاؤ کا رشتہ قائم کر لیتیں۔

اِس مجموعہ میں کل بیس نظمیں شامل ہیں، جن میں کنہیا جی کا جنم وغیرہ کی نظموں کے علاوہ وہ نظمیں بھی ہیں جو ہندوستان کے پُرلطف موسموں پر لکھی گئی ہیں۔ مفلسی کی مقبول نظم بھی ناظرین پڑھیں گے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کے زمانہ میں بھی ہمارا ملک افلاس کی بلا میں مبتلا تھا۔ اس نے اس نظم میں اُن عیوب کو جو افلاس سے کسی قوم میں پیدا ہو جاتے ہیں نہایت قابلانہ طریقہ سے پُراثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

اِس مجموعہ کا نام "نظیر کا دیس پریم" رکھا گیا ہے۔ اِس میں نظیر کی کلیات کا جو عطر کھینچا گیا ہے، کیا عجب ہے کہ اُس کی مہک اور خوشبو ہندو مسلم تعلقات کی اُس گندگی کو جو ہمارے ملک کی بدقسمتی سے پیدا ہو گئی ہے، دفع کرنے میں اکسیر کا کام دے، اور اس کتاب کی اشاعت کا مقصد پورا ہو۔

جذباتِ بسمل

(حضرت بسمل الہ آبادی)

خدا گواہ کہ بے لطف زندگی ہی نہیں (۱) خودی جو ہے تو حقیقت میں بیخودی ہی نہیں

مرے خیال کی دنیا میں آ گیا کوئی — یہی کمی تھی بڑی لیکن اب کمی ہی نہیں
زمانہ دوست مرا دوست میں زمانے کا — جہانِ عشق و محبت میں دشمنی ہی نہیں
مرے خیال میں ہے نام بندگی کا فقط — جو بندگی ہو غرض کی وہ بندگی ہی نہیں
زمانہ دیکھ رہا ہے تجھے زمانے سے — تجلیات میں تیری مگر کمی ہی نہیں
نشاط و عیش کی دنیا بھی کوئی دنیا ہے — جو رنج و غم میں نہ گذرے وہ زندگی ہی نہیں
کھُلے گا کس سے حقیقت کا راز دنیا میں — کہیں بلند وہ اب صوتِ سرمدی ہی نہیں
طوافِ دیر و حرم میں کروں تو خاک کروں — وہ تیرا در ہی نہیں یہ تری گلی ہی نہیں
کسی کے جانے سے چاروں طرف اندھیرا ہے — مرے خیال کی دنیا میں روشنی ہی نہیں
نصیب میں ہے اسیری کی موت اے صیاد — ہمارے واسطے گلشن کی زندگی ہی نہیں
بہت درست ہے یہ قول بسمل بدمست — شراب پی کے جو بہکے وہ آدمی ہی نہیں

منشی دیا نراین نگم

(جناب حسن عسکری صاحب عندلیب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ)

منشی دیا نراین نگم صاحب سے میری ذاتی واقفیت ۱۹۳۴ء میں ہوئی، جب میں نے اپنا ایک مضمون مثنوی سحرالبیان کے متعلق لکھکر زمانہ میں چھپنے کے لئے اُن کی خدمت میں روانہ کیا۔ اُس وقت تک منشی جی میرے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ ضمناً میرے مضمون میں کچھ تذکرہ گلزار نسیم مصنفہ پنڈت دیاشنکر نسیم کا آگیا تھا، بلکہ غالباً گلزار نسیم کے چند اشعار کو مقابلۃً پیش کرنے کی جرأت کی گئی تھی۔ اس لئے اُن کو مضمون کی اشاعت میں تأمل تھا۔ منشی جی کا خیال تھا کہ کہیں یہ مضمون دوبارہ "معرکۂ شرر و چکبست" کا دروازہ نہ کھول دے۔ چنانچہ میرے مضمون کی اشاعت کم و بیش ڈیڑھ سال تک تعویق میں رہی، زاں بعد منشی جی کو میرے نام سے گمان ہوا کہ میں حضرت تنہا کے خاندان سے متعلق ہوں، اور اُنھوں نے اپنی کسی ضرورت سے جب تنہا صاحب کو خط لکھا تو اُس میں میرے مضمون کا تذکرہ کیا، اور تنہا صاحب سے دریافت کیا کہ میں اُن کا لڑکا یا بھائی تو نہیں ہوں، نیز اُن کے ذریعہ مجھ تک یہ پیام بھیجا کہ اگر مجھے کوئی اعتراض نہ ہو تو مضمون میں سے گلزار نسیم سے متعلق حصہ خارج کرکے اسکو شائع کر دیا جائے۔ یہ تھی میرے اور اڈیٹر زمانہ کے تعلقات کی ابتدا۔ اس کے بعد میری ایک آدھ نظم زمانہ میں شائع ہوئی اور ہمارے تعلقات میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اگرچہ اب تک نہ اُنھوں نے مجھے دیکھا تھا نہ میں نے اُن کو۔

فروری ۱۹۳۹ء میں اپنی ایک ضرورت سے مجھے الہ آباد جانا پڑا، خیال آیا کہ میرٹھ واپس آتے ہوئے ایک روز کے لئے کانپور کیوں نہ اُتر جاؤں اور منشی دیا نراین سے شرف نیاز حاصل کروں۔ چنانچہ اس ارادہ سے میں نے اُن کو خط لکھا، اور یہ درخواست کی کہ وہ کانپور اسٹیشن پر مجھے ملیں، کیونکہ میں کبھی کانپور اس وقت تک نہ گیا تھا، اور خیال تھا کہ منشی صاحب کا مکان رات کے وقت تلاش کرنے میں وقت ہوگی، منشی جی نے میرے عریضہ کا جواب فوراً لکھا، اُس کی نقل ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

دفتر زمانہ نیا چوک کانپور   نیا چوک متصل برالیہ۔ مکان دیانراین نگم

۲۲۔ فروری ۱۹۳۹ء

مکرمی۔ تسلیم عرض۔ آپ کا خط ملا۔ مجھے افسوس ہے کہ پہلے معلوم نہ تھا ورنہ میں ۱۹۔ ۲۰ فروری

کو الہ آباد ہی میں جا پہنچا اور میں موجود تھا۔ وہاں سے واپسی پر طبیعت ذرا خراب ہو گئی ہے، اس لئے میں رات کو تو اسٹیشن نہ آسکوں گا، البتہ آپ اسی گاڑی سے آیئے جو کانپور دن میں پہونچتی ہو، اور دفتر زمانہ تک کم سے کم دو گھنٹہ کے لئے تکلیف فرمایئے۔ ایک گاڑی الہ آباد سے شاید آٹھ بجے چلتی ہے اسی سے کیوں نہ آیئے۔ اُمید کہ آپ نے اپنے پرچے اچھے کئے ہونگے۔ میرا مکان بھی دفتر ہی کے پاس ہے، آپ سیدھے مکان یا دفتر تشریف لایئے۔

بندہ دیانرائن نگم

مجھے منشی جی کا یہ خط الہ آباد ہی میں مل گیا تھا لیکن میں اس مرتبہ کانپور نہ اُتر سکا، کیونکہ میرے ایک دوست جو اس وقت میرے ہمراہ تھے اس بات پر مُصر تھے کہ ہم لوگ براہ راست میرٹھ پہونچ جائیں۔ میرٹھ پہونچکر مجھے منشی جی کا خط ملا جس میں کانپور میں اُن سے نہ ملنے پر اظہار افسوس کیا تھا۔

اکتوبر ۱۹۴۱ء میں اپنے ایک کام سے مجھے پھر الہ آباد جانا پڑا۔ وہاں سے واپسی پر کانپور اُترنا پڑا، لیکن قیام اپنے کرم فرما جناب سید احمد رضا صاحب انکم ٹیکس آفیسر کانپور کے ہاں رہا۔ اس موقع پر منشی صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ جب اُن کے مکان پر پہونچا تو مقامی آدمی سمجھ کر منشی صاحب نے مجھ سے رواروی میں باتیں کرنی شروع کیں۔ لیکن جب میں نے اُنھیں اپنا نام بتایا اور کہا کہ میں میرٹھ سے آیا ہوں تو انھوں نے ایک خاص انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا، والد محترم (تنہا صاحب) کے حالات پوچھے اور مہمانوں کی طرح میری خاطر و مدارات کرنی شروع کی۔ پان منگائے اور شاید کھانے کے لئے مجھ سے کہا۔ پھر میری ایک نظم سنی، اسی اثنا میں مولوی محمد یعقوب خاں صاحب کلام بی۔ اے جو اُن کے یہاں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے آگئے اور اُن سے میرا تعارف کرایا۔

میرا قیام کانپور میں کئی روز رہا، اور جب تک میں وہاں رہا منشی صاحب سے برابر ملتا رہا۔ ایک روز میں نے کانپور میں وکالت شروع کرنے کا خیال ظاہر کیا، تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ بھئی! تم ضرور آجاؤ جو امکانی کوشش تمھیں امداد پہونچانے کی میں کرسکتا ہوں اُس سے دریغ نہ کرونگا۔

دوران گفتگو میں یہ بھی ذکر کیا کہ زمانہ کی اشاعت کا سلسلہ میں اپنی حیاتِ فانی کے بعد بھی رکھنا چاہتا ہوں، مگر دشواری یہ ہے کہ اس ذمہ داری کو کوئی اپنے سر نہیں لینا چاہتا۔ میرا حق اس معاملہ میں اپنے عزیزوں یا دوستوں کے لڑکوں پر ہو سکتا ہے، لیکن اُردو کے کسی پرچہ کی ادارت مالی اعتبار سے نافع نہیں ہے اس لئے نہ کسی عزیز کے لڑکے کو مائل کرسکتا ہوں نہ دوست کے لڑکے کو، کیونکہ عزیز اور احباب دونوں کو شکایت ہوگی کہ میں نے اپنے سب لڑکوں کو اچھے عہدوں پر ملازم کرادیا اور ان کے لڑکوں کے

سپرد وہ کام کیا جو سب سے زیادہ بیکار اور غیر مفید ہے لیکن چونکہ تم وکالت کے لئے یہاں آنے کا قصد رکھتے ہو مجھے تم سے بڑی تقویت رہیگی اور مجھے اُمید ہے کہ اپنے پیشہ کے کام سے جو وقت بچ رہیگا اُس میں تم میرا ہاتھ بٹاؤگے۔ چنانچہ میں نے وعدہ کیا کہ اگر کانپور میں میرا قیام مستقل ہوگیا تو ضرور آپ کی امداد کرونگا۔ لیکن بعد کو میں نے کانپور کا خیال ترک کرکے میرٹھ ہی میں کام شروع کردیا۔

نومبر ۱۹۴۲ء میں میں نے اپنے ایک کام کے لئے منشی دیا نراین نگم صاحب کو خط لکھا۔ جواب میں تاخیر ہوئی تو میں نے یاد دہانی کی، اُس کے جواب میں رقم طراز ہیں:-

کانپور ۱۰۔ دسمبر ۴۲ء

میرے مکرم، تسلیم عرض۔ بفضلہ خیریت ہے۔ آپ کی خیر و عافیت معلوم ہوکر اطمینان ہوا۔ آپ کے دونوں خط ملے۔ مجھے افسوس ہے کہ پہلے خط کے جواب میں اتنی دیر ہوگئی۔ اس طرف آپ کی یاد اکثر آئی لیکن مصروفیات کی وجہ سے خط لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ اُردو کانفرنس کے انتظامات میں کوئی حصہ نہیں لے سکا۔ مجھے دو تین سال سے انجمن اُردو کی روش سے قدرے شکایت ہے اور مجھے یہ محسوس ہورہا ہے کہ اس پلیٹ فارم سے بھی پارٹی پالٹیکس کا مقصد پورا کیا جارہا ہے اور مجھے یہ پسند نہیں ہے اس لئے میں اس کی کمیٹی استقبالیہ سے علٰحدہ رہا۔ آپ نے پیج، ہماری زبان میں میرا نام دیکھکر خیال کیا ہوگا کہ جو خدمت آپ نے مجھے سپرد کی ہے انجام دے سکونگا۔ ثاقب صاحب کو تو شاید مجھ زیادہ دخل نہیں ہے، لیکن فرحت صاحب البتہ خاص کارکنوں میں ہیں۔ میں کوشش کرونگا کہ آپ کا مدعا اُن کے گوش گذار ہوجائے۔ اس سے زیادہ کوئی بات میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔

مضمون کے متعلق بعد میں عرض کرونگا، اس وقت وہ میرے سامنے نہیں ہے، دوبارہ پڑھ کر اگر ممکن ہوگا تو شائع کردونگا۔ ورنہ کہیں اور چھپ جائیگا۔

پرچے کے متعلق آپ نے جو باتیں لکھی ہیں اس کا شکریہ عرض ہے۔ سری نراین جی آپ کو سلام عرض کرتے ہیں، اپنے والد صاحب سے میرا آداب عرض کردیجئے گا۔ امید کہ مزاج مبارک بخیر و عافیت ہوگا

بندہ دیا نراین نگم

اکتوبر یا نومبر ۱۹۴۲ء میں تلاش روزگار نے مجھے پھر کانپور پہونچایا۔ مثل سابق اس مرتبہ بھی شروع میں بیس بائیس دن تک میرا قیام سید احمد رضا صاحب انکم ٹیکس آفیسر کانپور کے مکان پر رہا جو سروپ نگر میں واقع تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن دیا نراین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ جب پہلے دن اُن کے مکان پر پہونچا تو وہ اپنی آنکھوں کی تکلیف کے باعث ایک کمرہ میں لیٹے ہوئے تھے جس کو تاریک بنانے کے

خیال سے اُنھوں نے پردہ وغیرہ ڈال کر تیرہ و تار بنا رکھا تھا۔ اس زمانہ میں منشی صاحب اپنی آنکھوں کا علاج کرا کے بمبئی سے واپس تشریف لائے تھے۔ لکھنے پڑھنے کے کام سے بالکل معذور تھے اور ڈاکٹروں نے بھی یہی ہدایت کر رکھی تھی۔ مگر منشی جی اپنی عادت سے مجبور تھے، اپنے لڑکوں اور تیمارداروں کو ذرا غافل دیکھکر چوری چھپے خط وغیرہ ضرور پڑھ لیا کرتے تھے۔ بہرحال اُس روز جب میرے آنے کی اطلاع اُن کے بیٹے دمن نگم نے کی تو اُنھوں نے مجھے فوراً بلا لیا اور بے حد اظہار مسرت کیا، والد صاحب کی کیفیت مزاج پوچھی، پھر کہنے لگے "کہو کانپور کیسے آنا ہوا؟ محض سیر کے لئے یا وکالت کے ارادہ سے۔" میں نے کہا "وکالت کے ارادہ سے تو نہیں آیا ہوں لیکن اب کچھ دنوں کے لئے میرا قیام کانپور میں مستقل رہیگا۔" اس بات سے بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے "سچ کہتا ہوں مجھے ایک آدمی کی اس وقت بڑی سخت ضرورت تھی، اور خدا نے تمھیں میری اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بھیجا ہے۔" میں نے عرض کیا کہ "اگر خدا نے مجھے آپ ہی کے کام کی انجام دہی کے لئے بھیجا ہے تو آپ فرمائیے میں حاضر خدمت ہوں۔" پھر فرمایا "میں آزاد کا جنگ نمبر نکال رہا ہوں، اور تم کو مجھے اس میں مدد دینی ہوگی۔" جنگ نمبر کا نام سُنتے ہی مجھے تھوڑا تکدّر ہوا کیونکہ یہ بات میرے سیاسی خیالات کے منافی تھی۔ لیکن میں منشی جی کی دل آزاری یا اُمیدوں پر پانی پھیرنا بھی نہیں چاہتا تھا، اس لئے میں نے کہا "بہت اچھا، میں آپ کو ضرور مدد دونگا۔" منشی جی بڑے نبّاض اور ذہین انسان تھے۔ میرے جواب دینے میں ذرا سی دیر ہونے سے اُن کو خیال ہوا کہ مجھے انھیں مدد دینے میں کچھ تأمّل ہے۔ چنانچہ فوراً فرمایا "بھئی حسن یحییٰ صاحب! میں آپ کو اس امداد کا پورا معاوضہ دونگا۔" میں نے عرض کیا "مجھے معاوضہ کی ضرورت قطعاً نہیں ہے، میرے اور میرے والد صاحب کے آپ سے جو تعلقات ہیں اُن کا تقاضہ ہے کہ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں۔" بالآخر مجھے ان کے تعمیل ارشاد میں چند مضامین لکھنے پڑے اور حالانکہ میں مُصر تھا کہ میں کوئی معاوضہ اُن سے نہ لونگا لیکن منشی جی اُن آدمیوں میں سے نہ تھے جو آسانی سے مان جاتے۔ کہنے لگے "میاں کانپور میں تمھارا سرپرست (Guardian) میں ہوں اور تمھیں میرا حکم ماننا ہوگا۔" چنانچہ مجبوراً میں نے اُن سے معاوضہ لے لیا۔

سروپ نگر سے وہ مقام جہاں مجھے اپنے کام کے لئے جانا پڑتا تھا کافی فاصلہ پر تھا اور میں یہی چاہتا تھا کہ کہیں منشی جی کے قریب مکان مل جائے تو اتنی دُور کی مسافت طے کرنے سے بچ جاؤں لیکن مکان نہ ملا آخرکار منشی جی نے مجھ سے کہا "تم میرے یہاں کیوں نہیں آجاتے۔ میں تمھیں دفتر زمانہ میں ایک کمرہ دیدونگا اور وہ تمھاری ضروریات کے لئے کافی ہوگا۔" چنانچہ میں اُن کی اس ترغیب پر دفتر زمانہ میں رہنے لگا اور تقریباً ایک ماہ جب تک میں کانپور میں رہا، وہیں رہا۔ دورانِ قیام میں روزانہ مجھ سے دریافت کرتے تھے کہ اگر مجھے

کوئی تکلیف ہو تو رفع کر دی جائے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میں بغیر ناشتہ کئے ہوئے چلا جایا کرتا تھا۔ ایک روز مجھ پر ناراض ہوئے کہ تم بغیر ناشتہ کے کیوں چلے جاتے ہو، اگر خود ناشتہ کا انتظام نہیں کر سکتے تو میں اپنے یہاں کرا دونگا۔ اسی طرح جب موسم سرما شروع ہو گیا اور میں نے اپنے لئے پُل اوَور (Pullover) نہیں خریدا تو اُن کو خیال ہوا کہ شاید میرے پاس دام نہیں ہیں جس کی وجہ سے میں نے Pullover نہیں خریدا ہے چنانچہ مجھے اس کی خرید کے لئے کچھ روپیہ دینے لگے لیکن جب میں نے اُنھیں یقین دلایا کہ میں نے اپنی عدیم الفرصتی کے سبب سے Pullover نہیں خریدا ورنہ دام میرے پاس موجود ہیں، تب بمشکل تمام وہ اس بات پر راضی ہوئے کہ روپیہ واپس لے لیں۔

منشی صاحب آنجہانی کا اگرچہ میرے دل میں بڑا احترام تھا لیکن میرے اور اُن کے سیاسی خیالات میں فرق تھا، اور میں بے تکلفی سے اُن پر اس کا اظہار کر دیتا تھا، بلکہ بعض اوقات کافی دلچسپ اور طویل بحث چھڑ جاتی تھی۔ لیکن کبھی کوئی بدمزگی پیدا نہ ہونے پائی۔ منشی صاحب اُن لوگوں میں تھے جو دوسرے لوگوں کے دلائل پر بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے عادی ہیں۔

دوران قیام کانپور میں اپنے ہر ملنے والے سے میری تعریف فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ مجھے ان سے بڑی تقویت ہے اور انھوں نے جنگ نمبر میں مجھے بڑی مدد دی ہے۔ چنانچہ مسٹر سلیم جعفر، ثاقب کانپوری اور علی عباس حسینی صاحب سے میرے تعارف کا باعث وہ ہوئے، پروفیسر سنت پرشاد مدہوش صاحب سے بھی میری ملاقات انھیں کے ذریعہ سے ہوئی۔

منشی جی اپنے ادارتی فرائض بڑی تیزی اور تندہی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ باوجود اس کے کہ جس زمانہ میں کانپور پہونچا وہ صاحب فراش تھے لیکن دن رات اُنھیں زمانہ کی اشاعت و ترقی کی فکر لگی رہتی تھی بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو رات کو نیند کیونکر آتی ہوگی۔ اُن کے پرچہ میں کسی مضمون کا بغیر چک و اصلاح کے چھپنا مشکل تھا۔ اس میں کسی چھوٹے بڑے ادیب کی تخصیص نہیں تھی، اصلاح سب پر ہوتی تھی اور اگر کوئی ادیب ایسا ہے جس کا مضمون اُن کے پرچہ میں بغیر ترمیم و تنسیخ کے چھپ گیا تو اُسے بہت خوش قسمت سمجھنا چاہیئے لیکن باوجود اس اصلاح کے کوئی شخص اُن سے کبیدہ خاطر نہ ہوتا تھا۔ اور غالباً اس کا سبب اُن کی اپنی ذاتی خصوصیات تھیں۔

جن دنوں منشی جی صاحب فراش تھے میں نے دیکھا کہ وہ مضمون دوسروں سے پڑھوا کر پڑے پڑے سُنتے رہتے تھے اور نہایت برجستہ اصلاح دیتے تھے۔ اُن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ بڑے سے بڑا مضمون کم سے کم کاغذ پر آ جائے، اور اُن کی یہ عادت دوران جنگ میں کاغذ کی گرانی کی وجہ سے نہایت لگی رہتی

بلکہ جنگ سے قبل بھی جب کاغذ بافراط اور ارزاں قیمت پر مل جاتا تھا ایسا ہی کرتے تھے۔

منشی جی کا طرز تحریر نہایت سادہ تھا لیکن اُن کی اس سادگی میں عبارت کا زور قائم رہتا تھا۔ الفاظ عموماً آسان اور ہلکے پھلکے استعمال کرتے تھے، عبارت میں گنجلک نہیں ہوتی تھی اور اختصار پر جان دیتے تھے۔ خطوط لکھنے میں بھی سادگی اور صفائی مدِ نظر رہتی تھی اور حفظِ مراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اپنے چھوٹوں کو جس شفقت و مودت سے خط لکھتے تھے اُس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن سے ترسیل خطوط کا سلسلہ دائم رہا ہے۔ خط اُن کا نہایت پاکیزہ پختہ اور منشیانہ تھا، اگرچہ قلم دزا دبا کر لکھنے کے عادی تھے۔ انگریزی بھی بڑی تیزی اور روانی کے ساتھ بول اور لکھ سکتے تھے۔

میرے کانپور چھوڑنے پر اُنھیں افسوس تھا لیکن کہتے تھے کہ چونکہ تم اپنے گھر جا رہے ہو اور بہتر ملازمت پر جا رہے ہو اس لئے مجھے خوشی ہے۔ میرے ساتھ اپنی اولاد کی طرح پیش آتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں تمھاری خاطر تواضع نہ کر سکا، اگر آج میری بیوی زندہ ہوتیں تو میری علالت کے باوجود تمھاری خاطر و تواضع میں کمی نہ آتی۔ میرٹھ پہونچنے پر مجھے کانپور سے اُنھوں نے خط لکھا جس کو بجنسہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:-

کانپور، ۵۔جنوری ۲۲ء

مائی ڈیر حسن یحییٰ صاحب۔ تسلیم۔ شرمندہ ہوں کہ آپ کے محبت نامہ کا ابتک جواب نہ لکھ سکا۔ لیکن اس تاخیر کی اصل وجہ یہ ہے کہ خود ہی اپنے قلم سے آپ کو جواب لکھنا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اب لکھنے پڑھنے میں کس قدر تخفیف کرنا پڑی ہے۔ کرسمس میں لڑکے اور کئی اور عزیز آگئے تھے، اس لئے یہ زمانہ تو چہل پہل میں آسانی سے کٹ گیا، لیکن اس کے بعد قریب قریب ہر شام کو آپ کی یاد آتی رہتی ہے مگر اس خیال سے دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ آپ یہاں پردیس میں تھے اور تمام خواہشوں کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ میں آپ کے آرام و آسایش کا اپنے خاطر خواہ کوئی انتظام نہ کر سکا۔ آپ جس محبت و سعادتمندی سے ہم لوگوں سے پیش آئے اسکی بدولت ہم لوگوں میں مطلقاً کوئی غیریت یا اجنبیت باقی نہیں رہی۔ ابھی یہاں کے سب لوگ آپ کو اسی طرح یاد کرتے ہیں جیسے دوسرے قریبی عزیزوں کو جو کانپور سے باہر اور ہم لوگوں سے دور ہیں۔ بسری نراین جی اور رمن تمن سب آپ کو تسلیمات کہہ رہے ہیں۔ آپ نے سب کچھ تو لکھا لیکن نئی ملازمت کا کوئی مفصل حال نہ لکھا، میرا جی لگا ہوا ہے۔ براہ مہربانی لکھیئے کہ آپ کس وقت دفتر جاتے ہیں اور کب تک واپسی ہوتی ہے، کام کی کیا نوعیت ہے؟ تنخواہ کا کیا حال ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ انشاء اللہ جلد ہی یہ سلسلہ مستقل صورت اختیار کرلے گا۔

[1]......... کے ریویو کی سخت ضرورت ہے۔ اگر آپ لکھ چکے ہوں تو ریویو اور کتاب دونوں رجسٹری سے بھیج دیجیے۔ ورنہ اب جلد لکھ ڈالیے۔ اگر خدانخواستہ عدیم الفرصتی کے باعث آپ جلد نہ لکھ سکیں تو بے تکلف کتاب واپس کر دیں۔ میں جنوری نمبر میں اسے شائع کرنا چاہتا تھا، اب فروری نمبر میں جا سکے گا لیکن اگر اس میں قباحت ہوئی تو مجھے فاضل مصنف سے شرمندگی ہوگی

اپنے والد صاحب گرامی کی خدمت میں میرا سلام شوق عرض کر دیجیے، آپ کی بدولت اُن کے ساتھ میرا دوستانہ تعلق اب پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ خدا کرے آپ اُن کے زیر سایہ عرصۂ دراز تک خوش و تندرست رہیں۔ نیا سال آپ اور تمام اعزا کو مبارک ہو۔ زیادہ شوق۔

دعاگو دیا نراین نگم

(۱) دوسرا عریضۂ نیاز مکرمی تنہا صاحب کو دیدیجیے۔

(۲) کیا ساغر صاحب میرٹھ چھوڑ کر کلکتہ جا رہے ہیں؟ میں نے سنا ہے کہ وہ آج کل فضلی برادرس کے لیے ایک ادبی فلم تیار کر رہے ہیں۔ ذرا مفصل حالات سے مطلع کیجیے۔

دیا نراین نگم

والد محترم نے منشی صاحب کے خطوط محفوظ نہیں رکھے، ایک خط اتفاق سے میرے اس خط میں اُن کے نام نکل آیا ہے اُس کو بھی ذیل میں درج کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کانپور۔ ۵۔ جنوری ۱۹۴۲ء

میرے مکرم تسلیم عرض۔ عرصہ ہوا کارڈ گرامی آیا تھا، ان دنوں عزیزی حسن یحییٰ صاحب کانپور ہی میں تھے۔ آپ کے پرسش حال اور دعائے خیر کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس خط کے لکھنے میں کچھ تو سستی اور کچھ بے بسی کی وجہ سے دیر ہو گئی جس کی معافی چاہتا ہوں۔ عزیزی حسن یحییٰ صاحب کے ذریعہ پہلے بھی عذر خواہی کر چکا ہوں۔ مجھکو اور میرے یہاں سب لوگوں کو عزیز موصوف کے کانپور سے چلے جانے کا افسوس ہے لیکن اب وہ آپ کے اور اپنی والدہ ماجدہ کی آنکھوں کے سامنے رہیں گے، اس سے دلی اطمینان ہے، یہاں اُن کے آرام و آسایش کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میری علالت کی وجہ سے بھی معقول انتظام نہ ہو سکا لیکن وہ ہم لوگوں کے درمیان بالکل شیر و شکر ہو کر رہے، یہی وجہ ہے کہ ہم سب لوگ ان کی اس قدر یاد کر رہے ہیں۔ دراصل اپنے چند روزہ قیام کانپور کے دوران میں انھوں نے ہم لوگوں کی پرانی رفاقت اور ادبی دوستی کو بہت گہرا بنا دیا ہے۔ خدا کرے وہ آپ بزرگوں کے زیر سایہ رہ کر خوب پھلیں پھولیں۔

[1] کتاب کا نام قصداً چھوڑ دیا گیا ہے۔ عندلیب

عرصہ سے آپ نے زمانہ کے لئے کچھ نہیں لکھا ہے، ممکن ہو تو اگلی فرصت میں اس کے لئے کوئی نہ کوئی خاص مضمون تحریر فرمادیں۔ اُمید کہ آپ مع اہل وعیال بخیر و عافیت ہونگے۔ بچوں کو دعا۔

نیازمندِ قدیم بندہ دیا نرائن نگم

غرض مرحوم کے اوصاف کو کہاں تک گِنایا جائے، وہ سراپا ایثار تھے، اتنے مخلص اور بامروت لوگ آج کل بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اُن سے ملے جُلے ہیں۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

قطعہ تاریخ

وفات حسرت آیات جناب فیض مآب رائے صاحب منشی دیا نرائن نگم بی اے رئیس و اسپیشل مجسٹریٹ و مدیر "زمانہ" و "آزاد" کانپور

(از شریمتی شن سکینہ رازؔ، ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ بلند شہر)

کیا مِلا دستِ اجل توڑا جو تارِ زندگی — رہ گیا سازِ شکستہ یادگارِ زندگی
ہو گئی بزمِ زمانہ غرقِ دریائے الم — جب سُنا، ٹوٹا وہ دُرِّ شاہوارِ زندگی
ہو نہیں سکتے رقم اخلاقِ حسنہ آپ کے — تھی صحافت آپ کی صد افتخارِ زندگی
آپ کا ہر نوٹ، ہر اک تبصرہ بے لاگ تھا — یعنی تبلیغِ حقیقت تھا شعارِ زندگی
سچ تو یہ ہے زندگی جد و جہد کا نام ہے — آپ کی سعیِ عمل تھی شاہکارِ زندگی
ہو گئے آزاد قیدِ غم سے اس کو پھینک کر — ہو گیا جس دم وبالِ دوش بارِ زندگی
آپ کے پابندِ الفت ہیں اسیرِ رنج و غم — ہے خزاں کے رنگ پر اُن کی بہارِ زندگی

چرخ کا سر توڑ کر اے رازؔ لکھ تاریخِ غم
قلبِ ہستی سے مٹے نقش و نگارِ زندگی
۱۹۴۲ = ۳ - ۱۹۴۵

"ملے گا کیا حیاتِ جاوداں میں"

(از پنڈت اندرجیت شرما۔ ماچھرہ ضلع میرٹھ)

یہ تاریکی ہے کیسی آسماں میں
نظر آتا نہیں کچھ بھی جہاں میں

بدل جائے گا یوں رنگِ زمانہ
نہ تھی یہ بات تو وہم و گماں میں

الجھنا اے دلِ ناداں ہے بیکار
نہیں کچھ کاوشِ سود و زیاں میں

بہارِ عیش میں وہ لطف کب ہے
مزہ ملتا ہے جو سوزِ نہاں میں

کیا کیا تو نے اے داغِ محبت
لگا دی آگ ہی کون و مکاں میں

چٹکتا ہے جو غنچہ شاخِ گل پر
کھٹکتا ہے نگاہِ باغباں میں

ازل سے کھنچ رہا ہوں تیری جانب
کشش کتنی ہے تیری داستاں میں

نہ جانے کتنے جا بیٹھے تہِ آب
نہ ابھرا کوئی بحرِ بیکراں میں

بلا ہے چار دن کی زندگی بھی
ملے گا کیا حیاتِ جاوداں میں

کسی کا روئے رنگیں یاد آیا
جو دیکھا پھول کوئی گلستاں میں

غزل

مولانا نشور واحدی۔ کانپور

بے کیف شبِ مہ کی اجالی نظر آئی
بوتل جو مئے ناب سے خالی نظر آئی

ہلکی سی جوان آنکھوں میں لالی نظر آئی
میں کیا کہوں دل لوٹنے والی نظر آئی

جب فصلِ بہاری میں لگی آگ جگر میں
ہولی مجھے جیسے کہ دِوالی نظر آئی

محویتِ دیدار میں آئینہ جو دیکھا
مجھ سی نہ مری شکلِ مثالی نظر آئی

بھیگی ہوئی زلفوں میں وہ نکھرا ہوا چہرہ
ساون کی گھٹاؤں میں اجالی نظر آئی

کعبہ میں بھی اس حسنِ ستمگار نے مارا
سجدوں میں بھی ابروئے ہلالی نظر آئی

یاد آ گئی بیتی ہوئی اک شب کی ملاقات
لہرا گیا میں رات جو کالی نظر آئی

وہ دوش وہ بازو وہ سرِ انگشت حنائی
جو چیز تھی سانچے ہی میں ڈھالی نظر آئی

پھر پڑ گئی اک جان سی مایوس نظر میں
پھر حسن کے چہرے پہ بحالی نظر آئی

مدت پہ انھیں عین جوانی میں جو دیکھا
میں کیا کہوں دنیا ہی نرالی نظر آئی

اک صبحِ غم انگیز نشور آئی تو جیسے
دنیا مجھے امید سے خالی نظر آئی

شیخ فخرالدین عراقی

(جناب یوگ دھیان آہوجہ ایم. اے)

شیخ فخرالدین ابراہیم عراقی ہمدانی فارسی زبان کے اُن شعرا اور صوفیائے کرام میں سے ہیں جن کی زندگی اور کلام اس توجہ سے محروم رہے جس کے وہ مستحق ہیں۔

شیخ عراقی کی زندگی کے حالات تین مختلف حصوں میں منقسم ہوتے ہیں' (۱) ہندوستان میں آنے سے پہلے، بچپن، زمانۂ تعلیم و تربیت' (۲) قلندروں کی جماعت کے ساتھ ہندوستان میں آنے کے بعد شیخ بہاؤالدین ذکریا کی صحبت میں شیخ عراقی کی ریاضتیں اور روحانی تکمیل' (۳) ہندوستان سے واپسی کے بعد سے وفات تک۔ عدن سے ہوکر کعبۂ مکرمہ کی زیارت کے بعد اُن کے روم، مصر اور شام کے سفر و سیاحت کے طویل اور پُرشکوہ حالات۔

نام ابراہیم تخلص عراقی اور لقب فخرالدین ہے اور ان کے والد کا نام شہریار[1]۔ ریو[2]۔ سپرنگر[3] اور ڈاکٹر آربری[4] وغیرہ محققین کے ہاں ان کا یہی نام مذکور ہے۔ تاریخ گزیدہ[5] میں ان کا نسب یوں بیان کیا گیا ہے "عراقی وھو فخرالدین ابراہیم بن بزرجمہر بن عبدالغفار الجوالقی"۔ صاحب مجمع النفائس[7] نے ان کا نام "شیخ فخرالدین عراقی ابن ابراہیم ابن شہریار" لکھا ہے۔ سیر العارفین کے مطابق یہ نام شیخ فخرالدین محمد شہریار ہے۔

ان کی جائے پیدائش کا مفصل ذکر چند ہی مصنفین نے کیا ہے ورنہ عام طور پر انھیں ہمدانی ظاہر کردینے پر ہی اکتفا[10] کی گئی ہے۔ نفحات[11] الانس میں ان کی جائے پیدائش "نواحی عدن" تحریر کی گئی ہے۔ حمداللہ مستوفی کی تاریخ گزیدہ[12] میں اُن کے گاؤں کا نام "کوبجان بولایت اعلم ہمدان" کے طور پر درج ہے۔ پروفیسر براؤن نے ترجمہ میں ان کی جائے ولادت کا نام "محل" لکھا ہے۔

---

۱ نفحات الانس طبع نولکشور پریس ص۳۹۲۔ ہفت اقلیم نسخہ خطی کتاب خانہ ریاست کپورتھلہ ص۱۰۵ وغیرہ۔ ص۵
۲ مرأۃ الخیال طبع بمبئی ص۶۱۔ تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی مؤلفہ پروفیسر براؤن ص۲۱۵۔ تاریخ فرشتہ نولکشور پریس۔ سیر محمد شہریار
۳ فہرست مخطوطات فارسی در موزہ برطانیہ جلد دوم ترجمہ عراقی ص۵۹۳ ۴ فہرست مخطوطات کتاب خانہ ہائے شاہ اودھ جلد اول ص۱۶۔ ۵ ... و فہرست کتاب خانہ ایوان ہند جلد دوم ص۴۲ ۶ مؤلفہ پروفیسر براؤن ص۲۲
۷ نسخہ خطی پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ ۸ بحر الریحانہ (حاشیہ ص۲) مرتبہ خان بہادر مولوی محمد شفیع صاحب
۹ سیر العارفین: نسخہ خطی کتاب خانہ خان بہادر موصوف) ۱۰ ہفت اقلیم۔ مرأۃ الخیال۔ تذکرہ دولت شاہ سمرقندی۔ تاریخ فرشتہ
ریو (فہرست کتاب خانہ موزہ برطانیہ) سپرنگر (فہرست کتاب خانہ ہائے شاہ اودھ) وغیرہ۔ ۱۱ ص۴۹۲۔ ۱۲ مؤلفہ پروفیسر براؤن ص۲۲
Browne Biographies of Persian Poets.

جہاں اور کتابوں میں عراقی کے کچھ حد تک مفصل و معتبر حالات ملتے ہیں وہاں عراقی کے کلیات کے بعض نسخوں کے ساتھ ایک دیباچہ بھی ملتا ہے۔ ملا عبدالنبی فخر الزمانی نے شیخ عراقی کے حالاتِ زندگی کی چھان بین کرنے کی کوشش کی ہے، انھوں نے اس دیباچہ اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کی تحریروں کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے، وہ اپنے تذکرۂ میخانہ[1] میں لکھتے ہیں:-

"بر رائے انور ہنرمنداں و ضمیر ضیاگستر خردمنداں پوشیدہ نماند کہ مؤلف ایں اوراقِ پریشاں عبدالنبی فخر الزمانی بہت تحقیق احوال شیخ ابراہیم اکثر کتب معتبر ارباب خبر را بنظر در آورد۔ اقوال ہمہ خلاف یکدیگر بر آمد خاطر بہیچ قولے از اقوال آنہا قرار نگرفت مگر بر قول مولوی نامی عبدالرحمان جامی و بر گفتار عزیزی کہ دیباچہ بر دیوان آں کاشف اسرار ربانی نوشتہ و ایں ہر دو قول مطابق یکدیگر است، بنا بر آں بر بیان برد۔"

انگلستان کے مشہور مستشرق ڈاکٹر اے۔ جے۔ آربری نے ۱۹۳۹ء میں عراقی کی مثنوی عشاق نامہ[2] کا متن اور انگریزی ترجمہ "Song of Lovers" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں انھوں نے مذکورہ بالا دیباچہ مع ترجمہ شامل کیا ہے۔ یہ مفید کتاب اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کی طرف سے شائع ہوئی ہے عراقی کے حالاتِ زندگی کی تحقیق کے لئے اس دیباچہ کی اشاعت بہت قدر و قیمت رکھتی ہے۔

ملا عبدالنبی تذکرہ میخانہ[3] میں عراقی کی جائے پیدائش کمجان بیان کرتے ہیں۔ دیباچہ[4] میں بھی قریۂ کمجان از نواحی شہر ہمدان" مذکور ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ حمد اللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ میں "کونجان" اسی قصبۂ "کمجان" کے نام کی ہی دوسری صورت تحریر کی ہو۔

بہرحال ہمارے پاس یہی باور کرنے کے ثبوت ہیں کہ شیخ عراقی کمجان[5] کے قصبہ میں ایک ذی عزت خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد "جداً فوق جد" علما و فاضل تھے۔ اس امر کا ثبوت مختلف کتابوں میں ملتا ہے کہ شیخ عراقی مشہور صوفی شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے[6] تھے، اور یہ بات اُن کے خاندان کی عظمت کو اور بھی واضح کرتی ہے۔

شیخ عراقی کی پیدائش کے ساتھ ایک دلچسپ کہانی وابستہ ہے۔ کہتے ہیں کہ عراقی کے پیدا ہونے

[1] مولفہ خان بہادر مولوی محمد شفیع صفحہ ۲۹۱ [2] اس مثنوی کے نام مختلف طور پر عشاق نامہ، عشق نامہ اور دہ فصل پائے جاتے ہیں۔
[3] صفحہ ۲۴۲ + [4] مولفہ و مترجمہ ڈاکٹر آربری [5] ڈاکٹر آربری Kamjan
[6] دیباچہ و میخانہ سے ماخوذ [7] سیر العارفین بحوالہ میخانہ حاشیہ صفحہ ۲۴۲ و تذکرۂ حسینی نسخۂ خطی کتاب خانہ پنجاب یونیورسٹی۔ تاریخ فرشتہ صفحہ ۴۰۵

سے قریب ایک ماہ پہلے اُن کے والد نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام باقی ائمہؑ معصومین کے ساتھ ایک باغ میں سیر کر رہے ہیں اور وہ (شیخ عراقی کے والد) بھی وہیں باغ میں کھڑے ہیں۔ اچانک ایک شخص ایک بچہ لئے ہوئے آیا۔ اس نے وہ بچہ حضرت امیر کے مبارک قدموں میں زمین پر رکھ دیا۔ امیرالمؤمنین نے اسی بچے کو اُٹھا لیا اور (عراقی کے والد کو) اپنے نزدیک بُلا کر اُن کی گود میں ڈال دیا۔ اور فرمایا کہ لو، میرے عراقی کی پوری حفاظت کرنا، یہ بچہ عالمگیر ہوگا۔ اس خواب سے عراقی کے والد کو اتنی مسرت ہوئی کہ خوشی کے مارے آنکھ کھل گئی۔[1]

عراقی کے والد بیان کرتے تھے کہ جب عراقی پیدا ہوا اور اُن کے نزدیک لایا گیا تو انھوں نے بعینہٖ اسی بچے کی صورت دیکھی جو کہ حضرت امیرالمؤمنین نے انھیں عطا کیا تھا۔[2]

غزل

(از حضرت یکساں اکبرآبادی)

دِل بے شگفتگی نہیں نالہ ہے اور اثر نہیں　　پھول ہے تازگی نہیں آگ ہے اور شرر نہیں
اُف وہ نظر غضب غضب درد نہیں ہے بے سبب　　اور تو کیا کہوں کہ اب اپنی بھی کچھ خبر نہیں
اپنا کمالِ گریہ آج ان کو دکھا رہا ہوں میں　　اشک بہا رہا ہوں اور چشم بھی میری تر نہیں
آہ و فغاں ہے کس لئے قلب ہوا اگر دو نیم　　خالی ز خطرۂ عظیم عشق کی رہگذر نہیں

فکر ہے مجھ کو اب یہی کیسے کٹے گی زندگی
اُس نے نگاہ پھیر لی پہلی سی وہ نظر نہیں

---

[1] دیباچہ، بالسی از اجبار [3] از میخانہ و دیباچہ [4] خفد در دیباچہ [5] دیباچہ و میخانہ

پناہ

افسانہ

(از جناب پریم باسل۔ پٹیالہ اسٹیٹ)

"چچا جی" "کون؟"

"میں......" "کسم......"

"ہاں" "بولو......؟"

لیکن وہ نیچی نظریں کئے چپ چاپ ہی وہاں کھڑی رہی۔

"کسم......؟" وہ خاموش تھی۔ انھوں نے اُسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"کیوں کسم؟" مگر وہ اُس وقت کچھ بے جان سی، کچھ کھوئی ہوئی سی تھی، اُس کے گداز سینے میں ایک عجیب وجزر کی سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔

"ارے تم روتی ہو.... کسم...."

"نہیں..... مجھے چھوڑ دیجئے"

"نہیں کسم"

"نہیں، مجھے جانے دیجئے....." کسم ہچکیاں لینے لگی۔

چندر بابو نے کسم کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا، اور اُس کے چہرے پر ڈھلکتے ہوئے ان آنسوؤں کو ایک بار دیکھا، انھیں اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں بیچارگی کی جھلک دکھائی پڑی۔ اُس نے کہا۔

"کہاں جاؤ گی کسم؟" "کہاں!...." وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"سچ تو ہے،... وہ کہاں جائیگی؟ اسے اب قسمت کہاں لے جانا چاہتی ہے۔ باہر گھاٹ میں کچھ شور سنائی دینے لگا، ندی میں جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا، لوگ پکار پکار کر یاتریوں کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر رہے تھے۔

"نہیں مجھے جانے دیجئے"

"لیکن کہاں جانا چاہتی ہو تم؟"

"جلتا.... ؟ وہیں جہاں بابو جی گئے..... وہیں جہاں ... ماتا جی گئیں... وہیں میں بھی جانا چاہتی ہوں"

پھر کسم اپنے آپ کو روک نہ سکی، اور ان کے کندھے پر سر رکھ کر رو پڑی۔

چندر بابو اُسے تسلّی دیتے تھے، مگر اس کی ہچکی بند نہ ہوئی۔

بڑی بڑی لہریں غصّے سے بھری ہوئی ندی کے سینے پر پھنکار رہی تھیں، ہوا پانی سے بھیگی ہوئی تھی۔ کالے کالے بادل آسمان پر پر پھیلا رہے تھے۔ کنول، چندر بابو کی دھرم پتنی، کسم کی بڑی بہن نے جب بارش کے آثار دیکھے، تو شانتی کے گھر سے جو اُس کی پڑوسن تھی، اپنے گھر آئی۔ آسمان پر بجلی تڑپ اُٹھی، کنول گھر کے دروازے میں قدم رکھتے ہی سہمی۔ کنول کی اِن دنوں کچھ عادت ہی ایسی ہو گئی تھی، اسی لئے وہ سیڑھیوں پر دبے پاؤں آہستہ آہستہ چڑھی، جب وہ کمرے کے دروازے پر پہونچی، بادل زور سے گرج اُٹھے؛ کنول رُکی، اندر سے چندر بابو کی آواز آئی "کسم..... آ" کسم نے اُن کے کندھے پر سے سر اُٹھایا، اور بھیگی بھیگی آنکھوں سے چندر بابو کو دیکھنے لگی۔ "جیجا جی، آپ بہت اچھے ہیں....."

کنول اُسی وقت کمرے میں داخل ہوئی، اُس کی آنکھیں لال انگارے کی طرح دہک رہی تھیں، کڑک کر بولی "بدمعاش..... نکل جا اس کمرے سے....." اُس کے ہونٹ غصّے میں بُری طرح کانپ رہے تھے، اور سارا جسم لرز رہا تھا۔

"جب سے اس گھر میں آئی ہے ایک طوفان اُٹھا رکھا ہے، ہٹ جا میری آنکھوں کے سامنے سے۔ بے شرم!!" یہ سُنتے ہی کسم کے نازک جسم کا رُواں رُواں کانپ اُٹھا، لرزتے ہوئے لبوں سے صرف اتنا نکلا "بہن.....!"

باہر زور سے بارش شروع ہو گئی، ہوا کے جھکّڑ چلنے لگے، بجلی ایک دفعہ پھر کڑکڑا کر تڑپ اُٹھی، اور بادلوں کے سیاہ نقاب میں روپوش ہو گئی۔

"کنول.....!"

"بس چُپ رہیے آپ بھی، بے شرمی کی حد ہو چکی.....!!!"

سنسان اور بھیگی سڑکوں پر جہاں کہیں کہیں پانی بھرا ہوا ہے، بجلی کی روشنی بھی جھلملا کر بے قرار ہو گئی۔ چندر بابو ہونٹ کاٹ کر رہ گئے۔ نہ جانے کس طرح اُنھوں نے یہ سب کچھ برداشت کیا، اُن کے دل پر چھُریاں چل رہی تھیں، انھیں ایسا معلوم ہوا کہ اُن کے دل پر ہزاروں بچھوؤں نے ایک ساتھ ڈنک مارا ہو۔ اُنھوں نے کچھ کہنے کے لئے سر اُٹھایا ہی تھا کہ کسم سر جھکائے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

کسم دوسرے کمرے میں تھی، اُس کا منہ تکئے میں چھُپا ہوا تھا، ہوا چل رہی تھی، ہلکے ہلکے جھونکوں سے لیمپ بھبک اُٹھا، پانی کی بوچھار نے کمرے کو گیلا کر دیا، اچانک نہایت تیز بجلی کڑکی، گویا زور سے ٹکرائے بادلوں میں دل ہلا دینے والا دھماکا ہوا اور ہوا کے زور سے لیمپ بجھ گیا۔ لیکن کسم بیچاری، جس کے

دن ہی ایسے آگئے تھے، مگر پہلے تو اچھے تھے، لیکن مستقبل تاریکی کے پردے میں چھپا ہوا تھا۔ نہیں کہہ سکتے کہ اب کیا ہوگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کُسم جس کے ... ماتا تھیں .. باپو جی تھے، اُن کی دو لڑکیاں تھیں ایک کنول، دوسری کُسم۔ چندر بابو کا تبادلہ کلکتہ کا ہوا۔ کنول ان کے ساتھ تھی۔ یہ تینوں یاترا کو جا رہے تھے۔ اتفاقاً سر پر بوجھ گرنے کی وجہ سے باپو جی چل بسے۔ چار دن بعد ماں بھی مر گئیں ... رہ گئی کسم ..... ٹھوکریں کھانے کے لئے ..... بچاری ابھاگن کسم !!!

پناہ !! کنول نے اُسے اپنے پاس بلا لیا۔

ایک مہینہ گزر گیا ... پھر دو ..... چندر بابو نے محسوس کیا کہ کسم کو اُن کی ہمدردی کی ضرورت ہے، اُن کو اس کے بھولے پن میں ایک عجیب کشش محسوس ہوئی۔ کسم نے بھی چندر بابو کو ..... وہ ان کے ایک لفظ کو بھی ٹالنا نہیں چاہتی تھی .. کنول نے یہ دیکھا اور سوچا کہ یہ سب ہے کیا؟ اور اس کا مطلب کیا ہے؟ یہی کہ اب کسم بچی نہیں، وہ سیانی ہوگئی ہے، تو اس کا مطلب؟

چندر بابو ہنستے ہیں، کسم مسکراتی ہے، وہ بلاتے ہیں، "کسم"..... "جی"

اور کسم کی آنکھوں میں مسرت کی چمک آجاتی ہے، اور اس کا ننھا سا دل بے قرار ہو کر دھڑکنے لگتا ہے۔ مگر اس سب کا کنول کی مشکوک نگاہیں کیا نتیجہ نکال سکتی ہیں .؟ یہی کہ کسم اب بچی نہیں ہے، وہ سیانی ہوگئی ہے۔"

ایک دن گھر میں کچھ معمولی سا جھگڑا ہوا۔ جھگڑا بھی کیا، بس وہی جو اکثر گھروں میں "تعلقے" کا ہو جایا کرتا ہے۔ لیکن شام کو چندر بابو نے ہنستے ہوئے کہا "سینما چلتی ہو؟"

"میں نہیں جاتی" "چلو بھی ....."

"کہہ جو دیا مجھے نہیں جانا"

"جانے دو تمہاری مرضی ..... ہاں ... تو کسم آؤ ہم دونوں چلیں۔"

وہ چلے گئے۔ کنول نے دیکھا، دل میں کُرید نی سی لگ گئی۔ اس کا مطلب؟

ایک دن چندر بابو کے سر میں درد ہو گیا، کسم نے مالش کی، کنول نے دیکھا اور سوچا .... اس کا مطلب؟ چندر بابو سے کسم بات تک نہ کرے یہی کنول کی مرضی ہے، اُسے کنول کی مرضی ماننا ہی ہوگی۔

"...... پانی لانا کوئی ... پیاس بہت لگی ہے"۔ کسم جھٹ دوڑی ..... "لیجئے" مسکراتے ہوئے انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور پینے لگے۔ کنول پانی کا گلاس لائی۔ اُسے معلوم نہ تھا، چندر بابو نے دیکھا اور منہ دیئے۔ "اس کا مطلب؟" اور غصے سے ہٹا کر گلاس زمین پر پٹک دیا۔ کسم سہم گئی "تو اپنی عادتوں سے باز نہیں آتی ...... عادت؟" ــ چندر بابو بھی ..... عادت کا کیا مطلب ہے؟ کسم! سمجھا ... عادت کا کیا مطلب ہے؟

کنول کو محسوس ہونے لگا کہ کسم اس کے دل کی کوئی پیاری شئے اس سے جدا کر رہی ہے۔ پر وہ ایسا کبھی نہ ہونے دے گی، کبھی نہیں!! کسم آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی ہے، اس کا مطلب؟ وہ بال بناتی ہے، چندر بابو آتے ہیں "کسم" "وہ مسکراتے ہیں" آپ....." وہ کھل اٹھتی ہے۔" لو کسم ہم تمہارے لئے ایک بہت بڑھیا تیل لائے ہیں، اس سے تمہارے بال یہاں تک بڑے ہو جائیں گے..... بہت اچھے۔" کسم مسکرا کر ہاتھ بڑھاتی ہے، وہ ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ وہ ہنس دیتی ہے، تو وہ بھی ہنس پڑتے ہیں۔ اور تب ..... کنول آجاتی ہے۔ اس ہنسی مذاق ..... چال بازی..... کھلے بال... ان سب کا مطلب؟" مجھے تیرا اس گھر میں رہنا ہی پسند نہیں۔" "کیوں؟" "کنول۔ لیکن اس کا مطلب کیا ہے، جو تم میرے اور کسم کے ساتھ ہمیشہ کیا کرتی ہو؟"

"مطلب؟ مطلب یہی کہ تم دونوں ...."

"چپ رہو..... تم تو پاگل ہو گئی ہو۔"

"ہاں میں پاگل ہوں..... ہر روز جو ناٹک یہاں کھیلا جاتا ہے، اسے میں بخوبی سمجھتی ہوں۔ اب کسم میرے گھر میں رہنے کے لائق نہیں، وہ یہاں نہیں رہ سکتی، وہ بہن نہیں میری پکی دشمن ہے، اور تم بھی میرے ...."

"مگر وہ جا سکتی ہے؟"

"وہ نہیں جا سکتی، میں تو جا سکتی ہوں، تب ہی تم دونوں کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے گی۔"

"تم روتی ہو کسم؟" "نہیں مجھے چھوڑ دیجئے"

"کہاں جاؤ گی؟" "وہیں ....."

"کسم..... ؟" "مجھے آپ جانے دیجئے۔"

"لیکن تم جانا کہاں چاہتی ہو؟"

"جانا! وہیں جہاں ماتا گئیں، جہاں باپو جی گئے، میں بھی وہیں جاؤں گی۔"

"کسم ....." "جیجا جی ....."

اور پھر کنول کی دل خراش آواز "بدمعاش نکل جا میرے گھر سے..... جب سے اس گھر میں آئی ہے طوفان اٹھا رکھا ہے۔ ہٹ جا میری آنکھوں کے سامنے سے۔"

اس رات پانی تو برسا ہی رہا، موسم نہایت ہی خراب تھا، نہ جانے کیوں چندر بابو کو صبح ہوتے تیز بخار ہو گیا دوائیوں کے استعمال سے بخار تو کم ہو گیا، مگر درد کی وجہ سے سر پھٹا جا رہا تھا، جسم کے سارے اعضا درد سے ٹوٹ رہے تھے، آنکھیں لال ہو کر سوج گئی تھیں، لیکن کسم..... اس بچاری کو تو اتنا بھی اختیار نہ تھا کہ اپنے جیجا جی سے

اُن کی طبیعت کا حال ہی پوچھ سکے۔ لیکن اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ کنول پاس والے ڈاکٹر سے دوا لینے چلی گئی، گھر کے سنسان کمرے میں کسم بیخودی کی حالت میں پڑی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ دوسرے سونے کے کمرے میں چندر بابو پڑے کراہ رہے تھے "ہائے ..... پانی ....."

"پانی ..... پانی ..... کون دے پانی؟ کسم ..... وہ کیا کرے؟

"کب سے کھڑی ہو کسم؟" آنکھیں کھولتے ہی چندر بابو نے کسم کو پانی لئے ہوئے کھڑے پایا۔

پانی کا گلاس واپس دیتے ہوئے اُنہوں نے کہا "بیٹھ جاؤ" —— وہ کھڑی ہی رہی۔

"بیٹھو نا کسم ......" "جی ......!"

"تم کچھ سست ہو!" کسم بول نہ سکی، مگر اُس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ڈھلک گئے

"کسم تم روتی ہو ....؟"

"نہیں .... نہیں۔ تکلیف ہوگی آپ کو ..... آپ آرام سے لیٹے رہیں ... اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"طبیعت! ہاں اچھی ہے .... لیکن تم ....."

"ارے آپ کو تو بخار بھی ہے ...... لائیے سر دبا دوں ....."

"نہیں کسم ..." "نہیں ...." اُسی وقت کنول آ پہونچی۔

"ہوں، وہی ہوا، جو میں سوچتی آ رہی تھی ..... اُس کمرے سے یہاں کیوں آئی؟ ..."

"اُف کنول، کیوں اتنی ......" چندر بابو سے آگے نہ بولا گیا۔ باہر ندی میں طوفان آ رہا ہے،

کسم کی جان سی نکل گئی۔ اُس کا دل ایک وحشی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور دوسرے کمرے میں جا کر بے ہوشی کی سی حالت میں بیجان ہو کر پلنگ پر گر گئی۔

زور سے ہوا چلی، لمپ بجھ گیا۔ کنول چندر بابو کو دوا پلا رہی تھی، کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔

"کسم ..... او کسم؟ ذرا لمپ جلانا۔" کنول نے آواز لگائی۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

"او کسم ... سنتی نہیں ... بنتی ہے مکار۔" کنول خود اُٹھی۔ ہوا تیز ہو گئی۔ ہوا کی سنسناہٹ کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ کنول کمرے میں آئی ... کسم وہاں نہ تھی ...

ہوا کے جھکڑ بند ہوئے، بارش تھم گئی۔ مطلع بالکل صاف ہو گیا، اور چاند کی روشنی کھڑکی سے کمرے میں آنے لگی۔ کنول نے دیکھا میز پر ایک کاغذ اُڑ رہا ہے، پاس ہی لمپ پڑا بھک بھک کر رہا ہے۔ کنول نے کاغذ اُٹھا کر پڑھنا شروع کیا، لکھا تھا:-

"پیاری بہن ....! ایسے وقت میں جب میں دنیا میں بالکل اکیلی تھی تم نے مجھے پناہ دی۔ مجھے بے شک

ٹھہرادیا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں تمھیں کوئی شکوہ نہ پہونچا سکی۔ آج مجھے بابوجی اور ماتاجی کی یاد بہت آرہی ہے۔ نہیں جانتی اُنھیں کہاں ڈھونڈھوں... کیا کروں؟ بہن... جیجاجی کی طبیعت بہت کچھ بابوجی سے ملتی تھی جب میں اُنھیں دیکھ کر ہنستی تو ایک بار اپنے بابوجی کو بھول جاتی... لیکن مجھے اس بات کا خیال تک نہ آیا کہ میں اب بڑی ہوگئی ہوں۔ مجھے کوئی حق نہیں.... اچھا بہن رخصت..

لیکن تمھیں میری قسم ہے' مجھے یاد کرکے مت رونا۔ سمجھ لینا زندگی میں ایسے ہی کئی دفعہ ملنا اور بچھڑنا ہوتا ہے۔ جیجاجی کو میری طرف سے نستے کہنا۔ اور کہنا کہ "اُن کی پُتری" اپنے بابوجی اور ماتاجی سے ملنے گئی ہے اُن سے مل کر وہ سُکھی ہوگی۔ اچھا تو بہن آخری نستے اپنی بہن کو اُس کی غلطیوں کے لئے معاف کرنا۔"

تمھاری چھوٹی بہن کسم

پُورن ماشی کی رات تھی۔ نورانی چاند دنیا پر سیم و زر کی ملمع کاری کر رہا تھا۔ ندی میں جوار بھاٹے کی لہر چڑھ رہی تھی کنول کے ہاتھ میں خط تھا۔ لیمپ بجھا ہی چاہتا تھا۔ کنول کھڑکی میں کھڑی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پانی کی زور سے اُچھلنے کی آواز آرہی تھی، گھاٹ پر یاتریوں کا شور تھا ہوا نے تیزی پکڑلی۔ لمپ ایک دفعہ بھبکا اور بجھ گیا۔ کنول اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی۔ اُس کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکلی "کسم"! آواز چاردیواری سے ٹکرائی۔ اور جوار بھاٹے کی آواز میں سما گئی، اُس کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے بھر آگئیں "کاش! کچھ دیر پہلے ہی.... آہ میری کسم"۔ ندی کی چنچل لہریں ہوا سے اٹکھیلیاں کررہی تھیں۔ آسمان سے ایک تارا ٹوٹا اور ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔

غزل

(از جناب حکیم سید خورشید حسین مضطر رضوی۔ حیدرآباد دکن)

ایک ذرہ ہے جنوں اُس کو بیاباں کردیں
بے نیاز حد داماں و گریباں کردیں

پھر ڈرائے گی نہ تاریکی شام فرقت
آؤ ہر داغ کو اک شمع فروزاں کردیں

دل کو ہوتی ہے تغیر کی ضرورت محسوس
جی میں آتا ہے کہ کانٹوں کو گلستاں کردیں

صورت عذر رہے اور نہ رہے ذوق طلب
اُس کے جلووں کو نگاہوں سے نمایاں کردیں

دل مغموم کہاں، نغمہ غم سوز کہاں
چند آہیں ہیں کہ جو تجھ کو پشیماں کردیں

امتیاز سحر و شام نمایاں ہو جائے
وہ اگر چہرے پہ زلفوں کو پریشاں کردیں

اُس کے جلووں سے بہت ہو چکے حیراں مضطر
بات تو جب ہے کہ ہم یار کو حیراں کردیں

تنقیدِ کتب

پریم کی چوڑیاں

اگرچہ اُردو کی مختصر افسانہ نویسی کی عمر بہت تھوڑی ہے، لیکن اس تھوڑے عرصہ میں وہ بہت سے جادۂ ہائے نو پر گامزن نظر آتی ہے۔ اُردو دنیا کو مختصر افسانہ نویسی سے روشناس کرانے کا سہرا پریم چند اسکول ہی کے سر ہے پریم چند کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اعظم کریوی بھی اس اسکول میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں افسانہ نگار اُردو افسانہ نویسی کے دو زبردست ماہر ہیں۔ پریم چند نے آخر عمر میں "ترقی پسند" بن جانے کی کوشش کی اور قصداً اپنے مخصوص رنگ کو ترک کرنا چاہا، چنانچہ "کفن" لکھی۔ اس میں کلام نہیں کہ اس کا موضوع ترقی پسند ضرور ہو گیا ہے لیکن وہ خوبی پیدا نہ ہو سکی، جو افسانہ نویسی میں ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ ڈاکٹر اعظم اپنی راہ سے کبھی نہ بھٹکے۔ کسی "تازہ اُفق" کی تلاش میں ان کی طبیعت کبھی ڈانواڈول نہیں ہوئی۔ اُنھوں نے بطیر یا چال کو پسند نہ کیا، اپنے لئے ایک طرز ایجاد کی، اور اُس پر آج تک چلے جا رہے ہیں۔ وہ ایک انفرادیت کے مالک ہیں۔

"پریم کی چوڑیاں" ان کے بارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں بیشتر افسانے ایسے ہیں جو ہر لحاظ سے مکمل ہیں۔ ان سب کا موضوع ایک ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ تنوع سے عاری نہیں جو فن کار کی چابکدستی کی دلیل ہے۔ اس میں وہی محبت کی دُکھ بھری کہانیاں ہیں جن میں کہیں کہیں شگفتگی اور رنگینی بھی پیدا ہو جاتی ہے، وہی سماج کی عُریاں تصویریں ہیں، جو اس طرح پیش کی گئی ہیں کہ جن کو پڑھکر چند لمحوں کے لئے ہم اپنے دل میں ایک نشتر کی چبھن محسوس کرتے ہیں۔ اُسی ماحول کے نقشے ہیں جن میں آج ہم سب سُلگ سُلگ کر اور سسک سسک کر زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ وہی زمیندار اور کسان کی کشمکش۔ فساد۔ رشوت۔ بیگار۔ عورت کی بے لیسی، اور اسی طرح کی اور چیزیں۔

اِس مجموعہ کے تمام افسانوں کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حقیقی معنی میں کہانیاں ہیں۔ ان میں افسانویت ہے جو شروع سے آخر تک ہماری دلچسپی کو قائم رکھتی ہے۔ ڈاکٹر اعظم کریوی فن افسانہ گوئی کے ماہر معلوم ہوتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کی کہانیاں مغربی افسانہ نویسی کی تمام خوبیوں کی حامل ہیں۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر بات میں مغرب کی نقل کی جائے، مشرق بھی تو بعض خصوصیات کا مالک ہے، اس کے پاس بھی تو ایک شاندار ادب ہے جس کی مختلف شاخیں مغربیت سے کوسوں دُور ہیں۔ اس لئے اگر کوئی افسانہ نویسی کو مشرقیت

کا رنگ دینا چاہے تو کیا برا ہے بہاں افسانوں کی ٹیکنیک، ان کا پلاٹ، ان کا انداز بیان، ان سب کو مغربیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ ہمیں اپنی چیزیں معلوم ہوتی ہیں، اور ہم ان سے اپنے آپ کو مانوس پاتے ہیں۔ ڈاکٹر اعظم کریوی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے دیہات اور وہاں کے رہنے والوں کی تصویریں پیش کرتے ہیں لیکن یہ تصویریں صرف فوٹوگرافی ہی بن کر نہیں رہ جاتیں بلکہ ان کی فن کاری ان میں مصوری کی شان پیدا کر دیتی ہے۔ ان کے پلاٹ صاف اور سادہ ہوتے ہیں۔ ان میں سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کا سا تلاطم نہیں ہوتا جو طبیعتوں میں صرف چند لمحوں کے لئے ایک ہیجان سا پیدا کر دے، بلکہ میدان میں بہتی ہوئی ندی کا سا ہلکا ہلکا اتار چڑھاؤ ہے جو ترنم سے ہم آغوش ہو۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ وہ ایک ایسی زندگی کے عکاس ہیں جس میں سادگی اور معصومیت ہے۔ ان افسانوں میں جوش اور تلخی نہیں، پھر بھی ایک ہلکا سا احتجاج ہے! ایک دبی سی چیخ! ایک گھٹی ہوئی سی پکار!!!

کبھی کبھی ڈاکٹر اعظم گہری باتیں بھی سوچنے لگتے ہیں، اور تیزی کے ساتھ صرف چند الفاظ میں دنیا کے مظالم، انسان کی بے بسی، موجودہ نظام کی کشمکش اور زبوں حالی کی طرف نہایت معنی خیز اشارے کر جاتے ہیں، جن کا اثر پڑھنے والوں پر بڑے بڑے خطبوں سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اور کہیں کہیں وہ اپنے موضوع سے ہٹ کر انسانی زندگی کی اتھاہ گہرائیوں اور کبھی کبھی نہ ختم ہونے والی الجھنوں کا ذکر کرنے لگتے ہیں جو پڑھنے والے پر رقت کا سا عالم طاری کر دیتا ہے۔ "سیندور والا" "دل ہی تو ہے" "کھویا ہوا پیار" "دل کی دنیا" اور "پریم کی لیلا" میں یہ چیز زیادہ نمایاں ہے۔ اس مجموعہ کے تمام افسانوں میں انسانی نفسیات کا تجزیہ اور مشاہدہ کی گہرائیاں بھی موجود ہیں۔ کے ساتھ ساتھ ان کے انداز بیان اور زبان کے رس نے اس میں ایک عجیب دل موہ لینے والی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

کتاب ان معنوی خوبیوں کے علاوہ صوری حیثیت سے بھی بلند رتبہ رکھتی ہے، اور اس کو دیکھکر کہا جا سکتا ہے کہ یو۔ پی میں کتابت اور طباعت کے دن پھر نے نظر آتے ہیں اور وہ پنجاب ہوا چاہتا ہے۔ اس کا ناشر کتاب خانہ دانش محل لکھنؤ ہے، اور قیمت دو روپیہ عہ۔

یادان میکدہ

یہ عمدہ مختصر مضامین کے مجموعہ قریب ہی دامن ہے۔ حالانکہ انگریزی ادب اور دوسرے مغربی ادبیات میں یہ چیز ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ رشید احمد، پطرس، اور فرحت اللہ بیگ نے ضرور کچھ نہ کچھ اس کمی کو پورا کیا ہے لیکن ان سب کے ہاں مزاحیہ رنگ زیادہ غالب ہے جس کی وجہ سے ان کے رشحات قلم سنجیدہ قسم کے ادبی مضامین میں جگہ نہیں پا سکتے۔ عبدالشکور صاحب اپنے مضامین میں

ان سب سے علیحدہ ایک نئی راہ پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں نہ تو ایسی ظرافت ہے جو ہنساتے ہنساتے پیٹ میں بل ڈال دے، اور نہ ہی ایسی سنجیدگی جو طبیعت میں وحشت پیدا کرے۔ انھوں نے سنجیدگی و ظرافت کو کچھ اس طرح سمویا ہے کہ ان مضامین میں ایک عجیب قسم کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضامین انگریزی ادب کے گہرے مطالعہ کے زیر اثر لکھے گئے ہیں، اور ان میں ہر لحاظ سے وہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ لیکن اس پر بھی ان میں "مغربیت" کا رنگ نہیں۔ عبدالشکور صاحب نے ان کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ہمیں اپنی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ انھوں نے ایسے کردار پیش کئے ہیں جن کو ہم آئے دن چلتے پھرتے، ہنستے بولتے دیکھتے رہتے ہیں۔ لیکن ان پر اور ان کے حرکات سکنات پر توجہ نہیں کرتے اور ان کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ عبدالشکور صاحب نے انھیں لوگوں کو اپنا موضوع بنایا ہے اور انھیں کے حرکات و سکنات کو پیش کیا ہے اس لئے ہر پڑھنے والا اس میں دلچسپی لیتا ہے، اور ان میں خود اپنی اور اپنے آس پاس کے لوگوں کی تصویریں دیکھتا ہے۔ عبدالشکور صاحب کی نظر ہر چیز پر گہری پڑتی ہے، وہ چیزوں کی تہ تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بعض جگہ تو انسانی زندگی کے اسرار و رموز کچھ اس طرح بے نقاب کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے وہ دریا کی سطح ہی کو دیکھکر کوئی رائے قائم نہیں کرتے بلکہ ان کی نگاہ قعر دریا میں موجوں کے ایک طوفان کو دیکھ لیتی ہے۔ چاہے سطح خاموش اور ساکن ہی کیوں نہ ہو۔

انسانی نفسیات کے وہ ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ ان تمام مضامین میں فطرت انسانی کا تجزیہ ہے، بعض کردار تو ایسے ہیں جن کا تعلق گھریلو زندگی سے ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جو ہمارے سماج میں اپنی "کارفرمائیوں" کے باعث کافی مشہور ہیں۔ چنانچہ "حلوے کا تماشا" "بندالی" اور "باجی" کے ساتھ ہم "حافظ جی" "مولوی" اور "داروغہ جی" کو دیکھتے ہیں۔ ان سب کریکٹروں کو انھوں نے کچھ اس انداز سے بے نقاب کیا ہے کہ ہمیں اُن کی فن کاری کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔ ان کے اندر کردار نگاری کی بڑی صلاحیتیں ہیں۔ "بندالی" "باجی" "حافظ جی" "داروغہ جی" اور مولوی صاحب" کتاب پڑھ لینے کے بعد بھی دیر تک ہماری آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں۔ وہ ہمیں زندہ معلوم ہوتے ہیں، چلتے، پھرتے ہنستے بولتے ـــ کاش عبدالشکور صاحب کوئی ناول بھی لکھتے۔

ان مضامین میں اکثر جگہ طنز بھی موجود ہے۔ جس نے ان کی افادیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ حافظ جی، داروغہ جی، اور مولوی سماج کے ایسے افراد ہیں جن سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس بات کا یقین دلاتے ہوئے بھی ان کی فن کاری ہمارے دل میں ان سے نفرت کے جذبات پیدا نہیں ہونے دیتی، بلکہ

اس کی جادو بیانی ہمیں ان سے ہمدردی کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ اس طنز نگاری میں کہیں کہیں مزاح کا عنصر ضرور آجاتا ہے لیکن وہ ہمارے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تو لے آتا ہے، قہقہہ نہیں!

جیساکہ اوپر بیان ہوا یہ سارے مضامین انگریزی کے زیر اثر لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے ہمیں ہینیٹ [illegible] کی تمام خوبیاں موجود ہیں، اور اس لحاظ سے وہ سب کے سب کافی بلند ہیں۔

غرض ان مضامین میں دلچسپی کا سامان بھی موجود ہے، اور افادیت بھی۔ ان میں سوسائٹی پر طنز بھی ہے اور اس کے افراد کی چلتی پھرتی تصویریں بھی۔ ان میں مزاح بھی ہے اور سنجیدگی بھی۔ ان میں ہماری اُلجھنوں کا تذکرہ بھی ہے اور مجبوریوں کا بیان بھی۔ ان میں آنسو بھی ہیں اور تبسم بھی۔ مختصر یہ کہ ان میں خود زندگی بے نقاب ہے!!

یہ کتاب بھی کتاب خانہ "دانش محل" امین الدولہ پارک لکھنؤ نے عمدہ کتابت و طباعت، ولیسنڈرسائز اور رنگین گرد پوش کے ساتھ شائع کی ہے۔ قیمت عہ

(عبادت بریلوی ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی)

لائبریری اور اُس کی تنظیم

کتب خانوں کی ترتیب اور اُن کی تنظیم پر اُردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جسے تصنیف فرماکر سید سجاد حسین رضوی۔ ڈی۔ ایل۔ ایس۔ سی لائبریرین میرٹھ کالج نے اُردو زبان پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس دلچسپ اور مفید کتاب میں کتابوں کی فہرست تیار کرنے کے مختلف طریقے، اور کتابوں کی تقسیم، اجرا و واپسی کے ڈھنگ بتائے ہیں، اور آخر میں کتابوں کے منتخب کرنے کا سلیقہ بھی سکھلایا ہے، اور مختلف موضوعات پر عمدہ کتابوں کی ایک فہرست بھی درج کردی ہے جس میں کتاب اور اُس کے مصنف کے نام، مطبع کے نام، قیمت اور ملنے کا پتہ بھی درج ہے تاکہ طلب کرنے میں سہولت ہو۔ لائبریریوں کے سلسلہ میں جن جن رجسٹروں اور نقشوں کے رکھنے کی ضرورت ہے، اُن کے نمونے بھی دیئے ہیں۔

کتاب کے شروع میں مولوی یوسف الدین احمد صاحب لائبریرین عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد دکن کی تقریظ، خود فاضل مصنف کا مختصر سا دیباچہ، اور مسٹر فضل الٰہی بی۔ اے (آنرز) ڈپ۔ ایل بی۔ (لندن)۔ ایف ایل۔ اے، اسسٹنٹ لائبریرین لکھنؤ یونیورسٹی کا ایک فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے جس میں اس کتاب کی خوبیوں پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں متعدد تصویریں بھی ہیں۔

کتابت نفیس، طباعت روشن، کاغذ بیش قیمت، جلد انگریزی مع دیدہ زیب گرد پوش ۲۲×۲۹ تقطیع کے تقریباً دو سو صفحات ضخامت، قیمت پانچ روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مسٹر س رستوگی اینڈ کو پبلشرس اینڈ بک سیلرس میرٹھ [illegible]

عرب اور عربستان

یہ دلچسپ کتاب سلسلۂ ادبیاتِ اُردو کی ۲۰۳ویں اور سلسلۂ مجلس ادبیات اطفال کی تیسری کڑی ہے جسے جہاں بانو بیگم نقوی صاحبہ ایم۔ اے نے تصنیف فرمایا ہے۔ جس میں ملک عرب کے جغرافیائی، تاریخی، معاشرتی، اور تمدنی حالات اختصار کے ساتھ مگر دلچسپ پیرایہ میں درج کئے گئے ہیں۔ بچّوں کو اس رسالہ کا مطالعہ بہت مفید ہوگا اگرچہ کتاب اپنے دامن میں بڑوں کے لئے بھی سامانِ دلچسپی رکھتی ہے، جگہ جگہ تصویریں دی گئی ہیں جن سے کتاب کی دلچسپی میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ چونکہ کتاب بچوں کے لئے ہے اس لئے زبان عام فہم اور آسان ہے مگر کہیں کہیں لغزشیں ہوگئی ہیں، مثلاً:۔

"شعبدہ باز اور مداری بھی اپنے کرتب یہیں بتاتے ہیں" (صـ۱۶)

"دکھانے" کے بجائے "بتاتے" لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے، اسی طرح "اونٹ یا بکری کو ذبح کیا جاتا ہے، اور اس کو سالم آگ پر بھنا جاتا ہے۔" (صـ۳۶) "بھونا" کے بجائے "بھنا" لکھا ہے، ممکن ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہو علاقۂ موصل کے بارہ میں لکھا ہے "عربوں کو چونکہ اس قدر تیل کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے اُنھوں نے یہ رقبہ برطانوی رعایا کو فروخت کر دیا۔" (صـ۵۱)

یہ فعل عربوں کا نہیں بلکہ ترکوں کا تھا جنھوں نے روپیہ لے کر ولایت موصل سے دست برداری دیدی تھی۔ اُمید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں صحت ہو جائیگی۔ بہرحال رسالہ دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ چھوٹی تقطیع کے ۵۶ صفحات ضخامت قیمت ۱۰؍

ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد، حیدرآباد دکن۔

کامیاب زندگی کا قرآنی تصوّر

یہ فاضلانہ مقالہ ڈاکٹر میر ولی الدین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لنڈن) بیرسٹرایٹ لا، پروفیسر فلسفہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا لکھا ہوا ہے جو حیدرآباد اکاڈیمی کے پانچویں اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ فاضل مصنف نے قرآن شریف کی آیات سے استدلال کر کے بتایا ہے کہ انسان اپنی زندگی کو کیونکر کامیاب بنا سکتا ہے۔ اس مقالہ میں قرآن شریف کے علاوہ شعرائے عجم خصوصاً عمر خیام کے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بعض مثالیں ایسی دی ہیں جن میں خرافات اور گالیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مثلاً خیام کی یہ رباعی دی ہے:۔

کم خور غم روزگارِ ناساز شدہ　　　مے خور ز کفِ ساقیِ دمساز شدہ
کاں کز کسِ مادر آمد امروز بہ دل　　　فردا بینی بہ کونِ زن باز شدہ

معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کو معارفِ قرآنی پر اتنا عبور نہیں جتنا کہ شعرائے عجم کے کلام پر ہے۔ بہرحال یہ مقالہ دلچسپ و سبق آموز ہے

کتابت نفیس، طباعت روشن، کاغذ قیمتی، بڑی تقطیع کے ۲۰۵ صفحات ضخامت، قیمت ایک آنہ، حضرت مصنف سے طلب کیجئے۔

بائبل کی پیشینگوئیاں

بائبل میں پیشینگوئیوں کا ایک باب "مکاشفاتِ یوحنا" کے نام سے ہے۔ اس میں بہت سی پیشین گوئیاں کی گئی ہیں جن کا مطلب ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق نکال سکتا ہے۔ محلہ جنگلی گنج لکھنؤ میں نواب منّے صاحب نے ان پیشین گوئیوں کا اطلاق تحریک کانگریس پر کیا تھا، اور اپنی مطبوعہ کتاب ہمیں دکھائی تھی۔ اب قاضی عابد علی صاحب ملبوری کاپنوری نے ان پیشین گوئیوں کا اطلاق موجودہ جنگ پر کیا ہے۔ مثلاً پہلی آیت میں ایک سات سروں اور دس سینگوں والے ایک درندہ جانور کا ذکر ہے جس کے سینگوں پر دس تاج ہیں اور سروں پر کفر کے نام ہیں۔ فاضل مصنف نے تحریر کیا ہے کہ وہ "درندہ جانور" ہر ہٹلر ہے۔ اس کے دس سینگوں پر جو دس تاج ہیں وہ آسٹریا، چیکوسلاوکیا، پولینڈ، ڈنمارک، ناروے، بلجیم، لکسمبرگ، ہالینڈ، فرانس، و یونان ہیں۔ مصنف نے ان پیشین گوئیوں کو ہٹلر اور اس کے ساتھیوں پر چسپاں کیا ہے اور جہاں کوئی اچھی بات آئی ہے، وہ اتحادیوں کے لئے مخصوص کر دی ہے۔ ضخامت پانچ جز۔ تقطیع کلاں۔ ٹائیٹل دیدہ زیب۔ قیمت درج نہیں غالباً مفت ملے گی۔ شائقین رائے صاحب مسٹر جے۔ نراین ٹنڈن سکریٹری نیشنل وار فرنٹ کانپور سے درخواست کریں۔

تعلیمی خطبات

یہ کتاب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی کے چار خطبات اور پانچ تقریروں کا ایک دلپسند مجموعہ ہے۔ ہر خطبہ اور ہر تقریر کا تعلق کسی نہ کسی تعلیمی موضوع سے ہے۔ مثلاً (۱) قومی تعلیم، (۲) مسلمانوں کی ثانوی تعلیم (۳) طبی تعلیم، (۴) بنیادی تعلیم (۵) بچوں کی تربیت (۶) ننھا مدرسہ چلا، اور (۷) اچھا استاد۔ خطبات وہ ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں یا تعلیم گاہوں کے جلسوں میں ارشاد فرمائے تھے اور تقریریں وہ ہیں جو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئی تھیں۔ ہر خطبہ اور ہر تقریر اپنے اپنے موضوع پر مکمل ہے۔ زیادہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ ان خطبوں اور تقریروں کا اسلوب بیان اور زبان اس قدر پاکیزہ ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کتاب کا آخری مضمون یا تقریر "اچھا استاد" سمجھنے والوں کے لئے سبق کا کام دیگا۔ اس مجموعہ سے والدین اور اساتذہ پورا پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، کیونکہ تعلیم کے متعلق ان خطبات میں برسوں کے تجربات کا نچوڑ موجود ہے۔

کتابت۔ طباعت۔ کاغذ سب عمدہ۔ انگریزی جلد۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۴۰ صفحات ضخامت قیمت سوا روپیہ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ، دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی۔

شرخ آنسو

یہ پندرہ صفحوں کا چھوٹا سا پمفلٹ مولانا محمد اسحاق فاروقی رونق کراروی الہ آبادی، بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی، کی پانچ نظموں (۱) یادِ وطن، (۲) رودادِ دل، (۳) نالۂ فراق، (۴) نغمۂ شوق، (۵) نوحۂ معصوم، اور بارہ غزلوں کا مجموعہ ہے، جسے کتاب کے نام کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے سُرخ روشنائی سے چھاپا گیا ہے۔ جناب رونق کی نظموں میں جوش، ترنّم و روانی بہت کافی موجود ہے۔ جذبات و خیالات بھی قابلِ داد ہیں۔ لیکن جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے وہ دَورِ حاضر کے معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ بلکہ اُس ماحول و فضا سے تعلق رکھتی ہیں جس میں حضرت امیر مینائی اور اُن کے معاصرین نے شیریں نوائیاں کی تھیں۔ نمونتہً چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں جن سے ناظرین کرام جناب رونق کی شاعری کا خود اندازہ فرمائیں گے۔

اِک گلو میں ایک پائے سلسلہ جنباں میں ہے   آپ کا دیوانہ دو زنداں لئے زنداں میں ہے

تری چتونی میں نے کی آرزو تیرے آگے اتنا ہی خوار ہوں   میں حساب تیرے عتاب کا میں گناہِ دل کا شمار ہوں

کب سے باندھے ہے گرہ میں چار پر مرغِ چمن   مول لینے جا رہا ہے درد سر مرغِ چمن

لکھائی چھپائی، کاغذ معمولی۔ قیمت غالباً تین یا چار آنے ہو گی جو حضرت مصنف سے طلب کی جائے۔

یادگار شعراء

ڈاکٹر اشپرنگر نے شاہان اودھ کے کتب خانہ کی ایک فہرست مرتب کی تھی جس میں اُنھوں نے شعرائے ریختہ کے حالات بھی قلمبند کئے تھے۔ یہ کتاب ڈاکٹر اشپرنگر کی فہرست کے اسی حصّہ کا ترجمہ ہے جس کا تعلق شعرائے ریختہ سے ہے۔ ترجمہ جناب طفیل احمد صاحب بی۔ اے نے خان بہادر ابو محمد صاحب ایم۔ اے۔ اسپیشل افسر گورنمنٹ صوبجات متحدہ و ممبر کونسل ہندوستانی اکیڈیمی کے ایما سے کیا گیا۔ اس کتاب میں ان ۱۵۱۹ شعراء ریختہ کا تذکرہ ہے جن کا پتہ ۱۸۵۴ء تک چلا تھا۔ ان میں ایسے شعراء کم ہیں جن کے حالات تفصیل کے ساتھ درج ہوں اکثر کے حالات بہت ہی مختصر ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جن کا تخلص معلوم ہو تو نام معلوم نہیں ہے، اور جو نام معلوم ہو تو تخلص کا پتہ نہیں ہے۔

یہ کتاب ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے شائع کی ہے۔ چونکہ کتاب ہٰذا میں جن شعرا کے حالات درج ہیں اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جو تشنۂ تکمیل ہیں، اس لئے جن حضرات کو ادب اُردو سے شوق ہے اور وہ اُردو کی خدمت کرنا مناسب سمجھتے ہیں، اُنھیں اگر اِن شعرا میں سے کسی کے زیادہ حالات معلوم ہوں تو وہ اکیڈیمی کے سکریٹری صاحب کو لکھ بھیجیں، اور اگر کسی صاحب کے پاس کسی شاعر کا دیوان ہو تو وہ بھی اکیڈیمی میں پیش کر دیں تاکہ وہ اسے شائع کرا دے۔ اکیڈیمی اچھے دواوین کے نسخوں کا معاوضہ دینے کے مسئلہ پر

بھی مدد کرنے کو تیار ہے۔

چھپائی ٹائپ کاغذ عمدہ۔ بڑی تقطیع کے ۱۳۲ صفحات ضخامت۔ قیمت دو روپیہ

ملنے کا پتہ: ہندستانی اکیڈیمی، الہ آباد۔ یو۔پی۔

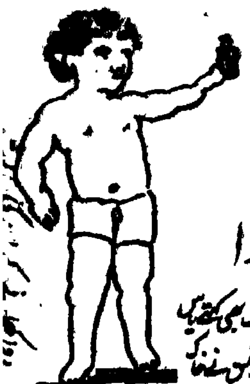
ہم کیسے پڑھائیں؟

ہندوستان میں کچھ دنوں سے اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ تعلیم کو لازمی کر دیا جائے، اور واقعی ہر قسم کی ترقی کے لئے ایسا کرنا ضروری بھی ہے۔ مگر اس کے واسطے واقف فن تدریس اُستادوں کی ضرورت ہوگی لیکن ایسے استادوں کی ٹریننگ کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ ہندوستان میں اس مقصد کے لئے جو ٹریننگ کالج یا نارمل اسکول کھولے گئے ہیں، ان میں ذریعۂ تعلیم عموماً انگریزی ہے، اور کہیں کہیں مادری زبان میں بھی تعلیم ہوتی ہے۔ مگر ہندستانی زبانوں میں اس فن سے متعلق موزوں لٹریچر نہیں ہے۔ انگریزی کتابوں سے ترجمہ کر کے کام چلا لیا جاتا ہے۔ نارمل اسکولوں کے طلبا جو عام طور سے انگریزی نہیں جانتے اپنے استادوں کے دست نگر رہتے ہیں۔ طلبا کی معلومات کا دارو مدار استاد کے نوٹوں یا لکچر پر رہتا ہے۔ ان کے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں ہوتی جس سے وہ اپنے فن کی مشق کے لئے ضروری مواد حاصل کر سکیں۔ تعلیم اور خصوصاً ابتدائی تعلیم جو ہر بچے کے لئے لازمی ہونی چاہیئے کس زبان میں دی جائے اس کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں یعنی مادری زبان کے سوا دوسری زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانا نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ بچوں کی ذہنی نشوونما کے لئے مضر بھی ہے۔

یہ کتاب اس مقصد کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے کہ اُردو جاننے والے استادوں کو پڑھانے کے فن کے متعلق چند بنیادی باتوں سے روشناس کرایا جائے۔ اس میں شروع کے چند باب نصاب تعلیم کے لئے وقف کئے گئے ہیں اور باقی فنِ تدریس کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں پڑھانے کے عام طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ پڑھانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ بچہ کے ذہنی غور و فکر کے عمل کو ابھارا جائے تاکہ وہ ایک خاص منزل پر بہترین راستہ سے پہونچ جائے۔ بچہ راہرو ہے جو ایک نامعلوم ملک میں سفر کر رہا ہے اور اُستاد اُسکا رہنما ہے

اس کتاب میں مولوی سلامت اللہ صاحب ایم اے۔ بی۔ٹی (علیگ) پروفیسر ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے مدرسین کو فن تدریس کے بہترین اور آسان طریقے بتائے ہیں۔ درحقیقت معلمین پر احسان کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے کسی اُستاد کو محروم اور کسی مدرسہ کی لائبریری کو خالی نہ رہنا چاہیئے۔ ہم اس کتاب کی پُرزور الفاظ میں سفارش کرتے ہیں۔

لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ، جلد انگریزی۔ گرد پوش دیدہ زیب۔ ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۲۲۴ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ) ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ، دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی۔



رام بالک کا
روغن سوکھا
بچوں کے سوکھا روگ کی شرطیہ دوا



یوں تو دنیا میں ہزاروں بیماریاں ہیں مگر یہ ظالم دشمن جان سوکھا مسان جسکو سوکھا روگ بھی کہتے ہیں بڑی بلا ہے اس نے لاکھوں ماؤں کی گودیاں خالی کردیں ہنستے کھیلتے خوبصورت بچوں کو اس دشمن نے خاک میں ملا دیا اس بیماری کا حال ان غمزدہ دکھیاری ماؤں سے پوچھیئے جن کے پیارے بچے سوکھا روگ میں مبتلا ہوکر ان کے ماتا پیرے دلوں کو داغ دیجاتے ہیں سوکھا روگ کے واسطے ماں باپ طرح طرح کے کلام کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ بچوں کو دھگواتے ہیں سر کی رگ سے خون نکلواتے ہیں میٹھے پرپان میں دوا ڈالکر کیڑے نکلواتے ہیں۔ گنے کے کھیت میں لیجاتے ہیں تالاب میں نہلواتے ہیں۔ جھاڑ پھونک کرواتے ہیں گلے میں گنڈے تعویذ ڈالتے ہیں۔ لالٹین تیل اور لال تیل ملواتے ہیں اور گدھی کا دودھ پلواتے ہیں بچے کے پاخانہ کے مقام میں انڈا داخل کرتے ہیں چونکہ بہت سے لوگوں کو سوکھا مرض کی پہچان نہیں ہوتی اور نادر قیمت سے طرح طرح کے تدابیر علاج سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مرض بڑھتا جاتا ہے اس لئے اس مرض کی معمولی علامات درج کیجاتی ہیں تاکہ تشخیص مرض میں آسانی ہو اور جن بچوں میں یہ علامتیں پائی جائیں فوراً روغن سوکھا استعمال کریں فائدہ اٹھایا جاسکے یہ مرض عام طور سے پیٹ کے پھیلنے سے شروع ہوکر ساون بھادوں میں زور پکڑتا ہے اور اگہن کے مہینہ تک رہتا ہے اس عرصے میں لاکھوں بچے اس مرض کا شکار ہوجاتے ہیں سوکھا مرض میں بچہ دن بدن سست رہتا ہے حرارت قائم ہوجاتی ہے آنکھیں ہر وقت کھلی رہتی ہیں بدن کا خون رفتہ رفتہ کم ہوجاتا ہے جسکی وجہ سے بچہ سوکھکر کانٹا ہوجاتا ہے ہاضمہ بالکل بگڑ جاتا ہے اور بدبودار ہرے پیلے دست آنے لگتے ہیں سر کا تالو خالی ہوجاتا ہے کان کو دبانے سے بچہ روتا نہیں بچہ کے ہاتھ پیر اور گردن پتلی پڑ جاتی ہے اور پیٹ بڑھ جاتا ہے اور چھینک نہیں آتی ہے کھانسی آنے لگتی ہے آنکھیں سفید ہوکر گڑھے میں گھس جاتی ہیں چہرہ پر جھریاں پڑجاتی ہیں بچہ ناخن کان کھیلاتا ہے ہوکر مرجاتی ہے اور وہ ڈولنے لگتا ہے جب بچہ متواتر سست نظر آئے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ سوکھا روگ شروع ہوگیا ہے ایسی حالت میں فوراً رام بالک کا روغن سوکھا کھلانا چاہیئے کیونکہ یہ تیل اس روگ کو ہمیشہ کیلئے جڑ سے کھو دیتا ہے چاہے بچے سوکھکر کانٹا ہی ہوگئے ہوں اسکے استعمال سے پھلانوں لال اور موٹے تازے ہوجاتے ہیں اگر سوکھا مرض نہ بھی ہو اور بچے دُبلے پتلے ہو رہے ہوں تو بھی اسکے استعمال سے بہت جلد تندرست اور طاقتور ہوجاتے ہیں۔ آجکل سوکھا روگ کیلئے بازاروں میں بہت سے تیل بکتے ہیں جو بدن پر ملنے کیلئے ہوتے ہیں مگر روغن سوکھا جسم پر ملا نہیں جاتا بلکہ پلایا جاتا ہے اس لئے اس مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور بچے کے اچھا ہوجانے پر پھر اس مرض کا اندیشہ نہیں رہتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرض سوکھا دوا سے نہیں جاتا لیکن یہ خیال غلط ہے کیونکہ خدا نے ہر مرض اور دکھ کی دوا پیدا کی ہے اور رام بالک کا روغن سوکھا ہزاروں بار کی آزمودہ مجرب دوا ہے آجتک سوکھا مرض کی اس سے بڑھکر مفید دوا نہیں بنی اسکی آزمائش کے بعد آپ خود ہماری صداقت کی شہادت دینگے روغن سوکھا کا اشتہار نفع کمانے کیلئے نہیں دیا جاتا ہے بلکہ اس مہلک مرض سے بے زبان بچوں کی زندگی کی حفاظت مقصود ہے کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جس کا ہمیشہ گھر میں رکھنا ضروری ہے اور اسی لئے یہ لاگت ہی کے دام پر دیجاتی ہے یعنی قیمت فی شیشی صرف بارہ آنہ ۱۲؍ ہے جو ایک مہینہ کیلئے کافی ہوتی ہے۔ روغن سوکھا کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کیلئے ہر جگہ ایجنٹوں کی ضرورت ہے جن کو معقول کمیشن دیا جاتا ہے۔

ملنے کا پتہ رام بالک پنساری عطار بیگم گنج والے نیا بازار کانپور برانچ آفس بیگم گنج کانپور

جدید مطبوعاتِ جامعہ

کاغذ کی مہنگائی اور مشکلات کا ہر اُس شخص کو اندازہ ہے جو اس سے کام لیتا ہے۔ مکتبۂ جامعہ نے اس کے باوجود حسب ذیل کتب ستمبر اور اکتوبر کے مہینوں میں شائع کی ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی دس کتابیں مثلاً جنگ کے چار سال۔ انشا، کی تعلیم کھیل کے ذریعہ تعلیم وغیرہ ایسی ہیں جو پریس میں ہیں اور عنقریب شائع ہو جائینگی ارباب ذوق سے اُمید ہے کہ انھیں خرید کر ہماری ہمت افزائی فرمائیں گے۔

علمی کتابیں

سٹالن	سوانح	۸/
نورتن	ڈراما	۸عہ/
مذہب و تمدن	مذہب	۴عہ/
انشا	تنقید	۱۲/
بند لفافہ	ڈراما	۴/
مارا ملے	"	۴/
مٹھائی کی ٹوکری	"	۴/
کٹھ پتلیاں	"	۸/

چھوٹے بچوں کی کتابیں

بندر اور نائی	کہانی	۸/
لومڑی کا گھر	"	۴/
بی مینڈکی اور کوا	"	۶/
جادو کا گھر	"	۶/

بڑے بچوں کی کتابیں

سونے کی چڑیا	معلومات	۸/
باغبانی	"	۸/
کاغذ سازی	"	۶/
ہماری زمین	"	۸/
لڑائی کے ہتھیار	"	۶/
قدرت کے کرشمے	"	۸/
لکڑی کا کام	"	۶/
ہوائی جہاز	"	۶/
بڑدادا کی کہانی	تاریخ	۶/
ہمت کے پھل	سوانح	۵/
چھوٹا لڑکا	ڈراما	۳/
چور لڑکا	"	۴/
مٹھی شکر	نظم	۹/

مکتبۂ جامعہ دہلی

شاخیں اور ایجنسیاں:-

(۱) شاخ مکتبۂ جامعہ، جامع مسجد دہلی۔ (۲) شاخ مکتبۂ جامعہ پرنسس بلڈنگ امین آباد لکھنؤ (۳) شاخ مکتبۂ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی (۴) پبلشرز یونائیٹڈ لاہور (۵) سرحد بک ایجنسی پشاور

ایڈیٹر: منشی دیا نرائن نگم ایم۔ اے۔ پبلشر: کیلاش نرائن سکسینہ بی۔ اے۔ پرنٹر: جگدیش پرشاد

THE ZAMANA, DECEMBER 1943.

زمانہ

بیادگار منشی دیا نرائن صاحب نگم مرحوم

نمبر ۶	دسمبر ۱۹۴۳ء	جلد ۸۱

فہرست

زمانہ [illegible] پریس [illegible] سے شائع ہوا

آئیے

جاڑے کا خوشگوار موسم آگیا، مُردہ دلوں میں بھی اُمنگیں اور جولانیاں پیدا ہونے لگیں، مایوس اور نامرادوں میں بھی زندگی کی لہر دوڑنے لگی، لیکن آپ پھر بھی مضمحل نظر آ رہے ہیں، کیوں؟ کیا وجہ کہ یہ موسم گزرا جا رہا ہے اور آپ کی جوانی کے باغ میں خزاں کا دَور دَورہ ہے۔

مت گھبرائیے ہم مکمل اور شرطیہ علاج کا دعویٰ کرتے ہیں، ایک مرتبہ ضرور تجربہ کیجئے۔

نِکسول

یہ گولیاں مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے یکساں مفید ہیں، یہ حلق سے اُترتے ہی کیمیا کی طرح اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ ان گولیوں کو استعمال کرتے ہیں بوڑھے، جوان اور جوان نوجوان بن جاتے ہیں۔ یہ گولیاں نہیں جوانی کا بیمہ ہیں۔ مردوں کے جریان۔ احتلام۔ سستی اور نامردی کے لئے رُوپہلی گولیاں ہیں۔ اور عورتوں میں ماہواری کی جملہ خرابیاں۔ سفید رطوبت کا آنا اور تمام کمزوری کے لئے سنہری گولیاں تیر بہدف ثابت ہوئی ہیں۔ قیمت بڑی شیشی آٹھ روپئے 8/-/- چھوٹی شیشی تین روپئے چار آنے 3/4/-

اسپشل نِکسول

یہ دوا نہیں جادو ہے، صرف وہ لوگ استعمال کریں جو شادی شدہ ہوں، دوسرے لوگ ان کی طاقت سہار نہیں سکتے۔ یہ گولیاں فوری لیکن دیرپا طور پر اثر کرتی ہیں۔ ان کو استعمال کرنے کے بعد کسی دوا کی ضرورت نہیں رہتی

قیمت بڑی شیشی پچاس روپے 50/- چھوٹی شیشی بارہ روپئے آٹھ آنہ 12/8/-

ہر انگریزی دواخانے سے طلب کریں یا براہ راست

سول ایجنٹ

نیشن اینڈ ایلیس پراسپیکٹ چیمبرس الکیس ہارنبی روڈ بمبئی

نوٹ۔ مندرجہ بالا پتہ آپ نوٹ کر لیجئے۔ ممکن ہے کہ آج آپ کو ان دواؤں کی ضرورت نہ ہو لیکن کل پیش آ جائے

اسٹاکسٹ ڈاکٹر شمبھو دیال ڈسپنسری مال اینڈ مسٹن روڈ۔ کانپور

زمانہ

جلد ۸۱ — دسمبر ۱۹۴۳ء — نمبر ۶

ادب اور مشینی عہد

(از جناب شمس الحق قریشی، بی۔ ایس۔ سی۔ علیگ)

قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ نئی ایجادیں، جو انسانی زندگی کو ایک قدم آگے بڑھا دیتی ہیں، نہ صرف ادب بلکہ ہر شعبۂ زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان ایجادات کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی کے معیار، غور و فکر، اسلوب اور تخئیل کی وسعت میں یقینی تبدیلی ہوتی ہے۔ یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ کسی قوم کا ادب اُس کی زندگی کا [illegible] ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ناممکن محض ہے کہ ادب تبدیل شدہ حالات سے متاثر نہ ہو۔ اور اگر ہم قدامت اور تعصب [illegible] قطع نظر کرکے صرف حقیقت پر نگاہ ڈالیں تو ہم آسانی سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ نئے رُجحانات ہم کو کس ڈگر پر [illegible] جا رہے ہیں، اور یہ کس حد تک ہمارے لئے مفید ہیں۔

"ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" بڑے اختلافی اور متنازعہ فیہ مسائل رہے ہیں۔ زمانۂ ماضی میں [illegible] نظریے کے لئے گنجائش نہ تھی لیکن اس صدی کا سب سے بڑا کارنامہ اس نظریہ کی تبدیلی ہے۔ لوگ مجبوری [illegible] کرکے اب زیادہ سنجیدگی اور حقیقت کے ساتھ سوچنے لگے ہیں کہ ادب اور زندگی میں کس قدر مستقل رابطہ ہے [illegible] بیجا نہ ہوگا اگر اس موقع پر ادب کے متعلق زمانۂ حال کے وہ رجحانات بھی پیش کر دیئے جائیں جن کو نظر انداز کرنا مسئلہ کو تشنہ رکھے گا۔

"آزادیٔ ادب کے علمبردار یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ادب زندگی کی تفسیر بھی ہے اور تنقید بھی [illegible] کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ زندگی کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ کے سماجی، سیاسی اور معاشی ماحول کی [illegible]

نہیں کرتا بلکہ اس میں رنگ بھی بھرتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور زندگی پر اثر انداز بھی۔

(افادی ادب سلسلہ اُردو لائبریری)

ہم لوگوں کو شکر گزار ہونا چاہیئے کہ ان جدید ایجادات نے بقول میتھو ارنلڈ[1] لوگوں میں اعلیٰ درجہ کی سنجیدگی پیدا کر دی ہے۔ جہاں تک مندرجۂ بالا اقتباس کا تعلق ہے، یہ بھی اس مشینی دَور کی پیدا شدہ ضرورت سے زیادہ حِس کا نتیجہ ہے۔ اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو اس کشاکش زمانہ سے پیشتر لوگ ادب کے متعلق اس قسم کے غور و فکر ہی نہیں کرتے تھے۔ سائنس کی تمام جدید ایجادات کا یہی منشا ہے کہ انسان کی زندگی آسایش اور سہولت سے بسر ہو۔ لیکن ان ایجادات کا آخری نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خود انسان کی ذات ایک کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ یہ بحث بطور خود بہت دلچسپ بحث ہے کہ یہ ایجادیں انسانی زندگی کی کشاکش اور مسلسل جد و جہد میں ممد و معاون ہوئی ہیں، یا انھوں نے تناؤ کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کا یہ نتیجہ ضرور ہوا ہے کہ انسان اب ضرورت سے زیادہ حساس ہو گیا ہے۔ ہندوستان کے مقابلے میں مغربی ممالک اور یورپ اس کے زیادہ شکار ہیں۔

ادب پر ہی موقوف نہیں انھوں نے ہر چیز میں افادی پہلو مدنظر رکھا ہے۔ ادیب کے لئے زندگی کا عکس ہونے کی شرط بھی اسی احساس اور جذبہ کا نتیجہ ہے۔ جب سے یہ گرم و تند لہر چلی شروع ہوئی ہے ادب میں نمایاں تبدیلی نظر آنے لگی ہے۔ اسی کا نام جدید اور قدیم ادب ہے۔ میں نے گرم اور تند لہر اس وجہ سے کہا ہے کہ اس میں بیش از بیش حرارتِ زندگی موجود ہے، ایک نئی اُمنگ اور نیا ولولہ ہے جو ہمیں شاہراہِ زندگی پہ لے جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم راستہ گم کر دیں یا گمراہ کن اثرات قبول کر لیں لیکن احساس اور ولولہ بذاتِ خود صحت بخش چیزیں ہیں۔ قدیم ادب میں بھی زندگی کی عکاسی موجود ہے۔ جس قسم کی زندگی ہمارے اسلاف بسر کر گئے اُس کی عکاسی اُنھیں کا حصہ تھا لیکن جو اُپج اور حقائقِ زندگی کی طلب آج کار فرما ہے اُس زمانہ میں مفقود تھی (اس دعوے کی تائید میں یہاں پر صرف اُردو سے مثالیں پیش کی جائیں گی) بہر حال ان لوگوں نے ادب کے ذریعہ انسانی زندگی کی ترجمانی کی اور اس میں کامیاب بھی رہے۔ لیکن ان کے تصانیف میں حیاتِ انسانی کی تنقید نہیں ملتی۔ انھوں نے محض ترجمانی کی غرض سے ترجمانی کی زندگی کا راستہ کمانے کے لئے نہیں اور نہ اُس میں فطری رنگ بھرنے کے لئے۔ اس سے زیادہ اور کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ قدیم تصانیف پڑھکر آنکھوں کے سامنے اُس زمانہ کے ماحول کی تصویر پھر جاتی ہے۔ اس روش سے ہٹ کر چلنے والے لوگ اپنے زمانہ میں بھی مقبولِ عام اور شہرتِ دوام حاصل نہ کر سکے۔ شاعرِ مشرق مرزا غالب دہلوی عام سطح سے نہایت

[1] Mathew Arnold

بلند تھے۔ چنانچہ لوگ انھیں مہمل گو سمجھنے لگے، اور انھیں مجبور ہو کر کہنا پڑا:۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یہاں شاعر نے اپنے دلی احساسات کے اظہار کے علاوہ، اپنے معاصرین کے مذاقِ سلیم کا شکوہ بھی کیا ہے بہرحال جو پچھلے ادب کو کھنگالا جائے تو اہلِ نظر فوراً پہچان لیں گے کہ کون سی چیزیں اصلی ہیں اور کون فرضی۔ مگر اُس زمانہ کے مصنف مجبور تھے کیونکہ عام مذاق یہی تھا۔ مثلاً سوداؔ کے قصائد میں مبالغہ آمیزی، تعریف میں موصوف کو آسمان پر چڑھا دینا اور مذمت میں تحت الثریٰ میں گرا دینا۔ ان کا ہیرو ایک فوق البشر انسان بلکہ کرۂ مریخ کا کوئی مخلوق اور ہجو کا ہیرو شیطان معلوم ہوتا ہے۔ ذوقؔ نے بھی سوداؔ کی پیروی کی یہی اُس زمانہ کا عام رجحان تھا، کم از کم جو اصنافِ سخن وہ برت گئے اور جو تشبیہات و استعارات وہ استعمال کر گئے اُن کو زندگی سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ آج کل کا شاعر ان تشبیہات و استعارات کو سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔ ان باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کس حد تک تصنع بڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ غالبؔ جیسا شاعر بھی اس سے بچ نہ سکا۔

فسانۂ عجائب کے ابتدائی فقروں کو دیکھیے، نثر میں بھی وہی رنگ غالب تھا۔ سرورؔ کے یہ فقرے اس بات کا بیّن ثبوت ہیں

"گرہ کشایانِ سلسلۂ سخن، تازہ کنندگانِ فسانۂ کہن، یعنی محررانِ رنگیں تحریر و مورخانِ جادو تقریر نے اشہب جہندۂ قلم کو میدان وسیع بیان میں باگ تیز نمو ساز و لطیفہ ہائے حیرت پرواز گرم جولان یوں کیا ہے کہ سرزمین ختن میں ایک شہر تھا، مینو سواد بہشت نژاد۔ پسندِ خاطر محبوبانِ جہاں" وغیرہ (فسانۂ عجائب کا ابتدائی ٹکڑا)

فیضیؔ نے قرآنِ حکیم کی بے نقط تفسیر لکھی۔ انیسؔ نے بھی بے نقط اور با نقط اشعار لکھے، انشاؔ نے ایسے شعر لکھے جن میں سے کوئی یہاں لکھا جائے تو زمانہ کے کئی صفحے درکار ہونگے۔ مثلاً ایک شعر کا مصرعہ یہ ہے:۔

"آہ کیوں ہم نے دیا دل جو ہے بے مہری میں کامل، جسے آتا نہیں غم و حسرت کا مٹانا، جسے عادت ہے جفا کی، جسے چاہ مہر و وفا کی ...." وغیرہ

جانِ عالم واجد علی شاہ اختر نواب شیدا بیگم صاحبہ کے نام ایک رقعہ مورخہ ۲۶۔ جمادی الآخر ۱۲۷۳ھ میں اس طرح لکھتے ہیں:۔

"حامی رعایا ناصر برایا تم پر خدا کا سایہ۔ اشتیاق نامہ تمہارا سترھویں کا لکھا ہوا عین انتظار میں آیا، میں نے دیکھتے ہی آنکھوں سے لگایا، جب میں نے پڑھ کر سنا ہر فقرۂ رنگین بہا، غنچۂ طبیعت کو کھلایا تمہاری جدائی نے صدمہ دکھایا کہ منہ کو کلیجہ آیا، ہم کو غم نے ایسا ستایا کہ خون آنکھوں سے بہایا، چرخ نے عجب نیرنگ دکھایا، تم کو ہم سے عین جوانی میں چھڑایا......"

بیگمات اودھ کے نام اور خطوط بھی ایسی ڈھنگ سے لکھے ہیں۔ اِن متفرق مثالوں سے میرا مقصد یہ ہے کہ جس قسم کی زندگی تھی اس کی عکاسی اُس وقت کی ادبی تحریروں میں ضرور ملتی ہے۔ البتہ اِن تحریروں میں قدرتاً وہ تڑپ موجود نہیں ہے جو زندگی کے لئے شمعِ راہ بن سکے۔ موجودہ ادب میں یہ بات کافی موجود ہے۔ اور واقعی امر بھی یہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں وہ ادب قطعی بیکار ہے جس میں زندگی کی راہ نمائی یا افادی پہلو نہ ہو۔ دراصل اُس زمانہ کی مقفّی عبارت میں اول تو الفاظ زیادہ خیالات کم ہوتے تھے اور یہ خیالات بھی دُور از کار ہوتے تھے، دراصل اُس زمانہ میں تصنیف و تالیف سے صرف زورِ قلم کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ رسالہ "ساقی" بابتہ نومبر ۱۹۴۱ء میں ایک معزز مضمون نگار نے لکھا ہے کہ:۔

"عام ادبی معیار کی اس افسوسناک گراوٹ کی وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارا زمانہ جسے عصرِ رفتار کہا جاتا ہے تیزی اور جلدی کا زمانہ ہے جو ادب کے لئے کارآمد فضا پیدا نہیں کر سکتا۔ آجکل ادیبوں کو اپنے ہر فقرے کو چمکانے اور بے لاگ کی اتنی فرصت نہیں جتنی ہمارے متقدمین کو مشینی دَور سے پہلے حاصل تھی۔ افلاطون بہت دفعہ اپنے فقرات کو باکمال اور جاذب بنانے کے لئے بیس تیس دفعہ لکھا کرتا تھا۔ آجکل اتنا صبر کس میں ہے۔ پہلے وقتوں میں ادیبوں پر اکملیت کا بھوت سوار رہتا تھا، کیونکہ صرف باکمال تصانیف ہی شائع ہو سکتی تھیں ان کو دَورِ جدید کی طرح اپنی تصنیفوں کے آسانی سے چھپ جانے سے سستی شہرت اور ناموری کی اُمید تھی"

مجھے اس نظریہ سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ ان کی "اکملیت کا بھوت" صرف زبان تک محدود تھا۔ زبان پر قدرت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ ہی اُن کا اصل مقصد تھا۔ اس بات سے مجھے انکار نہیں کہ انھوں نے خیالات پیش نہیں کئے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ زمانہ میں وہ کس حیثیت سے یاد کئے جائیں گے۔ آیا وہ صرف زبان کے خدمت گزار ہی سمجھے جائیں گے یا شاہراہِ زندگی کو اپنے خیالات سے منور کرنے والے کی حیثیت سے بھی یاد کئے جائیں گے۔ ایک قباحت اور بھی ہے کہ ہر چیز کے اضافی ہونے کے ساتھ ہی ہم اُن قدروں[1] کو بھی نظرانداز کر رہے ہیں جن پر پُرانے لوگوں نے غور کیا تھا یا جس زاویۂ خیال سے انھوں نے سوچا تھا۔ فاضل مضمون نگار نے آجکل کے ادب کو قدیم کسوٹی پر پرکھنا چاہا ہے اس لئے ٹھوکر کھائی ہے۔ کسی کاریگر کے کام کو ہم انھیں سانچوں سے پرکھ سکتے ہیں جو اس کے پاس ہونگے اسی لئے جدید ادب کے واسطے میں قدیم کسوٹیاں متروک سمجھتا ہوں۔

آجکل وہی مصنف یا انشا پرداز کامیاب ہے جو الفاظ تصنّع اور تعقید کے چکّر سے نکل کر صاف صاف بات کہدے اس لئے کہ صاف بات حقیقت سے نزدیک ہوتی ہے۔ قدما کا زیادہ تر زور لسانی کمال[2] پر تھا۔ اُن کا بنیادی جذبہ بھی یہی تھا کہ جو کچھ کہا جائے وہ پچھلوں سے بڑھ چڑھ کر ہو، خواہ وہ حقیقت سے کتنا ہی دُور کیوں نہ ہو۔

---

[2] Linguistic perfection [1] Values

قومی انحطاط کا بھی اس پر اثر تھا۔ جہاں تشبیہات و مرصع کاری کے اتنے پردے پڑے ہوں وہاں کس طرح حقائق بے نقاب ہو سکتے ہیں۔ یہ جدید ایجادات ہی کا طفیل ہے کہ ہم حقیقت سے زیادہ قریب ہوتے جاتے ہیں۔ ہمارے قدامت پسند نقاد اول تو قدیم ادب کا مرثیہ پڑھتے رہتے ہیں، اور جدید ادب کی خوبیوں، صلاحیتوں سے چشم پوشی کرتے ہیں، اُن کی نظر میں جدید ادب قدیم ادب کی ناخلف اولاد ہے جس سے کوئی توقع ہی نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ خیال کہ جدید رُجحانات ادب کو مٹا رہے ہیں، چند غلط فہمیوں پر مبنی ہے اور اگر ایسا ہے بھی تو اسے قدیم ادب ہی کا قصور سمجھنا چاہیئے کہ اُس نے جدید ادبی رُجحانات پر اپنا کوئی نقش نہ چھوڑا۔ چنانچہ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ زندگی سے کتنا دُور تھا۔

ایک بات جو جدید ایجادات سے وجود میں آئی ہے وہ اجتماعیت ہے یعنی قدیم ادب کی انفرادیت ختم کرکے اس نے ادبی مسائل کو عالمگیر بنا دیا ہے۔ یعنی موجودہ ادب سماج کی زندگی پر تنقید کرتا ہے، راستہ دکھاتا ہے اور حسب ضرورت مناسب قطع برید بھی کرتا ہے۔ جہاں ادب ماضی سے رشتہ جوڑتا ہے وہاں مستقبل کی بھی جھلک دکھاتا ہے۔ ولی دکنی سے لے کر، ذوق و مومن بلکہ داغ تک میں ہمیں یہ طلب مفقود ہی نظر آتی ہے۔ سبھی شعراء انشا پرداز سرمایہ داری محور پر گھومتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ خواہ وہ محور دہلی میں ہو یا لکھنؤ میں، حیدرآباد میں ہو یا رامپور میں، یا کسی دوسرے شہر میں، انفرادی جذبات کی جگہ اس وقت سماج کے مسائل اور اجتماعی جذبات ہیں۔ پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ماضی کے بہ نسبت موجودہ زمانے میں جبکہ اجتماعیت ہی سب کچھ ہے انسانی ذہن کا قد" پست ہو گیا ہے جو ذہنی قوت اور ادبی کمال اگلے زمانے میں درباروں میں ضائع کیا جا چکا ہے، اگر اس سے انسانیت کی خدمت گزاری کا کام لیا جاتا تو کیا کچھ نہ ہو جاتا؟

آج یہ شکایت کی جاتی ہے کہ ادب سرمایہ داروں کا مرہون منت ہے، مگر کیا پہلے کبھی ادب سرمایہ داروں سے عہدہ برآ ہو سکا ہے۔ کیا لال قلعہ دہلی میں مشاعرے منعقد نہیں ہوتے تھے، اور کیا آج بھی سرمایہ داری ادب کے ذریعہ ملکی پالیسی پر کنٹرول کرنے کی کوشش نہیں کرتی؟

اگر اس مشینی عہد کی روز افزوں کشمکش میں کوئی پیش قدمی کرتا ہے اور کامیاب ہے تو یقیناً وہ ادیب کہلائے جانے کا مستحق ہے، اخلاف اگر سمجھ سکیں کہ کسی زمانہ میں انسانی روح کتنی پریشان اور متحرک رہی ہے تو یقیناً ادیب کا مشن کامیاب ہے، یہ تو اور زیادہ خوش نصیبی ہے کہ ہر چیز ہر لمحہ ہر فرد تک پہونچائی جا رہی ہے اور جیسا اخبار، سینما، ریڈیو یا کتابی اشاعت کی ہر چیز ادب نہیں ہو سکتی، ہم یہ کیوں سمجھ لیں کہ وہ باقی رہنے والی ہیں اصل ادب ہیں۔ اگر آجکل کا ادب آجکل کی ترجمانی کرتا ہے جہاں قیام نہیں، جہاں افراتفری ہے تو برہم ہونے کی کوئی وجہ نہیں، جبکہ خیالات میں تنوع نہیں، گہرائی نہیں، بالیدگی نہیں۔ زندگی یکسر تنوع کا نام ہے

اگر کوئی مصنف ایسا لکھے تو ہراساں نہ ہونا چاہیئے، اگرچہ یہ بالکل صحیح نہیں۔ ریل گاڑی، ہوائی جہاز، موٹر، بحری جہاز، دخانی کشتی، ریڈیو، گراموفون، پریس، سینما، ٹیلی وژن، کیا مددگار نہیں کہ ہر چیز مصنف کے منہ سے آپ کے کان تک براہ راست پہونچ جاتی ہے، جبکہ انتظامات کی خرابی سے زمانۂ ماضی میں جواہر پارے ضائع ہوگئے۔ لوگ مصنفوں شاعروں، ادیبوں، آرٹسٹوں کی شکلوں کو ترستے تھے، آج غائبانہ شرف ملاقات حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ آپ کچھ ضرر میں بھی شریک ہو جائیں تو چنداں مضائقہ نہیں۔ ہر چیز میں منافع کے ساتھ کچھ ضرر بھی ضرور ہوتا ہے۔

یہ ضرور ہوا کہ "قلعۂ معلّیٰ کی اُردو وہ نہ رہی" اس لئے کہ گھاٹ گھاٹ کے آدمی سے ملنے سے زبان خراب ہو ہی جاتی ہے "اور یہ ریل گاڑی کا اثر تھا۔ لیکن کیا بغیر اس کے "اُردو" میں وہ روانی اور لچک پیدا ہو سکتی تھی۔ یہ ایجادات اور ترقی کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص ہر موضوع پر زبان ہی نہیں کھول سکتا بلکہ صائب رائے دے سکے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے، اس بات میں شاید کسی کو شبہ ہو کہ ادب پر جدید ایجادات کا خراب اثر پڑ رہا ہے یا نہیں لیکن اس میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ جو امیدیں ادب سے وابستہ کی جانی چاہئیں وہ پوری ہونے کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ اس طرح سوچتے ہوئے ہماری انتہائی سادہ لوحی ہوگی اگر ہم ہر چیز کو ادب سمجھیں۔

جذبات بسمل

حضرت بسمل الہ آبادی

اسیری پر نظر ہے اور میں ہوں — خیالِ بال و پر ہے اور میں ہوں
زمانہ کس نظر سے دیکھتا ہے — زمانے کی نظر ہے اور میں ہوں
کوئی ساتھی نہیں راہِ عدم میں — اکیلے کا سفر ہے اور میں ہوں
کہیں آنا کہیں جانا نہیں اب — کسی کی رہ گذر ہے اور میں ہوں
مجھے ہے زندگی کا لطف حاصل — مرا دردِ جگر ہے اور میں ہوں
نظر کو وہ نظر آتا نہیں ہے — مری حدِ نظر ہے اور میں ہوں
دھڑکتا ہے مرا دل اے شبِ غم — قیامت کی سحر ہے اور میں ہوں
نہیں دم کا کوئی دم بھی بھروسہ — یہ قصۂ مختصر ہے اور میں ہوں
لگاوٹ کی نظر نے مار ڈالا — محبت کی نظر ہے اور میں ہوں
زمانے بھر کے ہیں سو عیب بسمل — یہی میرا ہنر ہے اور میں ہوں

ہاتھی والا فقیر

(از حضرت احسان دانش)

چلچلاتی دھوپ مدھم ہو گئی دن ڈھل گیا
دور بیٹھی شام کا جادو تھا برحق چل گیا

رخ دیئے بام و در آرام فرمانے لگے
سائے دیواروں کے گلیوں میں نظر آنے لگے

پھر رہا ہے مانگتا ہاتھی پہ اک بوڑھا فقیر
بزم انساں کا خلیفہ حق تعالےٰ کا سفیر

ساتھ خدمت کے لئے دو نوجواں چیلے بھی ہیں
اور یہ خوش پوش بھی خوش گل بھی البیلے بھی ہیں

ان کے بشروں پر نہ معذوری نہ مجبوری نہ یاس
رہزنی ماتھوں پہ رخشاں نیکوکاری اداس

کھو چکے تقلید آبائی میں یہ ظرف و ضمیر
جسم دولتمند ہیں ان کے مگر روحیں فقیر

دل کا خوں آ کر ہوا جاتا ہے اشکوں میں شریک
آدمی، اور اسکا پیشہ بھیک؟ پھر ہاتھی پہ بھیک؟

ہاتھی اک حیوان انساں صاحب ادراک ہے
اس کا دو روٹی کا پیٹ اُسکی منوں خوراک ہے

دیکھنے میں پھر بھی یہ منظر کہیں آتا نہیں
ہاتھیوں کے پاس ہاتھی مانگنے جاتا نہیں

آدمی پھرتا ہے لیکن ٹھوکریں کھاتا ہوا
اپنے ہم جنسوں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہوا

پشت غیرت مند پہ بے حس گدا کی زین ہے
میں سمجھتا ہوں یہ ہاتھی کی بڑی توہین ہے

[illegible] منظر [illegible] میں کچھ فقیر ہاتھیوں پر سوار سال بھر میں ایک بار مانگنے آیا کرتے ہیں [illegible] میں ایک بار اپنے اس خاص انداز میں مخصوص [illegible]

"فسانہ گو"

(از پنڈت اندر جیت شرما اچھرہ ضلع میرٹھ)

بچوں نے کیا پیا مری مہر و وفا کا جام
میرے ہی انتظار میں رہتے ہیں صبح و شام
کھیلوں کو بھول جاتے ہیں سُنتے ہی میرا نام
چلّا کے دوڑ پڑتے ہیں کرتے ہوئے سلام
دو چار کھینچتے ہیں لبادے کو جھوم کر
دو چار ارد گرد اُچھلتے ہیں گھوم کر

دو ایک تو لپٹ کے ہی کرتے ہیں مجھکو پیار
دو ایک دیکھ کر مجھے پاتے ہیں کچھ قرار
دو ایک جھینپتے ہیں کسی دُھن میں بار بار
اور منہ پُھلا کے ہوتے ہیں دو ایک اشکبار
دو چار میرا ہاتھ پکڑتے ہیں فخر سے
دو چار میری ٹانگ جکڑتے ہیں فخر سے

تسخیر دل کا کیا ہی نکالا عجیب ڈھنگ
کرتے ہیں گھیر گھیر کے چاروں طرف سے تنگ
اُلفت کے رنگ روپ میں ہوتی ہے خوب جنگ
سو سو طرح جتاتے ہیں اپنا ہر ایک رنگ
کہتے ہیں پھر پری کی کہانی سُنائیے
ہے آپ کو تو یاد زبانی سُنائیے

اودھ اور کمپنی

(از جناب ارشاد فاطمی)

فتحِ پلاسی (۱۷۵۷ء) اور جنگ بکسر (۱۷۶۵ء) نے بعد کے آنے والے واقعات کے لئے راستہ ہموار کر دیا کمپنی اپنے دوام و قیام کی بنیادیں مضبوط و مستحکم کر کے اس منزل پر پہنچی جہاں اُس کا سیاسی اقدام دیگر طاقتوں سے پنجہ آزمائی کرنے لگا۔ اگر انگریزی محاورہ "To fish in trouble waters" (بحر طوفان خیز میں مچھلیاں پکڑنا) اس جگہ استعمال کیا جائے تو شاید بے محل نہ ہوگا۔ ماہی گیر کمپنی بہادر اور بحر طوفان خیز اٹھارویں صدی عیسوی کا بے بہا دورِ ہندوستان، ایک طرف کمپنی کے شاطرانِ سیاست اور دوسری طرف سلطنت اودھ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ، ایک طرف حساس میسور اور دوسری طرف مرہٹوں کی قید و بند سے آزاد بڑھتی ہوئی طاقت، بالخصوص صوبۂ بہار پر کمپنی کا تسلط، یہ صورتِ حالات اہم اور پیچیدہ آنے والے واقعات کا پیش خیمہ ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ نواب سعادت علی برہان الملک نواب وزیر اودھ اور صفدر جنگ داماد برہان الملک عرصے سے صوبہ بہار کو للچائی مگر دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، حکومت دہلی کی شمع تو گل ہو ہی رہی تھی اس پر ستم یہ ہوا کہ مرشد قلی جعفر خاں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اب کیا تھا نوابانِ اودھ نے یہ پالیسی اختیار کی کہ کسی نہ کسی طرح صوبہ بہار کو بھی اپنے تحت و تصرف میں لے آئیں، چنانچہ جب محمد شاہ نے صفدر جنگ کو مہابت جنگ علی وردی خاں کی کمک کے لئے بھیجا اور صفدر جنگ عظیم آباد وارد ہوئے تو ان کی روش سے مترشح ہوتا تھا کہ شہنشاہ دہلی وہ ہی ہیں، اُن کا آنا علی وردی خاں کے لئے حوصلہ افزا ہونے کی بجائے ضرر رساں اور ہمت شکن ثابت ہوا۔ اپنی اولو العزمی اور زعم میں اس نئے نواب نے اطراف میں پروانے روانہ کئے اور خسروانہ انداز سے نذریں قبول کیں۔ شجاع الدولہ سیاسی وجوہات کی بنا پر حکومت صوبہ بہار کے خواہاں رہے، چنانچہ جب میر قاسم کو جلاوطن کیا گیا، تو عظیم آباد سے بھاگ کر بندیلی مرہٹوں کے دامن عاطفت میں پناہ لی اور نجف خاں کی فہمایش کے باوجود شجاع الدولہ سے طالب امداد ہوا۔ اُس وقت بھی شجاع الدولہ کا دماغ الحاق صوبۂ بہار کی ہوس سے، جیسا کہ مصنفِ مآثر الامرا کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے، خالی نہ تھا۔ مگر اس کی یہ ہوس اس خیالِ خام سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ میر قاسم، نواب بے ملک اور شاہ عالم زوال آمادہ مملکت کا شہنشاہ تھا کمپنی کے مقابلے میں فتح کی امید بیہودہ سری کے سوا کچھ نہ تھی شکست بکسر کے بعد شجاع کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور شہنشاہ دہلی کو کمپنی کا دست نگر بننا پڑا جیسا کہ خود شاہ عالم کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔

"I threw in to the bosom of English friendliness".

اپنے حقوق اور فرمان فرخ سیر کو مزید تاسیس اور اپنے حقوق پر مہر جواز ثبت کرنے کے لئے کمپنی نے ۱۷۶۵ء میں صلح الٰہ آباد کے موقع پر تاجدار ہند سے بالآخر بہار و بنگال کی دیوانی حاصل کرلی۔ گو کمپنی کے اکثر حکام کلائیو کی اس حرکت پر معترض بھی ہوئے۔ شہنشاہ مجبور تھا، کمپنی جو چاہتی کرسکتی تھی، مگر فی الحقیقت کلائیو کی اس عیاری نے کمپنی اور حکومت برطانیہ کی بڑی لاج رکھ لی۔

شجاع الدولہ کو صوبۂ الٰہ آباد و کڑہ سے دست بردار ہونا پڑا جو نجف خاں کے لئے محفوظ رکھا گیا، بعدہٗ اس کا کیا انجام ہوا صاف ظاہر ہے۔ شاہ عالم کے دہلی پہونچنے اور مرہٹوں کا اقتدار نیز مادھوجی سندھیا کے وکیل مطلق ہونے نے انگریزوں کے دل میں شکوک پیدا کردئے تھے۔ وارن ہیسٹنگز نے کڑہ اور الٰہ آباد پھر شجاع الدولہ کے حوالہ کردئیے مگر، ستمبر ۱۷۷۳ء میں یہ نظم چند سیاسی وجوہات کی بنا پر بدل دیا گیا۔

اس دفعہ صلح بنارس کے موقع پر شجاع الدولہ نے وارن ہیسٹنگز کے سامنے روہیلہ افغانوں کے خلاف جنگ کا ارادہ ظاہر کیا۔ کمپنی فوراً تیار ہوگئی اور مالی منفعت کی طمع دامن گیر ہوئی۔ اودھ اور روہیلکھنڈ کی حکومتیں ہمیشہ ایک دوسرے کی جانی دشمن چلی آتی تھیں۔ صفدر جنگ کو محمد روہیلہ، سردار حافظ رحمت خاں اور دُوندی خاں کے خلاف جو ہزیمتیں اُٹھانی پڑی تھیں وہ تا عمر شجاع الدولہ کے دماغ سے محو نہیں ہوئی تھیں۔ وہ صرف موقع کا منتظر تھا۔ یہ موقع سے اُسی وقت مل گیا جب مرہٹوں کے خلاف شجاع الدولہ نے روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کی اعانت کی اور بعدہٗ حافظ رحمت خاں نے تاوان جنگ ادا کرنے میں تاخیر کی۔ جو نتیجۂ جنگ میراں پور کڑہ (۷۔ اپریل ۱۷۷۴ء) سے ظاہر ہوا، اوراقِ تاریخ اب تک اس کے شاہد ہیں۔ حافظ رحمت خاں کے دل میں بدنیتی تھی یا نہیں، یا وہ نواب اودھ کو جھوٹے وعدوں سے ٹالنا چاہتا تھا اس کا حال سر رابرٹ بیکر Sir Robert Baker ہمعصر شجاع الدولہ اور مصنف سیر المتاخرین کی تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

Hafiz Rahmat, the old Rohilla Chief, recieving the message of the Nawab, To clear up the demand, Summoned Fateh-ul-lah Khan, son of Dundi Khan, and Faiz-ul-lah Khan son of Ali Mohammad Rohilla, To liquidate the Promised money to Shuja at once, But they were in Conspiracy with Shuja to overthrow the old Chief. for Shuja had given them an under-standing that

he was only hostile to Hafiz, and did not mean to destroy Rohilkhand, the abode of thier ancestors, So they advised Hafiz Rahmat to fight; thereby, in hidden words to bring ruin upon himself."

(ضعیف العمر روہیلہ سردار حافظ رحمت کے پاس جب نواب کا پیام پہونچا کہ مطالبہ پورا کرو تو اُس نے فتح اللہ خاں فرزند دوندی خاں اور فیض اللہ خاں فرزند علی محمد خاں کو طلب کرکے کہا کہ نواب کا موعودہ روپیہ فوراً ادا کردو' لیکن اس ضعیف سردار کو تباہ کرنے کی سازش میں یہ دونوں نواب کے شریک تھے۔ کیونکہ نواب نے انھیں سمجھا دیا تھا کہ میں تو صرف حافظ کا مخالف ہوں تمھارے بزرگوں کے مسکن روہیلکھنڈ کو تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے انھوں نے حافظ کو صلاح دی کہ لڑ جاؤ جس کا در پردہ یہ مقصد تھا کہ اپنے آپ کو مٹا دو۔)

صاحب سیرالمتاخرین تحریر فرماتے ہیں کہ روہیلوں کی شکست کے بعد شجاع الدولہ نے سجدۂ حق ادا کیا اور صاف لفظوں میں کہا "شکر خدا کہ میں نے اپنے باپ کا آج بدلہ لیا۔"

کمپنی کا شجاع الدولہ کی مدد کرنا، روہیلوں کے خلاف چلنا کہاں تک حق بجانب تھا یہ مل (Mill) میکولے (Macauly) اور برک (Burke) کی تقریروں اور تحریروں سے صاف ظاہر ہے۔ بظاہر کمپنی کو روہیلہ افغانوں سے کوئی وجہ مخاصمت نہ تھی۔ چنانچہ ۱۷۸۶ء میں یہ واقعہ دارالعوام (House of Commons) میں معرض بحث میں آیا۔ اور برک۔ مل اور میکولے اور دیگر حضرات نے یک زبان کہا۔

Hastings deliberately sold the lives of the free people and condoned horrible atrocities on the part of the armies of the Nawab of Oudh.

(ہیسٹنگز نے دانستہ ایک آزاد قوم کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اور نواب اودھ کی فوج نے جو ہیبت ناک مظالم کئے اُن کو نظر انداز کیا۔)

لیکن موجودہ مورخ مثلاً سر جان اسٹریچی (Sir John Strachey) جو وارن ہیسٹنگز کے ہوا خواہ ہیں، وہ ہر طرح اس بدنما داغ کو اُس کے دامن سے دھونے کے کوشاں ہیں۔ سر جان کا خیال ہے کہ روہیلہ افغان مستوجب سزا تھے' اس لئے کہ پچیس سال قبل انھوں نے بزور ہندوؤں پر قبضہ و اقتدار جما کر حکومت قائم کرلی تھی۔ راقم الحروف سر جان کی اس کتاب کا اس پروپاگنڈہ (Propaganda) لٹریچر میں شمار کرتا ہے۔ جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک پیدا کر دیئے ہیں۔ اگر مورخ کا یہ

خیال روہیلہ خاندانوں کی نسبت ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغلیہ حکومت ہندوؤں پر حکمراں تھی یا مغلیہ حکومت ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ حکومت تھی؟ میرا تو یہ خیال ہے کہ یہ حکومت نہ صرف ہندوؤں پر حکمراں تھی بلکہ اہل ہند کے قلوب پر بھی اس کا سکہ جما ہوا تھا۔ روہیلوں کے ساتھ حکومت اودھ کا برتاؤ کیسا رہا، اس کو نہ سرجان چھپا سکتے ہیں اور نہ کوئی اور انگریز۔

جنگ میراں پور کٹرہ کو چند ہی ماہ گزرے تھے کہ شجاع الدولہ راہی ملک بقا ہوئے۔ اور ان کی جگہ اُن کے بیٹے نواب آصف الدولہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ شجاع الدولہ کا انتقال اودھ کے لئے قیامت تھا۔ آصف الدولہ کے زمانے میں اُس کی رہی سہی عزت بھی رخصت ہو گئی۔ بقول صاحب سیر المتاخرین آصف الدولہ کے میلان طبع کی سطح بہت ہی پست اور ملکات فاضلہ سے محروم تھی۔ مسند نشین ہوتے ہی اُنھوں نے کمپنی سے بے دام کا سودا کیا۔ یہ وہ پہلی غلطی تھی جس کی وجہ سے بنارس ہمیشہ کے لئے کمپنی کے ہتھے چڑھ گیا۔ عہد شجاع الدولہ میں وارن ہیسٹنگز اور مسٹر مڈلٹن رزیڈنٹ (Resident) اودھ نے بارہا خواہش ظاہر کی تھی کہ بنارس کمپنی کے تصرف میں دیدیا جائے، مگر شجاع الدولہ کا سا دور بیں بھلا کب ان کے دام تزویر کا شکار ہو سکتا تھا۔ مسند نشین ہوتے ہی نواب آصف الدولہ نے محض مسٹر جان برسٹو (John Bristow) رزیڈنٹ اودھ کے ادنیٰ اشارے پر صلح فیض آباد ۱۷۷۵ء کے موقعہ پر بنارس کمپنی بہادر کے حوالہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ جو متوقع تھا ہوا۔ تاریخ بآواز بلند بتا رہی ہے کہ اودھ کے ایک ادنیٰ نمک خوار راجہ چیت سنگھ والی بنارس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا۔ اس برتاؤ کے ذکر کی بھی یہاں ضرورت نہیں جو کمپنی نے مطالبات پورے نہ ہو سکنے پر بیگمات اودھ نواب بیگم دختر سعادت علی خاں برہان الملک و زوجۂ نواب صفدر جنگ، اور بہو بیگم دختر نواب اسحاق خاں مؤتمن الدولہ محمد شاہی و زوجۂ نواب شجاع الدولہ کے ساتھ کیا۔ حالانکہ یہ مخدرات معصوم جیسا کہ کلکتہ کونسل کی رپورٹ ظاہر کرتی ہے، کئی بار ان مطالبات کو پورا کر چکی تھیں۔ اس تحریر سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان غریبوں کو تین لاکھ پونڈ مسٹر ٹوم (Mr. Tom) رزیڈنٹ اودھ کے حکم سے ۱۷۷۵ء میں ادا کرنا پڑا تھا، اور از روئے معاہدہ برطانوی رزیڈنٹ کلکتہ نے فارغ الخطی بھی لکھ دی تھی۔ تاہم جیسا کہ خود وارن ہیسٹنگز کی اُس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے جو اُس نے رزیڈنٹ اودھ کے نام لکھ بھیجی تھی، کمپنی کے مطالبات وصول کئے گئے، وہ رزیڈنٹ کو لکھتا ہے:۔

"You must not allow any negociations, or for bearance but resources, untill the Begams are at the entire mercey of the Nawab."

(تاوقتیکہ بیگمات اپنے تئیں نواب کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیں، کسی قسم کی گفت و شنید تحمل و تدبر سے کام نہ لو)

اس کا کیا انجام ہوا ایک مورخ کی تحریر ملاحظہ فرمائی جائے:۔

British troops were sent to Faizabad; when the Begams lived; and then two Enuchs were Compelled by imprisonment and starvation thrnat, if not actual floging, to surrender the wealth in the month of December 1782."

(انگریزی فوجیں فیض آباد بھیجی گئیں جو اس وقت بیگمات اودھ کی قیام گاہ تھا۔ دو خواجہ سراؤں کو اگر سزائے بید نہیں دی تو کیا ہوا، قید، فاقہ اور دھمکیاں دے دے کر مال ومتاع حوالہ کرنے پر مجبور کیا۔)

جب دارالعوام (House of Commons) میں ہیسٹنگز سے اس واقعہ کے متعلق سوال کیا گیا تو اُس نے کہا "میں عورتوں پر ظلم کرنا پسند نہیں کرتا، لیکن اس موقع پر نہ کرتا تو کیا کرتا، کیونکہ انھیں بیگموں نے تو چیت سنگھ کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔" مگر اس بیان کی صحت ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے۔"

ہیسٹنگز کے ہندوستان سے چلے جانے پر، کارنوالس اور سر جان شور یکے بعد دیگرے بنگال کے گورنر جنرل ہوئے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب حیدر بیگ وزیر کے زیر اثر اودھ اپنی تمدنی حالت بدل رہا تھا۔ صیغۂ مال میں خاص طور سے اصلاح وترمیم شروع کی گئی تھی۔ حیدر بیگ کی درخواست پر گورنر جنرل لارڈ کارنوالس نے کمپنی کے مطالبات کو چوہتر لاکھ سے گھٹا کر پچاس لاکھ کر دیا۔ مگر حیدر بیگ کے بے وقت انتقال (۱۷۹۴ء) نے کل امیدیں خاک میں ملا دیں۔ تین سال بعد (۱۷۹۷ء) میں سازش، کج فہمی اور بے راہ روی کا زمانہ گذار کر آصف الدولہ بھی راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ اس کے بعد مسند نشینی کا معاملہ پیش آیا۔ اس وقت دو دعویدار موجود تھے۔ سعادت علی خاں برادر آصف الدولہ، اور وزیر علی خاں فرزند آصف الدولہ۔ سعادت علی خاں ہمیشہ بھائی کی سازشوں کا شکار بنے رہے، اس لئے مرتے وقت آصف الدولہ نے وصیت کی کہ وزیر علی خاں ہی کو ان کا جانشین کیا جائے۔ بموجب وصیت مسند وزیر علی خاں کو ملی، مگر یہ مجہول النسب تھے، سر جان شور اور دیگر ہمعصر تذکرہ نویسوں کی تحریریں اس کی شاہد ہیں کہ ان کی معزولی کی خاص وجہ یہی تھی۔ وزیر علی خاں جلا وطن کئے گئے۔ اور مسند سعادت علی خاں کے سپرد ہوئی۔ بعدہٗ وزیر علی خاں کو بنارس میں رہنے کا حکم ملا اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا لیکن ۱۴ جنوری ۱۷۹۹ء کو بنارس میں ایک شورش ہوئی، ریزیڈنٹ مسٹر شیری (Mr. Cherry) اور چند انگریزی حکام تہ تیغ کر ڈالے گئے۔ وزیر علی خاں اس شورش عظیم کے سرغنہ قرار دیے گئے۔ یہ شورش بنگال ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ بہار و بنگال و دیگر مقامات سے بھی اس کا تعلق تھا۔ خفیہ طور پر وزیر علی خاں نے زماں شاہ فرمانروائے کابل

سے بھی مدد طلب کی تھی، مگر قبل از وقت راز طشت از بام ہوگیا اور شورش فوراً دبادی گئی۔ ایک انگریزی دستہ نے نواب وزیر علی خاں کو قید کرکے فورٹ ولیم کلکتہ میں محصور کردیا جہاں ان کی باقی عمر تمام ہوگئی اور ۱۸۱۷ء میں طائر جان نے قفس عنصری سے پرواز کی۔ سعادت علی خاں کے زمانہ کی حالت صوبہ اودھ کا نقشہ مسٹر تھورن ٹن (Mr. Thorton) نے یوں کھینچا ہے:۔

In all iespects embrassements and disorder, the British subsidy was always in arrear, while the most frightful extortion was practised in the year.

Justice was un-known, the army was disorderly messed formidable only to the power, when it professed to serve. The wits of nation growth was aggraveted. by the pressure of an extra-ordiary number of adventurers. most of them were as destitude of charator and principles as that of the men of property."

(ہر طرف بدامنی اور بے نظمی کا دور دورہ تھا۔ برٹش گورنمنٹ کا سالانہ مطالبہ ادا نہیں کیا جاتا تھا، اور وہ ستم توڑے جاتے تھے کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے، انصاف عنقا تھا، فوج بے ترتیب تھی اور اسی کے لئے عذاب جان جس کی خدمت کا دم بھرتی تھی ہندوستانیوں کے اپنے عیب انگریزی بوالہوسوں کے عیبوں سے مل کر سمندِ ناز پر تازیانہ ہوگئے تھے۔ اِن بوالہوسوں میں زیادہ ایسے تھے جو کسی اُصول یا دستورالعمل زندگی کے پابند نہ تھے۔)

مسند نشین ہوتے ہی نواب سعادت علی خاں اور کمپنی کے درمیان جو صلح ہوئی، اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت اودھ کو قلعۂ الٰہ آباد سے دست بردار ہونا پڑا۔ مارش مین (Marsh man) اس قلعہ کو "Military Key of the Provence." یعنی صوبہ کی فوجی کنجی" کہتا ہے۔ اس کے اِس خیال کی تائید سابقہ واقعات بھی کرتے ہیں۔ جب صفدر جنگ کے خلاف احمد خاں بنگش بن محمد خاں بنگش اور دیگر افغانوں نے علم بغاوت بلند کیا، الٰہ آباد ہی وہ جگہ تھی جہاں اِن کے ہوش پراگندہ ہوگئے۔ باسدیو گیر گوسائیں (बासदेव गीर गोसाई) اور دیگر ناگا (नागा) فقیروں نے ان کا مردانہ مقابلہ کیا اور افغانوں کو سخت ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ اودھ سے قلعہ الٰہ آباد کا الگ ہونا جغرافیائی حیثیت سے اس ملک کے لئے قیامت تھا۔ جب قلعہ کی کنجی غنیم کے ہاتھ لگ جائے تو اہل قلعہ کا حال معلوم!

صلح کی دوسری شرط کے مطابق نواب کو چھتیس لاکھ روپیہ سالانہ کمپنی کو ادا کرنا پڑا۔ پھر تیسری شرط کے مطابق نواب پر سب سے بڑی پابندی یہ عائد کردی گئی کہ حکومت اودھ کسی دوسری حکومت سے کمپنی کے مشورہ کے بغیر نہ کوئی صلح کرے اور نہ کسی دوسری یورپین قوم کی مداخلت کو اپنی حکومت میں روا رکھے۔ یہ شرط اس لئے لگائی گئی تھی کہ فرانس نپولین اعظم کے ماتحت تمام ممالک مغربیہ و مشرقیہ سے حکومت برطانیہ کے خلاف سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ہندوستان میں بھی ٹیپو سلطان اور گورنر مارشیس (Mauritius) کے درمیان سلسلۂ مراسلت جاری تھا۔ مرہٹہ، نظام اور دیگر ہندوستانی حکومتوں میں فرانسیسی حکام ہندوستانی فوجوں کی تعلیم میں مصروف تھے۔ ٹیپو سلطان کے زیر اثر سرنگا پٹم اور میسور کے دیگر مقامات پر آزاد فرانس کے انقلابی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ نپولین کے مصر پر حملے نے کمپنی اور بالخصوص لارڈ ویلزلی کو اور بھی بیدار کردیا۔ کمپنی پر اپنی سرحد کی حفاظت فرض تھی، لہذا یہ صلح موقع اور وقت کے لحاظ سے کی گئی۔ مگر ان تین شرطوں نے دراصل حکومت اودھ کے جسم سے آزادی کی روح سلب کرلی، اور نواب کو پابزنجیر کردیا۔ نواب کی خود مرتبہ فوجوں میں کمی کردی گئی اور اس کے عوض کمپنی کی تازہ دم انگریزی فوجوں کی چھاؤنیاں لکھنؤ اور دیگر مقامات میں قائم کردی گئیں۔ جیسا کہ خود لارڈ ویلزلی کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے، دراصل اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ سرحد مستحکم ہوجائے۔ یہ تحریریں انھوں نے لارڈ لینسڈاؤن (Lord Lansdown) رزیڈنٹ اودھ کو بھیجی تھیں۔

وزیر علی کی بغاوت (۱۷۹۹ء) سے کمپنی اور بھی ڈر گئی اور نواب کو اپنی مرتبہ فوجوں کو قطعی برطرف کردینے اور ان کی بجائے انگریزی دستوں کو رکھنے کا حکم ہوا۔ اولاً سعادت علی خاں نے اس حکم کو ٹالنا چاہا۔ یہاں تک نوبت آگئی کہ جب کرنل اسکوٹ (Colonel Scott) نے زیادہ زور دیا تو نواب نے حکومت سے دست بردار ہونے کی خواہش ظاہر کی، مگر ویلزلی پر اس کا چنداں اثر نہ ہوا، اس کی دراصل یہی خواہش تھی کہ کسی طرح اودھ کمپنی کے قبضہ و اقتدار میں آجائے۔ چنانچہ نواب کی اس دھمکی کا اس پر جو اثر ہوا وہ اسی کی زبان سے سنئے۔

"It is my intention to profit by the visit to the utmost practicable extent."

(میری خواہش ہے کہ اس موقعہ سے جہاں تک ممکن ہو فائدہ اٹھایا جائے")

سعادت علی خاں کا یہ خیال تھا کہ اگر وہ حکومت سے دست بردار بھی ہوئے تو ان کی جگہ ان کے لڑکے کو ملے گی۔ مگر جب کمپنی نے نواب کے اس خیال کی تائید نہ کی تو انھوں نے اپنا ارادہ فسخ کردیا۔ خود پسند گورنر جنرل کی برہمی اور بھی بڑھ گئی۔ وہ خود تحریر کرتا ہے:-

"Extremely disgusted at the duplicity and insincerity which Marked the conduct of the Nawab."

(نواب کی دورروئی غیر مخلصانہ روش سے میری طبیعت بہت مکدر ہوئی)

اس بار کمپنی کی انگریزی فوجوں میں اور اضافہ کر دیا گیا، مطالبات بھی نئے صلحنامہ کے مطابق بڑھا دیے گئے۔ نواب نے اس ناروا ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، مگر نقار خانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا تھا۔ اُسے ایک اور صلح پر مجبور کیا گیا۔

یہ صلح نومبر ۱۸۰۱ء میں ہوئی جس کے مطابق روہیلکھنڈ بھی نواب کے ہاتھوں سے نکل گیا، دوآبہ کا کافی حصہ حکومت اودھ سے لے لیا گیا پہلے الٰہ آباد اور بنارس، پھر روہیلکھنڈ اور دوآبہ چلے جانے سے نصف حکومت اودھ کمپنی کی ملک ہو گئی، نواب کا علاقۂ حکومت، کمپنی کے علاقۂ حکومت سے محصور ہو گیا، اور اس کی حالت محض ایک جزیرے کی سی ہو گئی۔ یہ جزیرہ بھی رفتہ رفتہ موج حوادث کے نذر ہو گیا۔

دُور میں، معاملہ فہم نواب سعادت علی خاں کے انتقال کے بعد سے ۱۸۵۶ء تک تاریخ اودھ کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ کوئی مورخ ان واقعات کو غم، غصہ، رنج اور ملال سے متاثر ہوئے بغیر سپرد قلم نہیں کر سکتا۔ اس لئے مضمون ایک شاعر کے شعر پر ختم کیا جاتا ہے۔

اشارے کر دیئے مطلب کے اپنے چار لفظوں میں
مضامیں سب ہیں گویا بند اک کوزے میں دریا ہے

ارشادات

(حضرت ارشاد فاطمی، بی۔اے آنرز)

سوائے آہ نوائے غم آشنا کیا ہے — ترے فراق میں تنہائی صدا کیا ہے
اُلجھ کے سانس سے رہ جاتی ہے فغاں میری — پیام یاس ہے فریاد نارسا کیا ہے
یہی کہ تو نہ ہو شرمندۂ رضائے حبیب — دُعا سے اور ترے دل کا مدعا کیا ہے
بس اک نگاہ تلطف بس اک تبسم ناز — وگرنہ اور مرے غم کی ابتدا کیا ہے
کسی کی ذات میں ملنا ہے میرا مٹ جانا — ہے اصل سرّ بقا اور مری فنا کیا ہے
ازل سے سوز و دُرول ہے شریک درد جگر — اب اس میں اے دل مضطر مری خطا کیا ہے

جو لب ہلاؤں تو شکوے کا ہو گماں ارشاد
سوائے ضبط مرے درد کی دوا کیا ہے

نگاہِ اوّلیں

(از مسٹر علی اشرف حیدر آبادی)

عجیب شے تھی محبت کی اولین نظر — ادھر بھی بے خبری اور اُدھر بھی بے خبری
نگاہِ ناز کے اُٹھتے ہی بیخودی چھائی — سحر کے نور میں جیسے ستارۂ سحری
نہ لب پہ نالۂ جانکاہ اور نہ دل بے چین — نہ اہتمامِ اثر اور نہ خوفِ بے اثری
ملی جنوں کو نظر آشنائے رازِ حیات — بساطِ ہوش پہ ٹھہرا ہجومِ کم نظری

کسی نے چھیڑ دیا بیخودی میں سازِ حیات
نہ میں رہا نہ مرا وہ فریبِ رازِ حیات

وہی نگاہ، وہی سحر آفریں تنویر — بچا کے سب کی نظر لے گئی کہیں مجھ کو
ذرا سی دیر میں دُنیا بدل گئی میری — کچھ اِس ادا سے دیا جامِ آتشیں مجھ کو
اِسی نگہ سے ہوئی میری زندگی کی نمود — اِسی نظر سے مِلا درسِ اوّلیں مجھ کو
خیالِ یار میں فردوس کی لطافت ہے — نہ دے فریب بہاروں کی سرزمیں مجھ کو

کہوں میں کیسے وہ پہلی نگاہ کیا شے تھی
وہ حُسن و عشق کی دنیا بھی آہ کیا شے تھی

"ایک دوست کی جواں موت پر!"

از حضرت فیاض گوالیاری، بی۔ اے

اے کہ وابستہ تھیں تجھ سے عمر کی وہ ساعتیں　　زندگی بھر زندگی مُڑ مُڑ کے ڈھونڈے گی جنہیں!
آہ وہ ماضی جسے رکھتی ہے اِک دُنیا عزیز　　اِک خلا سا ہے مری نظروں میں، اِک تاریک چیز

اِس طرح جینے سے تیرے بعد شرمندہ ہوں میں
جیسے مجھ کو حق نہ جینے کا اور زندہ ہوں میں

کھا گئی یوں تجھ کو دُنیا کی نگاہِ عیش سوز　　یک بیک آئے گہن میں جیسے مہرِ نیم روز
سانحہ ایسا بھی سُننے میں کہیں آتا نہیں　　اب بھی تیری موت کا دل کو یقیں آتا نہیں
تجھ میں حد درجہ شرافت تھی مروّت بے قیاس　　مکر وبے مہری کی یہ دُنیا تجھے آئی نہ راس

دے گیا غم اُن کو لایا تھا خوشی جن کے لئے
اِس زمیں پر آفتاب آیا تھا کچھ دن کے لئے

جیسے صحنِ باغ میں دو دن کو پھولوں کی بہار　　جس طرح برسات میں دو دن کو جنگل کا نکھار
جس طرح بچپن کی بے فکری کے کچھ انمول دن　　جیسے طوفانی جوانی کا مسرت بار سِن!
جس طرح حُسنِ سراپا کا آنی التفات　　شر ورُت میں جس طرح روشن خُنک پونو کی رات!
جیسے کشتِ مغرب میں دم بھر شفق پھولی ہوئی　　جیسے یاد آئے کوئی میٹھی ادا بھولی ہوئی

جس طرح اِک لمحۂ عیش و خوشی کی تھرتھری
جس طرح خوابِ گدا میں سایۂ بالِ پری!

آہ وہ رنگینیوں کا انتشارِ نَو بہ نَو　　پَے بہ پَے دورِ خزاں پیہم بہارِ نو بہ نَو
آج سے پہلے مری نظروں میں دُنیا اور تھی　　شرحِ غم کچھ اور، تفسیرِ تمنا اور تھی
غم کو غم سمجھی ہی کب تھی فطرتِ عالی مری　　اب ہوئی محسوس مجھ کو بے پر و بالی مری
دل میں جھٹکا سا لگا، بنیادِ فطرت ہل گئی　　خاک میں اوجِ تخیل کی وہ دنیا مِل گئی
اِتنی بے رحم اور اچانک موت کب تھی دھیان میں　　آہ کیا رکھا ہے اِک بیکس غریب انسان میں
بدلا جاتا ہے وہ میرا زندگی کا نظریہ　　اِنقلابِ دہر کا۔ رنج و خوشی کا نظریہ
اے خیالِ دوست طاقت دے، دلِ فیاض کو　　پھر دلاسا دے کے ہمت دے۔ دلِ فیاض کو

شعرا اور شکایتِ روزگار

(از حضرت آدیب کھنڈلی)

اُردو اور فارسی کے شعرا کو بالعموم زمانہ سے بڑی شکایت رہتی ہے۔ مشکل سے کوئی استاد شاعر ایسا ہے گا جس کے کلام میں ایسے مضامین نہ ملیں۔ حضرت انیس ایک سلام میں فرماتے ہیں :۔

یک بیک ایسا زمانہ میں ہوا ہے انقلاب　　　قدرداں سب اُٹھ گئے، ناقدرداں پیدا ہوئے

ایک بند میں اپنے کلام کے متعلق فرماتے ہیں :۔

کیا ہو گئے وہ جوہریانِ سخن اک بار　　　ہر وقت جو اس جنس کے رہتے تھے طلبگار
اب ہے کوئی طالب نہ شناسا نہ خریدار　　　ہے کون دکھائیں کسے یہ گوہرِ شہوار
کس وقت یہاں چھوڑ کے ملکِ عدم آئے
جب اُٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے

اس قسم کی متعدد مثالیں انیس کے کلام میں موجود ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا واقعی انیس کے کلام کی قدردانی نہ ہوئی؟ اس سوال کا جواب صاف ہے۔ اُردو کے کسی شاعر کی اُس کی زندگی میں اتنی قدردانی نہیں ہوئی جتنی حضرت انیس کی۔ بنارس مجلس پڑھنے جاتے ہیں تو سرکاری عدالتیں بند ہو جاتی ہیں، شاہِ اودھ حضرت واجد علی شاہ خود صاحبِ دیوان تھے۔ قدردانی کا یہ عالم کہ فیاضی کی گنگا بہہ رہی تھی، اس پر طرّہ یہ کہ شیعہ تھے، یہ وہ وقت تھا کہ تعصب کا منحوس مرض لکھنؤ کی حکومت تک نہ پہونچا تھا۔ شاہی فیاضی اور رواداری نے ہندوؤں کو ایسا گرویدہ کر لیا تھا کہ یہ بھی اسی اخلاص اور عقیدت کے ساتھ محرم مناتے تھے جیسے شیعہ حضرات آج تک ہندوؤں کے ایسے خاندان موجود ہیں جو تعزیہ داری کرتے ہیں اور ماہ محرم الحرام کا ویسا ہی احترام کرتے ہیں جیسے شیعہ صاحبان۔ اس حالت کے پیشِ نظر یہ کیونکر ممکن تھا کہ حضرت انیس کو اپنے کلام کا کوئی طلبگار و خریدار نہ ملتا۔

اس امر کی مستند شہادت موجود ہے کہ شاہ اودھ نے سراپا اشتیاق ہو کر دعوت مرثیہ خوانی دی لیکن شاہ اودھ اگر اودھ کے بادشاہ تھے تو انیس اقلیم سخندانی کے تاجدار تھے، کسی دنیاوی حاکم کی مدح کیونکر کرتے چنانچہ سلام فرمایا جس کا مطلع ہے :۔

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر   مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

اب دوسرا سوال یہ ہو سکتا ہے کہ جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ انیس کی قدر دانی میں اُمرا و رؤسا نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی، تو کیا حضرت انیس نے جذبات کی سچی ترجمانی نہیں کی صرف رسمی طور پر شکایت زمانہ کی ہے؟ انیس کی شخصیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ باطل گو تھے۔

مرزا غالب کی نظم و نثر میں شکایت زمانہ کے مضامین بکثرت موجود ہیں، بلکہ اس باب میں جدت و مضمون آفرینی کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ کیا کہنا۔ فرماتے ہیں:-

شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن   ایں مے از قحطِ خریداراں کہن خواہد شدن

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:-

بیا ورید گر ایں جا بود سخنداںے   غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

ایک خط میں لکھا ہے کہ جہانگیر کے عہد میں کلیم کو جواہرات اور سونے چاندی میں تولا گیا، کاش میرے کلام ہی کو کوئی کلیم کے ساتھ تول لیتا۔ الغرض مرزا غالب کے کلام سے اگر اس قسم کی مثالیں تلاش کی جائیں تو ایک دفتر ہو جائے۔

یہاں بھی یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی مرزا غالب کی ناقدردانی ہوئی؟ اس میں شک نہیں کہ مرزا کو لوگوں نے ان کی زندگی میں نہیں پہچانا۔ جو رتبہ آج مرزا کو حاصل ہوا ہے وہ ان کی زندگی میں نہیں ملا۔ تیز روشنی کو قریب سے اچھی طرح نہیں دیکھا جا سکتا، پھر بھی یہ خیال غلط ہے کہ واقعی مرزا نے سخت کس مپرسی اور بیکسی میں زندگی بسر کی۔ غدر کے ہنگامہ کے بعد مرزا کو دربار رامپور سے سو روپیہ ماہانہ ملتے تھے، پنشن بھی جاری ہو چکی تھی، دربار اور خلعت بھی بحال ہو چکے تھے، دور دور سے لوگ بغرض ملاقات آتے تھے، حکام تک اچھی رسائی تھی، شرفا اور والیان ریاست سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ با ایں ہمہ مرزا کبھی مطمئن نہ رہے اور تمام عمر شکوہ و شکایت میں گزاری۔ لیکن یہ درست نہیں کہ مرزا نے اپنے جذبات کو فریب دیا۔

قدیم شعرا کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے اور رسمی مضامین کی طرح اس مضمون پر بھی طبع آزمائی کی ہو۔ لیکن جدید شعرا نے بھی اس طرح کے مضامین بکثرت نظم کئے ہیں۔ حضرت برق دہلوی خاصی شہرت رکھتے تھے، ہر جماعت میں ان کا کلام مقبول تھا۔ خاص و عام کلام کی داد دیتے تھے، مجھے ایسے مشاعرے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جن میں حضرت برق کی شعر خوانی نے کیفیت پیدا کر دی اور فضا داد سے معمور ہو گئی، لیکن برق مرحوم کو ہمیشہ زمانہ سے سخت شکایت رہی، وہ ہمیشہ محسوس کرتے رہے کہ ان کے کلام کا صحیح اندازہ کرنے سے لوگ قاصر رہے۔ اُن کا بہت مشہور شعر ہے:-

کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی   میں چمن زارِ جہاں میں گلِ صحرائی تھا

حضرت جوش ملیح آبادی کو آج جو مرتبہ حاصل ہے اُس سے کون واقف نہیں ہے۔ علامہ کیفی دہلوی نے لاہور کے ایک جلسہ میں جہاں ڈاکٹر ٹیگور مرحوم اور مسز سروجنی نائیڈو بھی موجود تھیں فرمایا تھا کہ جوش کی شاعری نے ہمیں اس قابل بنا دیا کہ آنکھیں نیچی کئے بغیر اپنی شاعری کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کے رکھ سکیں۔ کیفی نقاد ہیں اور اُن کی رائے اہمیت رکھتی ہے، بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کے کسی آزاد شاعر کو اپنی زندگی میں یہ شہرت نصیب نہیں ہوئی (آزاد شاعر سے میری مراد وہ شعراء ہیں جن پر مذہب، دربار شاہی یا ملیت کی مہر نہ لگی ہو) مگر حضرت جوش سے زیادہ شاید ہی کوئی ناقدردانیٔ زمانہ کا شاکی ہو، صرف ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ جوش کے کتنے ہی اشعار بلکہ نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

جہل کا دریا ہے اور نا قدریوں کی لہر ہے   شاعرِ ہندوستاں ہونا خدا کا قہر ہے

جوش کے متعلق یہ قطعی خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ شکوۂ زمانہ رسمی یا تقلیدی طور پر کریں۔ تقلید اور جوش دو متضاد چیزیں ہیں۔

پھر آخر یہ ہنگامہ کیا ہے؟

شاعر اقلیم تخیئل کا بادشاہ ہے۔ شعر کہتے وقت وہ ایسے خلوت کدے میں پہونچ جاتا ہے جہاں انسان کیا اور اُس کی بساط کیا، زمان و مکان کو بھی دخل نہیں ہوتا۔ ذرہ ذرہ کو وہ روح عطا کرتا ہے، پتّی پتّی کو زبان بخشتا ہے، دنیا اُسے بازیچۂ اطفال نظر آتی ہے۔ اس عالم میں اُسے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ جہاں وہ ہے وہاں کوئی نہیں، پھر اس خلوت کدۂ راز کی باتیں کون سمجھے۔ اکثر فخریہ نظموں کا ماخذ بھی یہی احساس ہے۔ حضرت اصغر فرماتے ہیں:-

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا   اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

لیکن باوجود اشعار میں نمایاں ہونے کے شاعر کے اشعار کو سمجھنے والا کون ہے ع اصغر

"ابھی مجھ سے سبق لے عالمِ روحانیاں برسوں"

شاعر کی اہمیت کا اظہار حضرت جوش سے زیادہ کسی اردو شاعر کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ جوش کے کلام کو پڑھنے کے بعد یہ حقیقت صاف روشن ہو جاتی ہے کہ شاعر خودستائی کیوں کرتا ہے، اور اس خودستائی میں وہ کہاں تک حق بجانب ہے۔ شعلہ و شبنم میں نظم "تنبیہ" ملاحظہ کیجئے۔ عصر حاضر اور ہندوستانِ نو کی لوح کو شاعر ایک صحیفہ پیش کرتا ہے:-

اس صحیفۂ عظیم کی اللہ ری وسعتیں   ہر موجِ ہے مشرقین بداماں ترے لئے

رکھتی ہے جس مقام پہ روح الامیں کی سانس　　دل کو وہاں کیا ہے پر افشاں ترے لئے
کس کو خبر تراش کے کن ظلمتوں کا دل　　لایا ہوں میں یہ چشمۂ حیواں ترے لئے

غرورِ ادب' کے عنوان سے ایک نظم 'شعلہ و شبنم' میں ہے جس کا آخری شعر ہے :-

اہلِ دنیا کیا ہیں اور اُن کا اثر کیا چیز ہے　　ہم خدا سے ناز کرتے ہیں بشر کیا چیز ہے

صوری اعتبار سے بھی شاعر کلام کی جو شست و شو کرتا ہے اس ریاضت کا احساس عوام کو نہیں ہوتا۔

برائے پاکیٔ لفظے شبے بروز آرد　　کہ مرغ و ماہی بود خفتہ او بود بیدار

اساتذہ نے شاگردوں کے کلام پر جو اصلاحیں کی ہیں اُن کو دیکھئے۔ بعض اوقات ایک لفظ شعر کے معنی کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتا ہے۔ بقول خواجہ آتش ع

"بندشِ الفاظ جڑنے سے نگیں کے کم نہیں"

پس کیا صوری اور کیا معنوی کاوش و بلندی، دونوں میں شاعر آپ اپنا حریف ہوتا ہے۔ اپنے سحر سے رستم جیسا پہلوان صفحہ قرطاس پر پیش کرتا ہے۔ کبھی مفلس کے گھر کا بیان کر کے محفل کی محفل کو رُلا دیتا ہے۔ کبھی رجز خوانی سے مردہ دلوں میں از سر نو حیات کا جوش پیدا کرتا ہے۔ ایسا صاحبِ اعجاز اگر اپنی ذات کو اس دنیا سے بالاتر خیال کرتا ہے تو کیا عجب ہے۔ خواجہ حافظ خود کیوں نہ کہتے کہ۔

دریں زماں نشد کس حریفِ فریادم　　بہ ملبلانِ چمن ہم گلے فرستادم

غزل

(حضرت ارشاد فاطمی، بی۔اے)

آہ اے ضعف! عجب زمزمہ پرداز ہوں میں　　سازِ بسمل کے جو رہ جائے وہ آواز ہوں میں
نالۂ دل تجھے اللہ سلامت رکھے　　نَے سے نکلے ہوئے نغمے کا ہم آواز ہوں میں
کیوں نہ گونج اُٹھے تری محفلِ عشرت اے دوست!　　اِک شکستِ طربِ ساز کی آواز ہوں میں
نالۂ دل پہ فدا جس کے فغانِ بلبل　　ہم صفیرو چمنِ سوز کا وہ ساز ہوں میں

دلِ پُر غم ہے کہ ہے مرکزِ اسرارِ وجود
ہستیٔ کون و مکاں جس سے ہے وہ راز ہوں میں

منجھلی دیدی

(از مسٹر جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی، بی۔اے۔ ایل ایل۔بی)

(۱)

کِشنا کی ماں بھاڑ جھونک کر گذر بسر کرتی تھی۔ اس مصیبت سے وہ کِشنا کو کسی طرح چودہ برس کا کر کے ایک دن دنیا سے کوچ کر گئی۔ اب کِشنا کے لئے گاؤں میں ٹکڑے ہونے کو بھی جگہ نہ رہی۔ اُس کی سوتیلی بڑی بہن کادمبنی کے گھر کھانے پینے کی کمی نہ تھی۔ جس کسی نے بھی کہا "جا کِشنا اپنی بہن کے گھر جا کر رہ، وہ بڑے آدمی کے گھر بیاہی ہے، اُس کے یہاں تو آرام سے رہ سکے گا۔"

ماں کے غم میں رو دھو کر کِشنا نے بخار بُلا لیا اور اس سے نجات پا کر لگاتار کئی دن تک دربدر کی خاک چھان کر کسی طرح بھیک کے ٹکڑوں سے ماں کی تیرھویں کی۔ اس کے بعد منڈے ہوئے سر پر گودڑ، بچھونا، ٹولیا کا ایک چھوٹا سا پلندہ رکھ کر وہ اپنی بہن کے گھر۔۔ راج گھاٹ گاؤں میں آیا۔ بہن اُسے پہچانتی نہ تھی، سارا حال پوچھ گچھ کر وہ ایک دم آگ ہو گئی۔ اُس نے اپنے اُصول کے مطابق لڑکے بچوں کو سمیٹ بٹور کر سب سے الگ تھلگ ایک چھوٹی سی دنیا بسائی تھی، جس میں کسی چیز کی بھی کمی نہ تھی۔ اب یکایک یہ بلا کہاں سے ٹوٹ پڑی؟ بیٹھے بٹھائے کس بکھیڑے میں پڑ گئی۔

محلے کا جو بڈھا کِشنا کو راہ دکھا کر اپنے ساتھ وہاں تک لے آیا تھا اُسے کادمبنی نے دو چار اینڈی بینڈی سُنا کر کہا "بڑی کرپا کر کے میرے سگے کو لوا لائے ہیں۔ میرے بچوں کا پیٹ کاٹ کر مٹھی بھر دانوں میں ساجھا لگانے کے لئے۔۔۔۔۔ تم سے یہ بھی نہ دیکھا گیا، کچھ تمہارا دیا تو نہیں کھاتی۔" اس کے بعد اپنی سوتیلی ماں کو کوس کوس کر بولی "بد ذات عورت نے جیتے جی تو کسی دن بات بھی نہ پوچھی خیر خبر لینے تک نہ بھیجا۔ اب مر کر کرنی کرتوت کے نام پر اس دیو کو میرے گلے باندھ گئی ہے۔۔۔۔۔ جاؤ بھیّا! تم اس پرائے لڑکے کو لوٹائے جاؤ۔ یہ بوجھ میں نہ اُٹھا سکوں گی۔ میں کیوں اس جھنجھٹ میں پڑوں؟"

بوڑھا ذات کا نائی تھا۔ وہ کِشنا کی ماں کو اپنی ماں سمجھتا تھا۔ اسی سے اتنی تلخ باتیں سُن کر بھی اُس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ خوشامد کر کے بولا "بہن! تمہارا لکشمی کا بھنڈار ہے، کتنے ہی نوکر چاکر دین اناتھ، چلتے پھرتے، آتے جاتے، اپنے پرائے اور کتے بلی تک اس گھر میں کھا پی کر پل رہے ہیں۔ یہ بھی پڑا مُٹھی بھر بھات کھا کر

باہر پڑا رہیگا۔ تمھیں معلوم بھی نہ ہوگا۔ بیچارہ بہت ہی سیدھا اور بھولا بھالا لڑکا ہے۔ بھائی۔۔ برادر سمجھکر نہ سہی، بپتا کا مارا ناتہ، برہمن کا لڑکا سمجھکر ہی اپنے گھر کے ایک کونے میں اسے جگہ دیدو۔"

اتنی تعریف سُن کر پولیس کے دار وغہ کا بھی دل پسیج اُٹھتا ہے، کادمبنی تو ایک معمولی عورت تھی قصہ کوتاہ اس وقت وہ بھی خاموش ہوگئی۔

بوڑھے نے کِشتا کو الگ آڑ میں لیجاکر دو چار مناسب ہدایتیں کیں اور پھر آنسو پونچھتا ہوا گھر لوٹ گیا۔

کِشتا کو پناہ مل گئی۔

کادمبنی کے شوہر نوین مکرجی دھان چاول کی آڑت کا کاروبار کرتے تھے، اُنھوں نے دوپہر کو گھر آکر ترچھی نظر سے کِشتا کو گھورتے ہوئے پوچھا "یہ کون ہے جی؟" کادمبنی نے منہ بچکا کر جواب دیا "تمھارا سالا ہے، بڑا سگا ہے، نہلاؤ دھلاؤ کھلاؤ پلاؤ! پہناؤ اوڑھاؤ آدمی بناؤ! پر دیکھ لو!"

نوین اپنی سوتیلی ساس کے مرنے کی خبر سُن چکے تھے، سارا معاملہ خود بخود سمجھ گئے، بولے "ہوں! لڑکے کا بدن تو خوب گول مٹول چوڑا چکلا ہے"

بیوی نے کہا "کیوں نہ ہو! میرے باپ جو کچھ روپیہ پیسہ اور زمین جائداد چھوڑ گئے تھے وہ سب اس عورت نے اسی کے پیٹ میں تو ٹھونسا ہے، مجھے تو اس میں سے کانی کوڑی تک نہیں ملی"

اس کا ذکر فضول ہے کہ روپئے پیسے اور زمین جائداد کے نام سے صرف ایک کچی جھونپڑی اور اسی سے ملا ہوا ایک لیموں کا پیڑ ہی اُس کے باپ کا متروکہ تھا۔ جھونپڑی میں بیچاری بیوہ پڑی رہتی تھی اور فصل کے لیموں بیچ کھوچ کر لڑکے کے مدرسے کی فیس دیتی تھی۔ نوین نے اپنے غصے کو دبا کر کہا "اچھا ہے!"

کادمبنی نے کہا "اچھا نہ ہوگا، سالا ہی تو ہے، اُسے اتنے ہی رکھ رکھاؤ سے رکھنا ہوگا، اس کے سبب سے میرے بچوں کو ایک وقت شام کو کھانا نصیب ہو تو وہی بہت ہے۔ ایسا نہ کروگے تو دیس بھر میں بدنام نہ ہو جاؤگے:"

اب کادمبنی پاس والے دو منزلہ مکان کی ایک مخصوص کھلی ہوئی کھڑکی پر لال لال آنکھوں سے آگ برسانے لگی۔ اس مکان میں کادمبنی کی منجھلی دیورانی ہیما نگنی رہتی تھی۔ کِشتا برآمدے میں ایک کنارے سر جھکائے بیٹھا شرم کے مارے مرا جا رہا تھا۔ کادمبنی نے جنس کی کوٹھری میں جاکر وہاں سے ناریل کے خول میں ذرا سا تیل لاکر کِشتا کے آگے رکھ دیا اور کہا "یہ جھوٹ موٹ کا رونا بند کرو، جاؤ تالاب میں غوطہ لگا آؤ، ہاں خوشبودار تیل پھلیل لگانے کی عادت تو نہیں ہے؟ بابو صاحب!" پھر شوہر کو سُنا کر بلند آواز سے کہا "تم نہانے

جاناتو بابو صاحب کو بھی ساتھ لے لینا نہیں تو اکیلے جاکر کہیں ڈوب ڈاب کر مر جائیں گے تو گھر بھر کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔"

کشنا کھانا کھانے بیٹھا تھا، اُس کی خوراک یونہی عمر کے تناسب سے زیادہ تھی، اس پر کل تیسرے پہر سے آج تک اُس نے کچھ کھایا پیا نہ تھا، آج اتنی دور پیدل چل کر آیا تھا، دیر بھی بہت ہو گئی تھی، انھیں وجہ سے اُس نے بڑی پھرتی سے تھالی صاف کر کے رکھدی اور پھر بھی بھوکا ہی رہ گیا، اچھی طرح اُس کا پیٹ نہ بھرا، نوین بابو بھی تھوڑی ہی دور پر بیٹھے کھا رہے تھے، اُس طرف صفائی دیکھکر بیوی سے بولے "کشنا کو تھوڑا سا بھات اور دیکاؤ جی!"

"دیتی ہوں!" کہہ کر کادمبنی اُٹھی اور بہت سا بھات لیکر کشنا کی تھالی میں ڈال دیا، پھر زور سے ہنستی ہوئی بولی "اب تو ٹھیک ہو گیا نا! یہ ہاتھی کی خوراک روز دیتے دیتے تمہاری آڑت خالی ہو جائیگی۔ دیکھو اس وقت دوکان سے موٹے چاولوں کے دو تین ڈھائی من کے بورے بھیج دینا، نہیں تو کہے دیتی ہوں بابو جی۔ چاول کھلاتے رہنے سے جلدی ہی دیوالہ نکالنا پڑ جائے گا۔"

دل کی گہرائیوں کو انتہا تک چیر کر رکھ دینے والی شرم کے بوجھ سے کشنا کا سر تھالی میں گڑ سا گیا، وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دکھیا غریب ماں نے محنت مزدوری کر کے اُسے مہین چاول کھلائے تھے، اور گلے پھاڑے گیہوں کی روٹیاں بھی۔ یہ تو ہم نہیں جانتے۔ لیکن یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اُسے پیٹ بھر کھانے کے جرم میں کسی دن ندامت سے اس طرح سر نیچا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اُسے یاد آیا، اُس کے ہزار بھوک سے زیادہ کھا لینے پر بھی کبھی اُس کی ماں کی تسلی نہ ہوتی تھی وہ ہمیشہ کم کھانے ہی کی شکایت کرتی رہتی تھی۔ کشن کو اُس دن کی یاد آگئی جب اُس نے دو لقمے زیادہ کھا کر پتنگ ڈور خریدنے کے لئے ماں سے پیسے وصول کئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بڑی بڑی بوندیں بہہ چلیں، اور تھالی کے اوپر ٹپ ٹپ گرنے لگیں۔ بیچارا دہی بھات سر جھکائے چپ چاپ کسی طرح حلق سے نیچے اُتارنے لگا، اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ بایاں ہاتھ اُٹھا کر آنسو تو پونچھ ڈالتا۔ ڈرتا تھا کہیں بہن کی نظر نہ پڑ جائے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے جھوٹ موٹ رونے کے الزام میں وہ بہن کی کافی بک جھک سن چکا تھا اس لعنت نے ماں کی وفات کے اتنے بڑے رنج والم کا بھی گلا گھونٹ دیا۔

(۲)

باپ دادا کا گھر دونوں بھائیوں نے دو حصے کر کے آپس میں بانٹ لیا تھا۔ قریب کا دو منزلہ مکان منجھلے بھائی نوین کے حصے میں آیا چھوٹے بھائی کو مرے بہت دن ہو چکے تھے۔ نوین بھی دھان چاول کی دکان کرتا ہے۔ اس کی بھی مالی حالت اچھی ہے مگر بڑے بھیا نوین کے برابر روپیہ پیسہ اس کے پاس نہیں ہے۔ پھر بھی اس کا مکان دو منزلہ بن گیا

منجھلی بہو، تو پن کی بیوی بھاگنی شہر کی لڑکی ہے۔ اُس نے اچھے دن دیکھے ہیں۔ نوکر چاکر رکھنا، دعوتیں دینا کھلانا پلانا اور شان شوکت کے ساتھ رہنا اُسے بہت پسند ہے۔ پیسہ بچا کر غریبوں کی طرح گذر بسر کرنے کی عادت نہ ہونے کے باعث ہی چار سال پہلے دونوں دیورانی جیٹھانی لڑجھگڑ کر الگ ہو گئی تھیں۔

اُس دن سے آج تک کھلی لڑائی، اور نوک جھونک برابر ہوتی چلی آتی تھی۔ اب پھر دونوں میں میل جول ہو گیا سہی مگر دل کا داغ اوپر سے میل دھو ڈالنے سے بھی نہ جا سکا تھا۔ اس کا علاج صرف کادمبنی کے پاس تھا، مگر وہی کھینچ تان کر کے برادرانہ خلوص و محبت کے ٹوٹے ہوئے تار کو پھر سے جڑنے دینا نہیں چاہتی تھی، وہ بڑی چالاک عورت تھی، اُسے معلوم تھا کہ بٹوارہ کر کے علیحدہ ہونے والا بھائی چاہے جان سے بھی زیادہ عزیز کیوں نہ ہو اس کے ساتھ پھر وہی پہلے کی طرح نباہ نہیں ہو سکتا۔ ٹوٹا ہوا چولھا پھر ایک نہیں ہوتا۔ لیکن ادھر منجھلی بہو کچھ کچی تھی، جیٹھانی کی طرح مطلب کے ہی سب ڈھب اُسے نہ سوجھتے تھے، وہ دل کی صاف تھی، پیٹ میں کو رنہ رکھ رہی تھی، جھگڑے میں پہلی منجھلی بہو ہی کی طرف سے ہوتی تھی مگر اُسے مٹانے کے لئے، بولنے کے لئے، اور مل بیٹھ کر کھلانے پلانے کے لئے وہ اندر ہی اندر چھٹپٹایا بھی کرتی تھی۔ اور کسی دن دبے پاؤں جا کر بھیگی بلی کی طرح جیٹھانی کے پاس جا بیٹھتی تھی اور ہاتھ جوڑ کر پاؤں پکڑ کر، رو دھو کر اپنی غلطی کا اعتراف کر کے جیٹھانی کو زبردستی اپنے گھر کھینچ لے جاتی تھی۔ اور اس طرح گلے پڑ کر میل کر لیتی تھی۔ اسی جوڑ توڑ میں دونوں بہوؤں کا آنا وقت گذر گیا تھا۔

آج کوئی ساڑھے تین بجے کے قریب بھاگنی جیٹھانی کے گھر آئی، کنوئیں کے پاس سیمنٹ کے پکے چبوترے پر دھوپ میں بیٹھا ہوا کشتنا صابن سے مل مل کر کپڑے دھو رہا تھا، اس کے پاس میلے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا کادمبنی دور کھڑی کھڑی اُسے بہت تھوڑا صابن گھسنے اور زیادہ سے زیادہ زور لگا کر کپڑے صاف کرنے کا سبق پڑھا رہی تھی۔ دیورانی کو دیکھتے ہی وہ فوراً بول اُٹھی "باپ رے باپ! چھوکرا کیسے میلے چکٹے چیتھڑے لیکر آیا تھا"

بات سچ تھی، کشتنا کی سی چوڑی لال کنی کی زنانی دھوتی پہنکر اور پھٹی چادر اوڑھکر کوئی کسی بھلے رشتہ دار کے گھر نہیں جاتا۔ ان دونوں کپڑوں کو صاف کر ڈالنے کی ضرورت تو تھی ہی۔ لیکن دھوبی کے عرصہ سے غائب ہو جانے کی وجہ سے بٹیا بنچو، گوپال اور اس کے باپ کی دھوتیوں اور کرتوں کی صفائی کشتنا کے کپڑوں سے بھی زیادہ ضروری ہو رہی تھی۔ اس وقت کشتنا انھیں کو لئے بیٹھا تھا۔ بھاگنی نے دیکھتے ہی تاڑ لیا کہ یہ کپڑے کس کے ہیں، لیکن اس بارے میں کچھ نہ کہا اور پوچھا "یہ لڑکا کون ہے دیدی!"

اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے کان لگائے سنتے رہنے سے بھاگنی پہلے ہی سب جانتی تھی۔ جیٹھانی کو ٹال مٹول کرتے دیکھکر پھر بولی۔ "لڑکا تو بُرا نہیں ہے، چہرا تمھارے چہرے سے بہت کچھ ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے دیدی!"

تو کیا تمھارے میکے کا کوئی ہے؟

کادمبنی نے چڑھکر منہ بگاڑتے ہوئے جواب دیا "ہوں! میرا سوتیلا بھائی ہوتا ہے۔ ارے او کشنا! اپنی منجھلی دیدی کے پاؤں تو چھو جا، نجانے کیسا گنوار لونڈا ہے، ارے تیری ماں کو کیا اتنا بھی شعور نہ تھا کہ مرنے سے پہلے بڑے بوڑھوں کے پاؤں چھونا ہی سکھا جاتی؟"

کشنا حواس باختہ سا اٹھ کھڑا ہوا اور جیسے ہی کادمبنی کے پاؤں کے پاس سر رکھکر ہاتھ جوڑنے لگا ویسے ہی وہ دھمکاتی ہوئی کہہ اٹھی "مرا احمق کہیں کے، تو کیا اندھا بہرا ہے؟ میں نے کیس کے پاؤں چھونے کو کہا تھا، اور تو یہاں آ کر یہ سب کیا کرنے لگا؟ نرا گدھا ہے، بالکل بے سینگ کا!

بات یہ تھی کہ جس گھڑی سے اس نے اس گھر میں پاؤں رکھا تھا، تب سے برابر ٹھوکر پر ٹھوکر کھا کر اس کا دماغ ٹھکانے نہ رہا تھا۔ بہن کی جھڑکیاں کھا کر گھبرائے ہوئے کشنا کی عقل ہی جواب دے گئی۔ بچارے نے ہیما نگنی کے پاؤں کے پاس کھسک کر سر جھکایا ہی تھا کہ اس نے درمیان ہی میں ہاتھ سے پکڑ کر روک لیا۔ اور ٹھوڑی اٹھا کر دعائیں دیتی ہوئی کہنے لگی "بس بس رہنے دو! ہو تو گیا..... بھائی! تمھاری لمبی عمر ہو!"

کشنا پاگل سا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا، اس بستی بھر میں اس طرح سے ایسی میٹھی باتیں بھی کسی کے منہ سے نکل سکتی ہیں؟ یہ بات جیسے اس کے ذہن میں سماتی ہی نہ تھی۔

اس کی ڈری سہمی مایوس اور مغموم بیچارگی کی حالت کے مظہر چہرے کی طرف دیکھتے ہی ہیما نگنی کے دل کو جیسے کسی نے اندر سے مسوس دیا، اور وہ ایک طرح سے رو اٹھا، اپنے کو اب اور زیادہ سنبھال نہ سکنے کے باعث یکایک اس بدنصیب لڑکے کو چھاتی کے قریب کھینچ کر اس کے تھکے ہوئے پسینہ سے تر منہ کو اپنے آنچل سے پونچھتے ہوئے ہیما نگنی نے جٹھانی سے کہا "اس بچے سے تو کپڑے دھلوانا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا دیدی! اس کام کے لئے کسی نوکر کو کیوں نہ بلوا لیا؟"

کادمبنی کو اتنا تعجب ہوا کہ وہ سناٹے میں آ کر یکایک کچھ جواب نہ دے سکی۔ مگر ایک ہی لمحہ میں سنبھل کر جھلا کر بولی "میرے ہاں تو تمھاری طرح دھن برستا نہیں، منجھلی بہو! جو میرے گھر میں دس بیس فالتو نوکر چاکر لگے ہوں..... میرے گرہستی کے گھر میں تو......"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی ہیما نگنی نے اپنے گھر کی طرف منہ کر کے لڑکی کو پکارتے ہوئے کہا "اوما! تُوا کو اس گھر میں بھیج تو دے، بیٹی! جیٹھ جی اور پانچو کے میلے کپڑے تالاب سے دھلوا لائے، اور سوکھنے کو ڈال دے۔ پھر جٹھانی کی طرف مڑ کر بولی۔ کشن اور پانچو دونوں شام کو میرے یہاں کھائیں گے، پانچو جیسے اسکول

سے رَٹے ویسے ہی بھیج دینا، تب تک میں اس کو لئے جاتی ہوں .... جیسے یہ تمھاری دیدی ہیں، ویسے ہی میں بھی ہوں کشن ..... آؤ میرے ساتھ چلو" کشنا کا ہاتھ پکڑ کر ہیمانگنی اپنے گھر کو چلدی۔

کادمبنی نے رو کا تک نہیں۔ یہی نہیں ہیمانگنی کی ایسی سخت چوٹ بھی وہ چپ چاپ سہہ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس نے طعنہ مارا تھا اُس نے ایک وقت کا خرچ بھی تو بچا دیا۔ کادمبنی کے لئے دنیا میں پیسے سے بڑھکر اور کوئی چیز نہ تھی، اسی سے دودھیل گائے کی دو لاتیں سہہ لینا اُس کی نظرت میں داخل ہو گیا تھا۔

(۳)

شام کے وقت کادمبنی نے پوچھا "کیا کھا آیا؟ رے کشن!"

کشنا نے نرم سے سر جھکائے ہوئے کہا "پوری!"

"اور کیا کھایا تھا؟" کشنا نے اسی طرح جواب دیا "روہو مچھلی کا سر، سندیش اور رس گلّے!"

کادمبنی بیچ ہی میں بول اُٹھی "واہ وا! اچھا مجھلی بہو نے سر کسے دیا تھا؟"

یکایک اس سوال کے اُٹھ کھڑے ہونے سے کشنا کا منھ پیلا پڑ گیا۔ کھینچی ہوئی تلوار کے آگے رسّی میں بندھے ہوئے جانور کے دل میں جیسی ہلچل ہوتی ہے، اُسی طرح کشنا کا کلیجہ کانپنے لگا۔ جواب ملنے میں دیر ہوتے دیکھکر کادمبنی خود بول اُٹھی "معلوم ہوتا ہے سر تجھے ہی دیا گیا ہے؟ کیوں!"

بہت بڑے ملزم کی طرح کشنا نے سر جھکا لیا۔

کچھ فاصلے پر بیٹھے نوین بابو حقّہ پی رہے تھے، کادمبنی نے انھیں سے کہا "سن لیا نا؟" ایک مختصر سی "ہوں" کرکے نوین بابو حقّہ گڑگڑانے لگے۔

کادمبنی گرم ہو کر کہنے لگی "سگی چاچی کا برتاؤ تو دیکھو! میرے پنچو کو روہو کا سر کتنا اچھا لگتا ہے یہ کیا مجھلی بہو نہیں جانتی؟ پھر کیا سمجھکر اُس نے پنچو کو تو نہ دیا اور گھوڑے پر موتی بکھیرے؟ کیوں رے کشنا! سندیش اور رس گلّے خوب پیٹ بھر کر کھائے تھے نا؟ تونے تو سات جنم میں یہ چیزیں آنکھ سے دیکھی بھی نہ ہونگی (شوہر کی طرف دیکھکر) جو دُوسمٹی بھات پاکر ہی جاتے ہیں اُن کے پیٹ میں پوری اور سندیش ٹھونسنے سے کیا ہوگا؟ مگر دیکھو میں تم سے کہے دیتی ہوں کشنا کو مجھلی بہو بگاڑ نہ دے تو مجھے کُتیا کہنا۔"

نوین پھر بھی خاموش ہی رہے، کیونکہ اپنی بیوی کے موجود رہتے مجھلی بہو اُسے بگاڑ سکے گی، ایسے کسی حادثہ کا امکان اُنھوں نے یقین کی حدود سے باہر کی بات سمجھی۔ لیکن اُن کی بیوی کو اپنے ادپر اعتماد نہ تھا اُسے سوطرح آنے یہی کھٹکا لگا رہتا تھا کہ بھولی بھالی نیک اور بھلی ہونے کے باعث چاہے جو کوئی ... ... بڑے بھائی کشن کے روحانی ارتقاء ... کی جانب اُسی دن سے وہ کڑی نگاہ

رکھنے لگی۔

دوسرے ہی روز سے ڈو میں سے ایک نوکر برخاست کر دیا گیا، کشنا اُس کی جگہ نوین کی دھان چاول کی آڑت میں کام کرنے لگا۔ وہاں وہ تُلائی کرتا ہے۔ چار پانچ کوس کی منزل کر کے نمونے لاتا ہے اور دوپہر کے وقت نوین جب کھانا کھانے کے لئے گھر آتا ہے تو دوکان کی رکھوالی کرتا ہے۔

دو دن کی بات ہے۔ نوین بابو کھا پی کر آرام کر کے دوکان پر واپس آئے تب وہ روٹی کھانے گیا۔ اُس وقت تین بج چکے تھے۔ کشنا تالاب سے نہا کر آیا تو دیکھا بہن پڑی سو رہی ہے، اُس وقت اسے ایسی شدت کی بھوک لگی تھی کہ شاید وہ شیر کے منہ سے بھی ہاتھ ڈال کر کھانا نکال لیتا۔ لیکن بہن کو جگانے کی ہمت نہ کر سکا۔

بیچارا رسوئی کے باہر چبوترے پر چپ چاپ ایک کنارے بہن کی آنکھ کھلنے کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ یکایک، کشن کہکر پکارنے کی آواز اُس کے کانوں میں پہونچی، یہ آواز اُس کے کانوں کو بڑی سُریلی اور محبت میں ڈوبی معلوم ہوئی۔ سر اُٹھا کر دیکھا، منجھلی دیدی اپنے گھر کے دو منزلہ پر کھڑکی کی کواڑ پکڑے کھڑی ہیں۔ کشن نے ایک بار اُدھر دیکھکر فوراً سر جھکا لیا۔ دم بھر میں ہیما نگنی نیچے اُتر آئی اور کشن کے سامنے کھڑی ہو کر پوچھنے لگی "آج کئی دن سے تم دکھائی نہیں دیئے؟ یہاں اس طرح چپ کیوں بیٹھے ہو۔؟"

ایک تو بھوک لگنے پر ذرا سی بات میں ہی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں، اُس پر یہ درد مندانہ لب و لہجہ! اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اُس نے گردن نیچی کر لی، کچھ جواب نہ دے سکا۔

حقیقت میں منجھلی چاچی کو سبھی لڑکے بچے بہت چاہتے تھے۔ اُن کی آواز سُن کر کادمبنی کی چھوٹی لڑکی باہر نکل آئی، اور وہیں سے چلّا کر بولی "کشنو ماما! چوکے میں تمھارا کھانا ڈھکا رکھا ہے، جا کر کھاؤ۔ ماں کھا پی کر سو رہی ہے۔"

ہیما نگنی مبہوت سی دیکھتی رہ گئی۔ پھر بولی "کشن نے ابھی تک کھایا بھی نہیں؟ اور تیری ماں پڑی سو رہی ہے۔ ہاں رے کشن! آج تیرے کھانے میں اتنی دیر کیوں ہوئی؟"

کشن اسی طرح گردن جھکائے کھڑا رہا۔ ٹونی نے اس کی جانب سے جواب دیا "کشنو ماما کو تو روز اتنی دیر ہو جاتی ہے، پتا نہا دھو کر کھا پی کر جب دوکان لوٹ جاتے ہیں تب ماما آتے ہیں۔"

ہیما نگنی پر تمام راز خود بخود منکشف ہو گیا، کشن کو دوکان کے کام میں لگا دیا گیا ہے ہیما نگنی کو ہرگز یہ امید نہ تھی کہ اس نوعمر لڑکے کو یونہی خالی بٹھا کر کوئی کھلائے پلائیگا۔ لیکن اتنی بیدردی کا سلوک کوئی بہن کر سکتی ہے، یہ تمام [illegible] ناممکن تھا [illegible] منکشف ہوئی [illegible] کی طرح [illegible] بار اس بیوگ

پیاس کے ستائے ہوئے بچے کی طرف دیکھکر اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی وہ گھر چلی گئی، اور دو ہی منٹ بعد دودھ کا بھرا کٹورا ہاتھ میں لئے لوٹ آئی۔ رسوئی میں پاؤں رکھتے ہی وہ اندر کی طرف دیکھکر لرزتی کانپتی منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

کشن کھا رہا تھا، پیتل کی ٹوٹی ہوئی تھالی میں لال موٹے چاولوں کا ٹھنڈا بھات ڈھیلا بندھا ہوا پڑا تھا ذرا سی جیل خانے کی سی دال اور ترکاری کے نام سے مولی کے اُبلے ہوئے پتے ایک کونے میں رکھے تھے۔ ہیامگنی کا دیا ہوا دودھ دیکھتے ہی کشن کا اداس غمگین چہرہ پھول کی مانند کھل اُٹھا۔

ہیامگنی دروازہ سے نکل کر باہر کھڑی ہو گئی۔ کشن کھا پی کر جب ہاتھ منہ دھونے کے لئے تالاب کی طرف گیا تب اُس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ تھالی میں بھات کا ایک دانہ بھی نہ تھا، اتنی زور کی بھوک لگی تھی کہ وہ یہ سڑا ہوا کھانا بھی امرت کی طرح چاٹ گیا۔

ہیامگنی کا لڑکا للت قریب قریب کشن ہی کا ہم عمر تھا، وہ دل میں سوچنے لگی "میں نہوں تو للت کی بھی ایسی ہی درگت بن سکتی ہے۔" اس خیال کے ساتھ ہی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی جھلکنے لگے گلے میں پھانسیں پڑنے لگیں اور وہ کسی طرح اس لہراتے ہوئے سمندر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں پی کر اپنے گھر کو چل پڑی۔

(۴)

سردی لگ جانے سے کبھی کبھی ہیامگنی کو حرارت ہو جایا کرتی تھی۔ اور دو ایک دن بعد لوٹ پوٹ کر وہ آپ ہی اُٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ اس واقعہ کے کئی دن بعد ایک روز اسی طرح کی ہلکی سی حرارت آ جانے سے ہیامگنی شام کو چراغ جلا کر بستر پر پڑ رہی تھی، پاس کوئی نہ تھا۔ یکایک اُسے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی بڑی احتیاط سے کواڑ کی آڑ میں چھپا کھڑا اندر جھانک رہا ہے۔ ہیما نے پکارا "وہاں کون ہے رے؟ للت! تو آیا ہے کیا؟" کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے پھر پوچھا "بولتا کیوں نہیں؟" کواڑ کے پیچھے سے کسی نے کہا "میں ہوں ما"

"میں؟ میں کون؟ سمجھی نہیں۔" "تو ہے تو اندر آ کر بیٹھ نا......"

کشن ڈرا سہما اندر آیا اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ہیامگنی اُٹھ بیٹھی، بڑے پیار سے پاس بلا کر بولی "کیا ہے کشن؟" کشن اور نزدیک آ گیا۔ میلی دھوتی کا پلا کھول کر گدرائے ہوئے دو امرود نکالتے ہوئے کہنے لگا، "بخار میں کھائیں، تو بڑے اچھے لگتے ہیں۔"

ہیما بڑے شوق سے ہاتھ بڑھا کر بولی "کہاں سے لے آیا؟ میں تو ان کے لئے کل سے لوگوں کی خوشامد کر کر کے ہری بگڑ کو بُلا نہ پایا کسی کو کہیں ملے ہی نہیں۔" اور کہتے کہتے مع امرود کشن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے

پاس ہی بٹھالیا۔ فطری حیا کی نرم نرم رو میں اُچھلتی ڈوبتی بےپایاں مسرتوں میں کھوئے ہوئے کشن نے اپنا سُرخ مُنہ نیچے جھکا لیا۔ حالانکہ یہ امرودوں کی فصل نہ تھی، اور ہیمانگنی کو بھی کھانے کی کچھ ایسی زبردست خواہش نہ تھی، پھر بھی کشن نے اِن حقیر پھلوں کے حاصل کرنے میں جس قدر کوشش کی تھی اور جس اُنس سے وہ یہ ناچیز تحفہ لیکر آیا تھا، وہ کتنی بیش قیمت اور احترام کی چیز تھی۔ دو کچے امرود توڑ لانے کے لئے آج وہ تمام دن دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔

ہیما نے پوچھا "کشن! اچھا یہ تجھ سے کس نے کہا کہ مجھے بخار چڑھا ہے؟"

کشن کچھ نہ بولا۔

"بولتا کیوں نہیں! کون تجھ سے کہنے گیا تھا کہ میں امرودوں کے لئے مری جارہی ہوں؟"

کشن نے اس کا بھی جواب نہ دیا، اُس نے جس وقت سے سر جھکایا تھا اُس کے بعد سے پھر اُٹھایا ہی نہیں اُٹھا ہی نہ سکا۔ ہیما پہلے ہی سے سمجھتی تھی کہ لڑکا بڑا شرمیلا اور ڈرپوک ہے۔ اس نے کشن کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر، چمکار کر، بھیا منو کہہ کر اور بھی ایسی ہی حکمتیں کر کے اس کا ڈر نکالا، جھجک دور کی! اور جب یہ تمام رکاوٹیں ایک ایک کر کے راستہ چھوڑ کر ہٹ گئیں تو اُس سے بات چیت کر کے اس نے آہستہ آہستہ بہت سی باتیں پوچھ لیں۔ بڑی تلاش بڑی دوڑ دھوپ کے بعد امرود لاسکنے کا حال، دوکان کے تمام کاموں کی تفصیل ماں باپ کی داستان، سب سُن کر آنکھیں پونچھتے ہوئے ہیما نے کہا "دیکھ کشن! میں تیری منجھلی دیدی ہوں اِس لئے مجھ سے کبھی کچھ چھپا کر نہ رکھنا۔ جب جو کچھ ضرورت ہو چپکے سے آکر مجھ سے مانگ لیجانا، لیجائیگا؟ بول؟"

کشن نے بڑی خوشی سے کہا "اچھی بات ہے"

بےلوث نسوانی محبت کا بولتا ہوا مجسمہ کشن نے پہلے کبھی اپنی بیکس و مجبور ماں کی شکل میں دیکھا تھا۔ دیکھا ہی نہیں پہچان بھی لیا تھا۔ آج منجھلی دیدی کے پیکر میں اسی حقیقی محبت کی حرارت پاکر اتنے دنوں کا ماں کے سوگ کا منجمد برفستان گل گل کر بہہ نکلا۔ اُٹھتے اُٹھتے منجھلی دیدی کے پاؤں کی دھول ہاتھ میں لیکر پیشانی پر چڑھانے کے بعد وہ جیسے ایک نئے جوش، نئی مسرت کے طوفانی جھونکوں کی پیہم تھپکیوں سے ہوا میں اُڑتا ہوا باہر نکلا۔

اُدھر اسکی اپنی بہن کا برتاؤ دن بدن بد سے بدتر ہوتا جاتا تھا۔ اس کی جلن، اس کا حسد حد سے بڑھتا جارہا تھا، اس کا سبب یہی تھا کہ کشن سوتیلی ماں کا لڑکا تھا، یتیم و لاوارث۔ ناخواندہ مہمان جو کبھی ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اتنا بےغیرت اور گستاخ! وہ اس کے لئے بلائے بےدرماں سے کم نہ تھا۔ خفت و رسوائی، سُبکی و تضحیک کے خوف سے اُسے نہ تو دھکے دیکر نکال ہی سکتے تھے اور نہ کسی کو دے ڈالنا ہی ممکن تھا جب مجبوراً اُسے رکھنا ہی پڑیگا تو پھر جب تک اُس کے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، چلتے ہیں، بدن میں گرمی

باقی ہے، تب تک اس سے کام لینا اور کھانے پینے کا خرچ کچھ فائدہ کے ساتھ نکالتے رہنا ہی دانشمندی ہے۔
کشن جیسے ہی لوٹ کر گھر آیا ویسے ہی بہن کا پہلا سوال یہ ہوا "آج دوکان سے بھاگ کر دن بھر کہاں غائب رہا؟ کیوں رے!" کشن کو سانپ سونگھ گیا۔ کادمبنی تنے آگ ہو کر بھرے ہوئے بادل کی طرح گرج کر کہا "بتا؟ ــــ جلدی ــــ!" پھر بھی کشن کا منہ نہ کھلا۔ کادمبنی ان لوگوں میں سے نہ تھی جن کے غصہ کی آندھی دوسرے کے چپ ہو جانے سے اتر جاتی ہے، وہ اس کے بالکل برعکس کشن کی مہر سکوت جبر سے زور سے توڑ ڈالنے کے لئے کمر کس کر کھڑی ہو گئی۔ کشنا سے اپنے سوال کا جواب نہ پا کر اس کا اشتعال حدود اعتدال سے تجاوز کر گیا اور یہاں تک نوبت جا پہونچی کہ بچو کو اپنے ماما کے کان پکڑ کر زور زور سے رگڑ کر اکھاڑ ڈالنے کی کوشش کرنا پڑی یہی نہیں اور بھی کچھ نہ کچھ ہونے کی گنجائش تھا بھی باقی ہی تھی۔ اگر بات یہیں ختم ہو جاتی تو کون کادمبنی کو سیانی تسلیم کر لینا پسند کرتا؟ کشن کے لئے رات کا کھانا بھی نہیں پکایا گیا۔ مٹھی بھر موٹے لال چاولوں کی بچت کی یہ کتنی اچھی اور آسان ترکیب تھی؟

دھکا چاہے جتنا مہلک اور زبردست ہو، رکاوٹ نہ ہو تو معلوم بھی نہیں ہوتا۔ پہاڑ کی چوٹی سے ڈھکیل دینے ہی سے ہاتھ پاؤں نہیں ٹوٹا کرتے، ٹوٹتے تب ہی ہیں جب پیروں کے نیچے سخت زمین حائل ہو کر اس کے زور کو روکنا چاہتی ہے کشن کا بھی یہی حال ہوا۔ ماں کی موت نے جب یکایک اس کے پاؤں تلے کی زمین نکال لی اور اس کے اس آخری سہارے کا نشان تک مٹا دیا تو اسی وقت سے وہ کچھ ایسا ہو گیا تھا کہ آنے والی بڑی سے بڑی مصیبت بھی دھکا دے کر اسے نیچے نہ گرا سکتی تھی۔

وہ فلک زدہ، مظلوم ماں کا بیٹا تھا، لیکن اس نے کڑیاں کبھی نہ جھیلی تھیں۔ گو مار کٹائی سے وہ پہلے سے آشنا نہ تھا تاہم اس گھر میں آنے کے بعد سے جو وہ کادمبنی کے مظالم چپ چاپ برداشت کر لیتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ درمیان میں حائل ہونے والی زمین پہلے ہی اس کے پاؤں تلے سے نکل چکی تھی۔ لیکن اب یہ بات نہ تھی، اسی لئے آج وہ یہ چوٹ برداشت نہ کر سکا۔

کشن بھیا گنی کی ماں کی سی ممتا کے مضبوط اونچے ٹیلے پر کھڑا تھا، اسی لئے اس بے غرتی و بے حرمتی کی ٹھوکروں نے اسے اوندھے منھ زمین پر پٹک دیا۔

ماں بیٹے دونوں اس بے قصور و بے خانماں کمسن لڑکے کو تحقیر و تحکم، لعنت و ملامت، تذلیل و تادیب کے ناقابل برداشت حملوں اور ٹھوکروں سے نیم جان کر کے، سزا دے کر چلے گئے۔ اور وہ اندھیرے میں زمین پر پچھاڑ کھا کر... لوٹ لوٹ کر آج بہت دنوں بعد پھر ماں کو یاد کر کر کے منجھلی دیدی کا نام لے لے کر........ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

(۵)

دوسرے دن علی الصباح کوئی آدمی یکایک آہستہ آہستہ دبے پاؤں ہیماگنی کے گھر میں گھس آیا۔ اور ہیماگنی کے بچھونے پر ایک کنارے قدموں سے لگ کر بیٹھ گیا۔ ہیماگنی نے پاؤں سمیٹ لئے، اور بے انتہا پیار میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہا "آج دوکان نہیں گئے کشن؟"

"اب جاؤں گا"

"دیر نہ کرو بھائی، چلے جاؤ ورنہ ابھی پھر گالیوں کی بوچھار ہونے لگے گی۔"

کشن کا منہ پہلے سرخ اور پھر بالکل زرد ہو گیا "جاتا ہوں!" کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا، ایک بار منہ اِدھر اُدھر پھیر کر کوئی بات کہتے کہتے رُک گیا۔ ہیماگنی نے شاید اُس کے دل کی بات تاڑ لی، پوچھا "کیا مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

کشن نیچی نگاہ کئے بہت آہستہ سے بولا "کل کچھ کھانے کو نہیں ملا، منجھلی دیدی"

"کیا؟ کل سے کچھ نہیں کھایا ......" "کچھ بھی تو نہیں!" جیسے کسی نے چپکے سے اُس کے کان میں گرم گرم نشتر چبھو دیا۔ کچھ دیر تک تو وہ بالکل بے حس و حرکت ..... مری سی پڑی رہی ... اس کے بعد آنکھیں ڈبڈبا آئیں پھر آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ ہاتھ تھام کر کشن کو اپنے بالکل نزدیک لاکر اور ایک ایک کرکے سب باتیں پوچھ اور سُن لینے کے بعد ہیما نے کہا "تو تُو کل ہی رات کو کیوں نہ آیا؟"

کشن خاموش رہا۔

ہیماگنی آنچل سے آنسو پونچھ کر بولی "تجھے میں اپنے سر کی قسم دیتی ہوں بھیا! آج سے تو مجھے وہی اپنی ماں سمجھا کر، یاد رکھ تیری ماں مری نہیں ..... میں تیری ماں ..... زندہ ..... اور یہیں موجود ہوں۔"

ٹھیک وقت سے یہ تمام باتیں کادمبنی کے کانوں تک پہونچ گئیں، اُس نے اپنے گھر ہی سے منجھلی بہو کو پکار کر کہا "کیا میں اپنے بھائی کو کھلا نہیں سکتی؟ جو تم نے خواہ مخواہ گلے پڑ کر اس سے اتنی باتیں لگائیں بجھائیں۔"

اس بے ڈھنگی بات سے ہیماگنی کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی، لیکن اُس نے بہت سنبھل کر نرمی سے کہا "اگر میں نے ایسا ہی کیا ہے تو کون سا گناہ کیا ہے؟"

"اچھا اگر تمہارے لڑکے کو بلا کر میں بھی اسی طرح طرح طرح کی باتیں بنا کر کہنے لگوں تو تمہاری کتنی سی آبرو رہ جائے؟ ذرا سنوں تو سہی۔ تم جو اس طرح شہ دیتی رہو گی تو تمھیں کہو میں کس طرح اسے اپنے قابو میں رکھ سکوں گی کیسے اُسے آدمی بناؤں گی؟"

ہیماگنی سے اب نہ رہا گیا، بولی "پندرہ سولہ سال سے تمہارے ساتھ رہتی اور نباہتی چلی آرہی ہوں

میں تمھیں خوب پہچانتی ہوں۔ پہلے پیٹ کی مار دیکر اپنے لڑکے کو آدمی بناؤ۔ اس کے بعد پرائے لڑکے کی خبر لینا اُس وقت میں گلے پڑ کر کوئی بات کہنے نہ آؤں گی۔"

کاویبنی حیرت و استعجاب کے بے پایاں سمندر میں ڈوب کر بولی "میرے پتّو کی اور اس کی برابری؟ دیوتا اور بندر برابر ہو گئے۔ میں یہی سوچتی ہوں کہ تم اس کے بعد ابھی اور بھی نہ جانے کیا کیا کہتی پھروگی۔"

"کون دیوتا ہے" منجھلی بہو نے جواب دیا "اور کون بندر؟ یہ جو جانتا ہے اُسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اب میں اور کچھ نہ کہوں گی۔ دیدی وہاں صرف ایک بات کہنا باقی ہے اور وہ تمھیں سُننا ہی پڑیگی۔"

"کیا! تمھارے منہ میں جو کچھ آیا ہو اُسے میں تمھارے کہنے سے پہلے نکال تو سکتی نہیں؟"

"اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ سُن لو میں یہی کہہ رہی تھی کہ تمھاری جیسی پتھر کے دل والی، تمھاری جیسی منھ پھٹ، بے شرم عورت دنیا میں اور کوئی نہیں ہے .... بس!" جواب کا انتظار کئے بغیر ہی ہیمانگنی نے زور سے کھڑکی بند کر لی۔

اُسی دن شام سے کچھ پہلے یعنی گھر کے مالکوں کے لوٹنے کے ٹھیک وقت یہ بڑی بہو نے اپنے گھر کے صحن میں کھڑے ہو کر داسی پر رکھکر اس طرح بآوازِ بلند سُنانا شروع کیا، "جو دن رات سب کرتے ہیں وہی اس کا بھی فیصلہ کریں گے، دیکھتی ہوں ماں سے بڑھکر موسی کو درد ہے، اپنے بھائی کی قدر نہیں جانتے جانتے ہیں پرائے۔ کبھی اس بیر کا پھل اچھا نہ ہوگا۔ بھائی بہن میں جھگڑا کرکے کھڑے کھڑے تماشا دیکھنا! یہ ظلم، یہ پاپ۔ دھرم سے دیکھا نہ جائیگا، یہ میں کہے دیتی ہوں۔" اسی طرح نہ جانے اور بھی کیا کیا کچھ کہتے کہتے وہ رسوئی میں غائب ہو گئی۔

آج تک دونوں گھروں کے مالکنوں میں اس طرح کے معرکے، ایسی لفاظی کئی بار کئی طرح سے ہو چکی تھی یہ کوئی نئی بات نہ تھی، ہاں یہ ضرور تھا کہ آج کی سخت کلامی میں جتنا زہر، جتنی تلخی بھری ہوئی تھی پہلے کی لڑائیوں میں اس کا شائبہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ یہ جنگ پچھلے معرکوں کی طرح لمبی تو نہ تھی، مگر اثرات کے لحاظ سے دیرپا ضرور معلوم ہوتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہیمانگنی کڑوی باتیں سُنکر سُنا اَن سُنا کر دیتی تھی، سمجھ کر بھی اَن جان بن جاتی تھی، یا بھول جاتی تھی مگر دل کو کبھی متاثر نہ ہونے دیتی تھی۔ لیکن آج اس کا مزاج ہی بگڑا ہوا تھا، اس لیے وہ اس جھٹکے کو نہ جھیل سکی، بپھر پڑی، جلدی سے کھڑکی کھول کر کھڑی ہو گئی۔ "اتنا ہی کہہ کر چپ کیوں ہو گئیں دیدی! اور تھوڑی دیر تک میری تباہی کے لئے گلا پھاڑ پھاڑ کر دُہائی دو، شاید بھگوان نے نہ سُن پایا ہو گا، جیٹھ جی گھر میں آجائیں وہ سُن لیں، میرے گھر کے لوگ بھی سُن سمجھ کر بغلیں بجالیں، اس سے پہلے ہی۔ ذرا سی دیر میں ہانپ اُٹھنے سے کیسے کام چلے گا۔"

اب کیا تھا مرچی میں چنگاری لگ گئی۔ کادمبنی جھپٹ کر دوڑی ہوئی باہر آکھڑی ہوئی، اور منہ اٹھا کر کے چلّا چلّا کر کہنے لگی "میں نے کیا کسی کلمنہی کتیا کا نام لیا تھا؟"

ہیما نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا "نام کیوں منہ سے نکالو گی دیدی! منہ سے نکالنے والی عورتوں میں تم نہیں ہو، مگر کیا تم یہی سمجھتی ہو کہ زمانہ بھر میں اکیلی تمھیں سیانی اور چتر ہو؟ باقی ساری دنیا احمق ہے! یہ کیا کوئی سمجھ نہیں سکتا کہ ٹھونک ٹھونک کر کس کا سر پھوڑ رہی ہو؟"

اب تو کادمبنی اپنے اصلی رنگ میں عریاں نظر آنے لگی، منہ بچکا کر، ہاتھ مٹکا کر، پیر پٹخ کا کر پھرکی سی ناچ ناچکر کہنے لگی: "سمجھ ہی لیا تو کیا، جہاں گڈھا ہو گا پانی وہیں تو مرے گا، چور کی داڑھی میں تنکا! جس کی کھونٹ ہو گی اسی کو تو برا لگے گا، اور کیا اکیلے تمھیں جان لیتی ہو؟ میں نہیں جان جاتی، کتنا جب آیا ہی آیا تھا تو اتنا سیدھا تھا کہ سات تھپڑ مارنے پر بھی چوں نہ کرتا تھا، میں جو کہتی تھی منہ بند کئے وہی کرتا تھا، تم اس کی ایسی کیا لگتی تھیں جو اس کے آنکھیں کان کر دئیے؟ تمھیں اس پرسنو کی ماں سے پوچھ دیکھو آج دو پہر کو وہ پھٹ سے کیا جواب دے گیا ہے؟ ... یہ سب کس کے بل پر ......؟" کہتے کہتے انگلی اٹھا کر پرسنو کی ماں کی طرف اشارہ کر دیا۔

پرسنو کی ماں نے کہا "یہ تو سچ کہتی ہیں منجھلی بہو۔ آج جب وہ سامنے کا دال بھات چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تو بہو رانی نے اتنا ہی کہا جب یہ اناج نگلے بغیر تم راج کے گھر سدھارنے کی نوبت آجائیگی تو پھر یہ غصہ کس لئے ہے؟ اس پر اس نے چھوٹتے ہی کہا 'اپنی منجھلی دیدی کے ہوتے میں کسی کی پروا نہیں کرتا'۔"

کادمبنی نے اینٹھ کے ساتھ کہا "کیوں اب تو سن لیا، میرا کہنا ٹھیک ہے کہ نہیں؟ آج میں صاف صاف کہے دیتی ہوں تم سے منجھلی بہو! اسے تم سیکڑوں دفعہ اپنے گھر نہ بلایا کرو۔ ہم دونوں بہن بھائی کے بیچ میں نہ پڑنا ہی اچھا ہے۔"

ہیما نگنی نے کچھ نہ کہا، سانپ کی طرح پھن اٹھا کر کینچوے کو کاٹ کھانے کی سی نامعقول، بحرادب جوڑ بات سنکر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کھڑکی سے ہٹ کر وہ یہی سوچتی رہی کہ نہ معلوم کتنی بڑی تذلیل کتنے بڑے صدمے کے زیر اثر کشن کے منھ سے ایسی بات نکلی۔

درد سر کے ساتھ بخار کی سی گرمی معلوم ہونے سے ہیما نگنی بے وقت ہی آکر پلنگ پر پڑ رہی جیسے اس میں جان ہی نہ رہ گئی تھی۔ اس کے شوہر کمرہ میں گھستے ہی اس کی حالت پر دھیان دئیے بغیر غصہ کے جوش میں کہہ اٹھے "بھابی کے بھائی کے بارے میں آج اور کیا جھگڑا کھڑا کر دیا؟ کیا کسی کا کہنا نہ مانوگی؟ کسی کی بات نہ سنوگی، دنیا بھر کے ابھاگے ابھاگوں کا پکش کرنے کھڑی ہو جاؤ گی، کہیں کا بھی کوئی ایسا غریب اناتھ

دکھائی دے جانا چاہیئے، پھر کیا ہے کمر باندھے اس کی طرفداری کرنے کو تیار کھڑی ہو۔ نا بھائی! روز روز کا یہ بکھیڑا مجھ سے برداشت نہ ہو گا۔ سمجھیں؟ آج اُنھوں نے تمھاری سبب سے ناحق مجھے دس پانچ کڑوی کہہ ڈالیں۔"

ہیا مگنی نے ٹھکی ٹوٹی سی آواز میں کہا "تمھاری بھابی حق بات کب کہتی ہیں؟ آج ناحق باتیں تمھیں سنادیں تو کیا نئی بات ہوئی؟"

"لیکن آج تو اُنھوں نے جو کچھ کہا وہ ایک واجبی بات تھی، تمھاری عادت تو میں جانتا ہی ہوں، اُس روز گھر کے پچھواڑے کے چھوکرے کا پکش کر کے بھی تم نے اسی طرح کی گڑبڑ مچا دی تھی۔ موتی لوہار کا ایسا عمدہ باغ ہاتھ میں آکر بھی کیوں نکل گیا؟ تمھارے ہی کارن، اُلٹی پولیس کی پوجا کے لئے ڈیڑھ سو روپئے کی تھیلی گھر سے دینا پڑی۔ تم کیا اپنا بھی بھلا بُرا نہیں سمجھتی ہو؟ تمھاری یہ عادت کب چھوٹے گی!"

اب ہیما اُٹھ بیٹھی اور دین کے چہرہ پر نگاہ جما کر بولی "میری یہ عادت تو مرنے ہی پر جائیگی، پہلے نہیں! میں ماں ہوں، میرے آگے میری گود میں لڑکے بچے ہیں، اوپر بھگوان موجود ہیں، مجھے ان کا بھی ڈر ہے، اس سے زیادہ بڑوں کی شان میں برائی کی کوئی بات میں نہیں کہنا چاہتی۔ میری طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں ہے نہ مجھے بہت سا بکنا جھکنا ہی آتا ہے، جاؤ اپنا کام کرو۔"

اس کے بعد وہ گرم اونی چادر کھینچ کر اور کروٹ بدل کر سو رہی۔

دین پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھنے کی ہمت نہ کر سکا، لیکن دل ہی دل میں ہیما پر اور خصوصاً اُس معتوب قسمت۔ مردود رشتہ دار لڑکے پر آج وہ بُری طرح بگڑ پڑا۔

(باقی آئندہ)

رُباعی

(حضرت آدیب لکھنوی، ایم۔ اے)

مستی وقتِ خمار ہو جاتی ہے ہم رنگِ خزاں بہار ہو جاتی ہے
آجاتا ہے ایسا بھی کوئی وقت آدیب جب زیست بھی ناگوار ہو جاتی ہے

"زندگی"

(از جگدیش سہائے سکسینہ وکیل شاہجہانپور)

دلربا ہے ہر ادائے زندگی　　جان و دل سے ہوں فدائے زندگی
دہر میں اس واسطے آیا ہوں میں　　دہر ہے پردہ سرائے زندگی
اُس گھڑی کا ہے تصور جانگداز　　چاک ہوگی جب قبائے زندگی
موت سے کہہ دو مجھے فرصت نہیں　　میں ابھی ہوں مبتلائے زندگی
آہ، وہ سرمستیٔ عہد شباب　　آہ وہ دلکش نوائے زندگی
آہ وہ دن نازسے چلتی تھی جب　　میرے گلشن میں ہوائے زندگی
حسن تھا جب محفل آرائے نشاط　　شوق تھا جب ناخدائے زندگی
درحقیقت نوجوانی کے مزے　　ہیں گل رنگیں ادائے زندگی
لیکن ان پھولوں کی خاطر ہمنشیں　　دل نہیں میرا فدائے زندگی

زندگی کا حسن پنہاں اور ہے
باعثِ شوقِ فراواں اور ہے

شکوۂ جور فنا کرتا ہوں میں　　مشکلوں پر زیست کی مرتا ہوں میں
موت ہے مرہم نہ زخم حیات　　موت سے اس واسطے ڈرتا ہوں میں
جادۂ ہستی دمِ شمشیر ہے　　شوق سے اُس پر قدم دھرتا ہوں میں
شادزی اے رنجِ ہستی شادزی　　تیری قدر و منزلت کرتا ہوں میں
تیری آہوں سے نہ ہو تو بدگماں　　درحقیقت تیرا دم بھرتا ہوں میں
دل میں داغوں کے جلاتا ہوں چراغ　　تیرا استقبال جب کرتا ہوں میں

گل سے ہیں بڑھکر مجھے خارِ حیات
ان میں پوشیدہ ہیں اسرارِ حیات

نشاطؔ

(از ڈی۔ پی۔ بھٹناگر کرتا)

منشی ہرگوبند سہائے متخلص بہ نشاطؔ کے والد بزرگوار منشی خوب لعل پٹنہ (بہار) کے کایستھ زمیندار تھے آپ اُس زمانے میں گزرے ہیں جب سرزمین ہند پر سرکار برطانیہ کا تسلط بڑھ رہا تھا، اور رفتہ رفتہ کل براعظم کو گھ[یرا] اُس نے اقصائے مغرب کی جانب فاتحانہ قدم اُٹھایا۔ منشی خوب لعل سرکار کے معتبر حلقے میں شامل ہوکر پٹنہ کے کلکٹر کے ہمراہ علیگڑھ تشریف لائے اور وہیں کے ہو رہے۔ نشاطؔ یہیں ۸۔ دسمبر ۱۸۲۹ء کو پیدا ہوئے، کایستھ گھرانو[ں کے] رواج عام کے مطابق فارسی اور عربی زبان کی تعلیم حاصل کی اور دونوں زبانوں میں کافی استعداد بہم پہنچائی۔ موصوف کو لڑکپن ہی سے شعر و شاعری سے شوق تھا۔ مبدءِ فیاض نے ذوقِ سلیم عطا کیا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں بسلسلۂ ملاز[مت] دہلی جانے کا موقع ملا۔ اِن دنوں یہ شہر مرکزِ شعر و سخن تھا۔ یہیں موصوف کی ملاقات منشی ہرگوپال تفتہؔ سے ہو[ئی] اور اُن سے اصلاحِ سخن لینے لگے۔ اُنھیں کے توسط سے مرزا نوشہ غالبؔ سے بھی اُن کا تعارف ہوا، اور رفتہ رفتہ اُن سے بھی آپ کے تعلقات گہرے و روابط مستقل قائم ہو گئے، جس کا پتہ مجموعۂ رقعاتِ غالبؔ سے چلتا۔ جس میں آپ کے نام مرزا کے کئی خط ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کا آغاز ہوتے ہی آپ اپنے وطن مالوف واپس آگئے۔ جہاں آپ کا تقرر بعہدۂ سررشتہ داری ہوگیا۔ ملازمت کے آخری زمانہ ۱۸۷۵ء میں والیِ ریاست نے آپ کی خدمات حاصل کیں اور آپ وہاں کی عدالت کے جج مقرر کئے گئے، لیکن خرابیٔ صحت نے آپ کو اِس عہدۂ جلیلہ پر عرصہ تک متمکن رہنے کا موقع نہ دیا۔ پبلک اور سوشل سرگرمیوں سے آپ کو مجبوراً سبکدوش ہونا [پڑا] بقیہ حصۂ عمر بہ امن و عافیت گذارنے کے لئے آپ راج گھاٹ کے تیرتھ استھان چلے گئے اور اپنا وقت پرماتما کی عبادت اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرنے لگے۔ ۲۰ مئی ۱۸۹۱ء کو آپ نے اس جہانِ فانی کو خیرباد کہا۔

دیوان نشاطؔ۔ اور نشاط المحاسبین۔ آپ کی فکرِ رسا و فلک پیما کا نتیجہ ہیں۔ ان کے علاوہ الہام تالیفِ ہرگوبند۔ کایستھ کمتاولی، اور ضوابط شادی وغیرہم تصانیف کایستھوں کی اصلاح و بہبودی سے متع[لق]

کلام پر تبصرہ | سادگی و صفائیٔ زبان اور روزمرہ آپ کے کلام کے خاص جوہر ہیں، محاورات کی خوش اس[لوبی] سے برتنے کے ثبوت جابجا کلام میں موجود ہیں، چند مثالیں درج ذیل ہیں:-

بے سبب کیوں مریضِ عشق بنوں — تندرستی ہزار نعمت ہے
ایک جا ٹھہرتی نہیں کافر — یہ بھی دولت کے پاؤں میں لت ہے
وہ آکے خواب میں اور میں نے کھول دیں آنکھیں — نصیب سوئے ہوئے یوں جگائے جاتے ہیں
سجدۂ بت سے منع کرتے ہو — تم کسی کے نہیں خدا صاحب
غیر کے ساتھ سیر باغ ہوئے — یہ نیا آج گل کھلا صاحب
دلِ شگفتۂ لالہ کو داغدار کیا — یہ گل کترنے لگے ان دنوں نگارِ سفت

تشبیہات کی بھی چند نادر مثالیں ملاحظہ ہوں :-

یہ رنگ ہوا اُس کے گورے پن کا، ہے عضو عضو آئینہ بدن کا — جو خال ہے اُس لبِ ذقن کا وہ داغ ہے سینے پیرہن کا
عارض پہ زلف آرہی ہے — بدلی سورج پہ چھا رہی ہے

روزمرہ کی زبان کا استعمال کس خوبی اور سادگی سے کیا ہے، ذیل کی مسلسل غزل سے اسکا لطف اٹھائیے

مجھ پہ یہ خشم ناروا کیا ہے — کچھ تو کہئے مری خطا کیا ہے
دل میں یہ رنجشِ نہاں کیوں ہے — لب پہ شکوہ یہ برملا کیا ہے
آپ کو فرطِ اضطراب ہے کیوں — آتے ہی اٹھ چلے ہوا کیا ہے
دم بدم کیوں نظر گھڑی پر ہے — پوچھتے کیا ہو، اب بجا کیا ہے
رات کتنی گذر چکی ہے اب — صبح ہونے میں اب رہا کیا ہے
میں نہ واقف تھا پہلے اس سے کبھی — لطف اِس حسن و عشق کا کیا ہے
فتنۂ دہر کس کو کہتے ہیں؟ — گردشِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
بے وفاؤں سے چاہتا ہے وفا — دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

معرفت کا رنگ بھی آپ کے کلام میں جھلکتا ہے :-

میں بہ غفلت ہمیشہ دور رہا — اور وہ پاس سے کبھو نہ گیا
کشتیِ طبع کو روانی دے — بحرِ وحدت کا ناخدا ہے دل
آرزوئیں ہوئی ہیں جل کر خاک — جب ذرا کیمیا بنا ہے دل
پردۂ تحقیق جو وا ہوگیا — دل بھی مرا نورِ خدا ہوگیا

شوخی اور ظرافت کے نمونے ملاحظہ ہوں :-

قاضی کی ریش خونِ کبوتر نے جذب کی — زاغِ سیاہ بال سے نکلی جو کم شراب

چھپتے گنبد میں گئے کاکلِ مشکیں یار کے ‏‏‏‏ ناگنوں کے ڈھیر دوں جیسے گر زمیندار کے

قدماء کی طرح نشاطؔ کے کلام میں بھی خمریات میں کچھ اشعار ہیں، گو وہ ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

رندِ میکش نہ ہوا میں یہی افسوس رہا ‏‏‏‏ مجھ کو بادہ سے ہمیشہ رہا انکار پسند

دنیا کا نام مزرعۃ الآخرۃ بھی ہے ‏‏‏‏ یاں بے پیئے نہ پائیں گے جنت میں ہم شراب

تا فکرِ توبہ خاطرِ خرم سے رم کرے ‏‏‏‏ بھر دے تو ساقیا مرے ساغر میں رم شراب

قندی نہ شہدی اور نہ برانڈی نہ اولڈ ٹام[1] ‏‏‏‏ ساقی وہ دے جو نکلی ہے از تعریم شراب

یہ دخترِ رز وہ ہے شوخ چنچل، غضب خدا کا ہے اُس کا چھل بل

دکھایا جھلکا تو خم کے اوجھل اُڑا دیا ہوش انجمن کا

سنگلاخ زمینوں کا انتخاب اور ثقیل الفاظ کا استعمال آپ کی قادر الکلامی کا ثبوت دیتے ہیں :۔

نہ طے ہوتا یہ جھگڑا مہر و مہ کی نور و ظلمت کا ‏‏‏‏ رخِ انور تمہارا گر نہ ہوتا درمیاں ثالث

ہے عرفاں خمِ وحدت میں اب مجھکو پلا ساقی ‏‏‏‏ حریفِ بادہ پیما جامِ جم کے ہو گئے وارث

رقیبوں کو الم مجھ کو نشاطِ دہر حاصل ہے ‏‏‏‏ یہ اپنی اپنی قسمت ہے عبث اس میں تم باحث

شیریں فدا ہے لب پہ شکر قند پر نثار ‏‏‏‏ پہچانتی ہے لذتِ قند و شکر مگس

جب سے تمہارا حسن سمایا نظر میں ہے ‏‏‏‏ مجھکو جہاں کی دید کی باقی نہیں ہوس

اکثر متقدمین کا کلام رکیک اشعار سے مملو ہے، نشاطؔ کا کلام بھی اس عیب سے مبرّا نہیں۔

تمہارے پاؤں تلک پہونچنے لگا یکسر ‏‏‏‏ یہ کس بلا کا مرا ہاتھ ہو چلا گستاخ

گذری وہ رات کہ لازم تھی حیا مجھ سے تجھے ‏‏‏‏ بے حجابی سے مل اور چھوڑ حیا آج کی رات

مرزا غالبؔ نے بے مہریِ یارانِ وطن کی شکایت کی ہے، لیکن نشاطؔ کہتے ہیں :۔

وطن میں اہلِ ہنر کی ہمیشہ عزت ہے ‏‏‏‏ شجر ثمر کے لئے ہے ثمر شجر کے لئے

ذیل میں آپ کے کلام کا انتخاب درج کیا جاتا ہے :۔

شرک سے دل جبکہ جدا ہو گیا ‏‏‏‏ سنگ سے بت، بت سے خدا ہو گیا

ہر اک دل ہے تجلی گاہِ نورِ پاکِ یزداں کا ‏‏‏‏ یہ شکلِ خاص کچھ مفہوم ہو موسیٰ عمراں کا

اے بتو عجب مت کرو سُن لو ‏‏‏‏ قصۂ نمرود کی خدائی کا

اُس پہ مرتے ہیں حسیں کا دامنِ شرم ‏‏‏‏ دستِ وہم و خیال چھو نہ گیا

تبسم گل کا ہے یا خندۂ برق ‏‏‏‏ وجودِ عشرتِ اہلِ فنا کیا

---

[1] غالبؔ مرحوم نے نشاطؔ کے نام ایک خط میں اس شراب کا ذکر کیا ہے۔

بادۂ تغزل کے چند جرعے

(از سید اختر علی اختر تلہری۔ شاہجہانپور)

بوئے گل تر ہوں مہ و انجم کی ضیا ہوں
سب ایک طرف آپ کا نقش کفِ پا ہوں

گلگشت گلستانِ محبت کو چلا ہوں
کانٹے ہیں بہت راہ میں اور آبلہ پا ہوں

جس سے کہ ہے دُنیا میں یہ سب کیف کا عالم
مَیں حُسن کے اُس جلوۂ رنگیں پہ فدا ہوں

کعبہ ہو کہ بت خانہ مجھے کچھ نہیں مطلب
میں ناصیہ سائے درِ اربابِ وفا ہوں

تم آؤگے اُجڑا ہوا دل میرا بسانے
اب تک اسی اُمید کے دھوکے پہ جیا ہوں

شرمائیں نہ سجدہ مجھے کرتے ہوئے قدسی
خاکی ہوں مگر حاملِ اسرارِ خدا ہوں

گرداب کے نظارہ سے او کانپنے والے
بپھری ہوئی موجوں میں بھی گھِر کر میں ہنسا ہوں

گلشن ہو کہ صحرا ہو کہیں جی نہیں لگتا
میں ذوق سے اپنے عجب آفت میں پھنسا ہوں

یہ حُسن یہ شوخی، یہ جوانی، یہ ادائیں،
اب تو ہی بتا تجھکو میں چاہوں کہ نہ چاہوں

ہاں یاد ہیں آغازِ محبت کے کرشمے
پھولوں میں کبھی اور کبھی کانٹوں میں رہا ہوں

توفیق طلب پھر ہوں ثباتِ شہدا سے
پھر نظمِ دو عالم کو بدلنے میں اُٹھا ہوں

ذوقِ گل و گلزار ہے اب تک وہی دل میں
ہوں گرچہ گرفتار مگر نغمہ سرا ہوں

منجملۂ اسرارِ خدا ہے مری فطرت
صحرا ہوں چمن ہوں ابھی کیا ہوا ابھی کیا ہوں

گر سیلِ حوادث ہے بلا خیز تو کیا ڈر
میں برق سے آندھی سے سمندر سے لڑا ہوں

سجدے تو نہیں کرتا ہوں منعم ترے در پر
مانا کہ مَیں بے برگ ہوں مفلس ہوں گدا ہوں

اختر رسن و دار کی مجھ کو نہیں پروا
میں گرمِ روِ راہِ شہیدانِ وفا ہوں

رفتارِ زمانہ

سردی کا موسم یورپ اور خصوصاً روس میں بہت سخت ہوتا ہے یہی زمانہ وہاں برسات اور برفباری کا ہے۔ روس میں آجکل لڑائیاں دریائے نیپر کے مغرب میں اس علاقہ کے اندر ہو رہی ہیں جو سفید روس کہلاتا ہے۔ روسیوں نے سفید روس کا دارالحکومت کیف۔ گومیل۔ چرکاسی اور بہت سے اہم مقامات لے لئے ہیں۔ کوروستن پر بھی قبضہ کر لیا تھا جو کہ اہم ریلوے جنکشن ہے لیکن جرمنوں نے کوروستن کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اس قدر شدید جوابی حملے کئے کہ روسیوں کو کوروستن خالی کر دینا پڑا۔ اسی طرح ژیتومیر بھی جرمنوں نے خالی کرا لیا۔ لیکن اس نقصان کی تلافی روسیوں نے گومیل فتح کر لینے سے کر لی یہ بھی ایک اہم ریلوے جنکشن ہے جہاں سے چند ریلوے لائنیں پولینڈ کی طرف جاتی ہیں۔ اس فتح سے یہ بھی فائدہ ہوا ہے کہ سفید روس کا راستہ روسیوں کے لئے کھل گیا ہے۔ روسی محاذ کو اس وقت تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک مورچہ کیف کے شمالی مغرب میں ہے جہاں روسی فوجیں پولینڈ کی طرف یلغار کر رہی ہیں دوسرا مورچہ خود شہر کیف کے مغرب میں ہے جہاں جرمن فوجیں روسیوں پر سخت جوابی حملے کر رہی ہیں اور جہاں روسیوں کو کسی قدر پیچھے بھی ہٹنا پڑا ہے۔ تیسرا مورچہ کیف کے جنوب مغرب میں ہے جو بحیرۂ اسود کے کنارہ تک چلا گیا ہے۔ یہاں روسیوں نے زنامینکا پر قبضہ کر لیا ہے جو سلسلۂ مواصلات کا ایک اہم مرکز ہے۔ اس محاذ پر روسی فوجیں نہایت ہوشیاری سے نقل و حرکت کر رہی ہیں اور ان کا منشا یہ ہے کہ دریائے نیپر کے گھماؤ میں جو جرمن فوجیں موجود ہیں۔ انھیں گھیر لیا جائے۔ روسی اس کوشش میں ہیں کہ جرمنوں پر مسلسل ضربیں لگاتے رہیں اور دشمنوں کو کہیں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا جائے تاکہ وہ تمام ریلوے لائنیں جن سے دشمن اپنا سلسلۂ مواصلات قائم کئے ہوئے ہے روسی قبضہ میں آ جائیں چنانچہ اسی خیال سے روسی فوجیں کیف کے جنوب سے نکوپول تک برابر حملے کرتی رہی ہیں۔ اور انھوں نے نیپروپیٹرووسک سے لیکر کریوائی روگ تک ریلوے لائن کو عبور کر لیا ہے۔ اب گویا نیپر کے موڑ میں جرمن فوجوں کو نقل و حرکت کرنے کے لئے ریلوے لائن سے مدد نہیں مل سکتی۔ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ اس مورچہ پر روسیوں نے بہت سے شہروں اور قصبوں پر قبضہ کر لیا ہے جن میں چرکاسی اور پیریاسلاول خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اب ایک طرف چرکاسی سے اور دوسری طرف کریمنچگ سے روسی فوجیں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ ایک کا مقصد یہ ہے کہ کیف کے علاقہ میں جتنا بھرا ہوا ناہموار علاقہ ہے وہاں کے جرمنوں کو گھیرے میں لے لیا جائے۔ اور دوسری فوج کا مقصد یہ ہے کہ کریوگراڈ پر قبضہ کیا جائے کیونکہ یہ مقام مختلف سڑکوں اور ریلوں کا ایک اہم مرکز ہے۔

دوسری طرف جرمن ہائی کمانڈ اس امر کی سخت کوشش کر رہا ہے کہ دریائے نیپر کی وادی میں جن مقامات پر وہ قابض ہیں وہ انھیں کے قبضہ و تصرف میں رہیں۔ چنانچہ جرمن ہائی کمانڈ نے تازہ فوجیں لا کر بے شمار ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی مدد سے اس قدر شدید جوابی حملے کئے ہیں کہ روسی فوجوں کو کیف کی طرف پیچھے ہٹ جانا پڑا۔ اس مورچہ پر جرمن فوجوں کا اس قدر دباؤ پڑا تھا کہ کیف کے بھی روسیوں کے ہاتھوں سے نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اب جرمن حملے روک دیئے گئے ہیں اور وہ کیف سے پچاس ساٹھ میل کے فاصلہ پر رکے ہوئے ہیں۔ روسی فوجوں نے سلیقہ کے ساتھ نقل و حرکت کر کے مضبوط مورچوں پر اپنے قدم جما لئے ہیں۔ کیف کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ تازہ دم روسی فوجیں اور سامان روز افزوں آ رہا ہے اور وہ دن دور نہیں ہے جبکہ روسی دشمنوں کو پھر پیچھے ہٹنا پڑیگا اور تمام یوکرین جرمنوں سے خالی ہو جائیگا۔

اٹلی: اٹلی میں ابھی لڑائیوں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اتحادی فوجیں جرمنوں کی سرمائی لائن توڑنے میں مصروف ہیں، اور وہ اس مقصد میں کئی جگہ کامیاب بھی ہوگئی ہیں۔ اتحادیوں کے آٹھویں اور پانچویں لشکروں نے جرمن مورچوں پر از سر نو حملہ شروع کر دیے ہیں اور وہ دریائے سانگرو سے آگے بڑھ کر کئی مقامات پر قابض بھی ہوگئے ہیں۔ لیکن جنگ رفتار سست ہے جس کی ایک وجہ موسم برسات ہے۔ دوسرے میدان جنگ کوہستانی ہے۔ تیسرے دشمن کی مزاحمت سخت اور اس کے مورچے بھی مضبوط ہیں، اور چوتھے یہ کہ دشمن کو اپنی کمک اور سامان لانے میں بہت سہولتیں حاصل ہیں، مگر اتحادیوں کو اپنی کمک اور سامان کئی کئی ہزار میل سے لانا پڑتا ہے۔ بایں ہمہ برطانیہ کی آٹھویں اور امریکہ کی پانچویں فوجیں اس حد تک آگے بڑھ گئی ہیں کہ پیسقرہ و روما کی سڑک اب ان کے سامنے آگئی ہے۔ جنرل منٹگمری نے جن کے ہاتھ آٹھویں برطانوی فوج کی کمان ہے پہلا حملہ بحیرۂ ایڈریاٹک کی طرف سے شروع کیا تھا۔ ان کی سب سے پہلی کامیابی دریائے سانگرو کو عبور کرنا تھا۔ اس کے بعد وہ جرمنوں کے پہاڑی مورچوں پر کامیابی کے ساتھ برابر حملے کرتے رہے اور بتدریج فتح کرتے کرتے دس میل آگے بڑھ کر انہوں نے دریائے مورو کو بھی پار کر لیا۔ اور شہر آرتونہ کی طرف بڑھنے لگے یہیں آجکل گھمسان کی لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ اگر اتحادی فوجوں نے آرتونہ کو فتح کر لیا تو پھر پیسقرہ تک ان کے اقدام کو کوئی طاقت نہیں روک سکے گی پیش قدمی کا سلسلہ جاری ہے۔ ابھی دو دریا یعنی فلیدا اور ایلنطو اتحادیوں کی راہ میں حائل ہیں۔ یہ دونوں دریائے مورو جیسے ہیں۔

پانچویں فوج جس کے کمانڈر امریکہ کے جنرل کلارک ہیں۔ اس سڑک پر جو میگنانو سے کاسینو اور وہاں سے روما کو جاتی ہے۔ جرمن فوجوں کے مقابل ڈٹی ہوئی ہے۔ سڑک کے جنوبی حصے پر اتحادی فوجوں کا غلبہ ہے اور شمالی حصہ میں جہاں سمیکرو اور کسیما کی پہاڑیاں ہیں، وہاں جرمن فوجیں مورچے جمائے ہوئے ہیں۔ ان بلندیوں سے دشمن نہ صرف روما کو جانے والی سڑک کی حفاظت کر رہا ہے، بلکہ اس راستہ پر بھی حملہ کر سکتا ہے جو پانچویں فوج کے قبضہ میں ہے۔ یہی باعث ہے کہ اتحادی فوجیں جو روما کی طرف رواں ہو رہی ہیں، ان کی رفتار سست ہے۔ اس محاذ پر موسم اس قدر سخت ہے کہ اتحادی سپاہیوں کو چمڑے کے کوٹ پہننے پڑتے ہیں۔

اطالوی محاذ کی تازہ ترین خبر یہ ہے کہ اتحادیوں نے شہر آرتونہ فتح کر لیا ہے، اور پانچویں فوج بھی وینافرو کے شمال میں کچھ آگے بڑھ گئی ہے اور اس نے ایک سخت حملہ کر کے الفدینہ کے جنوب میں دشمنوں سے ایک پہاڑی مورچہ چھین لیا ہے۔ اسی اثنا میں جرمن فوجیں دریائے گاریگلیانو کے کنارے اپنے مورچے قائم کر رہی ہیں۔ گویا والترنو، سانگرو اور مورو کے بعد یہ تیسری رکاوٹ اتحادیوں کی راہ میں پیدا ہو رہی ہیں۔

اگرچہ اٹلی میں اتحادیوں کو ہوائی غلبہ حاصل ہے لیکن بعض واقعات سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اب وہاں جرمنوں نے بھی اپنی ہوائی طاقت کافی جمع کر لی ہے، چنانچہ سرکاری طور پر بتایا گیا ہے کہ ۲۔ دسمبر کو دن نکلنے سے پہلے اٹلی کی بندرگاہ باری میں جرمن ہوائی جہازوں نے حملہ کر کے اتحادیوں کے متعدد جہاز ڈبو دیے اور اتحادیوں کے جہازوں پر جرمنوں کے ستر ہوائی حملے کئے جا چکے ہیں۔ دو جہازوں پر جن میں گولہ بارود تھا، بم گرے اور آگ لگ گئی۔ بندرگاہ کو بھی سخت نقصان پہونچا۔ متعدد اتحادی جہاز تباہ ہوگئے جن میں پانچ امریکن تجارتی جہاز بھی تھے۔ خوش قسمتی سے بہت سا سامان حملہ سے پہلے ہی اتارا جا چکا تھا۔ جنوبی گیا باری پر ہوائی حملہ سے اتحادیوں کے تقریباً ایک ہزار آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے، صحیح طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ کتنے جہاز تباہ ہوئے۔

یوگوسلافیہ | آجکل جرمنوں کے خلاف یوگوسلافیہ میں بھی لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ اگرچہ یوگوسلافیہ کی ایک گورنمنٹ لندن میں موجود ہے، مگر وہاں محبان وطن نے اپنی ایک نئی گورنمنٹ بھی قائم کر لی ہے جس کے وزیر اعظم جنرل ٹیٹو ہیں۔ اور تعجب انگیز امر یہ

جدید گورنمنٹ کو روس نے تسلیم بھی کر لیا ہے، جس سے مختلف قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے
اس وقت شمال میں سلاویفیہ اور جنوب میں تا نتی نیگرو تک اور ساحل دلماتیہ سے ہنگری کی سرحد تک ہر جگہ شورش برپا ہے۔ محب وطن فوجوں کو اتحادیوں کی طرف سے سامان جنگ برابر پہونچایا جا رہا ہے اور بہت ممکن ہے کہ آئندہ چلکر اتحادی فوجیں بھی محبانِ وطن کی مدد کو بھیج جائیں۔

یوگوسلافیہ میں ایک دوسری پیچیدگی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی محبانِ وطن کی دو پارٹیاں ہو گئی ہیں۔ ایک پارٹی کے لیڈر جنرل ٹیٹو ہیں اور دوسرے کے جنرل میہائلووچ ہیں۔ مگر یہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ یہی حالت یونان میں بھی ہے۔ یعنی وہاں بھی دو پارٹیاں ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی مخالف ہیں

کانفرنسیں

پچھلے دنوں اتحادیوں کی تین کانفرنسیں ہوئیں۔ پہلی کانفرنس قاہرہ میں ہوئی۔ جس میں پریسیڈنٹ روزویلٹ، مسٹر چرچل اور مارشل چیانگ کائی شیک نے حصہ لیا۔ اس میں ان تدابیر پر غور و خوض کیا گیا جو مشرق میں جاپان کے خلاف اختیار کی جائیں گی۔ دوسری کانفرنس طہران میں مارشل اسٹالین، پریسیڈنٹ روزویلٹ اور مسٹر چرچل کے درمیان ہوئی جس میں بعض سیاسی باتوں کے علاوہ اس نقشۂ جنگ پر غور کیا گیا جو یورپ میں جرمنی کے خلاف اختیار کیا جائے گا۔ اس کانفرنس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اتحادیوں کے سر سے یہ الزام مٹ گیا کہ پریسیڈنٹ روزویلٹ اور مسٹر چرچل کو مارشل اسٹالین پر اتنا اعتماد نہیں ہے جتنا کہ وہ ایک دوسرے پر کرتے ہیں۔ دوسرا الزام یہ تھا کہ یورپ میں کوئی دوسرا محاذ کھول کر روس کی مدد کرنے کے لئے برطانیہ و امریکہ کوئی اہتمام نہیں دکھا رہے ہیں۔ طہران کانفرنس نے ان دونوں الزامات کی بوجہ احسن تردید کر دی ہے۔ اور دوسرے محاذ کا معاملہ بھی طے ہو گیا ہے۔ چنانچہ روسی جنرل مارشل وارو شیلاف لندن جا رہے ہیں اور ان اسکیموں میں مشورہ دینگے جو مغربی یورپ پر حملہ کرنے کیلئے زیر غور ہیں۔

طہران کے بعد تیسری کانفرنس قاہرہ میں پریسیڈنٹ روزویلٹ، مسٹر چرچل اور عصمت انونو صدر جمہوریہ ترکیہ کے درمیان ہوئی جس میں منجملہ دیگر باتوں کے ان معاملات پر بھی گفت و شنید ہوئی جن کا تعلق بلقان اور ٹرکی سے ہے۔ اس تیسری کانفرنس کی نسبت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ غالباً سہی لیکن کچھ دنوں بعد ٹرکی کے بھی اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہو جانے کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ مگر ترکی کے وزیر خارجہ نعمان منجمی اوغلو کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ٹرکی کی خارجی پالیسی میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے۔ لیکن جرمنوں کو اندیشہ ہے کہ شاید ٹرکی جنگ میں شریک ہو جائے۔ چنانچہ جرمن سفیر متعینہ انقرہ نے ترکی وزیر خارجہ سے اس کانفرنس کے متعلق گھنٹوں بات چیت کی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی طے ہوا ہو لیکن اگر ٹرکی، روس اور بلقان کے معاملات اس کانفرنس میں خاطر خواہ طے کر دئے گئے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ ٹرکی بھی جلد یا بدیر جنگ میں کود پڑے۔

روس و چیکوسلاویکیہ

روس اور چیکوسلاویکیا کے درمیان اتحاد باہمی کا معاہدہ ہو گیا ہے۔ دونوں ملک اب اور جنگ کے بعد بھی ایک دوسرے کی مدد کرینگے اور ایک دوسرے کے دشمنوں سے لڑیں گے۔

لبنان

نومبر ۱۹۳۶ء میں حکومت فرانس نے لبنان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اُسے تین سال بعد آزادی و خود مختاری دیدی جائیگی یہ تین سال نومبر ۱۹۳۹ء میں پورے ہوتے لیکن بدقسمتی سے ستمبر ۱۹۳۹ء ہی میں موجودہ جنگ چھڑ گئی جس سے فرانس

خود پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۳۶ء میں پہلے معاہدہ کی پھر توثیق و تصدیق کی گئی۔ لیکن جنگ کے باعث پریشانیوں سے اتنی فرصت نہ ملی کہ اس سمت میں کوئی عملی قدم اُٹھایا جا سکتا۔ اب اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء میں لبنان میں ایک حکومت قائم کی گئی جس کے پریسیڈنٹ بشارۃ الخوری اور وزیر اعظم ریاض الصلح تھے۔ اس کے علاوہ ایک پارلیمنٹ بھی قائم کی گئی جس کے ۵۵ ممبر تھے۔ اس پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس ہوا تو اس میں وزیر اعظم کی تحریک پر ایک ایسا ریزولیوشن پاس کر دیا گیا جس کی رو سے دستور لبنان میں ترمیم ہو گئی اور وہ فوری طور پر آزاد و خود مختار ہو گیا۔ یہ بات فرانسیسی امپیریلزم کو ناگوار گزری۔ اور اُس نے اپنی فوجی مشینری کو حرکت میں لا کر لبنان کے پریسیڈنٹ، وزیر اعظم، اس کے ساتھی تمام وزیروں اور پارلیمنٹ کے تمام ممبروں کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ اس پر تمام ملک میں شورش برپا ہو گئی جسے رائفلوں کی گولیوں اور سنگینوں کی نوکوں سے دبانے کی کوشش کی گئی۔ اور کافی خون خرابے ہوئے۔ اہل لبنان کا استدلال یہ تھا کہ لبنان پر فرانس کی حکومت اس انتداب کی رو سے قائم تھی جو مجلس اقوام نے دیا تھا۔ اور اب چونکہ مجلس اقوام مردہ ہو چکی ہے اس لئے وہ انتداب بھی کالعدم ہو گیا۔ دوسری طرف فرانسیسی کمیٹی کا یہ جواب ہے کہ جب تک فرانس آزاد نہیں ہوتا، اس کی سلطنت میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ اتحادیوں خصوصاً برطانیہ کو اور تمام مسلم حکومتوں کو یہ پالیسی ناگوار گزری۔ برطانیہ کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا۔ بالآخر فرانسیسی کمیٹی نے جنرل کاترو کو بھیج کر تمام قیدیوں کو رہا کرا دیا اور وہی پہلی گورنمنٹ پھر بحال کر دی۔ لیکن ابھی تک معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے، دیکھئے کب تک اور کیونکر طے ہوتا ہے۔

برما سرحد ہندوستان و برما خصوصاً اراکان اور چن کی پہاڑیوں میں انگریزی اور جاپانی ہراول دستوں کی جھڑپیں ہوتی رہیں جن کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ مایو پہاڑی کے مشرق اور بوتھیڈانگ کے شمال میں گورکھے اور انگریز سپاہیوں نے پیشقدمی کی۔ اور خطِ جنگ مانگڈو۔ بوتھیڈانگ روڈ سے قریب تر آ گیا۔ گورکھوں نے بائیں طرف پیشقدمی کر کے بلا مزاحمت ایک بلندی پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت جس جگہ لڑائی ہو رہی ہے وہ بوتھیڈانگ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ فوجی کارروائیوں کے علاوہ فریقین کی طرف سے ہوائی حملے بھی ہوتے اور ہو رہے ہیں۔ ایک طرف برطانوی اور امریکن ہوائی جہاز اُڑ کر بنکاک تک دشمن کے ٹھکانوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں، اور دوسری طرف جاپانی ہوائی جہاز آ کر چٹاگانگ، کلکتہ اور آسام کے امریکن اڈوں پر بمباری کرتے ہیں۔ کلکتہ پر جاپانی ہوائی جہازوں نے ۵۔ دسمبر کو بمباری کر کے سویلینوں کو کافی نقصان پہونچایا۔ تقریباً پانسو آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ بڑے حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

چین چین میں لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ صوبہ ہونان میں چینیوں نے اپنی زبردست فتوحات کا دعویٰ کیا ہے جھیل ٹونگٹنگ کے علاقہ میں جاپانیوں کو زبردست شکستیں ہوئی ہیں۔ جہاں دس ہزار جاپانی فوج گھر گئی ہے۔ اسی طرح چینی فوجوں نے صوبہ ہونان میں صوبہ ہوپین اور ہوانگ کے درمیان جاپانیوں کو شکست دینے اور شہر ہوپین پر قبضہ کر لینے کا دعویٰ کیا ہے۔

بحرالکاہل

جنوب مغربی بحرالکاہل کے جزیروں میں جنگ کا سلسلہ سست رفتار کے ساتھ جاری ہے لیکن اتحادیوں کی سرگرمی معتد بہا ہے جزائر سلیمان سے جزائر گلبرٹ اور وہاں سے جزائر مارشل تک اتحادی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر اصلی لڑائی نیوگنی میں جاری ہے جہاں اتحادیوں نے سیلیمگ اور اراوہ پر قبضہ کر لیا۔ نیو برٹین میں بھی امریکن فوجوں نے پیشقدمی کی۔ سمندری معرکوں میں بھی متعدد جاپانی جہاز ڈبو دیئے گئے۔ اور کئی سو جاپانی ہوائی جہاز تباہ و برباد کئے گئے۔

بیماریوں کے بعد کی کمزوری



فصلی بخار، انفلوئنزا، میعادی بخار، یا دیگر امراض جانے کے بعد بھی کمزوری کی صورت میں اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ مریض یہ سمجھ کر طاقتور روغنی غذاؤں سے کمزوری دور ہو جائیگی اور بھی اپنی گت بنا لیتا ہے۔ اس سے معدہ اور جگر وغیرہ کی حالت تباہ ہو جاتی ہے، اور بعض اوقات گئی ہوئی بیماری لوٹ آتی ہے یا کوئی اور مرض اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ بیماریوں کے بعد جو کمزوری پیدا ہو اسے کسی مفید دوا سے دور کیا جائے۔

اس مقصد کے لئے **"شربت اکسیر خاص"**

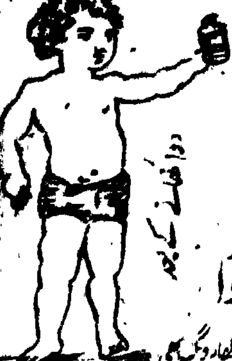
سب سے زیادہ مفید اور قابل اعتماد ثابت ہوا ہے۔ فصلی بخار سے جب تلی اور جگر میں خرابی پیدا ہو جائے اور پرانی بیماریوں سے نجات پانے کے بعد اعضائے رئیسہ میں کمزوری نظر آئے۔ بھوک اچھی طرح نہ لگتی ہو، ہاضمہ خراب ہو، خون کی کمی ہو اور خون کم پیدا ہوتا ہو کام سے جی گھبراتا ہو اس وقت "شربت اکسیر خاص" جادو کا اثر دکھاتا ہے چند خوراکیں کمزوری کا اثر زائل کر دیتی ہیں، معدہ و جگر ٹھیک کام کرنے لگتے ہیں۔ خون زیادہ مقدار میں پیدا ہو کر کمزوری اور ناتوانی کی شکایتیں دور ہو جاتی ہیں۔ مرض کے دوبارہ حملے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ بچوں۔ جوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کو اور ہر مزاج اور ہر موسم میں فائدہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کمزور ہو گئے ہیں یا آپ کے متعلقین میں سے کسی کو شکایت ہے تو دیر نہ کیجئے فوراً "شربت اکسیر خاص" کا استعمال شروع کر دیجئے۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ؍)



ہمدرد دواخانہ

نوٹ:۔ مقامی حضرات ہماری ایجنسی چھدامی لال گنج (نئی سڑک) سے شربت حاصل کریں۔



رام بالک کا
روغن سوکھا
بچوں کے سوکھا روگ کی شرطیہ دوا



یوں تو دنیا میں ہزاروں بیماریاں ہیں مگر یہ ظالم دشمن جان سوکھا سان جسکو سوکھا روگ بھی کہتے ہیں بڑی بلا ہے اس نے لاکھوں ماؤں کی گودیاں خالی کردیں ہنستے کھیلتے خوبصورت بچوں کو اس دشمن نے خاک میں ملا دیا۔ اس بیماری کا حال ان غمزدہ دکھیاری ماؤں سے پوچھیے جن کے پیارے بچے سوکھا روگ میں مبتلا ہو کر ان کے مامتا بھرے دلوں کو داغ دے جاتے ہیں سوکھا روگ کے واسطے ماں باپ طرح طرح کے کام کرنیکو تیار ہو جاتے ہیں بچوں کو دغواتے ہیں سر کی رگ سے خون نکلواتے ہیں میٹھے پانی میں دوا ڈالکر کیڑے نکلواتے ہیں گتے کے تمیت میں بیچاتے ہیں تالابوں میں نہلواتے ہیں جھاڑ پھونک کرواتے ہیں۔ گلے میں گنڈے ڈلواتے ہیں۔ لالٹین تیل اور لال تیل ملواتے ہیں اور گدھی کا دودھ پلواتے ہیں۔ بچہ کے پاخانہ کے مقام میں اندرا داخل کرتے ہیں چونکہ بہت سے لوگوں کو سوکھا مرض کی پہچان نہیں ہوتی اور ناواقفیت سے طرح طرح کے تدابیر و علاج سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مرض بڑھتا جاتا ہے اسلئے اس مرض کی معمولی علامات درج کی جاتی ہیں تاکہ تشخیص مرض میں آسانی ہو اور جن بچوں میں یہ علامتیں پائی جائیں فوراً روغن سوکھا استعمال کر کے فائدہ اٹھایا جا سکے یہ مرض عام طور سے چیت کے مہینے سے شروع ہو کر ساون بھادوں میں زور پکڑتا ہے اور اگہن کے مہینے تک رہتا ہے اس عرصے میں لاکھوں بچے اس مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سوکھا مرض میں بچہ دن بدن سست رہتا ہے حرارت قائم ہو جاتی ہے آنکھیں ہر وقت نڈھال رہتی ہیں بدن کا خون رفتہ رفتہ کم ہو جاتا ہے جسکی وجہ سے بچہ سوکھکر کانٹا ہو جاتا ہے ہاضمہ بالکل بگڑ جاتا ہے اور بدبودار ہرے پیلے دست آنے لگتے ہیں سر کا تالو خالی ہو جاتا ہے کان کو دبانے سے بچہ روتا نہیں بچہ کے ہاتھ پیر اور گردن پتلی پڑ جاتی ہے اور پیٹ بڑھ جاتا ہے چھینک نہیں آتی کھانسی آنے لگتی ہے آنکھیں سفید ہو کر گڑھے میں گھس جاتی ہیں چہرہ پر جھریاں پڑ جاتی ہیں بچہ ناک کان کھجلاتا ہے بھوک مر جاتی ہے اور دودھ ڈالنے لگتا ہے جب بچہ متواتر سست نظر آنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ سوکھا روگ شروع ہو گیا ہے ایسی حالت میں فوراً رام بالک کا روغن سوکھا کھلانا چاہیے کیونکہ یہ تیل اس روگ کو ہمیشہ کیلئے جڑ سے کھو دیتا ہے چاہے بچے سوکھکر کانٹا ہی ہو گئے ہوں اس کے استعمال سے بچے لال لال اور موٹے تازے ہو جاتے ہیں۔ اگر سوکھا مرض نہ بھی ہو اور بچے دبلے پتلے ہو رہے ہوں تو بھی اس کے استعمال سے بچے بہت جلد تندرست اور طاقتور ہو جاتے ہیں۔ آجکل سوکھا روگ کے لئے بازاروں میں بہت سے تیل ملتے ہیں جو بدن پر ملنے کے لئے ہوتے ہیں مگر ہمارا روغن سوکھا جسم پر ملا نہیں جاتا بلکہ پلایا جاتا ہے اس لئے اس مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور ایک بار بچہ کے اچھا ہو جانے پر پھر اس مرض کا اندیشہ نہیں رہتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرض سوکھا دوا سے نہیں جاتا لیکن یہ خیال غلط ہے کیونکہ خدا نے ہر مرض اور دکھ کی دوا پیدا کی ہے۔ اور رام بالک کا روغن سوکھا ہزاروں بار کی تجربہ اور آزمودہ دوا ہے۔ آجتک سوکھا مرض کی اس سے بڑھکر مفید دوا نہیں ہے اسکی آزمائش کے بعد آپ خود ہی ہماری صداقت کی شہادت دیں گے۔

روغن سوکھا کا اشتہار نفع کمانے کے لئے نہیں دیا جاتا ہے بلکہ اس مہلک مرض سے بے زبان بچوں کی زندگی کی حفاظت مقصود ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا ہر عیالدار گھر میں رکھنا نہایت ضروری ہے اور اسی لئے یہ ہر حاجتمند کو لاگت ہی کے دام پر دی جاتی ہے یعنی قیمت فی شیشی صرف ۱۲ بارہ آنہ ہے جو تقریباً ایک مہینہ کے لئے کافی ہوتی ہے۔ باہر سے منگانیوالوں کو ڈاک خرچ اور پیکنگ خرچ خود دینا پڑتا ہے ایک شیشی پر ۱۰ دس آنہ ڈاک خرچ لگتا ہے تین شیشیوں پر بھی ۱۰ خرچ پڑیگا۔ اسلئے اکٹھی کئی شیشیاں منگانے میں کفایت ہوتی ہے۔

روغن سوکھا بیچنے کیلئے ہر جگہ ایجنٹوں کی ضرورت ہے جن کو معقول کمیشن دیا جاتا ہے۔

پتہ رام بالک پنساری و عطار بیگم گنج والے ناریل بازار کانپور (برانچ آفس بیگم گنج۔ کانپور)

THE ZAMANA, JANY. 1943 REGD No. A

BC (1-4,5) 1943

زمانہ

بیادگار منشی دیا نراین صاحب نگم

جلد | جنوری ۱۹۴۳ء | نمبر ۱

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

1 میں 10

کوی و نود ویدبھوشن پنڈت ٹھاکردت شرما وید کی تیار کرائی ہوئی ایک نئی دوائی کا یہ نام ہے جس ایک ہی دوائی سے مردوں کے خاص امراض دسوں کی دس دور ہو جاتے ہیں۔ تاثیر معتدل ہر ایک کے موافق نہ حال لکھنے کی ضرورت نہ دوائی کسی سے تجویز کرانے کی ضرورت قیمت اتنی تھوڑی کہ ہر امیر و غریب فائدہ اٹھا سکے یہ ایک ایسی چیز تیار کی گئی ہے جو ہر مطلب کو حل کرے گی۔ اور بہت کم صورتوں میں دوسری ادویہ کی ضرورت ہوگی کھانے اور لگانے سے مندرجہ ذیل کام کرے گی:-

(۱) کثرت احتلام بہت جلد دور ہوگی۔

(۲) جریان کو پہلی گولی سے فائدہ ہو کر دو تین ہفتوں میں کلی آرام ہوگا

(۳) سرعت..... دور ہو کر ہم دن میں قدرتی دقت ہو جاویگا۔

(۴) کمزوری سستی۔ نامردی کو تیسرے دن سے فائدہ ظاہر ہوگا

(۵) رگوں پٹھوں کی تمام خرابیاں، کمزوری کجی وغیرہ چاہے بہ عادت سے ہوں یا عمر سے اسی گولی کو گھس کر لگانے سے دور ہو جاویں گی۔ کوئی ایا بلہ چھالہ وغیرہ نہ ہوگا۔

(۶) رقت جریان مذی ودی اور رطوبت بھی جلدی بند ہو جاویگی اور ذکاوت حس جاتی رہیگی۔

(۷) امساک:۔ ۲ گولی کھا لی جاویں ایک گھس کر لگائی جاوے تو بے حد امساک ہوگا اور دوسری ادویہ کی طرح کمزوری نہیں بلکہ طاقت ہوگی۔ طرفہ یہ کہ نہ کوئی قابض نہ کوئی مفتی افیم وغیرہ چیز اسکے اندر ہے خاص ترکیب سے یہ خوبی پیدا کر دی ہے

(۸) ملذذ عورت صرف لگانی ہوگی۔

(۹) ملذذ مرد لگانی و کھانی ہوگی۔

(۱۰) کمزوری جماع بعد از فراغت ایک گولی کھانے سے کمزوری۔ اداسی۔ سستی دور کرتی ہے۔ استعمال کیجئے اور داد دیجئے۔

قیمت ایک میں دس کی ۱۶ گولی صرف ایکروپیہ چار آنہ۔ ۶۴ گولی چار روپیہ -/-/4

عام طور پر صرف دودھ مکھن ملائی۔ چائے یا پانی سے کھائی جاتی ہے

خط و کتابت و تار کا پتہ امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا مارکیٹ ۱۲۰ لاہور المشتہر منیجر امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

امرت دھارا ہمیشہ پاس رکھو کبھی نہ بھولو۔

زمانہ

جلد ۸۰ — جنوری ۱۹۴۳ء — نمبر ۱

نظیر بے نظیر

(از مسٹر سلیم جعفر)

کسی شاعر کے بارے میں رائے قائم کرنے سے پہلے اس کے رنگِ طبیعت کا اندازہ لگانا ضروری ہے، جس طرح ہر شخص کے حرکات و سکنات سے اُس کا رنگِ طبیعت جھلکتا ہے اُسی طرح شاعر کا کلام اُس کے رنگِ طبیعت کا آئینہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہمیشہ اُس کی طبیعت کا اثر لیئے ہوئے منظرِ عام پر آتا ہے، ذوق۔ مومن۔ غالب۔ تینوں ایک ہی دَور کے شاعر ہیں مگر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ تینوں کی طبیعت ایک ہی تھی اور اُن کے کلام کے اختلاف کا باعث خارجی اسباب تھے۔ اگر ذوق سے مومن کے طرز میں کہنے کی فرمائش کی جاتی تو یقیناً وہ اُن کی ہمسری نہ کر سکتے، اور اس کے جواب میں کہ یہ نہ مومن کی طرز ہے نہ آپ کی بے تامل کہتے:۔

غزل کہلائی ہے مجھ سے یہ جبراً ایک صاحب نے ۔۔۔ نہیں اصلا قصور اپنا جو اندازِ سخن بگڑا

نظیر اکبرآبادی کی طبیعت کا اندازہ اگر صرف اُن کے کلام سے لگایا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مظاہر و مناظرِ قدرت سے بہت متاثر ہوتی تھی۔ اس قسم کے تاثر کا حصر نوعیتِ واقعات پر ہے۔ واقعہ ملال انگیز ہے تو طبیعت پر رنج و غم طاری ہونگے اور وہ دنیا سے متنفر ہو کر وعظ و پند کا دفتر کھولے گی۔ نشاط خیز ہے تو اس پر انبساط و انشراح چھا جائیں گے اور وہ لذاتِ دنیاوی سے لطف اندوز ہونے کی طرف مائل کر کے اپیکیورین (Epicurean) فلسفہ[1] کا درس دینے لگے گی۔ اسی لئے کلامِ نظیر کی دو ہی ممتاز اقسام ہیں، موعظت

[1] اس فلسفہ کے بنیادی اصول انبساط و انقباضِ طبع ہیں، یہ سعیٔ حصولِ انبساط اور رفعِ انقباض کی تعلیم دیتا ہے لیکن اس کے معنی قدر کنز میں صرف نفس پرستی رہ گئے۔

یا فطرت نگاری اور وہ مصورِ فطرت ہے یا شاعرِ محاکات۔

ایسا شاعر درحقیقت ایک واقعہ نگار ہے جو شاعرانہ انداز میں تصویرِ واقعات کھینچتا ہے، وہ محاکات میں ید طولیٰ رکھتا ہے، اُس کا کمال یہ ہے کہ اُس کی تصویر کے خدوخال اصل کے مطابق ہوں۔ جس قدر وہ اس مطابقت کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہوگا اُسی قدر اُس کا مرتبہ بلند ہوگا، اُسے تخیل کی ضرورت ہے اور جزئیات پر حاوی ہونے کی بھی۔ تاکہ اُنھیں اچھی طرح دکھا کر نقل کو اصل کے مطابق اور دل فریب بنا سکے۔ واقعات نفسیاتی پہلو سے کبھی خالی نہیں ہوتے اس لئے اُن کا بیان جذبات و احساسات سے خالی نہیں ہوتا اپنی تصویر کو مؤثر بنانے کے لئے مصورِ فطرت کو اسی طرح کے مصالح سے کام لینا پڑتا ہے جس سے اور طرح کے شاعروں کو یعنی اُسے وہ تمام تدبیریں اور طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں جو ادب کی جان ہیں، وہ صنائع و بدائع سے کام لیتا ہے جنھیں عُرفِ عام میں حُسنِ کلام سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن اُس کا فن مبالغہ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اُس کی تمام قوتیں خواہ اُن کا تعلق تخیل سے ہو یا تخلیق سے اصل کو پیشِ نظر لانے میں صرف ہوجاتی ہیں۔ اگر وہ اُصول نقل مطابق اصل کو فراموش کردے تو اس کی تصویر ہیچ و پوچ ہوجائے گی۔ اس لئے فطرت نگار شاعر بے پر کی نہیں اُڑا سکتا۔ غزل گو کہہ سکتا ہے ؎

سُنا کرتے ہیں اُس بت کے کمر ہے کہاں ہے، کس طرف ہے اور کدھر ہے

ہندی کا رسیا بید ھڑک اس حد تک جا سکتا ہے ؎

कोऊ कहे बार सी सेवार से कहत कोऊ, कोऊ कंजतार सी बनावत निसंक है।
मेरे जान सिरिफ लोनाई की लपेट लागी, ता ही की लहन औ लचक होत बंक है॥
तारबानिधि जो पै बेआधार को बहम बादे, तो परतच्छ को प्रमान कौन रंक है।
जैसे भूमि अंबर मध्य में न खंभ कोऊ, तैसे लोललोचनी के अंक में लंक है॥

کوئی کہتا ہے کہ وہ کمر بال کے مانند باریک ہے، کوئی اسے سیوار سے تشبیہ دیتا ہے، کسی کو اس کے کہنے میں بھی دریغ نہیں کہ وہ کنجتار سے ہے۔ مگر میرے نزدیک ایک حلقۂ ملاحت ہے جس کے ملنے اور جھکنے سے خم پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ وہم ستائے کہ جسم کے اُوپر کا حصہ نیچے کے حصہ پر کیونکر قائم ہے تو عیاں را چہ بیاں جس طرح زمین و آسمان کے بیچ میں کوئی ستون نہیں اُسی طرح اُس شوخ چشم کے جسم میں کمر نہیں لیکن مصور کیونکر اپنی تصویر سے کمر کو غائب کر سکتا ہے۔ اسے چھوڑ جائیگا تو وہ اصل کے مطابق کب ہوگی۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ مصورِ فطرت سرگشتۂ خمار رسوم و قیود نہیں رہ سکتا۔ اسکا میدانِ عمل اتنا وسیع ہے جتنا کہ مظاہر و مناظرِ عالم کا کیونکہ دنیا جو ڈرامے اسٹیج پر لاتی رہتی ہے وہ انھیں کی تصویر کھینچتا ہے۔ اس کا عمل محض اُن رنگوں کے استعمال تک محدود نہیں رہ سکتا جو اور طرح کے مصوروں کے روزانہ استعمال سے لوگوں کی آنکھوں میں

کھپ گئے اور قبولِ عام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، وہ اپنی تصویر کو اصل سے ملانے میں اس قدر محو ہوتا ہے کہ بعض دفعہ نامطبوع رنگ سے کام لیتے ہوئے ذرا بھی نہیں جھجکتا۔ اُس کے دل میں اس خیال کی کوئی وقعت نہیں ہوتی کہ نامانوس رنگوں کی عادی طبیعتیں گھبرا کر شکایت کرنے لگیں گی۔ وہ اکثر اپنے خیال اور اُس کی مستعدی کی رَو میں بہا چلا جاتا ہے اور ادبی مصالح کی پسندیدگی و ناپسندیدگی کو بھول جاتا ہے۔

ابھی تک اُردو میں اس طرح کے شاعروں کے لئے ایسا کافی سامان موجود نہیں جو استعمال میں آکر مقبول طبائع ہو چکا ہو۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی صاحب اس کا اعتراف اِن لفظوں میں کرتے ہیں:۔

"اُردو زبان میں چونکہ ایک مدت تک بیہودہ مبالغہ اور خیال بندی کی گرم بازاری رہی ہے اس لئے واقعات کے ادا کرنے کے لئے جو الفاظ، ترکیبیں، اصطلاحات مقرر ہیں، استعمال میں نہیں آئیں اس لئے آج نئے سرے سے انھیں استعمال کیا جائے تو ابتذال یعنی عامیانہ پن یا غرابت یعنی روکھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے کلام میں جو سُوقیانہ پن ہے اس کا یہی راز ہے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی میں اکثر واقعات کا سماں دکھانا چاہا ہے، یہ اُن کی صحیح المذاقی کا نتیجہ ہے لیکن اکثر جگہ ابتذال پیدا ہو گیا ہے۔"

(صفحہ ۲۱ موازنہ انیس و دبیر مطبع انوار احمدی الہ آباد ۱۹۲۵ء)

اِس کا مطلب صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل کلامِ نظیر میں "سوقیانہ پن" نہیں ہے بلکہ بے بُنیاد حالات و واقعات کی بنا پر مذاقِ عام غلطی سے اُسے سوقیانہ سمجھتا ہے اور فطرت نگاری وہ وادیِ پُرخار ہے [جو] ہزار احتیاط کے باوجود کہیں نہ کہیں دامن کانٹوں میں اُلجھ ہی جاتا ہے۔ حالاتِ حاضرہ کو پیش نظر رکھکر [اِس] طرح کے ابتذال، غرابت یا سوقیانہ پن" کے حامی اور بھی ہیں۔ چنانچہ شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن صاحب [فرما]تے ہیں:۔

"اُردو اگرچہ طفولیت کی حدود سے نکل چکی ہے لیکن ابھی کمال کو نہیں پہونچی ہے۔ علمی ادبی حیثیت سے ابھی اس کو بہت آگے بڑھنا ہے، نئے نئے الفاظ کی بھی حاجتمند ہے اس لئے اس کی فصاحت کو متداول و مانوس الفاظ تک محدود کر دینا صحیح نہیں، شاعر و انشا پرداز جب اپنے خیال کو عبارت کا جامہ پہناتے ہیں اور الفاظ متداول کا دامن وسعت تنگ پاتے ہیں، اکثر اصطلاحی غرابت کے حدود میں داخل ہو جاتے ہیں، اگر یہ غرابت منافی فصاحت تسلیم کر لی جائے تو ہماری زبان کبھی وسعت نہیں پا سکتی، مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ غریب الفاظ کا استعمال ہمیشہ توسیع زبان ہی کے لئے نہیں ہوتا کبھی اضطرار بھی اس کا باعث ہو جاتا ہے جس کو اگر کلام میں نظم ہو تو قافیہ کی حد تک جائز سمجھتا ہوں۔"

(صفحہ ۲۰۵، مرآۃ الشعراء مطبوعہ برقی پریس دہلی ۱۹۲۶ء)

آج بھی اُردو کمال کو نہیں پہونچی، ابھی عہدِ طفولیت سے نکل ہی چکی ہے تو سو برس (نظیر ۱۷۳۵ء تا ۱۸۳۰ء صفحہ ۵ تاریخ ادبِ اُردو از ڈاکٹر گراہم بیلی) پہلے کی اُردو تو بے شک و شبہ گہوارۂ طفولیت میں پڑی غاں غوں کر رہی ہوگی اور شعراء و اُدباء کی جگر کاویاں مصروف گہوارہ جنبانی ہوں گی۔ فصاحت کب پیدا ہوتی ہے اس کو بھی شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب ہی کی زبان سے سُنیئے ۱۔

"دنیا میں کوئی زبان اُصول موضوعہ سے نہیں بنتی، جب کوئی زبان اصول طبعی سے ترقی کرتی ہوئی فی الجملہ مرتبۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے اور ذوقِ سلیم تحریر و تقریر میں الفاظ کا حُسنِ استعمال محسوس کرنے لگتا ہے تو زبان کی فصاحت و بلاغت کے اُصول متعین ہوتے ہیں اور اُن کا اتباع ہونے لگتا ہے۔ (صفحہ ۲ مراۃ الشعراء)

اس عہدِ طفلی میں اگر کسی شاعر و ادیب کی زبان و قلم سے کچھ لفظ ایسے نکل جائیں جو فصاحت کو گراں گذرتے ہوں تو ہرگز قابلِ گرفت نہیں، اور بالخصوص ایسے شاعر و ادیب کے قلم سے جو شاہراہ عام چھوڑ کر ایک نئے راستہ پر پڑ گیا ہو۔ یہی اسباب تھے جنھوں نے پروفیسر آزاد کو سودا کے حالات میں "حُسنِ معذرت" لکھنے پر مائل کیا۔ ارباب ذوق "آبِ حیات" ملاحظہ فرمائیں۔ اگر زمانۂ حال کے ناظموں کے ساتھ جن سے میری مراد وہ بزرگ ہیں جو مناظر و مظاہرِ قدرت یا حبِ قومی وغیرہ پر طبع آزمائی فرماتے ہیں، اس وجہ سے ہر طرح کی رعایت منظور ہے کہ زبان نے تنگنائے غزل سے ابھی قدم نکالا ہی ہے تو سو برس پہلے کا شاعر جسے زمانۂ حال کے ناظموں کے "بابا آدم" سے تعبیر کیا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا بہت ہی زیادہ مستحقِ رعایت ہے۔

یہ "بابائے نظم" جدّت و جودت کا پُتلا، ایک زبردست مُصلح اور ریفارمر تھا۔ شاعری میں ایک راہ نکالی پھر زبان کی طرف توجہ کی تو معلوم ہوا کہ چیرہ دستیاں قومی زبان پر ستم توڑ رہی ہیں۔ جو زبان ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان بننے کی منزلیں طے کر رہی تھی اُس میں بیرونی اثرات[۱] نے نفاق و شقاق کی ایک ایسی خلیج کردی کہ جس کی اگر روک تھام نہ کی گئی تو وہ وسیع سے وسیع تر ہوتی جائیگی۔ عربی و فارسی کا غلبہ ادائے خیال پر اس قدر اثر ڈال رہا ہے کہ اس کے رنگ میں بیگانگی پیدا ہوتی چلی جارہی ہے۔ اس انقلاب کو وہ کب ٹھنڈے دل سے دیکھ سکتا تھا جس کی وطن پرستی اور بلند نظری اختلافِ مذہبی کی سدِ سکندری ڈھا چکی تھی۔ جو اگر عید، شب برات، حضرت سلیم چشتی پر اس جوش و ولولہ سے نظم لکھ سکتا تھا کہ وہ ایک ایماندار باخدا مسلمان کے خیالات کا آئینہ ہو تو ہولی، دیوالی، بابا نانک، کنھیا جی وغیرہ کی ثنا و صفت میں ایسی ایسی گل فشانیاں کرسکتا تھا کہ ناواقف اس دھوکے میں پڑ جائے کہ یہ کسی دھرماتما ہندو کے دل سے نکلے وہ نغمے

۱؎ خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامنِ تربیت سے ایسے شایستہ فرزند پرورش پاکر اٹھے جو زبانِ اُردو کے اصلاح دینے والے کہلائے۔ اور جس شاعری کی بنیاد حکمت اور دو معنی لفظوں پر تھی اُسے کھینچ کر فارسی کی طرز ادا اور مطالب پر لے آئے یعنی مرزا جانجاناں، مرزا رفیع، میر تقی، خواجہ میر درد وغیرہ۔ (آبِ حیات صفحہ ۱۲۱)

ہیں جو عقیدت وارادت، یگانگی اور آزادی منامیں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایسے شیدائے وطن شاعر کی نظر ایک ایسے انقلاب پر نہ پڑے محال ہے۔ چنانچہ اُس کے سدِ باب کی اُس نے یہ تدبیر کی کہ اپنے کلام کی بنیاد دو اُصولوں پر رکھی، ایک یہ کہ اس کا اسلوب فہم عام سے بالاتر نہ ہو دوسرا یہ کہ دلیرانہ وہ لفظ کلام میں لائے جو غلیۂ فارسی وعربی نے ترک کردیئے تھے یا فہرست لغات اُردو سے خارج تھے۔ ایسی چند مثالیں یہ ہیں:-

(۱) ستمگر نگہ سے نہ ہرگز لڑاتی تھی (۲) اِس بے قرار نے بھی کیا سب وہ ٹھکٹھکا

اتنے بڑے قادر الکلام شاعر کی نسبت یہ کہنا کہ ضروریات شعری سے مجبور ہو کر اس نے ہندی کے دامن میں پناہ لی، نادرستیٔ خیال کی بیّن مثال ہے۔ یہ وہ نغز گو ہے کہ جب اُس کا جی چاہتا ہے کہ اپنا کلام معاصرین کے رنگ میں پیش کرے تو نہایت صفائی وسادگی سے اُن کی معرکۃ الآرا غزلوں کی زمین میں فکرِ فلک پیما کے کرشمے دکھا جاتا ہے۔ اور اس وقت حرف گیری کی زبان قریب بند ہو جاتی ہے۔ یہ وہ جادونگار ہے جس کی طبعِ رسا نے اُن سب اصنافِ غزل میں طبند پروازی دکھائی ہے جن پر قدرت رکھنے کا مظاہرہ کر کے ممتاز ممتاز شاعروں نے فخر کیا ہے۔ یہ وہ شیوہ بیان ہے جس کا کلام صفائی وسادگی میں میرؔ اور انیسؔ کے کلام کا ہم پلہ ہے، اُس کے کلیات کا مطالعہ صاف صاف بتاتا ہے کہ غزلوں، مستزادوں، تضمینوں میں نظیرؔ نے اپنے تصرّف کو بہت کم دخل دیا ہے اور اُن کی زبان میں وہ پابندیاں موجود ہیں جو اُس کے معاصرین کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ رسالہ کے مضمون کی وسعت چونکہ محدود ہے اس لئے طویل اقتباسات سے قطع نظر کر کے اشارۃً چند غزلوں کے مطلعوں کے پہلے مصرع درج کئے جاتے ہیں

(۱) دیکھ کر کُرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی (۲) دیکھ عقد ثریا پہلیں انگور کی سُوجھی
(۳) تجھ سا تو حُسن میں یاں ناز میں نہیں (۴) بے جرم وخطا یار نہ کر چشم نمائی تیوری کو چڑھا کر
(۵) کب لالہ وگل کر سکیں عارض سے تیرے ہمسری۔

دراصل نظیرؔ اُس زبان کو رواج دینا چاہتا تھا جسے انگریز ہمیشہ سے ہندوستانی کہتے چلے آئے ہیں اور اب ملک میں ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جو قومی سود و بہبود کے لئے اس قسم کی زبان کی ترویج کا بیڑا اُٹھائے ہے، جہاں آج ہماری نظریں پہونچی ہیں وہاں نظیرؔ کی زمانہ شناس نگاہیں ایک صدی پہلے پہونچ چکی تھیں، لیکن افسوس کہ معاصرین سے دوربین تر ہونے کے باعث ہدفِ ملامت بن گیا۔

اس باکمال ہستی کی کوششیں صرف توسیع حدودِ زبان وشاعری ہی تک محدود نہیں رہیں بلکہ اُس نے ایک اور فریب نظر پسے پردہ اُٹھا دینا چاہا۔ اُس نے دیکھا کہ فارسی کی تقلید اور معشوق کے پاسِ ادب نے ایک غلط خیال دلوں میں جاگزیں کر دیا کہ اردو شاعری کا مخاطب امرد ہے۔ اُس نے دیکھا کہ فارسی میں صیغوں کی

تذکیر و تانیث کے فقدان، ایران کے دورِ آخر کے اخلاقی انحطاط، ہندوستان کی کورانہ تقلید اور تحقیق و تدقیق سے پہلوتہی نے اس خیالِ خام کا اتنا گہرا نقش دلوں پر مرتسم کر دیا ہے کہ برملا کوشش اصلاح کا نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس لئے وعظ و پند کا دفتر کھولنے کے بجائے لوگوں کو اپنی مثال سے رہ راست پر لانا چاہا۔ اس نے بے تکلف اپنی غزلوں میں مؤنث کے صیغے استعمال کئے، محبوب کے ایسے لباس اور زیور کا ذکر کیا جس سے ہر شخص فوراً سمجھ جائے کہ امرد ہرگز اس کا مخاطب نہیں۔ اسی لئے خلاف ہم شعرا اس نے معشوق کے القابوں کو مؤنث باندھا۔

(۱) دیکھ کر کُرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی (۲) جُھمکے جُھمکے وہ ثریا کے کرن پھول وہ پھول

(۳) ادھر جگنو اُدھر کچھ بالیوں میں جلوہ گر موتی گلے میں کان میں نتھ میں جدھر دیکھو اُدھر موتی

(۴) کبھی جو بال بال اپنے میں وہ موتی پروتی ہے سراپا موتیوں کا پھر تو اک گچھا وہ ہوتی ہے

زور کی آندھی چل رہی ہے دنیا تہ و بالا ہو رہی ہے اس طوفان میں محبوب سے مٹ بھیڑ ہو جاتی ہے پریشانی ہے پھر بھی اس کا ذکر کرتا ہے تو فرعومہ اور مفروضہ محبوب اُردو شاعری کا نام نہیں لیتا۔

یہ سُنتے ہی بھری ڈر کر وہ چنچل نازنیں گُرو چلی اس چال سے اُس دم کہ میرا جی گیا غش ہو

بیداری تو بیداری وہ خواب میں بھی اپنا دل صرف جنسِ لطیف ہی کی نذر کرتا ہے:-

آ کر کھڑی ہوئی تھی جو واں ناگہاں وہ شوخ لیتی تھی ہر نگاہ میں عاشق کی جاں وہ شوخ

آج سو برس بعد ایک اسکول پیدا ہو گیا ہے جو ہوا کا رُخ بدلنا چاہتا ہے، اس کی خواہش ہے کہ تخاطب میں اُردو شاعری صحیح فطری طریقہ اختیار کرے۔

نظیر اُس زمانہ کا شاعر ہے جب ہیولائے زبان و شاعری مشخص و معین شکل اختیار کرنے کے لئے ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اس نے نوے[۹۰] برس کی عمر پائی اور اگر بیس[۲۰] برس کی عمر سے شعر کہنے لگا تو ارا کین[۱] اربعہ اُردو میں سے ۱۲ برس تک

مرزا مظہر جانِ جاناں (سنہ ۱۶۹۹-۱۷۸۱ء) بیس[۲۰] برس تک سودا (سنہ ۱۷۱۳-۱۷۸۱ء) پچاس[۵۰] برس تک میر (سنہ ۱۷۲۴-۱۸۱۰ء) اور پچیس[۲۵] برس تک درد (سنہ ۱۷۱۹-۱۷۸۵ء) کا ہم عصر رہا۔ اس نے دیکھا کہ غلبۂ فارسی اُردو

---

[۱] اس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ خان آرزو کے فیضِ صحبت نے ان نوجوانوں کے کمال کو اس طرح پرورش کیا جس طرح دایہ اپنے ہونہار بچوں کو پالتی ہے۔ میں نے طبقۂ دوم و سوم کے اکثر استادوں کے حال مجمل طور پر حواشی میں لکھ دیئے ہیں اور اکثروں کے نام و کلام سے یہ جام خالی ہے۔ حقیقت میں ان سب کو زبانِ اُردو کی اصلاح کا حق حاصل ہے۔ لیکن اپنے استادوں اور بزرگوں سے یہی سنا کہ مرزا جانجاناں۔ سودا۔ میر۔ خواجہ میر درد، چار شخص تھے کہ جنہوں نے زبانِ اُردو کو خراد اُتارا۔ (صفحہ ۱۴۳ آبحیات۔ مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور ۱۹۱۳ء)

کا ہاتھ پکڑے اُسے کشاں کشاں ایران لئے جا رہا ہے۔ اُس کے جذبۂ وطن پرستی کو ٹھیس لگی، وہ تاب نہ لایا۔ اُس نے اُس کا دامن پکڑ کر اُسے بے خانماں ہونے سے بچانا چاہا لیکن کثرت نے قلت کا گلا گھونٹ دیا۔

نظیر کو اپنی کوشش کا صلہ وہی ملا جو ان مصلحانِ قوم کو ہمیشہ ملا ہے جن کی نگاہیں حجاباتِ مستقبل کو پار کرنے میں اپنے معاصرین کی دُور بینی کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ زمانہ نے اس کی جگر خراشی و سینہ کاوی کی داد بدنامی کی صورت میں دی۔ لیکن اُس کے کلام کا بے لوث مطالعہ کیا جائے تو ہر انصاف پسند بے تامل کہہ اُٹھے گا:۔

شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

"معلوم ہوتی ہے"

(از حضرت جالب مراد آبادی)

یہی شاید محبت کی ہنسی معلوم ہوتی ہے
کہ اس کے ساتھ آنکھوں میں نمی معلوم ہوتی ہے

مقامِ ہوش سے ہٹکر مقامِ شوق میں آجا
کہ اس منزل میں کچھ کچھ روشنی معلوم ہوتی ہے

بہاریں بھی ہیں گلشن بھی ہے رقصِ ماہ و انجم بھی
مگر اس دل سے پوچھو جو کمی معلوم ہوتی ہے

نہ جانیں کیوں وبالِ دوش ہے یہ زندگی ہمکو
نہ جانیں آج کیوں دُنیا بُری معلوم ہوتی ہے

جہانِ آب و گل سے ڈھونڈھ وہ اونچا مقام اپنا
جہاں ہمدوشِ فطرت زندگی معلوم ہوتی ہے

محبت دل کی ہے وہ پھانس اب جسکا یہ عالم ہے
کبھی ظاہر نہیں ہوتی کبھی معلوم ہوتی ہے

مری دیوانگی میں ہوش کا عنصر بھی شامل ہے
کہ جو صورت بھی ہے مجھکو تری معلوم ہوتی ہے

ترا صرفہ ہے اس میں رنجشِ بیجا نہ رکھ مجھ سے
کہ یہ افسانہ پرور برہمی معلوم ہوتی ہے

حریم ناز کے پردہ کو جنبش ہوتے ہی جالب
مری آنکھوں میں کچھ کچھ روشنی معلوم ہوتی ہے

زمانۂ جنگ میں ابر آلود چاند کو دیکھکر

(ایک کیفیت)

(از محمد ہادی حسین، انڈین سول سروس آسام)

ہے چودھویں کا چاند: مگر اُس کی روشنی،
مدّھم سی، ملگجی سی، مٹی سی، بجھی بجھی،

بادل کی جھلملی سے ہے چھن چھن کے آرہی،
مجموعہ عکس و نور کا ہے بن کے آرہی،

جیسے کہ ایک شمع سرِ رہگزر کی لَو،
بجھ بجھ کے جلنے اور بھڑک اُٹھنے والی لَو،

موجِ ہوا کی پھونک سے ہو جھلملا رہی،
سایوں کا ایک رقصِ مسلسل دکھا رہی؛

یا جیسے روشنی کے کچھ اجزائے منتشر
آتے ہیں ایک دیدۂ نمناک کو نظر،

جاری ہو جب کہ آنکھ سے اِک آنسوؤں کا تار،
آئینۂ نگاہ ہو آلودۂ غبار۔

کہتے ہیں مسکراتا ہے اوجِ فلک پہ چاند
پھولوں کا کھل کے ہنسنا بھی ہے اُسکے آگے ماند

یہ طرز مسکرانے کا لیکن عجیب ہے،
راحت سے دور اور الم سے قریب ہے،

یوں جیسے مسکرانے پہ مجبور ہو کوئی،
گو حالِ دل چھپانے سے معذور ہو کوئی۔

آگے ہی کم اداس نہ تھا رنگِ آسماں،
اِس چاند نے تو اور بڑھا دی اُداسیاں۔

تاریکیوں کا پردہ جو طاری تھا شہر پر،[1]
خاموشیوں کا حکم جو جاری تھا شہر پر،

اُس نے تو اُس کو اور پُر اسرار کر دیا،
چشم و دل و دماغ کا آزار کر دیا۔

یہ جنگ کے زمانہ کی شب کا چراغ ہے
یہ ماہتاب دہر کے سینے کا داغ ہے۔

---

[1] بلیک آؤٹ کی طرف اشارہ ہے۔

پردۂ حقیقت

(ایس۔ تسریر اکبر آبادی، بی۔ ایس سی)

شبِ تاریک، بیمِ موج، گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سُبکسارانِ ساحل ہا

وہ ایک عجیب شب تھی، شش جہت تاریکی چھائی ہوئی تھی، ماہتاب بھی اُس روز دہشت کے مارے دوسری دنیا میں جا بسا تھا۔ تارے بیچارے سہمے ہوئے گہرے سیاہ بادلوں کی موٹی چادر میں روپوش تھے خاک کی بجلیوں نے آسمانی بتیوں کی ہمدردی میں ہڑتال کر رکھی تھی۔ گویا زمین و آسمان دونوں نے کسی آنے والے ہیبت ناک خطرے کی وجہ سے آج بلیک آوٹ (Black out) کر دیا تھا۔ تاریکی میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک سینما گھر میں بیٹھا ہوا ہوں جس کی بجلی بھی خاموش ہے۔ دفعتاً میری نظر کے سامنے ہماری دنیا پردۂ سیمیں پر ظاہر ہوئی۔ کرۂ خاک کے چاروں طرف ہوائی کرہ بھی موجود تھا جس کے ذرات میری خوردبین نگاہ کے سامنے بالکل صاف نظر آ رہے تھے۔ کرۂ خاک تقریباً تین فٹ قطر میں تھا اور اپنے بوقلموں رنگوں میں نہایت جاذبِ نظر منظر پیش کر رہا تھا جس سے دل پر ایک سرور کی سی کیفیت طاری ہوتی تھی اور زمین بھی اپنی عجیب مستانہ چال سے باقاعدہ گھوم رہی تھی۔ بڑے بڑے پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی ہری بھری وادیاں سمندروں کی لہریں، دریاؤں کی موجیں، چشموں کا صاف و شفاف پانی، اُن کی اٹھکھیلے کی چال، دریا کی روانی، خوبصورت مکانات، آئینہ نما سڑکیں، سڑی لمبی گلیاں، کسرتی نوجوان، دیہاتی کسان، بچوں کی اول چول، مزدوروں کی دوڑ دھوپ، غرض سب مل کر ایک فرحت خیز نظارہ پیش کر رہے تھے۔ آوازیں بھی خواہ دھیمی ہوں یا تیز، اس طرح سنائی دیتی تھیں گویا وہ کسی نہایت اچھے ریڈیو سے نکل رہی ہیں۔ میں بھی ہر آواز کو سنتا اور ہر چیز کو ایک سیاح کی دور رس اور تیز فہم نگاہ سے دیکھتا ہوا ایک خاص سرور محسوس کر رہا تھا، کہاں!

دامنِ کوہسار پر، چشمۂ جوئبار پر، گلشنِ نوبہار پر، نغمۂ نے نواز میں
عشق کی غنغوانیاں، حسن کی نوجوانیاں، بکھری ہوئی کہانیاں، نگہِ نیم باز میں

——— مگر زمین باقاعدہ گھوم رہی تھی۔

جیسے ہی بحرالکاہل میری بائیں طرف سے داہنی جانب گذرا، میرا دل فرطِ مسرت سے بلیوں اُچھلنے لگا۔

اس اُمید پر کہ برہما کے میدان میں جاپان کی جنگ بچشم خود دیکھوں گا، مگر وہاں سنگاپور کی مسماری کے درد انگیز نظاروں کو آلامپر کے کھنڈروں، اور رنگون وغیرہ کی دلسوز تصویروں کے سوائے کچھ نہ تھا جو اپنی دُکھ بھری کہانیاں صاف صاف سُنا رہی تھیں۔

اُجڑے ہوئے دیار پر، ٹوٹے ہوئے مزار پر		صورتِ سوگوار پر، نالۂ شب گداز میں

مشکل سے یہ سین نظر سے اوجھل ہوا تھا کہ صوبۂ متحدہ بالکل میرے سامنے تھا۔ میری تجسس پسند نگاہیں بہت جلد اپنے شہر اور اپنے مکان کی تلاش کرنے لگیں۔ میں تصویرِ حیرت بن گیا۔ جب میں نے اپنے آپ کو اپنے باغ میں ایک کُرسی پہ بیٹھے ہوئے پایا، ایک چھوٹی میز پر جو میرے سامنے رکھی تھی میرے پیر پھیلے ہوئے تھے۔ بچے اِدھر اُدھر کھیل کود میں مشغول تھے۔ ایک نٹ کھٹ لڑکا امرود کے پیڑ پر چڑھا ہوا کچھ کھا رہا تھا اور سب سے چھوٹا پیڑ کے نیچے کھڑا تھا، اس کے گال پھولے ہوئے تھے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے کوئی وزنی چیز جو اُسکی قمیص کے دامن میں بھری ہوئی تھی پکڑے ہوئے تھا۔ ان کو کیا خبر کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، وہ تو اس مقولے پر کاربند ہیں۔

رنگِ خزاں سے دُور رہ، حسنِ بہار سے الگ		کون و مکاں کو چھوڑ دے، ہستی بے نیاز میں
میں ہی شمیمِ نور ہوں، میں ہی کلیمِ طور ہوں		رنگِ نشاط ہی رہا، میری حریمِ ناز میں

ــــــــ مگر زمین باقاعدہ گھوم رہی تھی۔

ایک شہر میں جو میرے شہر سے قریب ہی تھا ایک شخص کو جو زرق برق پوشاک پہنے ہوئے تھا، دوسرے خوش پوش آدمی سے کہتے ہوئے سُنا "کیا وہ میرا ہم پلّہ ہے، کیونکر اُس کو میرے برابر بیٹھنے کی جرأت ہوئی؟ کیا میں اُسکی جھونپڑیا پر جا کر اپنے آپ کو قعرِ مذلت میں گرادوں، نہیں نہیں یہ ہرگز نہیں ہوسکتا" جبکہ اُس کا مخاطب اپنی گردن جھکا جھکا کر اُس کی باتوں کی تائید کر رہا تھا، دوسری جگہ ایک دُکھا ہوا دل اپنے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔

"وہ بڑا آدمی ہے، میری کب سُنتا ہے، وہ مغرور ہے، خود دماغ ہے، اگر وہ لاٹ کا بچہ ہے تو ہوا کرے، مجھ پر ہرگز ہرگز حکومت نہیں کرسکتا۔ خدا نے مجھے بازو عطا کئے ہیں، جب تک اِن میں سکت ہے، میں اپنی روزی ایمانداری سے کما کر کھاؤں گا۔"

اس کے بعد میں نے ایک شریف خاتون کو کہتے ہوئے سُنا، "جناب! مجھے بالکل فرصت نہیں کہ آج اپنے محسن سے مِل سکوں، میں نکھٹو نہیں ہوں، مجھے آج بیحد کام ہے، مجھے کلب جانا ہے اور راستے میں اپنے دھوبی کو کھٹ کھٹانا ہے جو ہمیشہ میرے کپڑے دیر میں لاتا ہے، اور اس کمبخت درزی کو بھی تو یاد دلانا ہے کہ شنبۂ آئندہ کو میرے کپڑے ضرور بالضرور تیار کر کے لے آئے کیونکہ مجھے اُسی رات کو ایک فینسی ڈریس بال[1] میں شامل ہونا ہے پھر مجھے پکچر (سینما) میں پہونچنا ہے، کیا کروں جناب، مجھے ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں۔ مجھے سخت افسوس ہے

[1] Fancy Dress Ball

کہ میں اپنے محسن سے جو تقریباً ایک سو پچیس میل کا سفر طے کرکے مجھ سے ملنے آرہے ہیں نہ مل سکوں گی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے ضرور معاف کریں گے۔ افسوس افسوس، وقت بالکل نہیں دگھڑی دیکھکر معاف کیجئے گا، مجھے کلب کو دیر ہوتی ہے۔"

اتنی چڑھا مئے خودی، دہر کرشمہ ساز میں   غرق مئے الست ہو، ہمسکدۂ مجاز میں

———— مگر زمین باقاعدہ گھوم رہی تھی۔

ہندوستان گزر گیا، اور اسی طرح بہت سا ایران کا حصہ بھی، اب روس و جرمن کا میدان کارزار نگاہ کے سامنے تھا درحقیقت میں نے ہوائی جہازوں کو اڑتے، بم گرتے، مشینوں کو گولیوں کی بوچھار کرتے دیکھا۔ تمام میدان جنگ آہ و بکا اور دیگر دردناک آوازوں سے گونج رہا تھا، جو ہولناک منظر نظر کے سامنے تھا اُس کا بیان نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ کوئی آدھا منٹ بھی نہ گذرا ہوگا کہ تمام سین میری داہنی جانب غائب ہوگیا، لیکن میں اپنے خیالات میں اس قدر غرق تھا کہ جب مجھے ہوش آیا تو تقریباً تمام یورپ میرے سامنے سے گزر چکا تھا۔ اس کے بعد میں بحر اطلانٹک کی لاتعداد لہروں اور لامحدود وسعتوں میں گم ہوگیا۔

عموماً لوگ سفر آخرت یا موت سے خائف رہتے ہیں، صرف اپنی ہی نہیں بلکہ اپنے سے قریب ترین لوگوں کی موت سے بھی جو خاص طور پر محبت کی لڑیوں میں پروئے ہوتے ہیں، ایسے لوگ بہت کم ہیں جو بستر مرگ پر اطمینان اور شانتی کا سانس لیتے ہوئے دنیا سے چل بسیں، خواہ کسی نقطۂ نگاہ سے اس پر غور کیا جائے مگر موت سے بچنے کا کوئی چارہ نہیں، قدرت کسی مذہب و ملت سے واسطہ نہیں رکھتی، ہر چیز کو خواہ جاندار ہو یا بیجان ایک روز موت سے دوچار ہونا پڑتا ہے صبح ہو یا شام، دن ہو یا رات، گرمی ہو یا سردی، مگر مرنا ہی پڑتا ہے، خواہ ہم ہنسکر موت کا خیر مقدم کریں یا رو اور گھبرا کر اس سے منھ موڑلیں۔

ہندو فلسفے کے مطابق پرلے (परलय - قیامت) کے وقت سات ستارے یا سورج آکاش میں نمودار ہونگے۔ اسلامی فلاسفی حشر کے دن آفتاب کا سوا نیزے پر آجانا بتاتی ہے، وجہ کچھ بھی ہو مگر اس پر سب متفق ہیں کہ قیامت کے وقت حدت بڑھ جائیگی اور یہی گرمی ہماری دنیا کی بربادی کا باعث ثابت ہوگی۔ افسوس، صد افسوس ———— اے ہماری دنیا، مہذب دنیا۔ اچھی دنیا۔ بڑے بڑے دماغوں والی دنیا، ہنستے کھیلتے بچوں والی دنیا ......

جی کے نہ کوئی جی سکا، مر کے نہ کوئی مر سکا   ہستی و نیستی کہاں، عالم جاں نواز میں

یہ ہی مآلِ عشق ہے، یہ ہی کمالِ عشق ہے   ہاتھ میں جامِ مشکبو، سر ہو جھکا نماز میں

———— مگر زمین باقاعدہ گھوم رہی تھی۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ تمام کرۂ ارض سبزی مائل سفید رنگ کی روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ ٹمپریچر بڑھتا جاتا ہے اور ۱۱۰ ڈگری پر پہونچ گیا۔ آدمی اپنے اپنے مکانوں میں، چوپائے اپنے باڑوں میں اور پرند درختوں کے

پتیوں میں پناہ گزین ہیں۔ ٹمپریچر برابر بڑھتا جارہا ہے۔ پانی اُبلنے لگتا ہے، رقیق اشیاء حباب کی صورت اختیار کرتی ہیں، اوپر اُڑ کر منجمد ہوتی ہیں اور پھر موسلا دھار بارش کی شکل میں زمین پر آگرتی ہیں، جیسے جیسے گرمی بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ پانی کی مقدار اوپر جاتی ہے اور اتنے ہی زور کے ساتھ زمین پر آگرتی ہے۔ شہر بہتے ہیں، قصبے غرقاب ہوتے ہیں، پہاڑ ڈھیتے ہیں، مکان منہدم ہوتے ہیں، سمندر کی سطح اُونچی ہوکر زمین کو اپنے آغوش میں لینے کے لئے بڑھتی ہے۔ اشرف المخلوقات انسان، اسفل المخلوقات حیوان، نباتات اور جمادات، سب موت کا نوالہ ہوجاتے ہیں، ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی آبی جانور سراسیمگی کی حالت میں اپنے گناہوں کی معافی کے لئے پانی سے سر نکال کر دُعا کرتے نظر آجاتے ہیں، مگر یہ بھی کب تک

تار کے ٹوٹتے ہی چُپ، مطربِ کائنات تھا　　نغمۂ جاں نواز کیا، سوزِ شکستِ ساز میں

مگر زمین باقاعدہ گھوم رہی تھی۔

حرارت اور بڑھتی ہے، اس قدر بڑھتی ہے کہ پانی اوپر جاکر منجمد نہیں ہوتا بلکہ حباب ہی کی شکل میں قائم رہتا ہے۔ جہاں سرسبز و شاداب زمین تھی، اب وہاں جلتا ہوا، ہر چیز کو بھسم کردینے والا آگ کا گولا گھوم رہا ہے۔

گرمی اور زیادہ بڑھتی ہے آگ کے ذرات گیس (Gas) میں تبدیل ہوکر ہوائی کُرّہ تیار کرتے ہیں۔ ہوائی کُرّہ لطیف ہوکر آکاش یا خلا کی صورت اختیار کرتا ہے جس کی نہ کوئی شکل ہے، نہ جس کا کوئی وزن، ایک لامحدود شئے بصورتِ حرکت شش جہت میں پھیلی ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ آکاش بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر مختلف صورتیں اختیار کرتا ہوا مہاتتوا (महा तत्व) یا عنصرِ خاص میں تبدیل ہوجاتا ہے، یہی عالم کا خمیر ہے، جس سے دُنیا بنی ہے اور بنتی ہے۔

ایک قدم اور ـــــــ پھر خمیر بھی غائب ہے، اب روشنی ہے نہ تاریکی ـــــ تاریکی ہے نہ روشنی، ہستی نیستی ہے اور نیستی، ہستی ـــــ اب کچھ نہیں، مطلق کچھ نہیں ـــــــــــــــ صرف ایک ذاتِ مطلق باقی ہے۔

جتنے بھی ولولے اُٹھے، عشقِ کرشمہ ساز میں　　جذب تمام ہوگئے، ایک نگاہِ ناز میں

حسنِ رخِ کلیم میں، آبِ دُرِ یتیم میں　　رنگِ رگِ نسیم میں، حیرتِ آئینہ ساز میں

ہست میں نیست کا ظہور، نیست میں ہست کا وفور　　سربسجود ہوکے دیکھ، جلوہ گرِ نیاز میں

ہر چیز غائب ہے ـــــ میں بھی غائب ہوگیا، کھوگیا، بالکل کھوگیا، اس لامحدود اندھکار (अन्धकार) کے مہاساگر (महा सागर) میں ــــــــــــ مجھے کچھ بے چینی محسوس ہوئی، اور میں چلّایا ــــــــــــ

"جہان روشن ہو" اور تمام جہان روشن ہوگیا۔ ———

Let there be light and there was Light ——— میں اور میرے ساتھی ایک، ایک، دو دو کرکے سینما ہال سے باہر آنے لگے۔

پھر وہی راگ و رنگ ہے، پھر وہی شوخ و شنگ ہے — پھر وہی ہاؤ ہُو و حق، زلفِ شبِ دراز میں
حسنِ عمل سَحر کیا، کیا ہے بقا، فنا ہے کیا — خود ہی میں راز بن گیا، کھل کے ریاضِ راز میں

——— مگر زمین باقاعدہ گھوم رہی تھی۔

غزل

(حضرت نجم آفندی)

میرا وہ غم رہا نہ وہ اُن کی خوشی رہی — دونوں کے دل بدل گئے دُنیا وہی رہی
کافر کا آستاں نہ سہی رہگزر سہی — ہم چل کھڑے ہوئے تو حکومت دھری رہی
دیکھا کئے بہت مجھے ترچھی نگاہ سے — کچھ روز دوستی کے لئے دشمنی رہی
جب پیکے درد عشق ہم آئے تو دن پھرے — برسوں یہ کائنات معطل پڑی رہی
اپنا خیال آتے ہی اک حشر آ گیا — جب تک ترا خیال رہا خامشی رہی
دل میں تو ہے وہ شاہدِ مقصود جلوہ گر — آنکھیں بھی دیکھ لیں گی اگر زندگی رہی
سر کر لیا تھا ہم نے محبّت کا معرکہ — اللہ جانتا ہے تمھاری کمی رہی
اے وائے آدمی کہ ذرا دیر کے لئے — قلبِ مَلَک میں بھی خلشِ آدمی رہی
دیکھا تو آج ہے وہی غم رہنمائے دل — سُنتا ہوں مدّتوں مرے غم پہ ہنسی رہی
فتنے اُٹھے بہت ہمیں جنبش نہ دے سکے — بیٹھے رہے خموش قیامت کھڑی رہی

نجمی پڑی نہ خو ہمیں عجز و نیاز کی
ہم زد پہ تھے مگر یہ بلا دور ہی رہی

ننھی پُجارن

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

اِک ننھی مُنّی سی پُجارن پتلی باہیں پتلی گردن
بھور بھئے مندر آئی ہے آئی نہیں ہے ماں لائی ہے
وقت سے پہلے جاگ اُٹھی ہے نیند ابھی آنکھوں میں بھری ہے
ٹھوڑی تک لٹ آئی ہوئی ہے یونہی سی لہرائی ہوئی ہے
آنکھوں میں تاروں کی چمک ہے مکھڑے پہ چاندی کی جھلک ہے
کیسی سُندر ہے کیا کہیئے ننھی سی اِک سیتا کہیئے
چاند کا ٹکڑا، پھول کی ڈالی کمسن سیدھی بھولی بھالی
دھوپ چڑھے تارا چمکا ہے پتھر پہ ایک پھول کھلا ہے
کان میں چاندی کی بالی ہے ہاتھ میں پیتل کی تھالی ہے
دل میں لیکن دھیان نہیں ہے پوجا کا کچھ گیان نہیں ہے
کیسی بھولی اور سیدھی ہے مندر کی چھت دیکھ رہی ہے
ماں بڑھ کر چٹکی لیتی ہے چُپکے چُپکے ہنس دیتی ہے
ہنسنا رونا اُس کا مذہب اُس کو پوجا سے کیا مطلب

خود تو آئی ہے مندر میں
مَن اُس کا ہے گڑیا گھر میں

۱؎ یہ نظم آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے براڈکاسٹ ہو چکی ہے۔

اُردو نثر کا دورِ جدید

(از حضرت شمس قریشی بریلوی)

بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ اقلیم اُردو میں نثر جدید کا سنگِ بنیاد مرزا غالب کی ندرت پسند اور جدت طراز طبیعت نے رکھا، اور سر سید اور اُن کے رفیقوں نے اس پر فلک فرسا قصر تعمیر کیا لیکن درحقیقت یہ خیال اختلاف آراء کا ہدف بن سکتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ غالب نے ایک نیا راستہ اختیار کیا لیکن اُن کی جدت کا دائرہ تنگ اور صرف خط و کتابت اور مضامین شاعرانہ کی تنقید و توضیح پر محتوی تھا۔ سر سید اور اُن کے رفقاء کے میدان عمل کی وسعت لامحدود تھی۔ چونکہ یہ لوگ مصلح اور ریفارمر بن کر ایک مردہ قوم میں روح پھونکنے نکلے تھے اس لئے ان کی سرگرمیاں فلسفہ۔ منطق۔ طبعیات۔ تاریخ۔ اخلاق۔ مذہب۔ سیاست سب کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تھیں۔ بیدل اور ظہوری کی رنگین نثر جس کی دل فریبی کا مدار ترصیع و سجع تشبیہ و استعارہ اور صنائع و بدائع پر تھا، اس خدمت کو انجام نہ دے سکتی تھی اور مغربی تعلیم کا تقاضا تھا کہ عبارت میں زور و اثر صناعی سے نہ پیدا کیا جائے بلکہ لفظوں کی طبعی و فطری خوبیوں سے تقریر و تحریر میں جادو بھر دیا جائے۔ دقیق مسائل ایسی زبان میں بیان کئے جائیں کہ عام تعلیم یافتہ طبقہ کی سمند فکر کا شکار ہو سکیں۔ غرض یہ حالات و واقعات اسلوب بیان کی کایا پلٹ کا باعث ہوئے۔

اس رُجحان کو مقبول بنانے والے محرکات میں علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ[1]، اور سائنٹیفک سوسائٹی[2] (غازیپور علیگڈھ) کا قائم ہونا ہے جس نے تراجم کی اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ انھیں مطبوعات سے سر سید اور اُن کے رفقاء کی اُن مساعی کا آغاز ہوتا ہے جو جدید نثری نصب العین کی سرمایہ دار تھیں۔ سر سید کی دُوربیں نظروں نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا کہ ہماری اُپج، بلند رجحانات اور تفکرات اگر قدیم زمانہ کے حدود میں گھرے رہے تو ملک و قوم خصوصاً زبان کی ترقی کا موقعہ بھی نہ ملے گا۔ سر سید کی پہلی مشہور تصنیف آثار الصنادید[3] مقفیٰ اور مسجع عبارت میں تھی۔ اس کا دوسرا اڈیشن سر سید کے قلم سے جدید نثری رُجحان کی تفسیر ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح جدید شاعری کی ابتدا انگریزی ادب کے تاثرات کی حامل ہے اسی طرح جدید نثر بھی نقاد کے سامنے انگریزی ادب کے کچھ تاثرات لئے ہوئے روشناس ہوتی ہے۔ سائنٹیفک سوسائٹی، علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کی آبیاری اسی کی مرہونِ منت ہے

---

[1] اجرائے اول سنہ ۱۸۶۶ء [2] اس سوسائٹی کا سنگ بنیاد سنہ ۱۸۶۳ء میں رکھا گیا۔

[3] مولانا حالی کا قول ہے کہ سر سید نے اس کو مرتب نہیں کیا تھا بلکہ وہ مولانا صہبائی کے زور قلم کا نتیجہ ہے، سر سید نے دوبارہ اس کو مرتب کیا۔

اگرچہ سر سید اور اُن کے ساتھیوں کو عرصۂ دراز تک اپنے مشن میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور اُن پر نہ صرف مذہبی یورشیں ہوئیں بلکہ اُن کے اس جدید نثری نصب العین کو بھی تباہ کرنے کی بہت کوششیں کی گئیں تاہم انھوں نے جس کام کا بیڑا اُٹھایا تھا اُسے پُورا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اگرچہ اس زمانہ میں قدیم طرز کی کتابوں میں کوئی قابل ذکر کمی نہیں ہوئی مگر تہذیب الاخلاق اور نذیر احمد کی پیہم مساعی نے ایک زبردست ادبی سرد مہری کے باوجود آخر کار اس قدیم اسلوب کو پژمردہ کرکے ہی چھوڑا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جس طرح قومی اور وطنی جذبات کے احساس اور اُس کی تحریک نے اُردو شاعری میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ اسی طرح جدید اُردو نثر کے ایجاد و احیا میں بھی یہ تحریک بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوئی چنانچہ تہذیب الاخلاق کے متعدد مضامین قومیت، وطنیت اور اخلاقیات کے محرک تھے جن میں سر سید اور اُن کے ہم خیال دوست بظاہر مسلمانوں کو اُن کی تباہ حالی سے خبردار کرتے تھے مگر در پردہ وہ جدید نثری ارتقاء کے لئے بھی معقول سرمایہ فراہم کر رہے تھے۔

سر سید اور اُن کے رفقا کی اصلاحی کوشش اور اُن کی تصنیفات نے اس تحریک کو بہت کچھ کامیاب بنا دیا چنانچہ اُس کے نتائج ایک مسلسل صورت میں ظاہر ہونے لگے تھے اور تھوڑے ہی عرصہ میں جدید نصب العین کے ماتحت اُردو نثر میں قابل قدر تصنیفات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ انھوں نے اپنی مساعی کو مشکور دیکھتے ہوئے اپنی توجہ اس مرکز سے ہٹا لی۔ اُس وقت یہ خدشہ ہو چلا تھا کہ جدید تاثرات جو نہایت سادہ رنگوں سے رنگے ہوئے ہیں کہیں قدیم گہرے اور شوخ رنگوں کے تقابل سے مرعوب ہو کر نظروں سے نہ گر جائیں کہ پنجاب میں کرنل الرائڈ[۲] کی سرگرم مساعی نے ایک طرف تو جدید اُردو شاعری کا سنگ بنیاد رکھا اور دوسری طرف ضمناً اُن کی آمرانہ سرپرستی میں آزاد و حالی کی تقریروں اور اُن کی تصنیفات نے جن کا مطمح نظر جدید شعری اسلوب کو کامیاب بنانا تھا، اُردو نثر کے جدید نصب العین کو متحرک کر دیا اور کوئی طویل و برباد کن سکون سر سید کی اوراتی تحریکات میں پیدا نہ ہونے دیا۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری آزاد کی تقریریں، نذیر احمد اور شبلی کی نثری تصنیفات برابر ان رجحانات کو ارتقائی منازل سے ہمدوش کرتی رہیں اور جدید نثری نصب العین کو مقبول عام بنا کر دم لیا۔

اس کے بعد پھر سر سید کی مساعی رنگ لائیں اور اُن کی وہ کوششیں جو محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کی تشکیل کے لئے جاری تھیں کامیاب ثابت ہوئیں۔ علیگڑھ کالج[۱] کے ذریعہ سے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی اشاعت و ترویج نے جدید نثری نصب العین کو کامیاب بنانے کے لئے ایک کافی مواد فراہم کر دیا تھا، اور آخر کار قوم نے خود اس تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نہایت سرگرمی کے ساتھ اپنی توجہ کو اس کے ارتقاء پر مبذول کیا۔

---

[۱] علیگڈھ یونیورسٹی کی تشکیل۔ [۲] کرنل ڈبلیو۔ آر۔ این۔ ہالرائیڈ ناظم تعلیمات پنجاب

یہاں تک کہ دارالمصنفین کے قیام اور اس کی سرگرم کوششوں نے ایسے ادبی شاہکاروں کی پیداوار میں جن کے نقوش اُنھیں خاکوں پر اُبھارے گئے تھے جن کو سرسید نے پیش کیا تھا، ایک تسلسل اور گرم رفتاری پیدا کر دی' اور ایک مرکز پر جمع ہو کر جدید نثری تحریک کی اشاعت میں زبردست حصہ لیا، اسی طرح انجمن ترقی اُردو (دکن)، جامعۂ عثمانیہ اور دارالترجمہ شاہ دکن کی علمی سرپرستیوں میں جدید نثری رجحان کی اشاعت کے وہ محرکات ہیں جنھوں نے جدید نصب العین کو ارتقا کی آخری حدوں سے ہمدوش کر دیا ہے۔

انگریزی ادب کی اشاعت اور اُس کے تاثرات نے جدید اُردو نثر میں بہت سی ایسی نئی راہیں پیدا کیں اور اُن کی طرف ہماری رہنمائی کی جس میں نہایت اعلیٰ پایہ کے شاہکاروں کی تخلیق ہو رہی ہے، ان میں "انشاپردازی" "تاریخ و تمدن و ادب" "سوانح نگاری" "ناول و ڈرامہ" اور فنِ نقد قابلِ ذکر ہیں۔

انشاپردازی | اگرچہ قدیم نثر میں بھی بہت کچھ سرمایہ اس کا فراہم ہو سکتا ہے لیکن وہ جس قدر بھی ہے تکلف و آورد کا سرمایہ ہے اور کوئی فنی خصوصیت اس میں موجود نہیں بلکہ وہ چند سرسری نقوش ہیں، ایک فن کی حیثیت سے جدید نثری رجحان ہے جس نے ہم کو صحیح انشاپردازی سے روشناس کرایا، چنانچہ تہذیب الاخلاق کی زندگی اس سے قائم رہی سرسید، محسن الملک، چراغ علی، نذیر احمد اور حالی اس فن میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ خصوصاً سرسید، محسن الملک اور نذیر احمد نے مذہبی، فلسفیانہ، تاریخی اور ادبی ہر قسم کے مضامین نہایت حُسن کارانہ رنگ میں ہمارے لئے چھوڑے ہیں جو آج بھی حد درجہ جاذبِ نظر اور دل پسند ہیں۔ اسلام پر محسن الملک اور سرسید کے مضامین زبردست شاہکارانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ مگر اس فن کو کمال پر پہونچانے والی شخصیت عبدالحلیم شررؔ کی ہے جو سرسید اور اُن کے رفقاکار سے متاثر ہونے والی شخصیتوں میں بہت بلند درجہ رکھتے ہیں۔ اس خصوص میں جو انفرادیت شررؔ کے حصہ میں آئی وہ ابتک کسی کو حاصل نہ ہو سکی، باوجود کثرتِ مشاغل اُن کے مضامین کا مجموعہ موضوعی تقسیم کے ساتھ آٹھ جلدوں میں شائع ہوا ہے انھوں نے انشاپردازی کو کمال کی اُن حدوں پر پہونچا دیا ہے جس سے آگے بڑھنا محال اور ناممکن ہے، آج تک یہ فن شاہکارانہ نقوش کے ساتھ ادبیاتِ اُردو میں ایک زبردست شخصیت کا مالک ہے۔

سوانح اور تاریخ تمدن و ادب | اس فن سے بھی ہم کو جدید اُردو نثر ہی نے روشناس کرایا اور اس کے ماتحت مختلف عنوانات سے تصنیفات شائع ہوئی ہیں' حیات جیسے حیاتِ سعدی، حیاتِ غالب، حیاتِ جاوید وغیرہ۔ سیرت، جیسے سیرت النبی، سیرت الصحابہ، سیرت النعمان وغیرہ، تاریخ تمدن جیسے تاریخ ہند (ذکاء اللہ) تمدن عرب، تمدنِ ہند (گستاؤلی بان) ترجمہ سید علی بلگرامی، تاریخ ادب، شعر العجم (۵ جلد) خمخانۂ جاوید (سری رام) وغیرہ۔

نقد | مقدمہ شعر و شاعری، موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم وغیرہ، یہ تمام تر تصانیف اسی عہد کی یا اُس کے قریب ترین زمانہ کی پیداوار ہیں' اس کے بعد بھی آج تک اس موضوع پر بکثرت تصانیف کا اضافہ ہو رہا ہے۔

ناول | اخلاقی و معاشرتی و اصلاحی ناولوں کی تخلیق اگرچہ مولانا نذیر احمد سے وابستہ ہے لیکن اس فن کو جدید اُردو نثر میں روشناس کرانے میں پہلا نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہے، اودھ اخبار لکھنؤ (۱۸۷۸ء) میں اُردو کا پہلا اوریجنل ناول "فسانۂ آزاد" کے نام سے بالاقساط ۱۸۸۰ء تک انھوں نے شائع کیا۔ اس طرح انھوں نے اس فن کا گویا سنگِ بنیاد رکھا۔ مولانا نذیر احمد جن کی ہستی جدید نثری رجحان کے محرکوں میں سے ہے انھوں نے بھی اس کے بعد اپنی توجہ اس کی طرف منعطف کی اور کثیر التعداد اخلاقی ناولوں کی نگارش سے ایک طرف توسعلم اخلاق اور دوسری طرف جدید نثر کے مربی و سرپرست کی حیثیت پائی۔ اُن کے مشہور ناول مرأۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، محصنات، ایامیٰ اور رویائے صادقہ ہیں۔

حزنیہ اور طربیہ ناولوں کو بہترین اسلوب میں سرشار کے بعد مولانا شرر نے روشناس کرایا اور ناول نگاری کو ایک فن کی حیثیت سے پیش کرنے کا فخر ان ہی کو حاصل ہے۔ ۱۸۸۲ء کے اواخر میں آپ کا سب سے پہلا ناول "دلچسپ" شائع ہوا اور اس کے بعد انھوں نے متعدد بنگالی ناولوں کے تراجم شائع کئے۔ ۱۸۸۷ء میں مولانا نے اپنے ماہوار رسالہ "دلگداز" میں باقاعدہ طور پر اوریجنل اور تاریخی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا اور بیالیس شاہکار ناول علاوہ سوانح حیات و تاریخ اور مضامین اپنی یادگار چھوڑے۔ جن میں اٹھائیس تاریخی اور چودہ اوریجنل ناول ہیں۔ سرشار و شرر کے بعد حافظ نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا، محمد علی طبیب اور راشد الخیری ممتاز ناول نگار شخصیتیں ہیں۔

ڈرامہ | یہ بھی متذکرہ بالا اصنافِ نثر کی طرح جدید نثری نصب العین کی تخلیق ہے۔ اگرچہ ۱۸۵۳ء میں امانت کی اندر سبھا منظوم ڈرامہ واجد علی شاہی عہد کی رسمی پیداوار ہے مگر اس کو بمشکل ہی ڈرامہ کہا جا سکتا ہے۔ حقیقتاً ڈرامہ کو بھی فنی حیثیت سے پیش کرنے کا سہرا جدید نثری نصب العین ہی کے سر ہے لیکن اُس عہد میں ڈرامہ کی تخلیق انگریزی ڈراموں کے تراجم کی صورت ہی تک محدود رہی اور اوریجنل ڈرامے بہت کم لکھے گئے۔ انگریزی ڈراموں خصوصاً شیکسپیر کے ڈراموں کی قبولیت عام نے ہمارے ڈرامہ نگاروں کو اُن کے تراجم کی طرف بہت زیادہ متوجہ رکھا اسی وجہ سے طبعزاد ڈراموں کی اس عہد کی ادبیات میں بہت کمی رہی۔

شیکسپیر کے تمام شاہکار ڈراموں یعنی "رومیو جولیٹ" "کنگ لیر" "مرچینٹ آف وینس" "دی کمیڈی آف ایررس" "اوتھیلو" "ایز یو لائک اِٹ" "مڈ سمر نائیٹس ڈریم" "لوز لیبر لاسٹ" "ونٹرس ٹیل" اور "ٹمپسٹ" کے تراجم نہایت دلچسپی کے ساتھ کئے گئے۔ بلکہ بعض ڈراموں کے تو متعدد تراجم شائع ہوئے۔

سب سے پہلے ۱۸۹۳ء میں کنگ لیر کا ترجمہ اسی نام سے لالہ سیتا رام نے کیا جو بیحد مقبول ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں "اوتھیلو" کا ترجمہ "جعفر" کے نام سے منشی احمد حسین خاں نے کیا اور اسی سنہ میں "مرچینٹ آف وینس" کا ترجمہ "چاند شاہ سوداگر" کے نام سے لاہور میں طبع ہوا، اور اسی سال امراؤ علی نے "جہانگیر" کے نام سے "ہیملٹ"

کا ترجمہ پیش کیا۔

سنہ ۱۸۹۶ء میں "دی کمیڈی آف ایررس" کا ترجمہ مرادآباد میں فیروز شاہ خاں نے "بھول بھلیاں" کے نام سے شائع کیا، اور سنہ ۱۹۰۸ء میں "ٹمپسٹ" کا ترجمہ "تیر نگاہ" کے نام سے کیا گیا۔

سنہ ۱۸۹۸ء میں "مرچینٹ آف وینس" کا دوسرا ترجمہ عاشق حسین نے کیا۔

سنہ ۱۸۹۹ء میں "لوز لیبر لاسٹ" کا ترجمہ "یاروں کی محنت برباد" کے نام سے شائع ہوا۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں آغا حشر کاشمیری نے "بزم فانی" کے نام سے "رومیو جولیٹ" کا ترجمہ کیا اور اسی سال ایک دوسرا ترجمہ "ویٹرٹلیس" کا موسوم بہ "مرید شک" شائع ہوا۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں دوسرا ترجمہ "ہیملیٹ" کا "خونِ ناحق" کے نام سے مہدی حسن خاں نے کیا، اور "ایرِ یولائٹ" کا ترجمہ "دلپذیر" کے نام سے شائع ہوا۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں "رومیو جولیٹ" کا دوسرا ترجمہ موسوم بہ "گلنار فیروز" مہدی حسن خاں نے کیا۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں "ملٹ سمر نائٹس ڈریم" کا ترجمہ "جامِ الفت" کے نام سے کیا گیا۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں "ہیملٹ" کا تیسرا ترجمہ "واقعۂ جہانگیر ناشاد" کے نام سے مرزا نذیر بیگ نے کیا۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں "رومیو جولیٹ" کا تیسرا کامیاب ترجمہ "عشق فیروز لقا و گلنار سیر" کے نام سے نذیر بیگ نے پیش کیا۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں "دی کمیڈی آف ایررس" کا دوسرا ترجمہ اسی نام سے لالہ سیتارام نے مرادآباد میں شائع کیا۔

غرضیکہ اِس طرح ڈراموں کے تراجم کی کثرت نے ایک طرف تو مشہور ڈرامہ نگاروں کو ڈراموں کے تراجم کی طرف مشغول کردیا اور دوسرے اس تحریک سے اوریجنل ڈراموں کی تخلیق میں ایک زبردست تیز رفتاری پیدا ہوگئی جس کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔ اور اس عہد میں تو یہ فن حدِ کمال پر پہونچ گیا ہے۔ رونق بنارسی، طالب بنارسی، احسن لکھنوی، بیتاب دہلوی، اور آغا حشر کشمیری کامیاب متقدمین ڈرامہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ عہدِ حاضر کے ڈرامہ نگاروں میں امتیاز علی تاج، دل لکھنوی، آرزو لکھنوی اور کمال امروہوی قابلِ ذکر ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم اور بیتاب دہلوی مشاہیر ڈرامہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

اس اصلاحی رُجحان نے ادبیاتِ اُردو میں جو وسعت پیدا کی اُس کا اندازہ محال ہے۔ صرف اس کا نتیجہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اگر ہم عہدِ اصلاح اور مابعد کے نثر نگاروں اور اُن کے کارناموں کا شمار کریں تو اس کا ایک ضخیم سرمایہ جمع ہو سکتا ہے۔ عہدِ اصلاح سے اس وقت تک ہر فن اور ہر ایک موضوع پر جس قدر تصانیف موجود میں آئیں آج اُن سے اُردو ادب کا دامن مالا مال ہے۔ تصنیفات کے اس نہ ٹوٹنے والے سلسلے نے جہاں اُردو ادب کو مالا مال کر دیا ہے وہاں اس کو چند ایسے خصائص سے بھی روشناس کرایا ہے جو عہدِ اصلاح کے

عہد ماقبل میں محروم تھے۔ عہد اصلاح سے قبل کے نثری کارناموں میں کسی خاص اسلوب کے اتباع کا جذبہ معدوم تھا۔ لیکن جدید ترین رجحان نے اس قدیمی متنوعہ نگارشں کو فنا کردیا اور چند ایسے بنیادی خصائص کو اس کی جگہ قائم کیا جو آج تک مصنفین کی رہبری کر رہے ہیں اور خلاق قلم اور انشاپرداز اپنے نقوش فکریہ کو اسی داغ بیل پر ثبت کرتے چلے آ رہے ہیں۔

عزم بلند

(حضرت محوی صدیقی لکھنوی)

آیئے معجزۂ عشق نمایاں کردیں
ذرّے ذرّے کو جمالِ رخِ جاناں کردیں

زندگی کے لئے پیدا رہِ امکاں کردیں
دل میں ہم شمعِ تمنّا کو فروزاں کردیں

کیوں نہ ہم عشرتِ جاوید کا ساماں کردیں
کیوں نہ اب دل کو نثارِ غمِ جاناں کردیں

فطرتِ بندۂ آزاد بدلنا ہے محال
قتل کردیں، وہ ہمیں داخلِ زنداں کردیں

شیوۂ ضبط اگر رخصتِ گریہ دیدے
قطرۂ خونِ جگر زینتِ مژگاں کردیں

بحر و بر، ابر و ہوا، پھر ہوں ہمارے محکوم
آ کہ زندہ روشِ عزمِ سلیماں کردیں

دیکھ لے حوصلۂ ذوقِ جنوں پھر دنیا
چاک افسردگیِ دل کا گریباں کردیں

ہمتِ عشق بنا دیتی ہے بگڑے ہوئے کام
ہم جو چاہیں تو بیاباں کو گلستاں کردیں

دور کر جلوۂ ماضی رخِ زیبا سے نقاب
تاکہ ہم اپنے شبستاں میں چراغاں کردیں

دلِ ناکام ہے اور حسرتِ آزادیِ ہند
آگیا وقت کہ برپا کوئی طوفاں کردیں

خلشِ بیم و رجا کیوں رہے باقی محوی
کیوں نہ دل کو رہِ مقصود میں قرباں کردیں

جوش کی شاعری پر سرسری نظر

از عبادت یار خاں عبادت بریلوی، ایم۔ اے، بی۔ اے (آنرز)

ابھی کل کی بات ہے کہ ہماری شاعری کی بے مائگی پر ہر شخص نوحہ خواں تھا، اکثر اصحاب تو اس کا مطالعہ بھی کسرِ شان سمجھتے تھے، بعض اس کی اصلاح کے خواہاں تھے تو بعض پرانی لکیر کے فقیر ہی بنے رہنے میں اپنا کمال اور اپنی شاعری کی معراج تصور کرتے تھے۔ حالی نے ہماری شاعری میں اصلاح کرنے کی کوشش کی اور اُن کے بعد سے ایک جدید قسم کی شاعری کی بنیاد پڑی جس کا سب سے بڑا اور پہلا شاعر ہمیں اقبال کو سمجھنا چاہیئے۔ اُس زمانے میں کس کو معلوم تھا کہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب اُردو شاعری میں اقبال اور جوش ایسے شاعر اپنی شاعری سے چار چاند لگا دیں گے۔ اقبال نے تو اپنی ضیا پاشی سے کسی قدر اُردو شاعری کو اُسی زمانے میں جگمگانا شروع کر دیا تھا لیکن آفتابِ اقبال کے سامنے ماہتابِ جوش کی روشنی کا رنگ ذرا پھیکا پڑا ہوا تھا۔ قدرت نے جوش کو اس لئے محفوظ رکھ چھوڑا تھا کہ اقبال کے بعد کشتیٔ اُردو شاعری کا ناخدا بنایا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اقبال کے مکروہاتِ دنیا سے منہ موڑنے کے بعد موجودہ زمانے میں صحیح معنوں میں اگر کوئی شاعر ہے تو وہ جوش ہے۔ اُس نے اُردو کو اس بلند مرتبہ پر پہونچا دیا کہ غبارِ طعن و تشنیع کا اس کے دامن تک پہونچنا ناممکن ہے۔ علامہ کیفی فرماتے ہیں "ان کی شاعری نے ہم کو اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم آنکھیں نیچی کئے بغیر اُردو شاعری کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کے مقابلہ میں دیکھ سکتے ہیں۔"

جوش کو قدرت نے شاعر پیدا کیا ہے، چنانچہ اُنھوں نے نو سال ہی کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ لکھنؤ کی سرزمین پر سانس لینے کے باعث اُن کی شاعری نے شروع شروع میں وہی پُرانا رنگ اختیار کیا، یعنی اُنھوں نے بھی غزلیں کہیں، لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد غزل کی تنگ وسعتوں کے احساس نے انھیں نظم کے کشادہ اور وسیع میدان کی طرف مائل کیا اور وہ نظمیں کہنے لگے۔

ابتدا میں اُن کی شاعری نے جوانی کی گود میں پرورش پائی، اِسی لئے اُن کا ابتدائی کلام یا تو عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے یا جوانی و دوانی کی لطافتوں اور کیفیتوں کا نغمۂ دلآویز ہے۔ اس زمانے کی نظمیں جذبات و احساساتِ شباب کی جیتی جاگتی تصویروں کا مرقع ہیں۔ ان سے بہارِ عمر کی رنگینیاں ٹپکتی ہیں، ان کا لفظ لفظ شاہد ہے کہ حسین ساز کے نغمے ہیں اُس کا ہر پردہ اُمنگوں اور ترنگوں کا منبع ہے۔ "یہ کون اُٹھا ہے شرماتا" اِسی قسم کی ایک نظم ہے۔ اس نظم میں جوش نے محاکات، نادر تشبیہات و استعارات، صحیح تاثرات و نازک جذبات و احساسات کو جس نرالے انداز

سے یکجا کر کے پیش کیا ہے اس کی نظیر ادب اُردو میں تو کیا دنیا کے بڑے بڑے ادبیات میں ملنی مشکل ہے ذیل کے بند محاکات کی زندہ مثال ہیں :-

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا رَین کا جاگا، نیند کا ماتا
نیند کا ماتا دھوم مچاتا انگڑائیاں لیتا، بل کھاتا
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا ؟

رُخ پر سُرخی آنکھ میں جادو بھینی بھینی مُربل خوشبو،
بانکی چتون سمٹے ابرو نیچی نظریں، بکھرے گیسو،
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا ؟

نیند کی لہریں گنگا جمنی جِلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا مسکی ساری ہلکی منھدی دُھندلی بندی
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا ؟

اِن بندوں کے پڑھنے سے فوراً کسی مجسمۂ شباب کے سوکر اُٹھنے کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے، اور ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس تلمیذ الرحمٰن کو بے تاب جلوۂ دفور ادراک و احساس نے مجبور کیا کہ اِس کی وولعیت وہبی انھیں ایک دل فریب ہستی عطا کر کے عالمِ شہود میں لائے۔ اسی نظم کا ایک مندرجۂ ذیل بند ہے جس کے پڑھنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اسے واردات و محسوساتِ قلبی کو شاعرانہ انداز میں نظم کرنے کا کس قدر ملکہ ہے :-

چھیلا چھیلا آنکھ میں کاجل اُلجھا اُلجھا زلف کا بادل
نازک گردن پھول سی ہیکل سُرخ پپوٹے نیند سے بوجھل
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا ؟

محاکات اور اُس پر شاعرانہ رنگ آمیزی معراجِ شاعری نہیں تو کیا ہے؟ " سرخ پپوٹے نیند سے بوجھل " دیکھنے میں تو ایک معمولی سا مصرع ہے لیکن شاعری کے بے انتہا خزانے اس کے قدموں پر نثار نظر آتے ہیں۔ شاعر کی نظرِ دُوربین پپوٹوں تک پہونچی، اور اُس نے یہ دیکھ لیا کہ وہ نیند سے بوجھل ہو رہے ہیں۔ "بوجھل" ایسے ہندی لفظ نے کلام میں وہ لطف پیدا کیا ہے کہ بار بار پڑھکر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ الغرض ساری کی ساری نظم گوناگوں خوبیوں کا گلدستہ ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ ذکر تھا جوشؔ کی نوجوان شاعری کا اور بیان ہونے لگیں ان میں سے صرف

ایک نظم کی خوبیاں، خیر اس کو جملۂ معترضہ سمجھیے۔ آمدم برسرِ مطلب جوشؔ کی شاعری میں پہلے ہیں اسی قسم کی نظمیں ملتی ہیں۔ ان تمام نظموں کی خوبیاں بیان کرنا طول عمل ہے۔ بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ ایک تو جوشؔ کی حساس طبیعت اور پھر اس پر شاعری کا خداداد ملکہ سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے۔

جوشؔ نے ایسے گھر میں آنکھ کھولی جہاں کسی بات کی کمی نہ تھی، عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے سوا اس خاندان کے لوگ اور کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ دولت کی فراوانی ہونے کی وجہ سے افلاس و ادبار کی مصیبتوں سے آشنا ہی نہ تھے۔ جوشؔ نے دولت و ثروت کے سایہ میں جنم لیا، عیش و عشرت کی آغوش میں پرورش پائی، لڑکپن دنیا و مافیہا سے بے خبری میں گزرا۔ لیکن ہوش سنبھالتے ہی ہندوستان کی زبوں حالی نے دامنِ دل اپنی طرف کھینچا، ملک کی حالتِ زار دیکھ کر جوشؔ کا حساس دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اس زمانے کی سیاسی فضا نے بھی اُن پر کافی اثر ڈالا چنانچہ "شاعر کا اثیار" میں کہتے ہیں:-

تجھے خبر بھی ہے ہندوستاں کہ تیرے لئے — عمل پسند ہے غفلت شعار تھا جو شخص
رواں ہے دار و رسن کی طرف تری خاطر — اسیرِ حلقۂ گیسوئے یار تھا جو شخص
وہ آج نوکِ سناں کا ہے والہ و شیدا — ہلاکِ طرۂ گیسوئے یار تھا جو شخص
بنا ہوا ہے گدائے رہِ نگارِ دماغ — دیارِ دل کا کبھی شہریار تھا جو شخص
وہ آج تیغِ رواں کا ہے ہمدم و دمساز — رفیقِ سرو و لبِ جوئبار تھا جو شخص
وہ آج طنطنۂ طبلِ جنگ کا ہے امیں — انیسِ زمزمۂ آبشار تھا جو شخص
شعارِ مہرِ خزاں سے ہے آج گرمِ کلام — خطیبِ منبرِ ابرِ بہار تھا جو شخص
وہ آج صرصرِ خورشید سے ہے گرمِ ستیز — نسیمِ بیشۂ شبنم شعار تھا جو شخص

وہ آج صاعقہ بر دوش و سیل بر کف ہے
سمن بدست و چمن در کنار تھا جو شخص (شاعر کا اثیار)

چونکہ ہندوستان عرصے سے آزادی کی برکتوں سے محروم ہے اس لئے اس میں وہ تمام عیب پیدا ہوگئے ہیں جو اس حالت کا اقتضا ہیں، چنانچہ جوشؔ کا دل یہاں کے نوجوانوں کی غفلت شعاری پر بھی خون کے آنسو بہاتا ہے، اور بڈھوں کی زبوں حالی پر بھی ماتم کرتا ہے۔ اسی سلسلہ میں علامہ اقبالؔ بھی ایک جگہ کہتے ہیں:-

اے ہمالہ اے اٹک اے رودِ گنگ — زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب — نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر — خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر

ہندوستان کی غریبی و مفلسی کے المناک مناظر دیکھکر جوشؔ کا دل بھر آتا ہے اور کہیں ہم اس کا نتیجہ "حسن اور مزدوری" کی شکل میں دیکھتے ہیں اور کہیں "سرمایہ دار" "شہر یار" اور کہیں "مظلوم بچے" کی سی نظموں میں۔ ان نظموں میں سے ہر ایک نظم میں ان مناظر کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا اپنے دل میں ایک ٹیس سی محسوس کرتا ہے۔ اور غیر ممکن ہے کہ ایک حساس شخص ان کو پڑھنے کے بعد حرمان آزادی سے متنفر اور اور اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ آج یہ بات مسلم ہے کہ ہندوستان جتنا جوشؔ سے متاثر ہوا ہے کسی اور سے نہیں ہوا۔ نوجوانوں کے دلوں میں جو جذبہ جوشؔ کی نظموں سے انگڑائیاں لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے وہ شاید پچاس سال کی پیہم سیاسی جد وجہد کے بعد بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ جو شخص جوشؔ کا کلام محض ایک نظر غلط انداز سے دیکھتا ہے وہ بھی آزادی کی دیوی کا دالہ و شیدا ہو جاتا ہے۔ اور فوراً اُس سے ہم کنار ہونے کی کوشش کرنے لگتا ہے، سرمایہ داری سے اس کو نفرت ہو جاتی ہے۔ اُس کا دل ہندوستان کی اَن گنت مخلوق کی حالتِ زار پر خون کے آنسو بہانے لگتا ہے۔ سرمایہ داری کا خونی دیوتا اپنے خون آلود جبڑے کھولے انسانی جانوں کا شکار کرتا ہوا اس کی آنکھوں میں بھی کھٹکنے لگتا ہے۔ اسے اپنے ماحول سے نفرت ہو جاتی ہے اور اُس کو بدل دینے کی خواہش اُس کے دل و دماغ کے اندر ایک فوجی بینڈ سا بجایا کرتی ہے جس سے اس کے جسم کے ایک ایک رگ و ریشے میں دریائے انقلاب موجزن ہو جاتا ہے۔

جوشؔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ دَور کو بدلنے کے لئے انقلاب کے ایک سیلاب کی ضرورت ہے خواہ وہ انقلاب کسی قسم کا ہو، گویا امن وچین کی دنیا بسانے کے لئے، دوزخ کو جنت میں تبدیل کرنے کے لئے، غریب و مفلس کو پیٹ بھر روٹی دینے کے لئے، انسانوں کو جبر واستبداد کے خونی دیوتا کے خون آلود جبڑوں سے بچانے کے لئے اس فضا کو بالکل بدل دینا نہایت ضروری ہے۔ انقلاب کے اِس سیلاب کو لانے کے لئے نوجوانوں کے گرم خون کے تُند رَو دھارے کی ضرورت ہے جس کے سامنے مضبوط سے مضبوط اور طاقتور سے طاقتور چیزیں ہیچ ہو جاتی ہیں اور جو آہنی ٹینک (Tank) کی طرح اپنا راستہ بناتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں:-

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب میرا نعرہ انقلاب وانقلاب وانقلاب

جوشؔ کی نگاہِ دُور رس اس بات کو اچھی طرح دیکھ لیتی ہے کہ ہندوستان انقلاب کے دروازے پر کھڑا ہے، نوجوان بھرے ہوئے ہیں بھوک سے دل تنگ ہیں، یہاں لوگوں کو آرام و آسایش تو درکنار، ایک لمحہ کا سکون بھی میسر نہیں اور اس کا لازمی نتیجہ انقلاب کی صورت میں رونما ہونے والا ہے" وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہ ہندوستان کے نام" میں اسی چیز کو چند اشعار میں ظاہر کیا ہے:-

نوجواں بھرے ہوئے ہیں بھوک سے دل تنگ ہیں ذرے ذرے سے عیاں آثار حرب و جنگ ہیں

کشورِ ہندوستاں میں رات کو ہنگامِ خواب
کروٹیں لیتا ہے رہ رہ کر فضا میں انقلاب

گرم ہے سوزِ بغاوت سے جوانوں کا دماغ
آندھیاں آنے کو ہیں اے بادشاہی کے چراغ

ہم وفادارانِ پیشیں، ہم غلامانِ کہن
قبر جن کی کھُد چکی تیار ہے جن کا کفن

تُند رو دریا کے دھارے کو ہٹا سکتے نہیں
نوجوانوں کی اُمنگوں کو مٹا سکتے نہیں

مدح اب ڈر ڈر کے ہم کرتے ہیں یوں سرکار کی
جیسے کوئی دھار چھوتا ہو ننگی تلوار کی

آپ سے کیونکر کہیں ہندوستاں پر ہول ہے
آپ کا نام آگ ہے اور کانگریس پٹرول ہے

وہ سرنگیں کھُد رہی ہیں الحفیظ و الاماں
صرف انگلستان کیا یورپ سما جائے جہاں

... ...

چونکیئے جلدی ہوائے تند و گرم آنے کو ہے
ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

یہ اور اسی قسم کی دوسری نظمیں پڑھنے کے بعد اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ جوش کے کلام میں جوش ہے، اُمنگ ہے، اور ایک جارحانہ انداز ہے۔ جوش کا کلام اُن شاعروں کا کلام نہیں جن کے دل بجھے ہوئے تھے، جو صرف اپنی قوم کا دکھڑا ہی رو سکتے تھے اور اُس کے مداوائے مصیبت سے عاجز و قاصر تھے۔ اس سے قبل کی اُردو شاعری میں قنوطیت (Pessimism) بہت زیادہ غالب تھی اور شاید اقبال اور جوش سے قبل ایک شاعر بھی ایسا نہ ہوگا جو قنوطیت کے رنگ میں رنگا ہوا نہ ہو۔ وہ زانوئے فکر سے سر اُٹھانا ہی نہ جانتا تھا، وہ عمل کی دنیا میں اپاہج تھا۔ اُس کو سوائے زاری و نالی کے اور کچھ آتا ہی نہ تھا۔ لیکن یہ سب کچھ اس کا کیا دھرا نہ تھا، وہ مجبور تھا، یہ طرز اختیار کرنے کے لئے جب پیہم ناکامیوں کی آندھیوں کے تُند جھونکوں سے اُمنگوں کا چراغ بجھ جاتا اور دل کی دنیا پر اُداسی کے بادل چھا جاتے ہیں تو ہمت و شجاعت، تدبر و کیاست کے باوجود انسان روشنیِ اُمید سے مایوس ہو جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال اور جوش نے پیدا ہو کر اس قنوطیت کو موت کے گھاٹ کیونکر اُتارا۔ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ دنیا میں ہر چیز کا کوئی نہ کوئی ردِّعمل (Reaction) ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم عرصے تک قعرِ ذلت میں پڑی رہتی ہے اور اُس کی پستی اپنی پست ترین حدوں تک پہونچ جاتی ہے تو فطرت اُسے خود جھنجھوڑیاں دے کر خوابِ غفلت سے جگا دیتی ہے اور اُس میں اپنی ذلت کا احساس پیدا کر دیتی ہے، وہ جمود و خمود کی زنجیریں اُکھاڑ پھینکتی ہے اور شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو جاتی ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کا جواب روس، فرانس، اٹلی، ایران اور ٹرکی کی کتب تاریخ باآوازِ بلند دے رہی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہر قوم کا لٹریچر اس قوم کی حالت کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور چونکہ سب سے زیادہ حسّاس انشا پرداز

اور شاعری ہوا کرتے ہیں، اس لئے پہلے پہل اس چیز کا علم انہیں کے ہاتھوں بلند ہوتا ہے Rousseau Voltaire نے اپنی تحریروں سے سارے فرانس کو ہلا دیا۔ روس کے Pushkin، Tolstoy، Maxim Gorki اور Gogol اور Mayakovsky کی آتش زبانی نے نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ ساری دنیا میں آگ لگادی۔ ممکن ہے کہ وہ پرانا نظام کچھ دنوں اور باقی رہے لیکن وہ دم توڑ رہا اور ہچکیاں لے رہا ہے، اس کے جانبر ہونے کی توقع نہیں دنیا کی تاریخ اِس بات کی شاہد ہے کہ عوام کے دلوں میں بیداری کی روشنی جلوہ گر کرنے میں زیادہ حصہ شاعروں اور انشا پردازوں کا ہے۔ پھر بھی ادب برائے ادب (Art for Art's sake) پر ایمان رکھنے والے اس کا نعرہ لگاتے چلے جاتے ہیں کیسا غضب ہے کہ اس انتشار و اختلال کے زمانے میں بھی یہ صدائے بے ہنگام فضا میں گونجتی رہے، اور ان بے معنی ترانہ الاپنے والوں پر ماحول کا مطلق اثر نہ ہو لیکن ان کو اُن کے حال پر چھوڑئیے اور دیکھیے کہ زمانہ کی عام حالت کیا رہی ہے۔ دُور کیوں جائیے، اُردو شاعری ہی کو لے لیجئے، میر سے جوش تک دیکھ جائیے آپ کو ہر ایک شاعر کے زمانے کی جھلک اُس کے کلام میں نظر آئے گی۔ لیکن ہم میر سے اس بات کی توقع نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی پریشانیوں کو چھوڑ کر ہندوستان کے عام لوگوں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو قلمبند کرتے کیونکہ ابھی اِن باتوں کا زمانہ نہیں آیا تھا اور یہ اُن کی طبیعت کے بھی خلاف تھا۔ لیکن غالب تک آتے آتے ہم کو ایک بدلتا ہوا رنگ نظر آتا ہے۔ غالب گو کہ ایک گوشہ نشین شاعر تھے پھر بھی انگریزوں کی شان میں قصائد لکھنے کے باوجود غدر ۵۷ء کے ہنگامے میں دلّی کے لوگوں کی حالت دیکھکر تڑپ ہی گئے اور یہ شعر زبانِ قلم پر آ ہی گئے:۔

بسکہ فعّالِ ما یُرید ہے آج　　ہر سلحشور انگلستاں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے　　گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک　　آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
مَیں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا　　وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ مل کر کیا کئے شکوہ　　سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم　　ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

جوش بھی اپنے زمانے کے اثرات سے اپنا دامن نہ بچا سکے، جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہے۔ وہ زیادہ تر شہروں سے دُور دیہاتوں میں رہے ہیں، اس لئے دیہات سے متعلق واقعات نظم کرتے ہیں۔ ایک نظم میں گاؤں کے ایک بازار کا نقشہ کھینچا ہے۔ یوں تو ساری کی ساری نظم مرقع ہے لیکن ایک شعر سونے کے حرفوں میں لکھنے

کے قابل ہے، کہتے ہیں:-

ماؤں کے کاندھوں پہ بچے گردنیں ڈالے ہوئے
بھوک کی آنکھوں کے تارے پیاس کے پالے ہوئے

اِس شعر میں تمام خوبیاں ایک جگہ جمع کردی گئی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو غریبوں سے کس قدر ہمدردی ہے اسی وجہ سے فوراً اُس کی نگاہیں ایسے مناظر پر پڑ جاتی ہیں۔ یہ نظم پڑھکر گاؤں کے بازار کی تصویر ہوبہو آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور اس پر خیال رکھکر اگر نظر دوڑائی جائے تو طرح طرح کے دل ہلا دینے والے خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ بھوک کی آنکھوں کے تارے، پیاس کے پالے ہوئے، حقیقی مصوری اسی کا نام ہے۔

ہندوستان کی بُری حالت ہے لیکن اِن سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی کچھ لوگ ہیں جو گرفتار کفر و ایماں" ہیں۔ مذہب ان کی نظروں میں ایک عجیب چیز ہو کر رہ گیا ہے۔ جس چیز کو انھوں نے مذہب سمجھ رکھا ہے، وہ مذہب کی انتہائی مہیب اور بھیانک شکل ہے۔ وہ ایک ایسا دیوتا ہے جو انسانوں کی بھینٹ مانگا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستان میں آئے دن کہیں نہ کہیں ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کا گلہ کاٹنے کو اچھے اور اپنے مذہب کے لئے فخر سمجھتا ہے۔ ہندو مسلمان کے خون کا پیاسا ہے اور مسلمان ہندو کے۔ آج مذہب کو جس رنگ میں ہندوستان پیش کر رہا ہے اُس سے مذہب کو دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ مذہب تو انسان کو چین و آرام کی زندگی دینے کے لئے آیا تھا۔ انسان کو مہذب اور صحیح معنوں میں انسان بنانے کے لئے آیا تھا لیکن آج مذہبی دیوانے یہ سب کچھ فراموش کر چکے ہیں۔ اُن کے مذہب کا اولین اصول تعصب ہے جو در حقیقت نوع انسان کے لئے ایک بدترین لعنت ہے۔ جوش ایسے مذہب کو دُور ہی سے سلام کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ مذہب نہیں تعصب ہے اور تعصب اُن کے خیال میں نوع انسان کے حسین اور خوبصورت چہرے پر بدنما داغ ہے۔ اس لئے ہر سمجھدار انسان کو ایسے مذہب کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ جوش مذہبی جنون کا رونا یوں روتے ہیں:-

آہ اسے ہندوستاں اے مفلسوں کی سرزمیں
اِس گڑھے پر کوئی تیرا پوچھنے والا نہیں

آہ اک دل بھی ترے افلاس پر ہلتا نہیں
اب تو اک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے ملتا نہیں

ہندو و مسلم نہیں اُٹھتے تری امداد پر
تُف ہے ایسی بے حمیت ناخلف اولاد پر

ہائے کیا کرنا تھا ان کو، اور کیا کرتے ہیں یہ
گائے اور باجے پہ لڑنے کے لئے مرتے ہیں یہ

اِس طرف سے خوبی قسمت سے باجا اور گائے
اُس طرف افلاس کے مارے ہوؤں کی ہائے ہائے

ناخلف بچے تری جانب نظر کرتے نہیں
ان کو جس میدان میں مرنا چاہیئے مرتے نہیں

سخت ہو جاتی ہے اس سے ہر کڑی زنجیر کی
مار کر اپنوں کو مرنا موت ہے خنزیر کی

ان سے کہدو تا کجا بربادیاں، آباد ہو
یا گلے خود کاٹ کر مر جاؤ یا آزاد ہو

اِس قسم کی بہت سی نظمیں کہی ہیں مثلاً "دردِ مشترک" "حبِ وطن اور مسلمان" "قتال کا منور" وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جوش ان تمام باتوں کا ماتم کرتے ہیں لیکن اس کا کوئی علاج نہیں بتلاتے۔ وہ جس چیز کو بھی بُرا کہتے ہیں اُس سے اظہارِ بیزاری مقصود ہوتا ہے، مگر وہ اسی پر قناعت نہیں کرتے، وہ ایک ایسی اسکیم بھی تیار کرتے ہیں جس سے ہندوستان صحیح معنوں میں "جنّت نشان" بن جائے۔ جوش تخریبی نہیں بلکہ ایک تعمیری شاعر ہیں، وہ انقلاب کے حامی ضرور ہیں، دیکھنے والے کہیں گے کہ انقلاب بذاتِ خود ایک بھیانک اور بہت بڑی تخریبی چیز ہے جس میں لاتعداد انسانوں کے سر انقلابیوں کی ٹھوکروں میں نظر آتے ہیں۔ زمین انسانی خون سے لالہ زار بن جاتی ہے، آسمان خون کے آنسو بہاتا ہے، ہر طرف خون کے فوّارے چھوٹتے دکھائی دیتے ہیں، گوشہ گوشہ میں ہنگامہ و فساد کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اس قدر خونریزی کے بعد انقلاب کی خون آشام دیوی کو چین کی آغوش میں آرام کی نیند آتی ہے۔ تخریب کو تعمیر سے کیا نسبت؟ سب کچھ صحیح اور حرف بحرف صحیح۔ لیکن معترضین نے عقل کی روشنی میں کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اس تخریب کے بعد انقلاب ایک ایسی دنیا تعمیر کرتا ہے کہ اس کو جنت سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ درحقیقت انقلاب ذریعہ ہے ایک ایسے نظام کے قائم کرنے کا جس میں غریبوں کو پیٹ بھر روٹی ملتی ہے، جس میں مزدوروں کو بھی انسان سمجھا جاتا ہے، جس میں صحیح معنوں میں کسان "ارتقا کا پیشوا" اور "تہذیب کا پروردگار" خیال کیا جاتا ہے جس میں انسانیت دین و ایمان سمجھی جاتی ہے۔ جوش بھی انقلاب کو ایک نئے نظام کی تعمیر کا ذریعہ سمجھتے ہیں جس چیز کو بھی وہ بُرا سمجھتے ہیں اور مٹانا چاہتے ہیں اُس کا بدل اپنی طرف سے پیش کرتے ہیں جو اُس کی جگہ لے لے، ہندوستان کے ہندو مسلم مناقشات سے تنگ آکر اس کو موت کی نیند سُلانے کا ایک لائحہ عمل یہ پیش کرتے ہیں:۔

بت سے جھوٹے "کفر و ایماں" کو مٹا ڈالونگا میں	ہڈیاں اس کفر و ایماں کی چبا ڈالونگا میں
ولولے میرے بڑھیں گے ناز فرماتے ہوئے	فرقہ بندی کا سرِ ناپاک ٹکراتے ہوئے
ڈال دوں گا طرحِ نو اجمیر اور پریاگ میں	جھونک دونگا کفر و ایماں کو دہکتی آگ میں
کر خود گنگا کو اِک مرکز پہ لانے کے لئے	اِک نیا سنگم بناؤں گا زمانے کے لئے
ایک دینِ نو کی لکھوں گا کتابِ زرفشاں	ثبت ہوگا جس کی زرّیں جلد پر ہندوستاں
اس نئے مذہب پہ سارے تفرقے وارونگا میں	تجھ پہ پھر گردن ہلا کر قہقہے ماروں گا میں
پھر اُٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا	گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا،
خون میں لتھڑی لباسِ "کفر و دیں" اُلٹے ہوئے	فخر سے سینے کو تانے آستیں اُلٹے ہوئے

ولولوں سے برق کے مانند لہرایا ہوا
موت کے سایہ میں رہ کر موت پر چھایا ہوا

چونکہ جوش ایک حقیقی شاعر ہیں اور ایک حقیقی شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک چیز کو لے لے، اور اسی پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھے اور دوسری اور تمام باتوں کے لئے اپنی فکر کا دروازہ بند کر دے۔ اس لئے ان کے کلام کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں، کہ جوش نے انقلاب کی خون آشامیوں ہی کو اپنی نظموں میں جگہ نہیں دی، غریبوں کے دُکھڑے ہی کو نہیں رویا کئے۔ ہندوستان کی زار و زبوں حالت ہی پر خون کے آنسو نہیں بہایا کئے، بلکہ اس کے علاوہ دوسری چیزوں کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ حیرت ہوتی ہے جب ہم انقلاب کی ہنگامہ آرائیوں کے دوش بدوش اس قسم کی شاعری جوش کے یہاں دیکھتے ہیں جسکو رنگین شاعری کہا جاتا ہے۔ انھیں ایسی چیزوں میں بھی حُسن نظر آتا ہے جو بظاہر ہماری آنکھوں کو اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ ایسے موقع پر جوش اس حُسن کو اپنی نظر سے نہیں اور لوگوں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کوہستانِ دکن کی عورتوں کو دیکھکر اُن پر حقارت کی نظر نہیں ڈالتے اور نہ اُن پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے گزر جاتے ہیں، وہ ان کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور طرح طرح کے خیالات اُن کے دماغ میں موجیں مارنے لگتے ہیں، اور وہ اُن کی جوانی کی تعریف میں اچھا خاصہ قصیدہ لکھ دیتے ہیں:-

یہ اُبلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے رُوپ میں

واہ کیا کہنا ترا اے حسنِ ارضِ آفتاب
یہ برشتہ رنگ یہ تپتے ہوئے سنگیں شباب

ہر سراپا بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل
آتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

چال جیسے تند چشمے، تیوریاں جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال

عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز تیموریا شباب

یہ جواں چہرے ہیں اور چہروں میں برنائی کا جوش
تو کہ آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش

جسم میں ہیں کچھ اس قدر ٹھوس الحفیظ و الاماں
لیجئے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں

مچھلیاں شانوں کی اُبھری سی ہٹی سی کاکلیں
آہن و فولاد کے پٹھے سلاخوں کی رگیں

دید کے قابل ہے ان کا فربتوں کا رنگ روپ
کھپ چکی ہے جسمیں بارش ڈس چکی ہے جسکو دھوپ

اِن بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی الاماں
پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہیں یہ جواں

کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنھیں
آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنھیں

کیا خبر کتنے دلوں کی جوش پامالی ہوئی
اِن اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

کوہستانِ دکن کی عورتوں کا حسن و شباب کس کو پسند ہوگا؟ کسی کو ہو یا نہ ہو لیکن ہمارا شاعر تو اس کو ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اُن کے حسن و شباب نے خدا جانے کتنے دلوں کو زخمی کیا ہوگا، یہ خیال ہمارے شاعر کے دل میں موجیں مارنے لگتا ہے اور وہ یہ شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے:۔

کیا خبر کتنے دلوں کی جوشؔ پامالی ہوئی ان اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

جب ایک شاعر ایسی چیزوں کو جو بظاہر انسان کا دل نہیں لبھاتیں اس خوبی سے بیان کرتا ہے تو پھر وہ ان چیزوں کا ذکر کرنے میں اپنی جادو بیانی سے کیا قیامت برپا کرتا ہوگا جو بذاتِ خود حُسن کی دولت سے مالامال ہوتی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ جوشؔ جس خوبی سے اِن چیزوں کو بیان کرتے ہیں اس کا بیان الفاظ میں مشکل ہے۔ وہ چیز محسوس کی جاسکتی ہے بیان نہیں کی جاسکتی، اور شاعری تو محسوس کرنے کی چیز ہی ہے۔ "جنگل کی شہزادی" ان کی مشہور نظم ہے۔ اس میں ایک لڑکی کی تعریف جن الفاظ میں کی ہے وہ حقیقتاً دنیا کے ادب میں سونے کے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے:۔

کاندھوں پہ خوبصورت اِک بانسری پڑی ہے دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے
زاہد فریب گل رُخ، کافر دراز مژگاں، سیمیں بدن، پری رُخ، نوخیز حشر ساماں
خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر نازک بدن، شکرلب، شیریں ادا، فسوں گر
کافرادا، شگفتہ، گُل پیرہن، سمن بو، سروِ چمن، سہی قد، رنگیں جمال، خوش رُو
گیسو کمند، مہوش، کافور فام، قاتل، نظارہ سوز، دلکش، سرمست، شمعِ محفل
ابرو ہلال میگوں، جاں بخش روح پرور نسریں بدن، پری رُخ، سیمیں عذار دلبر

... ...

حوریں ہزار دل سے قربان ہوگئی ہیں
رنگینیاں سمٹ کر انسان ہوگئی ہیں

جوشؔ کی طبیعت اتنی رنگین اور حُسن پرست ہے کہ جس کا بیان الفاظ میں نہیں ہوسکتا۔ ہر خوبصورت چیز ان کا دل لبھاتی ہے۔ حُسن اُن کو اس قدر مرغوب ہے کہ وہ اسی میں گم ہو جانا چاہتے ہیں۔ اُن کے خیال میں زندگی کا سارا لُطف حُسن سے وابستہ ہو جانے میں ہے۔ ایسی ایسی چیزیں جن کو انسان دیکھ تو سکتا ہے لیکن اپنے قبضہ میں نہیں کرسکتا وہ اُن تک بھی پہونچنے کی آرزو میں رہتے ہیں اور اس منزل پر پہونچکر اُن کی شاعری Idealistic قسم کی شاعری ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر وہ ایسی ایسی باتیں بیان کرتے ہیں اور تخیل کا رنگ دیگر ان کو ایسا دل فریب بناتے ہیں کہ بے اختیار منہ سے واہ نکل جاتی ہے۔ شاعری اور پھر Idealistic

شاعری۔ خدا جانے شاعر کے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہیں اور وہ ان کو نظم کرتا چلا جاتا ہے، اور چونکہ شاعری کے اس میدان کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں اس لئے ان کا کلام ایسے موقع پر رنگین تصویروں کا ایک مرقع بن جاتا ہے۔ سیر گردوں کے عنوان سے ایک نظم لکھ دیتے ہیں :۔

اُف دامنِ شفق کا انداز دلستانی
کلیاں تو ہیں گلابی اور گوٹ آسمانی

تا دور اک سنہرا دریا بھرا ہوا ہے — خونِ سخن رگوں میں لہریں سی لے رہا ہے
جی چاہتا ہے ہوتی ہیرے کی ایک کشتی — کشتی پہ ساتھ ہوتا اک مستِ ناز ساقی

جوئے شفق کے اندر کشتی کو ڈال دیتا
ارض و سما کو اپنے دل سے نکال دیتا

مجھ سے قریب ہوتا گردوں کا بامِ رنگیں — ساقی کی بانسری پر سنتا کلامِ رنگیں
صحت کا میری ساغر اک لالہ فام پیتا — پہروں خمِ شفق سے بھر بھر کے جام پیتا
تصویرِ آرزو میں رنگِ نشاط بھرتا — اس وقت تک برابر گردوں کی سیر کرتا

جب فرطِ دلبری سے ہلکی سی تیرگی میں
منھ دیکھتے ہیں تارے شبنم کی آرسی میں

"گریۂ مسرت" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں تالاب کی موجوں کا بیان پڑھکر معاً Southey کا خیال آجاتا ہے، ایک ایک لفظ سے موجوں کی سی آواز پیدا ہوتی ہے، الفاظ اور ان کی بندش ہی سے موجوں کی روانی کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

روحِ طوفاں دربغل کف در دہاں — لو سنو کس طرح تھیں موجیں رواں
جھاگ اڑاتی پھاندتی اڑتی ہوئی — کپکپاتی، لوٹتی، مڑتی ہوئی
چلبلی ابھری ہوئی، نکھری ہوئی — چیختی، سر پھوڑتی، بپھری ہوئی
بجلیاں دامن میں چمکاتی ہوئی — پتھروں کو چھانٹتی، دھوتی ہوئی
گرتی پڑتی، مست سر دھنتی ہوئی — مرتعش قالین سا بنتی ہوئی
زیر و بم کا تار دکھلاتی ہوئی — اُٹھ کے بڑھتی، گر کے چکراتی ہوئی
گاتی، لہراتی، گرجتی، ہانپتی — دوڑتی، بڑھتی، سمٹتی، کانپتی
تو کہے دریا میں تھا غرقِ نمو — یار کی کڑیل جوانی کا لہو

(عثمان ساجی)

مناظرِ قدرت کا نظم کرنا دنیائے شاعری میں اُس وقت سے ملتا ہے جب سے انسان نے شاعری شروع کی۔ ہندوستان ہی کو لیجیے۔ سنسکرت کا پُرانا لٹریچر اس سے بھرا پڑا ہے۔ کالی داس نے جہاں کہیں بھی مناظر قدرت کی تصویر کھینچی ہے وہاں اس کے ڈراموں میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے۔ رامائن میں تلسی داس نے جس خوبی سے قدرتی مناظر کا نقشہ کھینچا ہے اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ غرضیکہ دنیا کا کوئی لٹریچر مناظر قدرت کے بیان سے خالی نہیں۔ سنسکرت اور بھاشا میں تو نیچر کی خوبیوں کا بیان ملتا ہے لیکن اُردو شاعری میں کہیں اس کا پتہ چلتا ہے تو مرثیوں میں۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انیس کا مرتبہ اس میں بہت بلند ہے۔ کہیں کہیں مثنویوں میں بھی یہ چیز مِل جاتی ہے لیکن جوش اس خصوص میں سب سے گوئے سبقت لے گئے۔ اُنھوں نے نیچر کو ایک فن کار (Artist) کی طرح پیش کر کے اُردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے، وہ نیچر میں روحانیت نہیں ڈھونڈتے بلکہ اس میں حسن محسوس کرتے ہیں، اور جب اس کی تصویر کھینچتے ہیں تو اپنی خداداد شاعرانہ قوت سے اس میں چار چاند لگا دیتے ہیں:-

جھٹپٹے وقت کا ہے سناٹا ابر چھایا ہوا ہے ہلکا سا
شام کی تیرگی سے ہیں مدھم دشت میں رہرووں کے نقشِ قدم
کس تکلف سے چل رہی ہے ہوا جیسے کوئل کی وادیوں میں صدا
دھیمی دھیمی ہواؤں کا ہے اثر گھاس کے نرم نرم ریشوں پر (پیشگوئی)

یا ایک جگہ ایک منظر کا بیان یوں کرتے ہیں:-

پارہ پارہ ابر، سُرخی، سرخیوں میں کچھ دھواں بھولی بھٹکی سی زمیں کھویا ہوا سا آسماں
پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

یا ایک اور نظم میں کہتے ہیں:-

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور تھا پچھلا پہر موجزن سیال چاندی تھی بساطِ خاک پر
بولنے والی تھیں کلیاں ہنسنے والے تھے گلاب جھلملاتے تھے ستارے جھک چلا تھا ماہتاب (انتظار کی رات)

ہر ملک و قوم کی شاعری اُس کے سماج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ کسی ملک کی شاعری کو لیجئے وہاں کے رسومات وغیرہ اُس کے آئینہ میں جھلکتی نظر آئیں گی۔ اس ملک کے بڑے بڑے لوگوں کے نام وہاں کے شعرا بڑے شد و مد سے لیں گے۔ اُردو شاعروں کی اس حالت پر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ اُنھوں نے کبھی بھی اس کا خیال نہ کیا۔ اور چونکہ شروع ہی سے اس شاعری کی بنیاد فارسی پر رکھی گئی تھی اور حقیقتاً فارسی کی نقل اُتاری گئی تھی اس لئے تمام وہ خصوصیات جو فارسی شاعری میں موجود تھیں اس میں بھی آگئیں۔ آنے والے شعرا

نے بھی اپنے آپ میں اتنی ہمت نہ پائی کہ اس کے خلاف بغاوت کریں اور نئی نئی راہیں نکالیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ :-

خشتِ اول چوں نہد معمار کج تا ثریا مے رود دیوار کج

کے مصداق اُردو شاعری کی عمارت ویسی ہی بے ڈھنگی بنتی رہی، اس میں دیسی چیزوں کا ہمیشہ سے فقدان رہا محمد شاہ کے زمانے کے شعراء کے وقت سے لیکر امیر و داغ بلکہ اُن کے بھی بعد تک دیکھ جائیے آپ کو وہی شیریں فرہاد کے عشق کی داستانیں ملیں گی. صحرائے نجد میں مجنوں کی ریشہ دوانیوں کے مرقعے آپ کے سامنے پیش کئے جائینگے بلبل و قمری کی آوازوں کے شور سے کوئل کی کوک اور شاما کے ترانے آپ کو دُور تک بھی نہ سنائی دیں گے. بھیم و ارجن کی جگہ آپ کو اُردو شاعری کی محفل میں رستم و اسفندیار جلوہ فرما نظر آئیں گے. گنگا جمنا کی جگہ آپ کو جیحون و سیحون بہتے نظر آئیں گے. ہمالیہ کے پربت کی جگہ فاران و سینا کا ذکر ملے گا. غرض دیسی چیزوں کا ہر طرف ہر شاعر کے یہاں نام و نشان نہیں. لیکن جب سے اُردو شاعری جدید راہوں پر گامزن ہوئی اُس وقت سے ہمارے پڑھے لکھے شعراء کے دماغوں میں یہ خیال موجیں مارنے لگا کہ اپنے ملک کی چیزوں کو چھوڑکر دوسرے ملکوں کی چیزوں کو اپنی شاعری میں جگہ دینا نقالی اور محض نقالی ہے. چنانچہ اُردو شاعری کے جدید رجحانات کے سیلاب میں یہ نقالی خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی. اور اُردو شاعری میں ہندوستانی بہادروں ہندوستانی مناظر قدرت، ہندوستانی پرندوں وغیرہ کا ذکر کیا جانے لگا. شروع شروع میں اقبال نے اس کو اپنے کلام میں بہت زیادہ جگہ دی، لیکن جوش نے جس خوبی سے ہندوستانی چیزوں کا ذکر کیا ہے اُس کی تعریف نہیں کی جاسکتی. وہ اس کی انتہائی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوستانی مناظر بیان کئے جائیں. رستم و اسفندیار کی جگہ بھیم و ارجن کو جگہ دی جائے. بلبل و قمری کی صداؤں کے بجائے کوئل کی کوک کے ترانے سنائے جائیں. غرض جہاں تک ہو سکے شاعری کو ہندوستانی رنگ میں رنگا جائے. بعض نظمیں تو ان کی ایسی ملتی ہیں جس میں بالکل بھاشا کا تتبع کیا ہے. جیسے اس کا بیان کہ ایک دُکھیا عورت کا جی پی کی دُوری سے نڈھال ہے، کیونکہ اس کا خاوند کسی وجہ سے پردیس چلا گیا ہے. اس کا یہ حال ہے کہ ساون بھادوں کی جھڑی کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں سے بھی جھڑی لگ جاتی ہے. اس سے یہ رنگین موسم نہیں دیکھا جاتا اور وہ گھٹاؤں سے خطاب کرتی ہے کہ اے گھٹاؤ! ایسے میں تمھارا گھر گھر کر آنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا بہتر تو یہ ہے کہ تم کسی اور دیس میں چلی جاؤ، اگر تم نے کہیں یہاں ایک بوند بھی ٹپکا دی تو گلشن میں پھول مہکیں گے اور میرے تن میں آگ لگ جائیگی؛ کبھی وہ پپیہے سے خطاب کرتی ہے کہ اے پپیہے! تیرا اس طرح پی کہاں، پی کہاں کہنا میرے دل میں نشتر چبھوتا ہے، خدا کے لئے تو اس دیس میں ایسی تان نہ لگا، تو اُس دیس میں اُڑ جا جہاں آجکل میرے پی براج رہے ہیں. کالی رات اس کو ناگن بن کر ڈستی ہوئی معلوم ہوتی ہے. جیسے جیسے

پھوار پڑتی ہے اُس کے دل میں آگ سی بھڑکتی ہے۔ بُوندوں کی آواز دل میں چُبھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ غرض اس برسات کی کوئی بات اُسے اچھی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ ساون کی تمام شوخیاں اُس کے دل کو گھائل کرتی ہیں۔ یہی موسم جو پی کے ہونے سے سب کچھ ہو جاتا، ان کے نہ ہونے سے اس کو کھائے جاتا ہے۔ برسات اُسے باؤلی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اُس کی سمجھ میں اتنا بھی نہیں آتا کہ اُس کے پی تو پردیس میں ہیں اور وہ اپنی حرکتوں سے باز ہی نہیں آتی۔

گھر اکیلا ہے پڑ رہی ہے پھوار | کیسا مورکھ ہے اے سکھی سنسار
اے سہیلی بجا نہیں اوسان | یہ تو مجھکو بتا ترے قربان
سیج سونی ہے اور برستی رات | باؤلی ہو گئی ہے کیا برسات

اِن خیالات سے اس کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ جوش بھاشا کی شاعری سے اور ان جذبات سے جو بھاشا کی شاعری کا طرّہ امتیاز ہیں بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ہندوستانی عورت کی نفسیات کا انھیں بخوبی علم ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی نظموں میں ہندوستانی بہادروں کا ذکر نہایت شد و مد کے ساتھ کرتے ہیں

تا کجا یہ خواب اے ہندوستاں آ ہوش میں | آج بھی ہیں سیکڑوں ارجن ترے آغوش میں

ہندوستان میں برسات کے زمانے میں جو رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں اُن کا بیان جوش نے اپنی نظموں میں کیا ہے جس کے ایک ایک لفظ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر ان سے کس قدر متاثر ہے اور ہندوستانیت کا کس قدر دلدادہ ہے۔ "بہن کی یاد" میں کہتے ہیں:-

نیم میں جھولا پڑا ہے پک رہی ہیں پُوریاں | پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی مست بھادوں کی پھوار
پینگ لے لے کر مزے سے گا رہے ہیں باغ میں | نیم کی نمکولی پکی آئی ساون کی بہار
میکے لینے آ گیا ہے جگ جگ جیے بیرن مرا | رکھ دے اس طوفان میں نمواتلے ڈولی کہار
صحن میں پانی بھرا ہے اور ہوائیں باغ سے | آ رہی ہے بارہ ماسے کی صدا دیوانہ وار
خود بخود سینے میں رہ رہ کر بھر آتا ہے دل | گو سمجھ میں کچھ نہیں آتی پپیہے کی پکار

یہاں جوش کی شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جوش بہت بڑا شاعر ہے۔ اگر وہ کسی مغربی ملک میں پیدا ہوتا تو اب تک اُس پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہوتیں کہ الماریاں بھر جاتیں لوگ اُسے دیوتا کی طرح پوجتے، اُس کا ایک ایک لفظ کئی کئی سکوں کے عوض مول لیا جاتا۔ لیکن افسوس کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوا جہاں اُس کی ہستی "ایک جنگل کے پھول" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ لوگ اُسے ہدفِ طعن و تشنیع بناتے ہیں۔ بعض اس سے سیاسی اختلاف رکھنے کے باعث اُس کی شاعری کو بھی فراموش کر جاتے ہیں۔ لیکن زمانہ کروٹ لے گا اور صورت حالات بدل کر رہے گی۔ جوش ہندوستانی نوجوانوں

کے دلوں میں جوش کا دریا موجزن کر دینے والے جوشؔ! تو نے ہندوستان کے لئے بڑا کام کیا ہے، آج محب وطن نوجوان تیرا شیدائی ہے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ تیرا ادب کریں، کیونکہ ایسی ہستیاں صدیوں میں کہیں جاکر پیدا ہوتی ہیں۔ حافظ و خیام کے ترانے اب بے روح ہو چکے اور ہندوستان کی ساری فضا میں یہ صدا گونج رہی ہے:-

ادب کر اُس خراباتی کا جس کو جوشؔ کہتے ہیں
کہ یہ اپنی صدی کا حافظ و خیام ہے ساقی! (جوشؔ)

غزل

(مسٹر جگن ناتھ آزاد بی۔اے)

سکون دل کو نہیں روح کو قرار نہیں
اب آ کہ اور مجھے تابِ انتظار نہیں

کبھی وہ دن تھے کہ کانٹوں سے اُنس تھا دل کو
یہ حال اب ہے کہ گلہائے تر سے پیار نہیں

وفا شعار ہے نامِ وفا پہ مرتا ہے
فراقِ دوست میں دل کو مرے قرار نہیں

وطن کی ارضِ دلآرا کو کیا ہوا یارب!
کہ نوبہار میں وہ حُسنِ نوبہار نہیں

ہوائے لالہ و گل ہے بہت جنوں انگیز
فضا چمن کی مرے دل کو سازگار نہیں

فضائے لالہ و گل میں سکوں نہیں ملتا
نسیم صبح مرے غم کی چارہ کار نہیں

نہ جاؤ

(سید اقتدا حسین غازیپوری)

نگاہوں کی حد تک دھواں چھا رہا ہے   کلیجہ دھڑکتا چلا جا رہا ہے
شعاعوں سے اُلجھی ہیں دل کی زبانیں   اُفق پر ستارہ بھی تھرّا رہا ہے
ارادے کے قربان جائیں، نہ جاؤ

کلی بے کلی کی زباں کھولتی ہے   یہ چُپ چُپ سی تنہائی بھی بولتی ہے
ارادوں سے ٹکرا کے مرضی کی کشتی   اِدھر ڈولتی ہے اُدھر ڈولتی ہے
یہیں آؤ ساحل بنائیں، نہ جاؤ

شعاعیں جہاں سے ہنسی کر رہی ہیں   عجب میٹھی سی گُدگُدی کر رہی ہیں
کمر سے درختوں کی بیلیں لپٹ کر   اندھیرے میں کچھ دل لگی کر رہی ہیں
تمھیں بھی گلے سے لگائیں، نہ جاؤ

نگاہیں اٹھاؤ، نظر تو ملاؤ   دھڑکتے ہوئے دل کے کچھ پاس آؤ
مروّت کو آنکھوں میں سنکار دیکر   بڑی ہی نوازش ہو گر مان جاؤ
زباں پر ہیں لاکھوں دعائیں، نہ جاؤ

ستاروں کی آنکھیں لگی ہیں سحر سے   چراغوں کی لَو ہے پتنگوں کے پر سے
گذرتی ہوئی رات کی ہلکی چالیں   تمھیں کیا سکھاتی ہیں پچھلے پہر سے
مری جان لے لوں بلائیں، نہ جاؤ

یہ فکر کشاکش مری جاں بُری ہے   قدم پر یہ کیوں بے نیازی جھکی ہے
تمھیں کون سمجھائے کیونکر بتائیے   محبت ہی کیا حاصلِ زندگی ہے
الگ آؤ دُنیا بسائیں، نہ جاؤ

محبت کی دُنیا میں آئی تباہی   کریں کیا چلی ہے کچھ ایسی ہوا ہی
خیالات کا بھی بدن ٹوٹتا ہے   تصوّر کو آنے لگی ہے جماہی
یہ کیا پوچھتے ہو نہ جائیں، نہ جاؤ

یہ ہُو کا ہے عالم یہ سنکی ہوائیں   برستی ہیں ایسے میں لاکھوں بلائیں
تمھیں خود یہ بھی رحم آتا نہیں ہے   بتاؤ تمھیں کس طرح سے بتائیں
کلیجے میں اپنے چھپائیں، نہ جاؤ

ستاروں کی دنیا میں

(صدرالدین عظیم)

اگر ناظرین علم الفلک (Astronomy) سے آگاہ نہ ہوں تو وہ عنوان بالا دیکھ کے خیال کریں گے کہ شاید میں نجوم کے بارے میں کچھ بیان کروں گا۔ اور ایک شاعرانہ انداز میں اپنے سمندِ فکر کی باگ کو چھوڑ دونگا کہ وہ اجرام فلکیہ کے حصوں اور عظمت کو دلچسپ اور فلسفیانہ انداز میں بیان کرے اور مجھے اپنی فکری بلند پروازی میں ڈانٹے، ملٹن اور المقری کی سی زندگی جاوید حاصل ہو۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ ناممکن ہوگا کہ علم (Science) اس کائنات کے ایک ایسے خطّے کی حالت بیان کرے جو عالم حسّ و ادراک سے پرے ہے۔ مگر اُن سے میری گزارش ہے کہ اختتام مضمون تک ذرا صبر سے کام لیں۔ کیونکہ یہ موضوع آج دنیائے علم و اکتشاف کے لئے کچھ نیا نہیں ہے۔ آج علم اور انسانی فکر نے ان بہت سی چیزوں کو جو اس سے پہلے ہزاروں پردوں میں پنہاں تھیں اختیار و تحقیق کے ذریعہ ایک ناقابل انکار حقیقت منوا دیا ہے اور غیر محسوس و غیر مُدرک چیزیں بھی ادراک و حس سے بہت قریب ہیں۔

یہ بات مخفی نہیں کہ جب سورج کی روشنی کسی شیشے پر پڑتی ہے تو قوس قزح کے رنگ نمودار ہوتے ہیں یا اس کا سبب محض یہ ہے کہ سورج کی یہ سفید روشنی دراصل متعدد رنگوں سے مرکّب ہے۔ اختلاف رنگ کے معنی یہ ہیں کہ وہ موجیں (Waves) جو روشنی پیدا کرتی ہیں مختلف ہیں۔ شیشے میں یہ مختلف الالوان عکس متعدد زاویے بناتے ہوئے منتشر ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا زاویہ سُرخ رنگ بناتا ہے اور سب سے چھوٹا بنفشئی۔ ان کے درمیان میں اور سب رنگ ہوتے ہیں۔

جب ہم سورج کی موجوں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام یکساں نہیں ہیں جیسا کہ اولین دھلہ (؟) میں ظاہر ہوتا ہے بلکہ بہت سے متعین طول کے امواج کا پتہ چلتا ہے جن کو درمیان سے ایک ایک سیاہ خط علیحدہ کرتا ہے۔ یہ مختلف الالوان امواج سورج میں ایسے مادّے کے وجود کا پتہ دیتے ہیں جو انھیں جذب کر لیتا ہے۔ اس دریافت سے ہمیں اس کا پتہ آسانی سے چل جاتا ہے کہ یہ کون سا مادّہ ہے۔ اگر ہم لوہے کے ایک ٹکڑے کو آگ پر گرم کریں اور آگ کی آنچ غیر معمولی کر دیں تو وہ ایک سُرخ رنگ کی ہیئت اختیار کر لیتا ہے اور اگر ہم اُسے اس سے بھی زیادہ گرم کریں تو پھر سفید روشنی پیدا ہو جاتی ہے جو بعد میں نیلگوں ہو جاتی ہے۔ یہ تجربات ہم کو بتاتے ہیں کہ اجسام کی حرارت اور روشنی کے رنگوں کے درمیان خاص علاقہ ہے۔ اگر ایک

معدنی ٹکڑا جو چمک رہا ہو سُرخی پر مائل ہونے لگے تو اس سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ برودت کی طرف آ رہا ہے۔ اس تجربہ سے ہم نے بہت کچھ جان لیا۔ اوّلاً یہ کہ سورج[1] میں پگھلے ہوئے معدنی مادّوں کا وجود ہے۔ ثانیاً یہ کہ ہم اس کے ذریعہ طے کر سکتے ہیں کہ نجوم میں کتنی حرارت ہے۔ ثالثاً ہم اس حرارت کے ذریعہ نیوٹن (Newton) کے نظریۂ کشش سے اس کی کشش متعین کر سکتے ہیں، اور پھر اس کشش سے خود ستاروں کا حجم اور اُن کے اندر جمع شدہ مادّوں کی تخمینی مقدار معلوم کر سکتے ہیں۔ غور کیجیے کہ ان روشنی کی موجوں نے ہمیں کتنا علم بخشا۔ آج ان موجوں کا درس و مطالعہ خود ایک علم ہو گیا ہے، مگر اس وقت ہمیں اس سے بحث کرنا نہیں ہے۔

علمار سائنس کا خیال ہے کہ ستاروں کی تالیف و ترکیب بھی بجنسہ انھیں عناصر سے ہوئی ہے جن سے کہ سورج کی، زمین کی۔ کیفیت اور یہ دونوں نظام تھے۔ اصل عناصر کے اختلافات کا باعث ہیں اور ہم انھیں ٹھوس ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممیز کرتے ہیں مگر چونکہ ستاروں میں انتہائی حرارت ہے اور تمام ذرات متحرک اور لاتعداد اجزا میں منقسم ہو جاتے ہیں اس لئے وہاں عناصر کی فوری تمیز مشکل ہے۔ البتہ اگر ہم ستاروں کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر باہر لاویں اور ٹھنڈا کریں تو یقیناً اس کے بعد وہ انھیں اجزاء و عناصر سے مرکب نکلے گا جس سے کہ یہ زمین۔

آج علمار نے ان بہت سے اصولوں کا پتہ لگا لیا ہے جن سے ہم ستاروں کے متعلق صحیح علم حاصل کر سکتے ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت سے ستارے ایسے ہیں جن کی سطح کی حرارت ۵۰۰۰ سنٹی گراڈ ہے۔ دوسری طرف چند ایسے بھی ستارے دریافت ہوئے ہیں جن کا قطر سورج کے قطر سے دس گنا ہے۔ مگر اب تک کوئی ایسا ستارہ نہیں دیکھا گیا جس میں یہ دونوں خصوصیتیں بیک وقت موجود ہوں۔ اس سے ہم یہ بآسانی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ زیادہ تاباں و درخشاں ستارہ وہی ہوگا جس کا حجم زیادہ ہو، لہذا اس آسمان میں بکھرے ہوئے ستاروں کے اندر جو ہمیں جتنا زیادہ درخشاں نظر آتا ہے وہ اتنا ہی بڑا ہے یا پھر بہ نسبت دوسروں کے ہم سے زیادہ قریب تر ہے۔

اس کے بعد ستاروں میں ایک اور چیز جو دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ستارے کبھی تو بہت بھڑک اُٹھتے ہیں اور کبھی ان کی روشنی بہت مدھم پڑ جاتی ہے۔ اور ان میں اکثر کے بدلنے اور متغیر ہونے کی ایک متعین مدت ہوتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کبھی کبھی کوئی ستارہ شروع میں اتنا دھندلا ہوتا ہے کہ بلند سے بلند رصدگاہ سے بھی نظر نہیں آتا۔ مگر پھر یک بیک اتنا درخشاں ہو جاتا ہے کہ عام ستارے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح کے اور بھی فلکی حوادث ہیں جن کے اسباب و علل کے جاننے سے ہم ستاروں کے متعلق علم

[1] سورج بھی اس فضائے محیط میں بکھرے ہوئے ستاروں میں ایک ستارہ ہے۔ لفظ ستارہ سے سیارہ (Planet) نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ مراد نجوم (Stars) ستارے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ سیارے سورج کی پیداوار اور مولدات ہیں اور ستارے خود سورج جیسے یا اس سے وسیع تر نظام شمسی کے رکن ہیں۔ (ص ع)

حاصل کر سکتے ہیں اور ہمارا یہ علم کوئی تخیلاتی یا شاعرانہ علم نہ ہوگا بلکہ اس کی دلیل میں ایسے شواہد و علل ہونگے جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

علماء اور سائنس دانوں نے سورج کی شعاع کے وزن کا اندازہ کیا ہے جو اس کی سطح سے نکل کر زمین پر گرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک ثانیہ (سکنڈ) میں یہ روشنی تقریباً چار ملین ٹن فضا میں ضائع ہوتی ہے۔ انھوں نے شعاع کی رفتار کا بھی اندازہ لگایا ہے اور بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک ثانیہ (سکنڈ) میں تین لاکھ کیلو میٹر طے کرتی ہے۔ یہ روشنی جیسا کہ اولین وہلے میں ظاہر ہوتی ہے سورج کی سطح پر نہیں ہے بلکہ دراصل سورج کے اُن اندرونی مادّوں سے خارج ہوتی ہے جو اس کے قلب میں جمع ہوئے ہیں۔ اور سورج کے بننے اور ان مادّوں کے جمع ہونے میں ایک طویل مدت صرف ہونا ضروری ہے۔ اسے ہم اس طرح اندازہ کر سکتے ہیں کہ گیسوں کا ایک معمولی ٹکڑا یا ڈھیر ہے جو ایک خاص سمت میں حرکت کر رہا ہے۔ اثنائے سفر میں یہ بہت سے مادّی ذرات سے متصادم ہوتا ہے جنھیں وہ اپنے میں جذب کر لیتا ہے اور گیس کی شکل میں تبدیل کر کے ملا لیتا ہے۔ فضا کے اس ذراتی تصادم کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اور یہ ایک سکنڈ میں ہزار دفعہ $\frac{1}{10(10)}$ میں واقع ہوتا ہے۔ بہرحال اسی طرح وہ "غازی کتلہ" (Gaseous Mass) اپنا عمل جاری رکھتا ہے اور ہزاروں سال میں جا کر ایک عظیم الشان شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ "غازی کتلہ" جوں جوں بڑھتا جاتا ہے اسی طرح اس کی روشنی میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور آخر میں آکر یہ روشنی ترقی کرتی ہوئی کسی جرم فلکی سے دوچار ہوتی ہے اور جب زمین سے دوچار ہوتی ہے تو ہم جانتے ہیں کہ اس فضا کے لامتناہی ستاروں میں ایک کا اضافہ ہوا ہے۔ ستاروں کی پیدائش کے یہ علل و عوامل جیسے جو اوپر بیان کئے گئے یہ دراصل Gaseous Mass ہے جو ایک بہت حقیر صورت سے ترقی کر کے غیر معمولی اور عظیم الشان ہو جاتا ہے اڈنگٹن (Eddington) کی فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں۔

بلکہ دراصل میں کہونگا کہ ستاروں پر سب سے پہلے غور و تدبر مشہور فلسفی (Astronomer) لین (Lane) نے کیا تھا۔ اُس نے اپنی بحثوں کو ۱۸۷۰ء میں شائع کیا، اور بتلایا کہ ستارے دراصل غازی کتلے ہیں۔ اس وقت لوگوں نے اس تحقیق کا مذاق اُڑایا اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک کوئی ستارہ ایسا نہیں دریافت ہوا تھا جس کی کثافت غازات (گیسوں) کی کثافت کے مماثل ہو مگر بعد میں ایسے ستارے دریافت ہوئے بلکہ بہت سے تو ایسے ہیں جن کی لطافت تقریباً خلا کے برابر ہونے کے باوجود وہ درخشاں ستارے ہیں۔ اس تحقیق نے بتا دیا کہ لین کی تحقیق درست تھی اور ستارے گیسی مادے ہیں جو برابر مزید مادّوں سے مل کر کثیف تر ہوتے جاتے ہیں چونکہ یہ نظریہ پایۂ ثبوت کو پہونچ چکا ہے اس لئے ہم کو اڈنگٹن یا لین کا ساتھ دینا ہوگا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ

عام ستارے کا ایک محدود حجم بھی ہے اور وہ مرکز سے دائرہ تک ایک معین دوری رکھتے ہیں۔ یہ حجم و قطر نہ تو بڑھتا ہے اور نہ گھٹتا ہے۔ یہ سنتے ہی فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے اور اس کا کیا سبب ہے؟ اس کا جواب وہ تجربات سے دیتے اور بتاتے ہیں کہ ستاروں میں تین قسم کی قوتیں موجود ہیں۔ پہلی قوت جاذبہ ہے جو اس کی مقتضی ہے کہ اگر محض یہی قوت کام کرے تو ستارے ایک دم سکڑ جائیں۔ اس کے برخلاف دوسری قوت دافعہ ہے جو اس کی طالب ہے کہ ستاروں کو پارہ پارہ کرکے فضا میں بکھیر دے اور یہ دونوں قوتیں ایسی ہیں جو تنہا رہ کر ستاروں کے وجود کے لئے باعث ہلاکت ہیں۔ تیسری قوت وہ ہے جسے ہم حرارت غازیہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ قوت اس کی طالب ہے کہ عام مادّوں کی طرح حرارت کی وجہ سے ستاروں کو بھی پھیلائے اور وسیع کردے کیونکہ یہ مشاہدہ ہے کہ مادّے حرارت سے بڑھتے اور پھیلتے ہیں، مگر یہ اچھی طرح ثابت ہے کہ ستاروں میں ان میں سے کوئی قوت تنہا کام نہیں کررہی ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ستاروں میں تبدل و تغیر ہوا کرتا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ تینوں قوتیں ستاروں میں کسی توازن کے ماتحت ہیں۔

اڈنگٹن نے اس توازن کو ریاضی سے حل کیا ہے اور اس نے طریقۂ تناسب سے ایک ایسا قانون بنایا جس کے رو سے کتلہ (Mass) اور ستاروں کی روشنی کے درمیان خاص علاقہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طریقے سے ہم ستاروں کی روشنی کے ذریعہ ان کی "غازی" کثافت معلوم کرسکتے ہیں یا اگر کثافت معلوم ہو تو روشنی بآسانی جانی جاسکتی ہے۔ اس کے ذریعہ ہم لطیف سے لطیف کتلہ اور خفیف سے خفیف روشنی کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔ اڈنگٹن نے اس اصول کے ذریعہ سے ان شاذ و نادر ستاروں کی مقدار کا بھی فیصلہ کردیا ہے جن کی کثافت غیر معمولی ہے اور یہ ستارے بھی اس کے اصول کی گرفت سے آگے نہیں نکل سکے ہیں۔

تضمین بر اشعار اقبال

(از مسٹر جگن ناتھ آزاد بی۔ اے)

زمانہ روزِ ازل سے یہ دے رہا ہے پیام ۔۔۔ وہی ہے زندہ سکوں کی طلب ہے جس پہ حرام
حقیقتِ ازلی ہے رقابتِ اقوام ۔۔۔ "نگاہِ پیرِ فلک میں نہ میں عزیز نہ تو"

نظر نہ آئے گا تجھ کو کوئی حریف ترا ۔۔۔ نہ ہوگا تیرے جہاں میں کوئی بھی تیرے سوا
رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا ۔۔۔ "اُتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہٗ"

پروانہ

(از جناب لچھمی نراین صاحب جوہر بدایونی)

اے شہیدِ شمعِ محفل، آہ اے جانبازِ عشق یہ تری ننھّی سی جاں اور اُس پہ یہ اندازِ عشق
بے نیازِ ہوش ہے تو آہ! اے دمسازِ عشق تیری وارفتہ ادائیں کھولتی ہیں رازِ عشق

جوت جاگی تھی کہ تو جامے سے باہر ہوگیا
پی کے جامِ آتشیں آپے سے باہر ہوگیا

دل بڑھا لیکر بلائیں روئے پُرتنویر کی جذبِ صادق میں جھلک آئی ذرا تاثیر کی
دل کی بیتابی میں جب سازش ہوئی تقدیر کی حُسن نے دنیا بدل دی شوقِ دامنگیر کی

شعلہ رو سے لب بلب ہوتے ہی فرطِ جوش میں
زندگی کو ہوش آیا موت کے آغوش میں

داغ خوردہ حسرتوں کی آہ! تصویرِ وفا اے حدیثِ دردِ غم، اے کشتۂ نقشِ جفا
چشمِ نظارہ بدامن دے گئی تجھکو ہوا رنگ لایا یہ اُمنگوں کا شبابِ فتنہ زا

بے نیازِ ہوش ہے تو آرزو کے سامنے
بے کفن میّت پڑی ہے شعلہ رُو کے سامنے

تنقید کتب

دنیائے عرب

یہ دو جزو کا چھوٹا سا پمفلٹ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر عربی مسٹر ایچ۔ اے۔ آر گب کا لکھا ہوا ہے، جسے محمد حمید الدین ایم۔ اے۔ لکچرار فلسفہ گورنمنٹ کالج لائلپور (پنجاب) نے اردو زبان کا لباس پہنایا ہے۔ اس پمفلٹ میں ساحل خلیج فارس سے لیکر مراکش تک پھیلے ہوئے تمام عرب ممالک کا مختصر حال بیان کرتے ہوئے جدید قومی تحریکات پر معقول روشنی ڈالی ہے، اور بتایا ہے کہ عرب قوم اب بیدار ہوگئی ہے جو ایک متفقہ عرب قومی سلطنت کا خواب دیکھ رہی ہے۔ اب عرب پرانے کاہل اور شاکر برضاء الٰہی عرب نہیں رہے بلکہ ترقی کے لئے جانفشانی اور جدوجہد کو لازمی سمجھنے لگے ہیں۔ یہ پمفلٹ سبق آموز اور مفید ہے، ترجمہ سلیس ضرور ہے لیکن شگفتہ نہیں ہے، بعض جگہ زبان بھی نامانوس ہے، مثلاً فاضل مترجم نے صفحہ ۱۹ پر لفظ "خواب" کو مؤنث لکھا ہے:-

"یہ ہمیشہ دوبارہ جی اٹھنے کی خوابیں دیکھتا ہے۔"

خواب مؤنث نہیں بلکہ مذکر ہے۔

کتاب کے سرورق کے اندرونی صفحات پر ایشیائی اور افریقی عرب ممالک کے نقشے بھی دیے گئے ہیں، اور دوسرے صفحہ میں ایک نقشہ دیکر ہر ملک کا رقبہ، آبادی، سالانہ آمدنی، درآمد و برآمد بھی بتادی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ ضخامت ۳۲ صفحات قیمت چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:- آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی، کلکتہ، مدراس۔

بابا جی

یہ ایک جزو کی چھوٹی سی کہانی ہے جس میں سادھو لوگوں کی عیاریوں اور ہتھکنڈوں اور انکی چالاکیوں پر افسانہ کے پیرایہ میں نہایت ستھری اور عام فہم زبان میں روشنی ڈالی گئی ہے، اور دکھایا گیا ہے کہ سادھو لوگ کس طرح اپنے زہد و اتقا کا جال پھیلا کر اپنے عقیدتمندوں کو پھانستے ہیں اور اپنا اُلّو سیدھا کرکے چلتے بنتے ہیں۔ کتاب دلچسپ اور سبق آموز ہے کتاب پر مصنف کا نام درج نہیں ہے نہ قیمت اور ملنے کا پتہ لکھا ہے، صرف رفاہ عام برقی پریس آگرہ لکھا ہے۔

کلام حرماں

یہ فرید احمد صاحب حرماں خیرآبادی کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ شروع میں حرماں صاحب نے کچھ اپنے بارہ میں بھی لکھا ہے جس میں اپنی ابتدائی "مفلسی" ترک وطن، تعلیم اور تدریجی ترقیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ دیباچہ ہمارے

نوجوانوں کے مطالعہ کے قابل ہے جس سے معلوم ہوگا کہ باوجود ناداری اور بیکسی کے ایک صاحب ہمت انسان شاہراہ ترقی کے منازل کس طرح طے کر سکتا ہے، بشرطیکہ ترقی کرنے کا ذوق اور بیقرار شوق ہو۔

جہاں تک کلام کا تعلق ہے، حرماں صاحب کا کلام بڑی حد تک "اپٹوڈیٹ" ہے، بندشیں چست، ترکیبیں درست، الفاظ کی تلاش عمدہ ہے اور تخئیل کی بلندی پائی جاتی ہے۔ اس مجموعۂ کلام کی غزلوں کی ابتدا ۱۹۲۳ء سے ہوتی ہے اور ۱۹۴۲ء تک ختم ہوتی ہے۔ ہر غزل پر تاریخ اور اس مقام کا نام درج ہے جہاں وہ کہی گئی تھی جس سے حرماں صاحب کے کلام کی تدریجی ترقی بخوبی معلوم ہو سکتی ہے، بعض شعر تو ایسے ہیں جن کی داد نہیں دی جا سکتی، چند شعر ملاحظہ فرمائیے:-

میرا سجود منحصر آستاں نہیں اے صاحبِ مکاں تجھے قیدِ مکاں نہیں
میں عالمِ وجود میں سربستہ راز ہوں رسوائے خاص و عام مری داستاں نہیں

کیا شباب نے برباد روزگار مجھے پیامِ مرگ ہوئی دعوتِ بہار مجھے
نشاطِ دہر ابھی درد سے بدل جائے ملا ہے ضبطِ محبت کا اختیار مجھے

کس کو تری تلاش کا حاصل شعور تھا تو جس سے تھا قریب وہی تجھ سے دور تھا
جلوے کجا، کسی کا تصور بھی دور تھا دیدار صرف حسنِ نظر کا ظہور تھا

ذرہ ذرہ میں محبت کارفرما ہو نہ جائے رفتہ رفتہ کل زمیں عرش معلیٰ ہو نہ جائے
آہ یہ طرزِ تغافل! اُف یہ بے پروائیاں دیکھ! دنیائے سکوں میں حشر برپا ہو نہ جائے

اس مجموعہ میں بہت سی نعتیہ غزلیں، مسلسل نظمیں، رباعیات، قطعات، طنزیات اور متفرق اشعار بھی ہیں طنزیات کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے:-

منزل ہے کہیں، راہگذر ہے کہیں اور جاتے ہیں کہیں اور سفر ہے کہیں اور
اللہ رے اختلافِ منشا و عمل دل تو کہیں اور ہے، نظر ہے کہیں اور

اطوار میں عاجزی ہے، شاہی دل میں ہونٹوں پہ ہنسی ہے، کینہ خواہی دل میں
انسان کے کچھ عجیب ہیں لیل و نہار چہرہ پہ تو نور ہے، سیاہی دل میں

اس مجموعہ میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو آل انڈیا ریڈیو دہلی کی فرمائش پر کہی گئی تھیں۔ لکھائی چھپائی، کاغذ نہایت عمدہ۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- دفتر مجلس اردو نمبر ۴، جی بلاک، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

رفتارِ زمانہ

جاڑوں کے آتے ہی مشرق و مغرب و جنوب کے تمام محاذوں پر جنگ انتہائی شدت اختیار کر گئی ہے، اتحادی اقوام کی طاقت روز افزوں ہے۔ امریکہ میں جہاز سازی اور سامان جنگ کی تیاری میں بہت ترقی ہو گئی ہے جس کا اثر ہر محاذ پر پڑ رہا ہے۔ محاذات جنگ کو اس وقت پانچ جگہ تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی (۱) روس (۲) افریقہ (۳) چین (۴) جزائر بحر الکاہل اور (۵) ہندوستان۔

روس اس وقت روس میں جھیل آلمین سے لیکر قفقاز تک حد درجہ خونریز اور گھمسان کے رن پڑ رہے ہیں۔ اسٹالین گراڈ کے محاذ پر دو لاکھ جرمن فوج ہر طرف سے گھیر لی گئی ہے جس پر شمال مغرب اور جنوب مغرب دو طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ روسیوں نے ولیکی لوکی جو ایک اہم ریلوے جنکشن ہے دشمنوں سے چھین لیا ہے، اور اب روسی فوجیں یلغار کرتی ہوئیں روستوف کی طرف بڑھ رہی ہیں جو جنوبی یوکرین کا اہم ترین مقام ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ بہت بڑا ریلوے جنکشن ہے جہاں سے کریمیا، کاکیشیا، اسٹالین گراڈ اور دوسرے مقامات کو ریلوے لائینیں جاتی ہیں، دوسرے باد کوبہ کے تیل کے چشموں سے جو تیل کا نل چلتا ہے اسکا آخری سرا اسی مقام پر ہے۔ ادھر کاکیشیا میں بھی روسیوں نے شہر مزدوک پر قبضہ کر لینے کا دعویٰ کیا ہے، یہ بھی کاکیشیا کا اہم ترین مقام ہے کاکیشیا میں سب سے زیادہ تیل باد کوبہ اور گروزنائی میں نکلتا ہے۔ روس کا ۸۹ فیصدی تیل انھیں مقامات میں پیدا ہوتا ہے، اور مزدوک کو گروزنائی کے علاقہ کا پھاٹک خیال کیا جاتا ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایک طرف شمالی کاکیشیا اور دوسری طرف ملک قلماق کے میدانوں سے جو روسی فوجیں شمال اور جنوب کی سمت بڑھ رہی ہیں وہ دونوں بہت جلد مل جائیں گی کیونکہ دونوں فوجوں میں اب صرف اسّی میل کا فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔ اگر یہ دونوں فوجیں مل گئیں تو پھر روستوف کا خدا حافظ ہے۔ وادی ڈان میں بھی روسیوں نے جرمنوں پر چاروں طرف سے نرغہ کر رکھا ہے اگر جرمن فوجیں وہاں سے ہٹا نہ لی گئیں تو ان کے گھر جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ دسمبر کے مہینے میں جرمنوں کو شدید نقصانات اٹھانے پڑے ہیں۔ اگر جرمن نقصانات کے بارہ میں روسی رپورٹیں صحیح ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اب روسی محاذوں پر جرمنوں کی دو تہائی فوجی طاقت باقی رہ گئی ہے۔ کیونکہ پچپن ۵۵ ڈویژن جرمن فوج وادی ڈان میں، ۲۲ ڈویژن اسٹالین گراڈ میں، ۲۵ ڈویژن وادی ڈان کے وسطی علاقہ میں اور آٹھ ڈویژن فوج کاکیشیا میں روسیوں نے گھیر لی ہے۔ اور اب تک ڈھائی لاکھ سے زیادہ جرمن کام آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۹ نومبر ۱۹۴۲ء سے ابتک ۱۴۴۱۵۰ جرمن قیدی روسیوں کے ہاتھ آ چکے ہیں۔ قلماق کے میدانوں کی طرف سے جو روسی فوجیں مغرب کی طرف بڑھ رہی ہیں اُن سے ان جرمن فوجوں کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے جو وادی ڈان کے نشیبی علاقہ میں ہیں۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۴۲ء میں دشمنوں پر روسیوں کو جو فتوحات حاصل ہوئی ہیں اُن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان کامیابیوں کے باوجود ابھی روسیوں کو بہت سی قربانیاں کرنی ہیں۔ کیونکہ روسی محاذات کا نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روسی فتوحات بعض جگہ مقامی حیثیت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں اور جس خط سے بڑھکر جرمنوں نے مئی ۴۲ء میں حملہ شروع کیا ابھی وہ اس سے پیچھے نہیں ڈھکیلے جا سکے ہیں۔

افریقہ جنگ کا زور اس وقت تیونس میں ہے۔ مصر میں العالمین کے محاذ سے جو محوری فوجوں نے بھاگنا شروع کیا تھا اُس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ جنرل رومیل کی فوج نے ابھی کسی جگہ جمکر مقابلہ نہیں کیا وہ برابر پیچھے ہٹتی چلی جاتی ہے، تیونس میں البتہ میدانداریاں ہو رہی ہیں لیکن رفتار کسی قدر سست ہے جس کی وجہ

کہ شمالی افریقہ اور جنوبی یورپ کے ان ملکوں میں جو بحیرۂ روم کے کنارے واقع ہیں، برسات کا موسم جاڑوں میں شروع ہوتا ہے جس کی وجہ سے جنگی سرگرمیاں سرد پڑجاتی ہیں، پھر بھی اتحادیوں کے ہوائی اور سمندری حملوں سے دشمنوں کو خوب نقصان پہونچایا گیا ہے لیکن ابھی تک دشمن کمزور نہیں ہوا ہے بلکہ اُسے تازہ دم کمک اور سامان جنگ پہونچ گیا ہے۔ ۵ جنوری کو اتحادی فوجوں نے حملہ کرکے ورزآج کی پہاڑیوں پر اور اس کے شمال میں بھی ایک پہاڑی پر قبضہ کرلیا تھا، لیکن ۶۔ جنوری کو دشمنوں نے جوابی حملہ کرکے وہ پہاڑیاں پھر واپس لے لیں اور اتحادی فوجیں اپنے پہلے مورچوں پر واپس آگئیں۔ آزاد فرانسیسی فوج کا ایک دستہ جسکی کمان کرنل آنگولڈ کے ہاتھ میں ہے جھیل شاد کی طرف سے ایک ہزار میل کی مسافت طے کرکے تیونس اور لیبیا کے جنوب میں پہونچ گیا ہے اور اُس نے تین دن تک سخت میدان داری کرکے اُم الارانیب کا مورچہ فتح کرلیا جو مرزوق سے ۵۰ میل جانب مشرق ہے

شمالی افریقہ کی جنگ میں سب سے زیادہ کارہائے نمایاں انگریزی سپاہ ۸ نے انجام دیئے ہیں جس کی کمان جنرل منٹگمری کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سپاہ اب مصر کی طرف سے بڑھتے بڑھتے تمام سائرینائکہ اور لیبیا کو دشمنوں سے پاک کرچکی ہے۔ اور اب طرابلس الغرب کے علاقہ میں گھستی چلی جارہی ہے۔ بیورات کا مورچہ بھی دشمنوں سے خالی کرالیا گیا ہے۔ اور اب بیورات کے مغرب میں زبردست جنگی سرگرمیاں عمل میں آرہی ہیں۔ لیکن جب تک موسم موافق نہ ہو عمدہ نتائج کی توقع نہیں کیجاسکتی

فرانسیسی امیر البحر دارلان کو جس نے اتحادیوں کی طرفداری کا اعلان کردیا تھا ایک فرانسیسی نوجوان نے جس کی ماں اطالوی ہے ریوالور سے قتل کردیا۔ امیر البحر دارلان کی وجہ سے فرانسیسیوں میں نفاق پیدا ہوجانے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا، کیونکہ مقتول نے خود کو مارشل پیتاں کا جانشین اور سیاہ وسفید کا مالک قرار دے لیا تھا۔ چونکہ فرانسیسی جنرل ڈیگال جو شروع ہی سے اتحادیوں کے ساتھ ہے اب تک آزاد فرانسیسیوں کا سردار تصور کیا جاتا تھا، اس لیئے امیر البحر دارلان اور جنرل ڈیگال میں رقابت پیدا ہوگئی تھی۔ امیر البحر دارلان پہلے برطانیہ کے سخت خلاف تھا اس لئے اُس کے قتل سے ایک کانٹا نکل گیا جو اتحادیوں کے پہلو میں خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔ لیکن امیر البحر دارلان کے بعد فرانسیسی جنرل جیرو نے اُس کی جانشینی اختیار کرلی ہے۔ اس لئے فی الحال نفاق پیدا ہونیکا کھٹکا باقی ہے۔ مگر کوشش ہورہی ہے کہ دونوں جرنیلوں میں گفت وشنید کرکے سمجھوتہ کرادیا جائے۔

شمالی اور مشرقی افریقہ اتحادیوں کے زیر اثر آہی گئے تھے صرف فرانسیسی بلاد الصومال کا علاقہ جو مشرقی افریقہ میں ہے دشی گورنمنٹ کے ماتحت رہ گیا تھا مگر اب وہ بھی اتحادیوں کے زیر اثر آگیا ہے اور بندرگاہ جیبوتی میں انگریزی فوجیں داخل ہوگئی ہیں۔ اس طرح اب افریقہ کا کوئی علاقہ وشی گورنمنٹ کے ماتحت نہیں رہا۔

چین | چین میں اگرچہ جنگ کا سلسلہ بدستور جاری ہے لیکن جنگی سرگرمیاں کسی قدر سرد پڑگئی ہیں، جسکی وجہ ایک تو جاڑے کی شدت ہے اور دوسری چینیوں کے پاس سامان جنگ کی قلت ہے۔ برہما ہاتھ سے نکل جانیکے بعد چینیوں کو اتحادیوں کی طرف سے معقول امداد پہونچانیکے تقریباً تمام راستے بند ہوگئے ہیں۔ ہوائی جہازوں سے جو کچھ سامان سپلائی کیا جاتا ہے وہ کافی نہیں ہوتا۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کے مہینہ میں جاپانیوں کی جنگی سرگرمیاں زیادہ تر صوبہ انہوئی اور صوبہ کوانتنگ میں رہیں۔ ۲۔ جنوری کو جاپانیوں نے صوبہ انہوئی کے دار الحکومت لیہوچنگ پر قبضہ کرلیا تھا اور کوانتنگ کے دار الحکومت شاہ کوان پر ہوائی جہازوں سے بمباری کرکے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، اب شانچنگ کے گرد ونواح میں گھمسان کی لڑائی ہورہی ہے۔ بہرحال چینیوں نے آخر دم تک جنگ جاری رکھنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ اگر اتحادیوں کی طرف سے چینیوں کو مدد پہونچنے کا سلسلہ قائم ہوجائے تو اتحادیوں کو برہما فتح کرنے میں بہت بڑی مدد ملے۔

بحر الکاہل | روس کے بعد اگر کسی جگہ سخت معرکہ آرائیاں ہورہی ہیں تو وہ بحر الکاہل کا جزیرہ نیوگنی ہے۔ جہاں گودہ

اور بیونہ میں کئی مہینہ سے اتحادیوں اور جاپانیوں میں رسہ کشی ہو رہی ہے۔ گونہ پر اتحادیوں نے قبضہ کر لیا تھا اب اعلان کیا گیا ہے کہ [illegible] کے علاقہ پر بھی اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ خبریں بھی آئی ہیں کہ جاپانیوں نے نیو برٹن کی بندرگاہ ربول میں اس قدر بیڑہ جمع کیا ہے کہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ وہ چاہتے ہیں کہ لائیر میں فوجیں اتاریں۔ لیکن اتحادیوں کے ہوائی جہاز مسلسل حملے کر کے جاپانیوں کے فوج بردار جہازوں کو تباہ کر رہے ہیں جزائر سلیمان کے سمندر میں اتنے جاپانی جہاز غرق کئے جا چکے ہیں کہ اب جاپانی بیڑے کی طاقت آدھی رہ گئی ہے۔

ہندوستان | ہندوستان کے سیاسی جمود کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ جہاں تک ہندوستان کی داخلی سیاسیات کا تعلق ہے، اس میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ البتہ سب سے بڑا اندرونی سانحہ یہ ہوا ہے کہ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں کا ۲۲۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کو انتقال ہو گیا۔ اب اُن کے جانشین جنرل سر عمر حیات خاں کے صاحبزادے میجر خضر حیات خاں آف ٹوانہ ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ میجر خضر حیات خاں کے دم سے پنجاب کی یکجہتی کی کوششیں اسی طرح جاری رہیں گی جیسی کہ سر سکندر کے زمانہ میں تھیں۔

دسمبر کا مہینہ خصوصاً آخری ہفتہ ہندوستان میں کانفرنسوں کا ہوا کرتا ہے، امسال بھی ایسا ہی ہوا جس میں سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہز اکسیلنسی وائسرائے نے کلکتہ میں یونائیٹیڈ چیمبرس آف کامرس کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان کی تقسیم سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔ دوسری اہم کانفرنس کانپور میں آل انڈیا ہندو مہاسبھا کی ہوئی جس میں انھیں مطالبات کا اعلان کیا گیا جو کانگریس کر چکی ہے اور جس کا [illegible] کارروائی [illegible] ہے۔

جہاں تک ہندوستان کی جنگ کا تعلق ہے ہندوستان کی لڑائی شروع ہو گئی ہے۔ ۲۰۔ دسمبر کی رات کو جاپانی ہوائی جہازوں نے کلکتہ پر بمباری کی۔ اس کے بعد بھی تین چار مرتبہ بمباری کی گئی، لیکن نقصان خفیف ہوا۔ [illegible] نے حیرت انگیز استقلال اور پامردی کا اظہار کیا۔ اے۔ آر۔ پی اور متعلقہ سروسوں نے خوب خدمات [illegible] سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان حملوں سے پبلک میں کسی قسم کی گھبراہٹ پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہونا چاہئے تھی۔

۱۷۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کو اتحادی فوجوں نے جن میں ہندوستانی فوجیں بھی شامل ہیں، ہندوستان کی سرحد پار کر کے اراکان کے علاقہ میں برہما پر حملہ کر دیا اور بغیر مقابلہ دریائے ناف کے کنارہ موضع مونگڈاہ اور اس کے ۱۷ میل شمال میں راتھیڈونگ پر قبضہ کر لیا۔ جاپانی فوجیں مزاحمت کئے بغیر پیچھے ہٹ گئیں۔ ہمیں امید ہے کہ اگر اتحادی فوجیں [illegible] طرح استقلال کے ساتھ بڑھتی رہیں تو بہت جلد برہما پر قبضہ ہو جائیگا، کیونکہ اب بحری، بری اور ہوائی [illegible] اتحادیوں کو دشمن پر فوقیت حاصل ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ برہما کو دوبارہ فتح کرنے کے لئے جو فوجی مہم بھیجی جا رہی ہے [illegible] کو برداشت کرنا پڑیگا۔ اگر پہلے کی طرح برہما ہندوستان کا ایک حصہ ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا [illegible] ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ برہما کی بازیابی کا خرچ ہندوستان کے سر [illegible] اس وجہ سے کہ برہما ہندوستان کا ہمسایہ ہے۔ اگر یہی بات ہے تو کیا فرانس کو جرمنوں سے [illegible] جو مصارف ہونگے وہ انگلستان کا خزانہ برداشت کریگا؟ کیونکہ فرانس بھی تو انگلینڈ کا پڑوسی ہے

فہرست مضامین زمانہ جلد ۹۷ جولائی لغایتہ دسمبر ۱۹۴۲ء

(حصۂ نثر)

(حصۂ نظم)

تعلیمی خطبات

(از)

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی،

یہ کتاب جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ کے خطبات اور مضامین کا مجموعہ ہے، موصوف نے یہ خطبے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ، طبیہ کالج پٹنہ، بنیادی تعلیمی کانفرنس دہلی، اور کاشی ودیا پیٹھ بنارس وغیرہ میں پڑھے تھے۔ خطبات کے علاوہ چند مضامین مثلاً اچھا اُستاد، بچوں کی تربیت، بچہ اور مدرسہ وغیرہ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے تھے۔

تعلیم کے عام نقائص، موجودہ تحریکوں کے جدید رُجحانات اور تعلیم و تربیت کے نئے اُصولوں پر یہ رسالے ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں۔ قیمت ۲ر

دوسری تعلیمی کتابیں

ہم کیسے پڑھائیں۔ ازجناب سلامت اللہ صاحب بی۔ اے، بی۔ ٹی	قیمت	۸ر
ایک معلّم کی زندگی حصہ اول۔ ازجناب عبدالغفار صاحب مدھولی استاد جامعہ	”	۱۲ر
ایک معلّم کی زندگی حصہ دوم۔ ازجناب عبدالغفار صاحب مدھولی اُستاد جامعہ	”	[illegible]
لیونارڈ و گرٹروڈ۔ مصنفہ پستالوزی، مترجمہ غلام حسین صاحب ڈی ایڈ	”	عہ
پستالوزی۔ ڈاکٹر عبدالحمید صاحب زبیری ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی	قیمت مجلد	۱۲ر
اصول تعلیم۔ خواجہ غلام السیدین صاحب ایم۔ ایڈ	قیمت	سے
تعلیمی رپورٹ۔ مرتبہ ایجوکیشنل کانفرنس علیگڈھ	”	۲ر

مکتبہ جامعہ دہلی، قرول باغ

شاخیں:۔ مکتبہ جامعہ جامع مسجد دہلی۔ مکتبہ جامعہ امین آباد لکھنؤ۔ مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی

[illegible]

THE ZAMANA, APRIL 1943. REGD. No. A14

زمانہ

بیادگار منشی دیا نراین صاحب نگم

نمبر ۴	اپریل ۱۹۴۳ء	جلد

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا



رام بالک کا روغن سوکھا

یعنی

بچوں کے سوکھا روگ کی شرطیہ اکسیری دوا



یوں تو دنیا میں ہزاروں بیماریاں ہیں مگر یہ ظالم دشمن جاں سوکھا مسان جس کو سوکھا روگ بھی کہتے ہیں بڑی بلا ہے۔ اس نے لاکھوں ماؤں کی گودیں خالی کر دیں ہنستے کھیلتے خوبصورت بچوں کو اس دشمن نے خاک میں ملا دیا۔ اس بیماری کا حال ان غمزدہ دکھیاری ماؤں سے پوچھئے جن کے پیارے بچے سوکھا روگ میں مبتلا ہو کر ان کے ہاتھ سے نکل کر داغ دے جاتے ہیں۔ سوکھا روگ کے واسطے ماں باپ طرح طرح کے کام کرتے پھرتے ہیں اور تیار ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو گودواتے ہیں، سر کی رگ سے خون نکلواتے ہیں، میٹھے برتن میں دوا ڈال کر کپڑے چلواتے ہیں، گنتی کے کھیت میں لے جاتے ہیں۔ تالاب میں نہلواتے ہیں، جھاڑ پھونک کرواتے ہیں، گلے میں گنڈے تعویذ ڈلواتے ہیں۔ لالٹین تیل اور لال تیل ملواتے ہیں اور گدھی کا دودھ پلواتے ہیں۔ چونکہ بہت سے لوگوں کو سوکھا مرض کی پہچان نہیں ہوتی اور ناواقفیت سے طرح طرح کے علاج کرنے کے باوجود فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مرض بڑھتا ہی جاتا ہے اس لئے اس مرض کی معمولی علامات درج کی جاتی ہیں تاکہ تشخیص مرض میں آسانی ہو اور بچوں میں یہ علامتیں پائی جائیں تو فوراً روغن سوکھا استعمال کر کے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یہ مرض عام طور سے چیت کے مہینے سے شروع ہو کر ساون بھادوں میں زور پکڑتا ہے اور اگہن کے مہینے تک رہتا ہے۔ اس عرصہ میں لاکھوں بچے اس مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سوکھا روگ میں بچہ دن بدن سست رہتا ہے، حرارت پیدا ہو جاتی ہے، آنکھیں ہر وقت نڈھال رہتی ہیں، بدن کا خون رفتہ رفتہ کم ہو جاتا ہے جس سے بچہ سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے۔ ہاتھ پیر پتلے ہو جاتے ہیں اور پیٹ بڑا ہو جاتا ہے، سر کا تالو خالی ہو جاتا ہے، کان کی لو دبانے سے بچہ روتا نہیں، پیچھے ہاتھ پاؤں اور گردن پتلی پڑ جاتی ہے اور پیٹ بڑھ جاتا ہے، کھانسی آنے لگتی ہے، آنکھیں سفید ہو کر گڑھے میں دھنس جاتی ہیں، چہرہ پر جھریاں پڑ جاتی ہیں، بچہ ناک کان کھجلاتا ہے، چڑچڑا ہو جاتا ہے اور دودھ ڈالنے لگتا ہے۔ جب بچہ سست نظر آئے تو سمجھ لینا چاہئے کہ سوکھا روگ شروع ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں فوراً رام بالک کا روغن سوکھا لگانا چاہئے، کیونکہ یہ تیل اس روگ کو ہمیشہ کیلئے جڑ سے کھو دیتا ہے۔ چاہے بچے سوکھ کر کانٹا ہی کیوں نہ ہو گئے ہوں اس کے استعمال سے بچے لال لال اور موٹے تازے ہو جاتے ہیں۔ اگر سوکھا مرض نہ بھی ہو اور بچے دبلے پتلے ہوں تو بھی اس کے استعمال سے بچے بہت جلد تندرست اور طاقتور ہو جاتے ہیں۔ آجکل سوکھا روگ کیلئے بازاروں میں بہت سے تیل ملتے ہیں جو جسم پر ملنے کیلئے ہوتے ہیں مگر ہمارا روغن سوکھا جسم پر ملا نہیں جاتا بلکہ پلایا جاتا ہے اسلئے اس منحوس مرض کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور بچے اچھے ہو جانے پر پھر دوبارہ اس مرض کا اندیشہ نہیں رہتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مرض سوکھا دوا سے نہیں جاتا لیکن یہ خیال غلط ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے ہر مرض اور دکھ درد کی دوا پیدا کی ہے اور رام بالک کا روغن سوکھا ہزاروں بار کی آزمودہ اور مجرب دوا ہے۔ آجتک سوکھا روگ کی اس سے بڑھکر مفید دوا نہیں بن سکی۔ آزمائش کے بعد آپ خود ہی ہماری صداقت کی شہادت دیں گے اور آزمائش ہی بہترین کسوٹی ہے۔

روغن سوکھا کا اشتہار نفع کمانے کیلئے نہیں دیا جاتا ہے بلکہ اس مہلک مرض سے بے زبان بچوں کی زندگی کی حفاظت مقصود ہے کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جسکا ہر عیالدار گھر میں رہنا نہایت ضروری ہے اور اسی لئے یہ لاگت ہی کے دام پر ضرور تمندوں کو دی جاتی ہے۔ یعنی ایک شیشی کی قیمت صرف بارہ آنہ (۱۲؍) ہے جو قریب قریب ایک مہینہ تک کام آتی ہے۔ باہر سے منگانے والوں کو خرچ پیکنگ و ڈاک خرچ خود دینا پڑیگا۔ ایک سے تین شیشیوں تک آٹھ آنہ محصول لگتا ہے۔ ایک شیشی پر بھی یہ خرچ پڑیگا اسلئے کئی شیشیاں اکٹھی منگانے سے ڈاک خرچ میں کفایت ہوگی۔ ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ روغن سوکھا کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کیلئے ہر جگہ ایجنٹوں کی ضرورت ہے جنکو معقول کمیشن دیا جاتا ہے۔

المشتہر

رام بالک پنساری و عطار بیگم گنج والے۔ ناریل بازار کانپور۔ (برانچ آفس بیگم گنج۔ کانپور)

زمانہ

جلد ۸ | اپریل ۱۹۴۳ء | نمبر ۴

پرتھی راج راسو کی زبان

(از سید رفیق مارہروی)

چند بردائی ایک ہندی شاعر تھا، بعض اُردو تذکروں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ایک ہندی شاعر کی حیثیت سے رسالہ زمانہ میں بھی اس کا مفصلاً ذکر ہو چکا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ چند کی ہندی شاعری میں اُردو کے آثار ملتے ہیں، مگر اس موضوع پر ابتک بہت مجمل اور مختصر لکھا گیا ہے، میں نے اپنی غیر مطبوعہ کتاب "ہندوؤں میں اُردو" کے اندر چند کی اس خصوصیت پر نہایت شرح و بسط سے بحث کی ہے، اس کا کچھ حصہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں

ہندوستان کے قدیم نشانات اور آثار ادب، سندھ، ملتان، پنجاب اور دکن کے علاوہ بہت کچھ راجپوتانہ کی سرزمین سے بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں اور واقعات کا تھوڑا بہت اندازہ اُن رزمی و بزمی نغمات سے بھی لگایا جانا ممکن ہے جو وہاں کے کلاونتوں اور مطربوں کی زبانوں پر آج تک جاری ہیں، ہندو قوم میں بھاٹوں کا طبقہ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے اس فرقہ کا وجود بہت قدیم ہے۔ ہندو قوم نے اپنے مذہب کے عام پرچار کے لئے ان کو تیار کیا تھا۔ اس تبطہ کے افراد اُن چھوٹے سے چھوٹے لوگوں تک بآسانی پہنچ جایا کرتے تھے جن میں جانا ایک برہمن مذہبی اور قومی اعتبار سے اپنے لئے باعث ذلت متصور کرتا تھا مذہبی تبلیغ کے باب میں بھاٹوں کا وجود بڑا قیمتی ثابت ہوا۔ برہمن اپنی مذہبی کتابوں سے آسان و سہل بھجن اور نظمیں بھاٹوں کو حفظ کرا کے تبلیغ مذہب کا کام لیا کرتے تھے۔ برہمنوں کا اقتدار جب کم ہوا تو یہی طریق کار رہا آخر بھاٹوں کا پیشہ ترن کران کا مستقل وسیلۂ روزگار ہو گیا راجاؤں اور سورماؤں کے وہ منظوم کارنامے، ہندو مذہب و ملت کی وہ شاندار حکایات جو بھاٹوں کو زبانی یاد کرائی گئی تھیں نسلاً بعد نسلاً ایک حافظے سے دوسرے حافظے تک منتقل ہوتی رہیں اور آجتک کسی نہ کسی صورت میں گوش آشنا ہو رہی ہیں۔

بھاٹوں میں عام طور سے جہاں ایسے جاہل اور ان پڑھ ہوتے تھے جو دوسروں کی تصنیف کردہ نظموں اور دوہروں کو یاد کر کے سنایا کرتے تھے وہیں کچھ زمانہ گزرنے کے بعد بھاٹوں کی کچھ ایسی تعداد بھی ہو گئی جو ملکی زبانوں میں پوری پوری مہارت حاصل کر کے اپنی

صوبیات کے مطابق تصنیف و تالیف کیا کرتی تھی۔ اس قسم کے بھاٹوں میں سب سے پہلا بھاٹ جس کے حالات ذرا تفصیل کے ساتھ دستیاب ہوتے ہیں چند بردائی ہے۔ اس نے مہاراجہ پرتھی راج کے کارناموں کو شہرت دی۔ یہ بے عدیل بھاٹ ۱۱۵۹ء (۵۵۶) میں بمقام لاہور پیدا ہوا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ پرتھی راج اور چند بردائی کا سنہ ولادت ایک ہے۔ چند بردائی کا باپ اجمیر کے راجہ رائے پتھورا کے زمانہ میں لاہور سے چل کر راجپوتانہ پہونچا اور راجہ کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ وہ ایک ایسے ملک سے آیا تھا جہاں چند بردائی کی پیدائش سے بہت پہلے اسلامی اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کی آمد و رفت ہر طرف تھی۔ اُن کی تہذیب و معاشرت نے ہندوؤں کے تہذیب و تمدن سے بڑی حد تک اختلاط پیدا کر لیا تھا اور مسلمانوں کی زبان بھی ہندی زبانوں سے کم و بیش ممزوج ہوتی جاتی تھی۔ چند بردائی کی تعلیم و تربیت یقیناً اسی ماحول میں ہوئی ہوگی اس کا باپ چونکہ اجمیر کے دربار میں معزز تھا اس لئے یقیناً اُس نے اپنے ہونہار بیٹے کو حسب ضرورت اور حسب رواج مختلف زبانیں اور علوم و فنون حاصل کرنے کا پورا پورا موقع دیا ہوگا۔ ایک ہندی تذکرہ میرے اس قول کی تائید میں لکھتا ہے کہ:- (ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص۱۲ مولفہ رام چند شکل)

"چند بردائی چھ زبانوں سے واقف تھے، شاعری، عروض، شاستر اور جوتش میں بھی پورا پورا دخل حاصل تھا۔"

باپ کے انتقال کے بعد پرتھی راج کے زمانۂ حکومت میں چند بردائی تخت شاہی سے وابستہ ہو گیا۔ شروع شروع میں محض ایک درباری کی حیثیت میں رہا، بعد ازیں اس کے جوہر کھلے اور اسکی فطانت و ذہانت نے پرتھی راج کو اتنا گرویدہ کیا کہ سلطنت کا وزیر مقرر کر دیا گیا اور ایک جان دو قالب کی مثال قائم ہو گئی۔ چند کی درباری حیثیت کی وضاحت میں ایک ہندی تذکرے کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:-

"وہ پرتھی راج کے صرف درباری شاعر ہی نہ تھے بلکہ ان کے وزیر اور مخلص دوست کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ اُن کی زندگی پرتھی راج کے ساتھ اس طرح ملی ہوئی تھی کہ علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ لڑائی میں شکار میں دربار اور سفر میں وہ ہمیشہ مہاراج کے ساتھ رہا کرتے تھے، اور جہاں جو باتیں ہوتیں اُن میں شامل ہوتے۔"

چند بردائی کی ایک نظم پرتھی راج راسو کے نام سے بہت مشہور ہے۔ یہ درحقیقت ایک بہت بڑا گرنتھ ہے جس میں ۶۹ ابواب ہیں اور یہ گرنتھ ڈھائی ہزار صفحات کو محیط ہے۔ اس میں چھتری قوم کی تاریخ ضبط تحریر میں لائی گئی ہے۔ اجمیر راج کے قیام سے راجہ پرتھی راج کے آخری زمانہ تک کے حالات اس میں ملتے ہیں نظم میں یہ خصوصیت ہے کہ اس کے اشعار میں جگہ جگہ عربی و فارسی الفاظ ملتے ہیں اگرچہ نظم شاعرانہ تعلّیوں اور بڑی حد تک غیر محقق واقعات و روایات پر مشتمل ہے پھر بھی اس میں فارسی اور عربی الفاظ کے بے تکلف استعمال نے یہ امر محقق کر دیا ہے کہ ہماری موجودہ اُردو زبان کی تخلیق اور تنظیم کی ابتدائی غیر محسوس و غیر معلوم کوششیں اُس وقت شروع ہو چکی تھیں اور ہندی زبان میں اسلامی زبانوں کے امتزاج نے موجودہ اُردو زبان کی داغ بیل ڈال دی تھی۔

اس دور کے بعض محققین کا خیال ہے کہ پرتھی راج راسو میں فارسی و عربی کا استعمال اس کی قدامت کو مشکوک کر دیتا ہے ان کا خیال ہے کہ جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی اُس زمانے میں ایک ہندی زبان میں غیر ملکی الفاظ کا اس کثرت سے استعمال

غیر ممکن تھا۔ اور یہ نظم یقیناً چند بردائی کے بہت بعد سولھویں یا سترھویں صدی عیسوی میں کسی نے تصنیف کرکے چند بردائی کے نام سے موسوم کردی ہے۔ یہ خیال محض واہمہ ہے اور نہ یہ کتاب سولھویں یا سترھویں صدی عیسوی کی پیداوار ہے اور نہ چند کے سوا اس کا کوئی دوسرا مصنف ہوسکتا ہے۔ پرتھی راج راسو کے متعلق جس قدر بھی شکوک پیدا ہوئے ہیں وہ اس نظم کے اُن واقعات اور روایات کی بنا پر ہیں جو تاریخی حقائق سے متبائن ہیں۔ اس میں بعض ایسے اسلحہ کا ذکر ہے جو اس زمانے میں رائج نہیں تھے بلکہ بہت بعد میں رائج ہوئے تیمور و چنگیز کا بھی ذکر ہے جو بہت بعد کے لوگ ہیں۔ محمد غوری کے پہلے حملے پر اس کا گرفتار ہونا اور پرتھی راج کا اُس کو آزاد کرنا دوسرے حملے پر پرتھی راج کا شکست پاکر گرفتار ہونا، غزنی بھیجا جانا بعد میں چند بردائی کا بھی وہیں پہونچ جانا اور آخر غزنی ہی میں پرتھی راج کے اشارے سے شبد بیدھی بان کا محمد غوری کو قتل کرنا[2]۔ اس کے بعد پرتھی راج اور چند بردائی کا خودکشی کرلینا۔ شہاب الدین غوری کا ایک پٹھان مسمی سردار حسن کی بیوی پر عاشق ہونا، پرتھی راج کے پاس سردار حسن کا آنا اور پناہ مانگنا وغیرہ وغیرہ ایسی غلط اور بےسروپا باتیں ہیں جو نظم کو اپنی واقعیت سے بہت دُور پھینک دیتی ہیں۔ یہ نظم تاریخی اعتبار سے بھی بے وقعت ہے بعض واقعات کا جو زمانہ متعین کیا گیا ہے وہ مستند تاریخوں سے میل نہیں کھاتا۔ نظم کی زبان بھی درست نہیں ہے، ہندی قواعد کے اعتبار سے بھی مہمل ہے لیکن بعض جگہ زبان بھی درست ہے، اور قواعد کا بھی پُورا پُورا لحاظ رکھا گیا ہے، ہندی فن عروض کا بھی خیال رکھا ہے، ان تمام امتیازات کے باوجود یہ فیصلہ پھر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ پرتھی راج راسو چند بردائی کی تصنیف نہیں ہے۔ ہاں اس میں ایجاد و تصرف ضرور ہوا، خود چند بردائی راسو میں ایک جگہ لکھتا ہے:-

رگھناتھ چرت ہمنت کرت بھوپ بھوج اُدھریہ جم[3]

پرتھی راج سجس کو چند کرت چند نند اُدھریہ تم

یعنی جس طرح ہمنت شاعر کا بنایا ہوا "رگھناتھ چرت" اس کے بعد بھوج نے پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔ بالکل اسی طرح چند کے ان گنوں کو جو اس نے پرتھی راج کے حق میں کی ہیں اس کے لڑکے پُورا کریں گے۔ اسی نظم کا ایک اور مصرعہ ہے

پستک جلہن ہتھ دے چل گجن (غزنی) نرپ کاج[4]

یعنی راسو نامی کتاب جلہن کو دیکر راجہ کے کام سے چند بردائی غزنی چلا گیا جلہن چند بردائی کا لڑکا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ راسو میں ایجاد و تصرف کا ذمہ دار جلہن ہو۔ نظم کی بے ترتیبی اور عدم تسلسل خود اس امر پر گواہ ہے۔ یہ گرنتھ ایک ساتھ نہیں لکھا گیا۔ اسکی ترتیب میں بہت مدت صرف ہوئی ہوگی، چند بردائی چونکہ ہمہ وقت پرتھی راج کے ساتھ رہا کرتا تھا اس لئے موقع بہ موقع پیش یا افتادہ حالات لکھتا جاتا ہوگا۔ کتاب دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسمیں کہیں تو جنگ جدال کے واقعات قلم بند کئے گئے ہیں۔

[3] रघुनाथ चरित हनुमंत कृत भुप भोज उद्धरिय जिम। पृथ्वीराज सुजस कवि चंद कृत चंद नंद उद्धरिय तिम ॥

[4] पुस्तक जल्हन हत्थ है चल गज्जन नृप काज

[1] دیکھو پنجاب میں آریہ" صفحہ ۱۱۲ [2] شہاب الدین غوری کو ۶۰۲ھ میں دریائے جہلم کے قریب ملاحدہ اسمٰعیلیہ نے قتل کیا تھا جب وہ پنجاب کی کھوکر قوم کی بغاوت رفع کرکے غزنی واپس جا رہا تھا۔ (دیکھو دول الاسلام از ذہبی جلد دوم صفحہ ۸۱)

اور کہیں راجہ کے درباری حالات و مشاہدات، کہیں راجہ کا خاندانی شجرہ رقم ہے تو کہیں راجہ کی متعدد شادیوں کے اذکار ہیں۔ الغرض یہ کہ پرتھی راج راسو میں دنیا زمانے کے واقعات بھرے ہوئے ہیں، اور ان کو افسانوی رنگ دیکر مصنف نے ایسا مبہم کر دیا ہے کہ بعض جگہ مطلب و مفہوم تک خبط ہو گیا ہے۔ یہ نظم درحقیقت قدیم ترین پراکرت میں ہے۔ اس کی زبان اس درجہ مشکل ہے کہ ہندی زبان کے ماہرین بھی اس کو اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ یہ نظم اپنی ابتدائی حالت میں یقیناً بے عیب ہوگی۔ چند بردائی کے بعد اس میں جو ردوبدل اور تصرّف ہوا اُس نے اس کو جاں غلط گوئی اور واہمہ نوائی سے ہم ردیف کر دیا ہے وہیں اس کی اصل خصوصیت یعنی عربی و فارسی الفاظ کے استعمال کو بھی مبہم کر دیا ہے۔ بعض الفاظ کو تو ایسا توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے کہ وہ اپنی اصلیت و قومیت سے بہت دُور جا پڑے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ نظم شروع سے ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی رہی ہے اور چونکہ سنسکرت جاننے والے فضلاء کے دست و قلم کا تختۂ مشق بنی رہی ہے اس لئے ان حضرات نے اپنے ماحول اور افتادِ طبع کی مناسبت سے ایجاد و تصرّف میں مطلق دریغ نہ کیا ہوگا۔

اس دور کے بعض محقق پرتھی راج راسو میں دس فیصدی عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش ثابت کرتے ہیں۔ ان کا یہ نظریہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ دس فیصدی بلکہ اس سے بھی زیادہ ایسے الفاظ ضرور ملتے ہیں جو اس وقت بھی ہماری اُردو زبان میں مستعمل ہیں اور کثرتِ استعمال نے ان کو اپنی اصل سے دور کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ راسو میں مشکل سے تین یا چار فی صدی غیر ملکی الفاظ محض اپنی برجستگی کی بنا پر چند بردائی کے مستعمل متصور کیے جا سکتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو واقعی راسو کے کسی نسخہ میں اس سے زیادہ عربی و فارسی الفاظ ملے ہیں تو مجھے کہنا پڑتا ہے کہ یہی وہ بعد کے اضافے اور ترمیمات ہیں جو متاخرین کے دست و قلم سے وقتاً فوقتاً ہوتے رہے۔

قدیم مخطوطات سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس زمانے میں محض مطابع کی موجودہ آسانیاں غیر ممکن ہونے کے باعث ایک تصنیف کی متعدد نقلیں ہوا کرتی تھیں، قدردان خود یا کاتبوں سے لکھوایا کرتے تھے کتابوں کی اس ترتیب و تیاری سے جو فرق اصل و نقل میں رہنا چاہیئے تھا، اس کا اندازہ آج بھی پُرانی قلمی کتابوں کے دیکھنے اور مقابلہ کرنے سے کیا جا سکتا ہے۔ بمشکل سے دو تین فی صدی ایسی قلمی کتابیں ملیں گی جو اصل سے پوری پُوری مطابقت کرتی ہوں۔ قلمی کتابوں سے قطع نظر اگر اس ترقی یافتہ زمانہ میں چھپی ہوئی کتابوں پر نظر ڈالی جائے تو وہ بھی تصرف و ایجاد سے خالی نہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو، راسو کا ایک شعر ہے جو اُردو رسم الخط میں یوں لکھا جائیگا

بارہ بانس بتیس گج، انگل چار پرمان　　اتنے دھر پر شاہ ہے متی چوکے چوہان

یعنی بارہ بانس بتیس گز اور چار انگل کے فاصلے پر بادشاہ ہے، اے چوہان اب مت چوک۔ مولوی حامد حسن صاحب قادری اپنی کتاب موسومہ "تاریخ تنقید ادبیات اُردو" میں اس شعر کو اس طرح تحریر کرتے ہیں:-

بارہ بانس بنیں میں چار انگل پرمان   استے گھر بادشاہ ہے متے چوکے چوہان

مولوی حامد حسن صاحب نے اس شعر کے خط کشیدہ لفظ کو "فرمان" قرار دیا ہے۔ اگر واقعی یہ لفظ فرمان ہی ہے تو پھر یہ غور کیجیے کہ دوسرے الفاظ کی مناسبت سے اس شعر کے معنی کیا ہوئے۔ پرتھی راج راسو میں دس فیصدی عربی و فارسی الفاظ کی ملاوٹ کو ماننے والے ایسی ہی تحریروں سے غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نظم عربی و فارسی الفاظ سے تہی مایہ ہے۔ عربی و فارسی الفاظ کی اس میں آمیزش ہے لیکن اسی قدر جتنی کہ اس زمانہ میں ہو سکتی تھی۔ اور اس امتزاج کا مرتکب بھی چند بردائی ہی تھا۔ اس معاملے میں شک و شبہ کرنے والے وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے تعلق کو ہندوستان سے پرتھی راج کے قتل یا فتح دہلی کے بعد سے ہی مانتے ہیں۔ مسلمانوں کے قدیم ترین ہندی اختلاط اور اس کے متعلق مستند و مؤقر تاریخی شواہد سے ہم منکر نہیں ہو سکتے۔ چند بردائی کے زمانہ ہی میں متعدد ایسے ہندو شاعر گزرے ہیں جن کی شاعری میں عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ جگ نائک جو مہوبا کے راجہ کا درباری شاعر تھا ہندی کا زبردست شاعر گزرا ہے مثنوی آلہا کھنڈ اس کی شاہکار تصنیف ہے۔ اس میں صدہا اشعار ایسے ملتے ہیں جو اسلامی معاشرت سے متاثر ہیں، اور السنۂ اسلامیہ کی بقدر ضرورت اس نظم میں بھی آمیزش ہے۔ گو یہ نظم بھی پرتھی راج راسو کی طرح بہت کچھ مسخ کر دی گئی ہے لیکن اس کے قدیم خط و خال میرے خیال کے مؤید ہیں۔ یہ نظم اپنی اصلی حالت میں نابید ہو چکی ہے لیکن اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ انگریزی زبان تک میں منتقل ہو چکی ہے۔ یہ نظم آلہا اودل کے نام سے بھی مشہور ہے۔

ہندو شعرا کے علاوہ اس زمانے کے اگر مسلمان شعرا کے کلام کو دیکھا جائے تو وہ بھی ہندی زبان کی آمیزش سے ملوث ہے۔ حکیم سنائی، عثمان مختاری، مسعود سلمان قدیم اور مشہور اہل قلم گزرے ہیں۔ ان کے فارسی کلام میں اکثر اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی طرح انھوں نے بھی رواداری سے کام لیکر اپنے فارسی کلام میں ہندی الفاظ کو بلا تکلف استعمال کیا۔ معضلہ بالا شعرا تو وہ ہیں جو ہندوستان آئے اور اس سے یا یہیں پیدا ہوئے۔ فارسی ادب میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ہندی زبان اپنے حدود سے باہر بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہی۔ اس کی مثالیں فردوسی کے شاہنامہ میں دیکھیے، فردوسی کا ایک شعر ہے ؎

چو آگاہ شد کوتوال حصار   بہ آویخت با رستم نامدار

ایران کے مشہور شاعر منوچہری کا شعر ہے ؎

الا تا مومنان دارند روزہ   الا تا ہندواں گیرند لنگھن

اس طرح کے صدہا اشعار ہیں، مضمون کی طوالت کے خیال سے چھوڑے جاتے ہیں اور صرف یہ بتایا

جاتا ہے کہ جب مسلمانوں کے فارسی کلام میں ہندی الفاظ کے استعمال کو دیکھکر تعجب نہیں کیا جاتا تو پھر آخر چند برائی کی نظم میں عربی و فارسی الفاظ دیکھکر حیرت کیوں کی جاتی ہے، اور اس کی صحت و قدامت میں تردد کیوں ہے یقیناً جس طرح آپس کی یکجائی اور ایک جہتی سے ہندی زبان سے مسلمان اجنبی نہیں رہے بالکل اسی طرح ہندوؤں کو السنۂ اسلامیہ سے کسی قسم کا گریز نہیں تھا۔ یہاں بحث کا ایک اور پہلو بھی نکلتا ہے۔ بعض تذکرہ نویس مسعود سعد سلمان کو سب سے پہلا اردو شاعر کہتے ہیں۔ اس کا زمانہ سنہ ۴۹۲ھ تھا۔ پنجابی تذکروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مسعود نے اردو نما ہندی شاعری کا پورا دیوان تیار کیا تھا لیکن وہ اب ناپید ہے۔ تذکرہ نویسوں کو یہ غلط فہمی محمد عوفی اور حضرت امیر خسرو کی تحریروں سے ہوئی ہے۔ محمد عوفی اپنے تذکرہ "لب الالباب"[1] جلد دوم کے صفحہ ۲۴۶ پر رقمطراز ہیں کہ:۔

"اورا سہ دیوان یکے بہ تازی یکے بہ پارسی یکے بہ ہندی دارد"

حضرت امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں صفحہ ۶۶ پر تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"وپیش ازیں از شاہان سخن کسے را سہ دیوان نبود مگر کہ خسرو ممالک کلام مسعود سلمان را گرچہ ہست، اماں آں سہ دیوان و عبارت عربی و فارسی و ہندی است و در پارسی کہ مجرد کسے سخن را سہ قسم نکردہ جز من کہ دریں کار قسام عادلم۔"

یہ دونوں تحریریں ایسے مشہور و مستند افراد کی ہیں کہ بظاہر ان پر اعتماد کئے ہی بنتی ہے، لیکن بعض وجوہ اس ایوانِ عقیدت کو متزلزل کر دیتے ہیں۔ مسعود سلمان نے اپنے قصائد میں جگہ جگہ اپنی عربی و فارسی دانی پر فخر کیا ہے۔ باوجود تلاش اس کا ایک شعر بھی ایسا دستیاب نہیں ہوا جس میں اشارتاً کنایتاً بھی اس نے اپنی ہندی دانی یا اس زبان میں ایک پورا دیوان ترتیب دینے کا ذکر کیا ہو۔ بلکہ جہاں اور جس جگہ بھی کچھ اظہار کیا ہے تو صرف دو زبانوں سے واقفیت کا۔ حالانکہ عربی و فارسی کے مقابلے میں ہندی دانی اس کے لئے محض غیر ملکی ہونے کی بنا پر بہت زیادہ فخر و مباہات کا باعث ہو سکتی تھی۔ سعد سلمان کے اس سلسلے میں کچھ شعر ملاحظہ ہوں:۔

بریں ہر دو زبان در ہر دو میدان بگردونم رسیدہ کامرانی
ہجو آرد بہ پیش خاطر من روانِ رودکی و دام مانی
کس ار بہ پارسی و تازی امتحان زدمے مرا مبارز میدانِ امتحان ندمے
مرا بوال کہ در پارسی و در تازی بہ نظم و نثر ندارد چو من کس استقلال

خواجہ مسعود سعد سلمان برابر ۶۰ سال ہندوستان (پنجاب) میں رہا، بلکہ وہ پیدا بھی یہیں ہوا تھا[2]، مگر:

[1] یہ تذکرہ ۱۹۰۳ء میں بمقام لندن مرزا محمد خاں بن عبدالوہاب قزوینی نے تصحیح کرکے شائع کیا تھا۔ [2] اردوئے قدیم صفحہ ۱۳

کہ اُنہوں نے یہاں کی زبان سیکھلی ہو اور اس میں اشعار بھی کہے ہوں۔ اور امیر خسرو اور عوفی کے قول کے مطابق ایک پورا دیوان بھی ترتیب دیا ہو لیکن اس کا ہندی (اُس زمانے کی اُردو) زبان میں ایک شعر بھی دستیاب نہ ہونا تعجب خیز ہے۔ محض قیاسات کے ماتحت تو سعد سلمان کو اُردو کا پہلا شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ اس ثبوت میں عوفی اور امیر خسرو کی ضمنی تحریریں کوئی معنی نہیں رکھتی ہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ سعد نے اُردو یا ہندی میں شعر کہے یا نہیں کہے۔ ہم خود مقر ہیں کہ اُس زمانے میں جب کہ عربی و فارسی ہند شعرا کے لئے اجنبی نہیں رہی تھی، مسلمانوں کے لئے ہندی زبان کا اجنبی رہنا غیر قرین قیاس ہے، اسلامی و ہندی زبانوں کے میل جول سے ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ سعد نے بھی اس زبان میں اشعار کہے ہوں، ایک پورا دیوان بھی ترتیب دیا ہو اور عجب نہیں کہ حوادثِ زمانہ نے اس کو نا پید بھی کر دیا ہو لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ جن معمولی اور بے دلیل تحریروں کے مقابلے میں آج سعد سلمان کو اُردو کا شاعر متصور کیا جاتا ہے تو آخر یہی رواداری اور خوش خیالی چند بردائی کے معاملے میں کیوں عدم اعتمادی و بے اطمینانی اور بدگمانی میں تبدیل ہو جاتی ہے، خصوص ایسے حالات میں کہ سعد سلمان کے مقابلے میں چند بردائی کے صدہا اشعار بھی ایسے دستیاب ہو چکے ہیں جن میں عربی و فارسی الفاظ پوری طرح شریک حال ہیں جس نظریہ کے تحت پنجابی حضرات سعد سلمان کو اُردو شاعری کا پہلا شاعر تسلیم کر لینے پر مُصر ہیں بالکل اُسی نقطۂ نظر کے مطابق ہم کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ چند بردائی کے کلام میں نہ صرف اُردو زبان کے وہ ابتدائی خط و خال موجود ہیں جن سے اُردو زبان کے نشو اور ترتیب و ترقی پانے کا اندازہ ممکن ہے بلکہ اس کے کلام سے ایک ایسے اشتراکِ عمل کا بھی ثبوت ملتا ہے جس کی بنا پر بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں نے اُردو زبان کی تخلیق و تنظیم میں شروع سے ہی مسلمانوں کا پورا پورا ساتھ دیا، ان کا ہاتھ بٹایا اور اُردو زبان کو اپنی زبان سمجھا اور اس طرح اُردو کے اولین علم برداروں میں چند بردائی کا شمار بیت اہمیت رکھتا ہے میں چند بردائی کے ذکر سے پہلے بعض اور ہندو شعرا کا ذکر بھی "زمانہ" کے صفحات پر کر چکا ہوں، اور ہر ہندو شاعر کے مقابلے میں اس کے ہم عصر مسلمان شعرا کا ذکر کر کے یہ دلائل ثابت کر چکا ہوں کہ ہر زمانے اور ہر دَور میں ہندو شعرا مسلمان شعرا کے دوش بدوش اُردو کی ترتیب و تنظیم میں مصروف رہے ہیں، اور کوئی دلیل ہم کو یہ باور کرنے پر مجبور نہیں کرتی کہ اُردو (تنظیم و تخلیق کے بارے میں) ہندو شعرا اولیت سے محروم ہیں۔

پنڈت ہر پرشاد شاستری نے ۱۹۰۹ء و ۱۹۱۳ء میں مخصوص بعض ہندو شعرا کے حالات کی تصدیق و جستجو میں راجپوتانہ کا سفر کیا تھا۔ وہاں پہونچکر انھوں نے پرتھی راج راسو کے باب میں بھی پوری پوری جستجو فرمائی تھی۔ واپسی میں ایک رپورٹ[1] بھی شائع کی تھی جو چند بردائی کے حالات کو بہت کچھ واضح کر دیتی ہے۔ ان کا

[1] یہ رپورٹ ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کرادی ہے۔

بیان ہے کہ پرتھی راج نے اپنے زمانۂ حکومت میں ناگور آباد کیا تھا، چند بردائی کو وہاں جاگیر عطا کی، چنانچہ اس کا خاندان اب تک ناگور میں آباد ہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ "نانورام" مشہور ہیں، شاستری جی ناگور میں ان سے ملے[1]۔ نانورام نے ان کو بتایا کہ چند بردائی کے چار لڑکے تھے جن میں سے ایک مسلمان ہوگیا ایک لاپتہ ہوا، اور دو[2] یعنی جل چند (جھلن) اور گن چند سے نسل چلی۔ نانورام نے یہ بھی بیان کیا کہ چند بردائی نے تین یا چار ہزار اشلوک لکھے تھے، اُن کے لڑکے نے کچھ اضافہ کرکے گرنتھ مکمل کیا، بعد میں دوسرے آدمیوں نے بھی اپنی اپنی عقل کے مطابق ترمیم و تنسیخ سے کام لیا۔ اکبر کے وقت میں جب اس نظم کی قدر ہوئی اور اکبر نے اس کو پسند کیا تو متعدد نظمیں اس نام کی مناسبت سے لوگوں نے لکھ ڈالیں۔ نانورام کے پاس بھی پرتھی راج راسو کا ایک نسخہ ہے۔ لیکن اس کی نقل جو اُنھوں نے شاستری جی کو دی ہے وہ بھی اغلاط سے پاک نہیں ہے۔ پرتھی راج راسو کے صحیح نسخے درحقیقت اب نایاب ہیں۔ اس نظم کے تین نسخے یورپ بھی پہونچے، جن میں سے ایک لندن کی ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں میجر ٹاڈ کا دیا ہوا موجود ہے دوسرا ایسکنزی لائبریری میں موجود ہے، تیسرا نسخہ روس کے ایک فاضل مسمّی رابرٹ لنز کے پاس تھا جس نے ۱۸۶۳ء میں اس کا کچھ حصّہ روسی زبان میں منتقل کرکے شائع بھی کیا تھا اور وہ مطبوعہ حصۂ نظم وارسا میں موجود ہے[2]۔

۵۸۸ھ (۱۱۹۰ء) میں جب شہاب الدین غوری تھانیسر کے مقام پر پرتھی راج سے نبرد آزما ہوا تو عین لڑائی میں پرتھی راج قتل ہوا[3]، چند بردائی بھی شریک جنگ تھا، وہ بھی اپنے آقا کے ساتھ قتل ہوا، اور اس طرح اُس نے ایک ایسی رفاقت کا ثبوت دیا جو شاہ و وزیر کی حیات و موت میں مشترک نظر آتی ہے[4]۔

---

[1] راسو کے مطالعہ کے بعد واضح ہوتا ہے کہ چند کے دس لڑکے تھے جس کی تائید ناموں کے فرق کے ساتھ سورداس نے بھی کی ہے۔ راسو کا ایک شعر بھی ملاحظہ ہو:۔

دہت پُتر کو چند کے سند روپ سوجان　　اِک جیلن گن با بردگن سمند سمجان

[2] دیکھو تاریخ شعرائے اردو از مولوی کریم الدین و ڈاکٹر فیلن صفحہ ۴۶۔

[3] دیکھو ہسٹری آف ایشری پرشاد

[4] پرتھی راج اور چند بردائی ایک ہی دن اور تاریخ میں پیدا ہوئے اور ایک ہی دن قتل ہوئے۔

کلامِ جگر

(از حضرت جگر مراد آبادی)

دل کو سکون رُوح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

جب کوئی ذکرِ گردشِ ایّام آگیا
بے اختیار لب پہ ترا نام آگیا

غم میں بھی ہے سُرور، وہ ہنگام آگیا
شاید کہ دَورِ بادۂ بے نام آگیا

دل کے معاملات میں ناصح شکست کیا
سَو بار حُسن پہ بھی یہ الزام آگیا

صیّاد شادماں ہے مگر یہ تو سوچ لے
میں آگیا کہ سایہ تہِ دام آگیا

دیوانگی ہو، عقل ہو، اُمید ہو کہ یاس
اپنا وہی ہے، وقت پہ جو کام آگیا

دل کو نہ پوچھ، معرکۂ حُسن و عشق میں
کیا جانیے غریب کہاں کام آگیا

ہم نامرادِ شوق جیئے بھی تو کیا جیئے
آنا تھا، مفت یہ بھی اِک الزام آگیا

یہ کیا مقامِ عشق ہے ظالم کہ اِن دنوں
اکثر ترے بغیر بھی آرام آگیا

احباب مجھ سے قطعِ محبت کریں جگر
اب آفتابِ زیست لبِ بام آگیا

شامِ انقلاب

(از حضرت فراق گورکھپوری)

دے رہا ہے عہدِ رفتہ آج بھی اپنا نشاں
آج بھی تلووں سے مل جاتا ہے آنکھیں آسماں
اب گزرتا ہے وہاں سے زندگی کا کارواں
پیچھے چھٹتی جا رہی ہے منزلِ دیر و حرم
عزمِ انساں کی جبیں پر نظمِ فردا کی جھلک
اُن کے چہروں پر ہوائی پر ہوائی چھوٹنا
پاؤں کے نیچے زمیں لینے لگی ہے کروٹیں
پھر سمندر کی تہوں میں جاگ اُٹھے زلزلے
حشر بھی دامن کشاں نکلا جہاں سے بارہا
آج دو جگ مل رہے ہیں کانپتی ہیں لے یہ لے
سازِ دل ہر قطرہ کا رہ رہ کے جیسے تھرتھرائے
پھر چمک کر دردِ ہستی اُٹھ رہا ہے لے یہ لے
مسکرا کے جن میں آنکھیں کھول دیتی تھی بہار
جیسے بل کھاتی ہوئی لہریں فضا میں دوڑ جائیں
دیکھئے لو دیتا جائے کب تک آدم کا گناہ
شام ہی سے پھر شبستانِ سیہ کاراں میں آج
جاگنا سونا تو ناداں عمر بھر کا کام ہے،
اب بھی صبحیں مسکراتی ہیں نشاطِ عشق میں
غور کر تو ہے یہ ہستی کی حقیقت کا ثبوت
دامنِ دل پردۂ صد قیامت بن گیا

آج بھی خاکسترِ ماضی سے اُٹھتا ہے دھواں
آج بھی ہیں نقشِ پا آئینہ دارِ کہکشاں
موت کی بھی جن فضاؤں میں نکل آئے زباں
نغمۂ جنت میں بھی ہے سوزِ یادِ رفتگاں
بزمِ حاضر کی نگہ میں حسرتِ پس ماندگاں
جن کے جسموں پر جھلکتے ہیں حریر و پرنیاں
آسماں لیتا ہے اک مدت کے بعد انگڑائیاں
پھر دلِ کہسار سے آئی صدائے الاماں
اُس فضائے آتشیں میں زندگی ہے پرفشاں
پاس کی پرچھائیوں کو دور کی پرچھائیاں
دیدۂ ہر ذرہ کی اب بڑھ چلیں گویائیاں
قولِ شاعر ہے کہ دنیا ہو رہی ہے پھر جواں
اُن ہواؤں کی بھی جیسے چڑھ گئی ہوں تیوریاں
آسمانوں کی لچک جاتی ہے رہ رہ کر کماں
دیکھئے اُٹھتا ہے کب تک خرمنِ انساں سے دھواں
عشق کی تر دامنی ہے مہ چکانِ خور فشاں
یہ کہاں بھرپور دن بھرپور یہ راتیں کہاں
اب بھی تیرے غم کی لو ہے شمعِ محرابِ جہاں
وہم اندر وہم ہے ہستی گماں اندر گماں
موت کو بھی جیت لینے کی ہیں اب تیاریاں

آدمی سے پھر نیا ہوتا ہے پیمانِ ازل　　پھر نئی خوش کامیاں ہیں پھر نئی غم کوشیاں
چونک اٹھی اس طرح چشمِ مہر و ماہ و مشتری　　ٹوٹتا ہے جس طرح آفاق کا خوابِ گراں
آج بھی ہے خاک اور خوں سے بنا انساں کا دل　　آشنائے کہنہ یزداں اہرمن کا رازداں
اس طرح گم سُم ہیں گلزارِ بہار اندر بہار　　جیسے گہرے سوچ میں پڑ جائے حسنِ شادماں
لگ گئی ہے سر بسر پانی کے چھینٹوں سے بھی آگ　　اڑ گئی ہیں شبنمی آنکھوں سے بھی چنگاریاں
اپنی ہی گرمی سے آیا عشق میں اک بانکپن　　اپنی ہی نرمی سے گھائل ہو گیا حسنِ بتاں
اور پلٹے لینے والا ہے مزاجِ عشق ابھی　　اور بدلے گا ابھی رنگِ نگارِ دلبراں
عشق مجھ میں سوزِ پنہاں تجھ میں اک برقِ جمال　　آگ ہی تو ہے کہاں دب جائے لگ جائے کہاں
یہ سکونِ بیکراں یہ نکہتوں کی کروٹیں　　اور یہ تاروں بھری رات اسکے میرے درمیاں
اے فریبِ وصل و ہجراں الفراق و الوداع　　حسن بھی پرچھائیاں ہے عشق بھی پرچھائیاں
پڑ رہے ہیں دور تک سینوں میں رنگا رنگ عکس　　سج رہی ہے آئینہ در آئینہ بزمِ جہاں
نغمۂ شاعر سے مرجھائے گلستاں لہلہائے　　کر رہی ہے امرت کی برکھا آج شعلے کی زباں
نیند مُردوں کی اُچٹ جاتی ہے جس آواز سے　　پھر اُسی لَے میں ہوں میں لے سازِ فطرت نوحہ خواں
پا نہیں سکتی ہے جن کی باغِ جنت بھی ہوا　　چیرتی ہے اُن فضاؤں کو بھی یہ آہ و فغاں
دیکھتی ہے بعد مدت آج پھر انسانیت　　خوابِ مستقبل جھپک جاتی ہیں جن سے بجلیاں
انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب　　ذرّے ذرّے کی زباں پر ہے نویدِ ناگہاں
اپنے جھنڈے گاڑ دے انسانیت اس موڑ پر　　آ گئی وہ منزل نہیں ہے موت بھی اب درمیاں

زندگی کا زندگی ہونا قیامت ہے فراق
اُف یہ دردِ بے نہایت یہ نشاطِ بیکراں

رُباعی

(فراق گورکھپوری)

دنیا ابھی منقلب سراپا ہوگی　　یہ ہوگی وہ ہوگی جانے کیا کیا ہوگی
جب کیفِ دوام دیگی شانِ تغیر　　دنیا اس دن فراق دنیا ہوگی

غزل

(حضرت فراق گورکھپوری)

یہ نکہتوں کی نرم روی، یہ ہوا، یہ رات
یاد آرہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

لے جائیں جو کہیں سے کہیں سامنے کی بات
ان آنکھوں کے دلوں پہ کھلیں کیا معاملات

پیدا کرے زمین نئی آسماں نیا
اتنا تو لے کوئی اثر دورِ کائنات

مٹ کر یہ دے رہے ہیں صدا کشتگانِ عشق
اب بھی کوئی بنا لے تو بگڑی نہیں ہے بات

دریا کے مد و جزر بھی پانی ہی کے ہیں کھیل
ہستی ہی کے کرشمے ہیں کیا موت کیا حیات

شاعر ہوں گہری نیند میں ہیں جو حقیقتیں
چونکا رہے ہیں ان کو بھی میرے توہّمات

ہر جذبۂ عمل میں محبت کا ہاتھ ہے
تاریخِ زندگی کے کچھ کچھ محرّکات

اس جا تری نگاہ مجھے لے گئی، جہاں
لیتی ہو جیسے سانس شب و روزِ کائنات

ہم اہلِ غم کو پوچھ ہی لیتی ہے گاہ گاہ
تیری بھری نگاہ کے اُف رے تکلفات

اہلِ رضا میں شانِ بغاوت ذرا نہیں
اتنی بھی زندگی نہ ہو پابندِ رسمیات

اِک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں
ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

اہلِ وفا نے صاف بدل دیں مشیّتیں
جو ہو سکا وہ کر گئے، اب اس سے بڑھ کے بات

کب تک رہے گی آنکھ تری سازِ بے صدا
ہاں ٹوٹ جائے اب یہ سکوتِ نظر تو بات

یوں تو بجھی بجھی سی اُٹھی وہ نگاہِ ناز
دنیائے دل میں ہو ہی گئی کوئی واردات

جن کا سراغ پا نہ سکی غم کی روح بھی
ایسے بھی کچھ ہوئے ہیں محبت میں سانحات

مارے سکون سے ہیں غم آسودگانِ عشق
اب ماتمِ عذاب نہ اب کاوشِ نجات

تھے اہلِ غم جنھوں نے زمانہ بدل دیا
کوشش تو کی سبھی نے مگر بن پڑے کی بات

ہم اہلِ دل ہیں تیرے کرم سے بھی بے نیاز
سُن اے نگاہِ ناز اب اگر آ پڑی ہے بات

ہم اہلِ انتظار کے آہٹ پہ کان تھے
ٹھنڈی ہوا تھی، غم تھا ترا، ڈھل چلی تھی رات

کچھ اور بھی تو ہو ان اشارات کے سوا
یہ سب تو اے نگاہِ کرم بات بات بات

مجھ کو تو غم نے فرصتِ غم بھی نہ دی فراق
دے فرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

بنگال میں سازشی کارروائیاں

(از مسٹر نقی احمد خاں ارشاد فاطمی ایم۔ اے (تاریخ) شاد منزل پٹنہ)

میں اپنے گزشتہ مضامین میں بلیک ہول کی مشہور من گھڑت کہانی پر کافی روشنی ڈال چکا ہوں ب اُن سازشی کارروائیوں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ ے نکل کر بیرونی حضرات کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ میں اس مضمون میں لارڈ کلایو اور دیگر معاصر حضرات کی د نوشت تحریریں پیش کرکے ثابت کروں گا کہ ان حضرات نے بھی اپنی سازشی کارروائیوں کا درپردہ اعتراف ا ہے۔ برک (Burke) کا خیال ہے

"When Lord Clive forded a deep water with an un-known bottom, he left a bridge for his successors over which the Lame might hobble and the blind might grope thier way." (Speeche in the Trail of W. Hastings, Edited by E. A. Bond Vol IV P. 348)

(جب کلایو نے اس بحر زخار کو عبور کیا جس کی تہ کا پتہ نہ تھا تو اُس نے اپنے بعد کے آنیوالوں کے لئے ایک پل چھوڑا جس سے لنگڑے لولے کدک کدک کر اور اندھے ٹٹول ٹٹول کر پار اُتریں)

اب یہ پل کس طرح تیار کیا گیا، کلایو کی خود نوشت تحریروں سے ملاحظہ کیا جائے۔ ایک خط جو ۱۷۵۸ء ں لارڈ کلایو نے اپنے معاصر مؤرخ آرم (Orme) کو لکھا تھا، اُس میں وہ تحریر کرتا ہے:۔

I am possessed of Volumes of materials for the Continuance of your history, in which will appear fightin Tricks, Chicanery, intrigues, politics and the Lord know wha

(تمہاری تاریخ کو جاری رکھنے کے لئے میرے پاس بکثرت مواد و مصالحہ ہے، جو فریب، چالبازی سازش، سیاسیات اور خدا جانے کن کن چیزوں پر مشتمل ہے۔")

مندرجہ بالا تحریر میں یہ تین لفظ (Tricks, Chicanery, intrigues ازی۔ فریب۔ سازش) قابل غور ہیں۔ لفظ (Intrigues = سازش) سے غالباً کلایو اُس سلسلہ سازش

کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اُس نے امین چند اور میر جعفر سے مل کر سراج الدولہ کی حکومت کے خلاف کی تھی۔ چونکہ تمام مراسلات امین چند کے ذریعہ ہوتے تھے، لہٰذا ایک روز امین چند نے کلائیو کو دھمکایا کہ اگر اس کو زر کثیر بہ صورت کمیشن نہ دیا جائیگا تو وہ ان تمام کارروائیوں سے نواب کو مطلع کر دے گا۔ یہ دھمکی معمولی نہ تھی کلائیو ڈر گیا۔ ایک تو یہ خدشہ کہ اگر امین چند نے نواب کو ان تمام سازشوں سے آگاہ کر دیا اور مراسلات دکھا دیئے تو بالخصوص وہ کمپنی کے اور دیگر ملازم کہیں کے نہ رہیں گے، اور اگر امین چند کو اتنی بڑی رقم دی گئی تو کمپنی کے حکام کس طرح اپنی جیب گرم کریں گے۔ ان باتوں کو مدنظر رکھکر کلائیو نے کونسل کے رُوبرو صاف لفظوں میں کہا:

"Art and Policy are warrantable in defeating the purpose of such a villain."

(ایسے بدمعاش کے منصوبوں کو خاک میں ملانے کے لئے عیاری و سیاست جائز ہیں۔")

تحریر اول میں لفظ (Trick = چالبازی) کا اشارہ صاف طور سے معاملۂ امین چند کی طرف ہے۔ کلائیو کے ان الفاظ کے بعد دو[2] خفیہ صلح نامے تیار کئے گئے۔ ایک وہ جس میں امین چند کو روپے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، یہ امین چند کو دکھایا گیا۔ اور دوسرا وہ جو امین چند سے پوشیدہ رکھا گیا اور جس پر خود کمیٹی نے دستخط کئے۔ اس سازشی صلح نامے پر کلائیو اور خفیہ کمیٹی (Secret Committee) نے بھی اپنے دستخط کئے مگر مسٹر واٹس (Mr. Watts) نے دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا اور سازش میں شریک ہونے سے معذوری ظاہر کی۔ کلائیو مجبور تھا، اُس نے مسٹر موصوف کے جعلی دستخط بنوا لئے۔ بعد کو جب اُس کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی تو اپنے بچاؤ کے لئے اس صلح نامے کو خود ہی نذر آتش کر دیا۔ امین چند کو روپے ملے یا نہ ملے، یہ میں بیان کرنا نہیں چاہتا۔

ظاہر ہے کہ برٹش امپیریلزم کا پہلا سنگ بنیاد اسی کارروائی پر رکھا گیا تھا جیسا کہ خود کلائیو اور مسٹر ایچ۔ وال پول (H. Walpole) کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ مسٹر وال پول اپنے مجموعۂ خطوط جلد ۸ صفحہ ۲۰ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"Our governors there (in India) I think, have learned more of their treachery and injustice, than they have thought them of our discipline."

(ہمارے وہاں (ہندوستان) کے گورنروں نے انھیں جتنا اطاعت و انقیاد نہیں سکھایا، خود اس سے زیادہ ان سے دغا، فریب اور بیداد و استبداد سیکھا۔)

اب یہ رہا یہ کہ یہ حیل اور سازشیں صرف کلائیو ہی کی ذات تک محدود تھیں یا بعد کو بھی ہوتی رہیں؟ میں ہالی ول کی سازشوں اور دروغ گوئیوں پر روشنی ڈال چکا ہوں۔ مسٹر ہیسٹنگز کے متعلق دارالعوام کی رپورٹ جلد سوم ملاحظہ کی جائے۔

بنگال میں ان سازشوں کی ابتدا کب سے ہوئی؟ یہ ۱۷۵۲ء کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک خط ہے جو مشہور مورخ اُورم (orme) نے کلائیو کو کلکتہ لکھ بھیجا تھا۔ وہ تحریر کرتا ہے:۔

It would be a good deed, to swing the Old dog. I don't speak at random when I say that the Company must think seriously of it, or it will not be worth their while the trade in Bengal."

(کیا خوب ہو کہ لاٹھیاں مار مار کر اس بوڑھے کُتّے کا خاتمہ کر دیا جائے، میں بے تکی نہیں ہانک رہا ہوں۔ کمپنی کو اس پر غور و تامل کرنا چاہئیے ورنہ ان کا بنگال میں تجارت کرنا فضول ہے۔"

اس خط میں (old dog = بُڈھے کُتّے سے مُراد علی وردی خاں مہابت جنگ کی ذات ہے۔ مگر جب تک علی وردی خاں زندہ رہے کسی کی بھی اتنی مجال نہ ہوئی کہ چُوں کر سکے۔ سراج الدولہ کے مسند نشین ہونے کے ساتھ ہی کمپنی اپنی چالیں چلنے لگی۔ اس سازشی کمیٹی کے سرغنہ مسٹر کلائیو تھے، اور مسٹر کلائیو کے بعد ان کے ایک سے ایک یکتائے روزگار جانشین ہوئے۔ چال تو یہ تھی کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ بظاہر تو چند ہندوستانی ایکٹر بنگال کے اسٹیج پر کام کر رہے تھے مگر پس پردہ کمپنی تمام کارروائیوں کی محرک تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فتح کلکتہ کے متعلق کلائیو نے یوں تحریر کیا ہے:۔

The Capture of Calcutta appears no very difficult task".

(فتح کلکتہ کوئی بہت بڑی مہم نہ تھی)

اسی خوشی میں ایک اور دوسرے خط میں جسے اُس نے اپنے باپ کو لندن لکھ بھیجا تھا تحریر کرتا ہے

It is by far the grandest of my undertakings.
(Indian Records 1845 Vol I)

(میری مہمات میں یہ عظیم ترین ہے۔ میں بہت تیزی اور طنطنہ کے ساتھ قدم اُٹھا رہا ہوں)

اب فتح کلکتہ اور جنگ پلاسی کا اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کے صرف تیئس ۲۳ آدمی مارے گئے اور اُنچاس زخمی ہوئے۔ اسی طرح نواب کی فوج کے سپاہی چار سو سے زیادہ زخمی اور ہلاک ہوئے۔ غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ پلاسی کوئی جنگ نہ تھی۔ صرف چند شاطروں کی زد و کوب کے لئے ایک کاغذی بساط پر نقشۂ جنگ آراستہ کیا گیا تھا جس پر لارڈ کلائیو اور میر جعفر جیسے لوگوں کی شخصیتیں خاص

طور سے نمایاں تھیں، کلائیو اچھی طرح سے جانتا تھا کہ یہ محض جنگ زرگری تھی، اس کی فتح اس سے پہلے ہو چکی تھی۔

فروری ۱۷۶۰ء میں کلائیو لندن روانہ ہو گیا۔ لندن پہونچکر اس نے اپنے باپ کا کل قرض ادا کیا، بڑی بڑی جائدادیں خریدیں اور لارڈ کا خطاب پایا۔ صرف کیتھرسے پارلیمنٹ کے الیکشن میں کامیاب ہوا۔ اس کی دولت و ثروت دیکھکر لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ بچہ جو کل دو کانداروں کی دوکانیں محض چند روٹیوں کے لئے لوٹتا تھا آج امیر کبیر بنا ہوا ہے۔ شدہ شدہ یہ باتیں تمام ملک میں پھیل گئیں۔ صرف کلائیو ہی پر کیا موقوف تھا۔ ہندوستان سے جتنے حضرات واپس جاتے۔ لندن میں بیٹھکر دولت کا دریا بہاتے تھے، اور وہاں اُمرا میں رسوخ حاصل کرنے کی فکر کرتے تھے۔ رسوخ تو رسوخ برابری کا برتاؤ چاہتے تھے۔ بھلا انگلستان کے اُمرا کب ایسے تھے جو اپنے ملک کے نوخیز رئیسوں کو برابری کی نگاہ سے دیکھتے۔ عجب تصادم پیدا ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ وزیر اعظم لارڈ چیتھم (Lord Chatham) نے اپنی ایک تقریر میں کہا:-

The importers of foreign gold have forced their way in t Parliament by such a Torrent of Corruption as no private heriditary fortune could resist."

(اس ملک میں غیر ملکی سونا لانے والے ایسے ناجائز طریقہ سے پارلیمنٹ میں گھس آئے ہیں کہ موروثی صاحب ثروت ان کے داخلہ کو نہ روک سکے۔)

یہ حضرات لندن میں ہندوستانی نواب (Indian Nawab) کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے ایک عرصۂ دراز تک اخباروں میں ان کے کارٹون چھپتے رہے، ان کے ہندوستانی اطوار و خصائل پر لوگ نکتہ چیں ہوتے۔ مگر رفتہ رفتہ سب اس رنگ میں رنگے جا رہے تھے۔

مسٹر والش (Mr. Walls) جو خود سراج الدولہ کے خلاف سازشی کارروائیوں میں شامل تھے ان تمام حالات کو بہ کمال وضاحت اپنی کتاب "معذرتِ سازش" (Apology of Conspiracy) میں بیان فرماتے ہیں اور اپنی مجبوریوں کا اظہار کرتے ہیں۔ خیر ان کی ذات کسی قدر قابل ستائش ہے کہ وہ جرم کا اعتراف تو کر لیتے ہیں، دیگر حضرات تو دانستہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔

کلائیو جب آخری بار ہندوستان سے واپس گیا تو بعض حضرات اس کی دولت و ثروت دیکھکر دیدہ اس کے دشمن ہو گئے، اور رفتہ رفتہ اس کے مخالفین کا ایک جتھا ہو گیا، نتیجہ ظاہر تھا، ۱۷۷۲ء میں پارلیمنٹ نے تحقیقات شروع کر دی۔ لارڈ کلائیو سے سوال کیا گیا کہ جس وقت میر جعفر نے اس کو جاگیر بخشی تھی کیا یہ امر اس

پر روشن تھا کہ نواب کے سپاہیوں میں تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے کھلبلی پڑی ہوئی تھی۔ کلائیو نے جواب دیا کہ یہ امر اُس پر بخوبی روشن تھا، مگر یہ عام طور سے ہندوستان کا رواج ہے کہ فوج کو اُس کی چوتھائی تنخواہ بھی نہیں دی جاتی ہے۔ اس جواب کے بعد ہی فوراً دوسرا سوال کیا گیا کہ جس وقت اس کو جاگیر عطا کی جا رہی تھی کیا اس وقت کمپنی کے مطالبات کو از روئے صلحنامہ پورا کرنے کے لئے نواب کے جواہرات، اسباب اور فرنیچر سربازار نیلام نہیں ہو رہے تھے؟ کلائیو نے مجبور ہو کر کہا "ہاں! میں واقف تھا"

(ملاحظہ ہو رپورٹ ہوس آف کامنز صفحہ ۱۵۵ جلد سوم)

یہ وہ جاگیر تھی جو میر جعفر نے کلائیو کو سندِ مرشد آباد حاصل کرنے کے معاوضہ میں دی تھی۔ اور تو اور خود شہنشاہِ دلّی سے اس کے لئے "امیر" اور "ثابت جنگ" کے خطابات حاصل کئے تھے۔ اسی لئے کلائیو ہندوستان میں اپنے اصلی نام سے کم مشہور تھا، عوام اُسے امیر ثابت جنگ کہتے تھے۔

پارلیمنٹ کے روبرو محض "ہاں" کہہ دینے سے کلائیو کی نجات نہیں ہو سکتی تھی۔ ۱۰ مئی ۱۷۷۳ء میں کرنل برگوئن (Colonel Burgoyne) نے تین ریزولیوشن پیش کئے۔ پارلیمنٹ نے انہیں منظور کیا۔ کیونکہ یہ کسی خاص شخص کی طرف اشارہ نہیں کرتے تھے، مگر ان کی منظوری کے بعد ہی کرنل صاحب موصوف نے خاص طور سے کلائیو پر حملہ شروع کر دیا اور کہا کہ کلائیو نے دو لاکھ چونتیس ہزار پونڈ غبن کئے ہیں۔ لارڈ کلائیو اس پر بہت برہم ہوا۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے ایک طویل تقریر کی اس تقریر کی آخری سطر بھی قابلِ غور ہے۔ کلائیو کہتا ہے۔

"Before I sit down, I have one request to the House, and it is that when they come to decide upon my honour, they will not forget their own."

(بیٹھنے سے پہلے میں اس ایوان سے ایک درخواست کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میری عزت و آبرو کا فیصلہ کرتے وقت اپنی عزت و آبرو کا بھی خیال رکھیں۔")

اس دفعہ کلائیو کو وہ ہزیمت اُٹھانی پڑی جس سے اُسے اس سے پہلے سابقہ نہ پڑا تھا۔ تمام شب یہ ریزولیوشن زیرِ بحث رہا۔ بالآخر پانچ بجے صبح بالاتفاق یہ تجویز قرار پائی کہ لارڈ کلائیو نے جو کچھ بھی حاصل کیا یا جو کچھ بھی کیا ہو باوجود ان باتوں کے اس نے اپنے مُلک کی بڑی خدمت انجام دی۔

ہر چند کہ پارلیمنٹ نے اس کو آزاد کر دیا مگر وہ اس ذلّت کو برداشت نہ کر سکا۔ اس کا دل ترددات و غم سے تنگ آ چکا تھا، موت کوسوں دُور کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ اُس نے فرشتۂ اجل کا بھی انتظار نہ کیا، اور کشاکشِ ہستی سے نجات حاصل کرنے کے لئے خود ہی تارِ رگِ جان پر زخمِ جانگزا لگا کر ۲۲۔ نومبر ۱۷۷۴ء کو پچاس سال کی عمر میں بحرِ فنا کی گہرائیوں میں روپوش ہو گیا

جذباتِ اثر

(از مرزا جعفر علیخاں اثر لکھنوی، ہوم منسٹر کشمیر گورنمنٹ)

تجلیات کا عالم تری نقاب میں ہے
اِک آفتاب کا پرتو اِک آفتاب میں ہے

نہ انتظار کی حد ہے نہ اضطراب کی حد
کہ انتظار ابِ آغوشِ اضطراب میں ہے

نظارہ شوق میں گم، شوق بے سر و ساماں
شہود، غیب نہیں، پھر بھی تو حجاب میں ہے

جگر کا بس نہیں، پہلو کو توڑ کر رکھ دے
خیالِ یار جو مہمانِ دلِ خراب میں ہے

شگفتگی جسے نسبت ہی تیرے چہرے سے
شراب میں ہے نہ اس حسن سے گلاب میں ہے

خرام مست، ادا مست، ہر کرشمہ مست
تمام نشے کا عالم ترے شباب میں ہے

کہے جو زہد وہ سچ، مَیں نے تو یہی دیکھا
کہ ایک شانِ کرم بھی ترے عتاب میں ہے

سراب جزوِ حقیقت نہیں تو پھر کیا ہے
حقیقتوں کی نمائش اگر سراب میں ہے

نمودِ بحر کا ہے راز بھی اُسی میں نہاں
شکستگی جو اثر فطرتِ حباب میں ہے

چودھری جگت موہن لال رواں

(از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

میرے ادب و احترام اور جناب رواں مرحوم کی محبت و الفت نے ہم دونوں کے تعلقات میں ایک لطف ایک کشش پیدا کر دی تھی کہ جس نے ۲۲ ستمبر ۱۹۳۶ء کو دہلی سے لکھنؤ جاتے ہوئے مجھے اوناؤ سے آگے نہ بڑھنے دیا، میں اُس دیارِ حبیب میں پہونچکر آستانِ محبوب تک سر کے بل گیا۔ خوش قسمتی دیکھیے کہ جناب جلیل قدوائی و دیگر احباب جناب رواں کی صحبتِ ادب نواز میں رونق افروز تھے، چونکہ دو گھنٹے سے زیادہ نہ ٹھہر سکتا تھا، بادلِ ناخواستہ اجازت طلب کی۔ فرمانے لگے بھائی منور، کیا آگ لینے آئے تھے، آئے ابھی چلے۔ آج تو ملاقات سے سیری نہیں ہوئی"۔ دوسرے روز مرحوم شکار کھیلنے جا رہے تھے اس لئے ملاقات ۲۴ ستمبر پر اُٹھا رکھی گئی۔ میں منظرانہ اس روز شام کو پہونچا، میرا انتظار کر رہے تھے، بڑے تپاک سے لیا۔ میرے شوقِ بیباک نے فرمایش کی کہ اپنی معرکۃ الآرا مثنوی مہاتما گوتم بدھ کی سوانحعمری کا کچھ حصہ زبانِ مُبارک سے سُنائیں۔ چنانچہ ایک گھنٹہ کامل مجھے اس سے مسرور و محظوظ فرماتے رہے۔ مثنوی کے لئے مولویِ معنوی کی بحر پسند کی تھی۔ جس وقت تمہید کا یہ شعر زبان پر آیا:۔

قصۂ پارینہ دُہراتا ہوں میں ساز پر تاریخ کے گاتا ہوں میں

وجد میں جھومنے لگے، اور مجھ پر بھی ایک عالمِ کیف طاری ہوگیا۔

خلوصِ قلب کا اندازہ اِس سے کیجئے کہ مثنوی سنانے سے پہلے ارشاد فرمایا کہ دشمن بنکر اس پر غور کرنا۔

۲۴ کی رات کو میں کانپور ہوتا ہوا دلی واپس آیا، ۲۸ کی سہ پہر کو میرے بھانجے ڈاکٹر کیشو پرشاد سکینہ کا خط پہونچا کہ ۲۴ کو جناب رواں عالمِ فانی سے ملکِ جاودانی کو راہی ہوئے۔

دنیا میں حُسنِ اخلاق ہی وہ وصف ہے کہ ایک انسان کو دوسرے کا گرویدہ و فریفتہ بنا دیتا ہے۔ مرحوم میں یہ وصف بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا، اور حلقۂ احباب میں ضرب المثل تھا۔ جس شخص نے ایسی بزرگ ہستی سے دو چار روز پہلے ہی فیضِ صحبت حاصل کیا ہو، جس کی عقیدت و ارادت پرستش کی حد تک پہونچی ہو، اُس پر اِس خبرِ روح فرسا کے اثر کا اندازہ کچھ وہی لگا سکتے ہیں جنھیں اس قسم کے سوانحاتِ جانکاہ سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ میں چونکہ مرحوم کی نوازش ہائے محبانہ کا مورد تھا آج بھی دل پر وہی صدمہ گزر رہا ہے

جو اُن کے کسی قریبی سے قریبی رشتہ دار یا عزیز سے عزیز دوست کے دل پر گزرتا ہوگا۔ میری آرزو تھی کہ میری تصنیف "منظوم بھگوت گیتا" پر مرحوم اظہار رائے فرمائیں، چنانچہ میری درخواست منظور فرمائی گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اس تصنیف کا کوئی حصہ خدمت میں پیش کر سکوں آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

سپہرِ ادب کا یہ درخشندہ ستارہ ۱۴ جنوری ۱۸۸۹ء کو منشی گنگا پرشاد صاحب کے اُفقِ خاندان پر طلوع ہوا، اور قریب قریب ۴۵ سال تک اپنی تابانی سے دنیائے تیرہ و تار کو منوّر کر کے غروب ہو گیا۔ فلکِ کج رفتار نے مرحوم کو عہدِ طفلی ہی میں سایۂ شفقت پدری سے محروم کر کے بڑے بھائی منشی کنھیا لال صاحب کی بزرگانہ تربیت و تعلیم کے حوالے کر دیا۔ قدرت نے طبع رسا فکرِ فلک پیما عطا کی تھی۔ ۱۹۰۷ء میں انٹرنس پاس کیا، ۱۹۱۱ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی، ہر امتحان میں ممتاز درجہ حاصل کر کے جودت و ذکاوت کا ثبوت دیتے رہے۔ ۱۹۱۳ء میں ایم۔ اے اور ۱۹۱۶ء میں ایل ایل۔ بی کی ڈگریاں شاہینِ بلند حوصلگی کا شکار ہوئیں، وکالت شروع کی تو بہت جلد کامیاب وکلاء کی صفِ اول میں نظر آنے لگے۔

ایک مشہور مقولہ ہے کہ "شاعر پیدا ہوا کرتا ہے بنا نہیں کرتا" اس کے معنی چاہے جو کچھ ہوں لیکن مشاہدہ سے اس کی تائید ضرور ہوتی ہے کہ اقلیم شاعری کے فرمانروایانِ باعظمت کا زمانِ طفلی ہی ان کے اوجِ سخن سنجی پر فائز ہونے کی خبریں دینے لگتا ہے۔ گہوارہ سے قدم نکالتے ہی مضرابِ طبع و تارہائے ربابِ نظم پر زمزمہ زن ہونے لگتی ہے۔ رواںؔ مرحوم اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے، جیسا کہ "روحِ رواں" کے مقدمہ میں جناب عزیزؔ نے تحریر فرمایا ہے۔ چھ برس کی عمر ہی سے اس بلبلِ چمنستانِ سخنوری کے نغموں سے فضائے عالم گونجنے لگی تھی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد وکالت کی مصروفیت ادبی سرگرمیوں پر کسی قدر غالب آگئی۔

جناب رواںؔ کی صحیح المذاقی اُن کے کلام، اور اُن کی اُن تنقیدوں سے ظاہر ہے جو مرحوم نے اکثر شعرائے وقت کے کلام پر وقتاً فوقتاً کی ہیں، وہ فطری شاعر تھے اور نہایت بلند خیال، طبیعت جدید روش کی طرف مائل تھی مگر قیود فن سے وہ اپنا دامن کبھی نہ چھڑاتے تھے۔ کمالِ فن کے باوجود ان کو اپنی خامیوں کا اعتراف تھا، اسی لئے بوقت ضرورت جناب عزیزؔ لکھنوی سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

یوں تو بہت سے اُستاد ایسے ہوئے ہیں جن کے شاگرد اُن کے لئے باعثِ فخر تھے لیکن میرا خیال ہے اور میں اکثر اسے احباب کے سامنے ظاہر بھی کر چکا ہوں کہ دورِ حاضرہ میں جناب عزیزؔ آتشؔ مرحوم کی خوش نصیبی میں شریک و سہیم تھے۔ جناب عزیزؔ کے اکثر شاگرد آتشؔ مرحوم کے شاگردوں کی طرح نہایت بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان میں جناب جعفر علی خاں صاحب اثرؔ لکھنوی، جناب جوشؔ ملیح آبادی، جناب جگرؔ بریلوی، جناب

تسکین سوروئوی اور جناب رواں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
جناب رواں اور جناب آثر میں خاص طور پر دوستانہ تعلقات تھے جو اس زمانہ میں بہت ہی گہرے ہو گئے جب جناب آثر اوناؤ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔
ایک مرتبہ میں نے جناب عزیز سے جناب رواں اور حضرت آثر کے متعلق اُن کی رائے دریافت کی تو فرمایا کہ "رواں دل کے شاعر ہیں اور آثر دماغ کے" میرے نزدیک یہ فرق وامتیاز حقیقت پر مبنی تھا جن اصحاب نے دونوں باکمالوں کے کلام کا بغور مطالعہ فرمایا ہے وہ جناب عزیز کے اس نکتہ کی یقیناً داد دیں گے۔
جناب رواں نظم بھی کہتے تھے اور غزل بھی، رباعیوں سے تو ان کو خاص دلچسپی تھی، اور اصل یہ ہے کہ ان کے کلام کی مقبولیت کا راز زیادہ تر اُن کی رُباعیوں ہی میں پنہاں تھا۔ غالباً اس حقیقت کا اعتراف دوسری دنیا میں جناب رواں کی روح بھی کرتی ہوگی کہ نظم نگاری میں وہ بھی اُسی شاعر اعظم کی روش کے ایک کامیاب پیرو تھے جس کو قدرت نے عالم شباب میں ہم سے آج سے ۲۴ برس پیشتر چھین لیا۔ میری مراد انڈین ورڈسورتھ درگا سہائے سرور جہان آبادی سے ہے۔ غزل اور نظم دونوں میں اُن کے جذبات کی نوعیت یکساں ہے۔ اسی لئے بعض نظموں میں غزل کا لطف ہے اور بعض غزلوں میں نظموں کی کیفیت۔ اور یہی ایک وصف ہے جس نے جناب رواں کو اُن کے صفِ معاصرین میں ایک بلند مقام پر متمکن کر دیا۔ ورنہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ غزل کہنے والے حضرات کا اشہب قلم میدانِ نظم میں جولانیاں نہیں دکھا سکتا۔ اور نظم کہنے والوں کی طبع رسا کا دست ہوس حقیقی غزل کے دامن تک نہیں پہونچتا۔
جناب رواں کے حقیقی جذبات کا اندازہ اُن کی رباعیوں سے ہو سکتا ہے، لیکن ایک خاص رنگ ہے جو اُن کی نظموں اور غزلوں میں یکساں طور پر جھلکتا ہے۔ میں ذیل میں اسی کے چند نمونے مختصراً پیش کرتا ہوں:۔
نظم "معمائے فطرت" میں اسکی رنگینیوں پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنے کے بعد سوال کرتے ہیں:۔

دُور از امکانِ عقل، از بس تحیر زا ہیں یہ
کس طرح ہیں، کس زمانے سے ہیں کیوں ہیں کیا ہیں یہ

یہ قمر یہ مہر یہ تارے، یہ رنگِ آسماں — یہ زمیں یہ بادوباراں یہ شفق کی سُرخیاں
یہ چمن، یہ پھول یہ پتے، یہ پھل، یہ سبزہ زار — یہ لبِ جُو، یہ سمندر، یہ فضائے کوہسار
یہ جبل، یہ دشت، یہ ہامون، یہ ریگِ خاک و سنگ — یہ سحاب و برق، یہ موسم، یہ ابر رنگ رنگ
آخر ان چیزوں میں، جو ربط باہم کون ہے؟ — خود اگر پیدا نہیں، خلاقِ عالم کون ہے؟

برتر از دنیائے فانی کوئی ہے بھی یا نہیں، اس بھری محفل کا بانی کوئی ہے بھی یا نہیں؟
چل رہی ہیں ہر طرف کیونکر عناصر کی کلیں؟ جل رہی ہیں کس طرح شمس و قمر کی مشعلیں؟
خودبخود چلتی ہیں یا ان کو چلاتا ہے کوئی آپ ہی جلتی ہیں یا ان کو جلاتا ہے کوئی

صبح تک رہتا ہے اکثر اس طرح کا پیچ و تاب
پر نہیں ملتا ہے اطمینان کے قابل جواب

لاوارث بچہ' اور 'شوہر کش حسینہ' دو ایسی نظمیں ہیں جن میں رواں کی طبیعت کا عکس خاص طور پر ظاہر ہیں
لاوارث بچہ کو دیکھکر فرماتے ہیں:-

سچ بتا بچے، ترا وارث، ترا والی ہے کون؟ پھول ہے تو کس شجر کا، اور ترا مالی ہے کون؟
سچ بتا بچے، تجھے خاکِ وطن کا واسطہ پھول ہے تو جس چمن کا، اُس چمن کا واسطہ
زینتِ آغوش ہے تو جس کی وہ مادر ہے کون نور ہے جس گھر کا تو، بچے وہ آخر گھر ہے کون؟
سچ بتا، وہ دل کہاں ہے جس کا اک ٹکڑا ہے تو آہ وہ آنکھیں کہاں ہیں جن کا اک تارا ہے تو
اختصارِ طولِ آزارِ نہانی سچ بتا اے خمارِ بادہ کیف جاودانی سچ بتا

....

حیف کیا میں مان لوں دنیا کے لوگوں کی دلیل تجھ کو سمجھوں ثمرۂ بدکاریِ نفسِ ذلیل
دل نہیں کہتا کہ بدکاری کا ہے انجام تو ہو رہا ہے گرچہ دنیا میں بہت بدنام تو
حیف ہے لیکن اگر دنیا کا کہنا ٹھیک ہو حیف ہے گر آدمی کی عقل یوں تاریک ہو
ہائے کیا انساں کا ہو سکتا ہے یوں بھی خوں سفید ڈال دے گھورے پہ اپنا مرکزِ جذبِ اُمید
توبہ توبہ حضرتِ انساں کی یہ کمزوریاں اور اُس پر اشرف المخلوق ہونے کا گماں
پال لینا کچھ ترا ماں کو تری مشکل نہ تھا سنگریزہ تھا مگر پہلو میں اُس کے دل نہ تھا
یوں نہ کرتی ورنہ ماں اپنا نثارِ آرزو یوں بناتی خود نہ ماں دل میں مزارِ آرزو
حسن کا برباد ہونا کچھ مجھے بھاتا نہیں میرے مالک کچھ سمجھ میں راز یہ آتا نہیں

باپ ماں کے نفسِ سرکش کی کہانی ہائے ہائے
اے معاذ اللہ بچے کی زبانی ہائے ہائے

'شوہر کش حسینہ' میں افتادِ طبیعت ملاحظہ ہو۔ مختلف طریقوں سے خطاب کرنے کے بعد دریافت فرماتے ہیں:-

یہ جفائیں اے نگاہِ ظلم پرور کس لئے
یہ ستم تو نے کئے آخر ستمگر کس لئے

جاں گدازی کو نگاہِ ناز کیا کافی نہ تھی
حلقِ عاشق پر کیا تھا تیز خنجر کس لئے

کیا رہے گا آہ بتلا تیرے پائے ناز پر
تو نے کاٹا عاشقِ جانباز کا سر کس لئے

اضطرابِ دل کا تھا کیا کم تماشا دل فریب
رقصِ بسمل کا ہوا منظور منظر کس لئے

کیوں کیا بدنام تو نے حسن کی عصمت کو آہ
داغ ڈالا دامنِ شرم و حیا پر کس لئے

کام تو نے اے حسیں جلاد کا کیونکر کیا
خون اپنے شوہرِ ناشاد کا کیونکر کیا

تیرا یہ حسنِ شرر انگیز اک دھوکا ہی تھا
کچھ نہ تھا تجھ میں گلِ خوش رنگ کانٹوں کے سوا

ہم سمجھتے تھے تجھے پیمانۂ آبِ حیات
جامِ زریں، آہ لیکن تیرے اندر زہر تھا

رنگِ کافوری کو ہم مرہم سمجھتے تھے ترے
زخمِ دل میں لیکن اس سے اور نشتر چبھ گیا

اب میں سمجھا تیرے رخساروں پہ یہ سرخی نہیں
رنگِ خونِ آرزو ہے عاشقِ ناشاد کا

حشر تک اب یہ لہو ہاتھوں سے چھٹنے کا نہیں
جا نہیں سکتی کبھی سرخیِ خونِ بے خطا

قتلِ شوہر کے لئے تو نے اٹھایا ہاتھ جب
مجھ کو حیرت ہے نہ تجھ پر آسماں کیوں پھٹ پڑا

.. ..

حیف لیکن کچھ قرینہ اس طرح فطرت کا ہے
حسن کے ہاتھوں ہمیشہ ظلم دنیا میں ہوا

حسنِ ہیلن سے ہوئی روما میں اک جنگِ عظیم
حسنِ نوشابہ نے اسکندر کو نادم کر دیا

حسن اودا سے رہا پٹرارک اٹلی میں ذلیل
ڈانٹی خود بیٹرس کے حسن سے تھا بے نوا

حسنِ سیتا نے کیا لنکا کو تاراجِ جدال
دروپدی کے حسن نے یہ حال بھارت کا کیا

حسن کی خاطر گوارا ہے ہر اک ظلم و ستم
ہاں مگر جب حسن پر عصمت کی رہتی ہے جلا

پاسدارِ حسن ہوں لیکن یہاں نادم ہوں میں
اِن حسینوں میں کسی کا حسن شوہر کش نہ تھا

گرچہ ماہ و سال کیا، صدیاں گذر جائیں یونہیں
خونِ شوہر کا وہ دھبہ ہے کہ مٹ سکتا نہیں

عظمت توبہ۔ آنسو۔ تسلی اور غبارہ پر جناب رواں کی نظموں میں جہاں جذبات کا دریا موجزن ہے وہاں تشبیہاتِ گوناگوں سے شاعری کا لطف دوبالا ہے۔

"آنسو" کے متعلق یہ اشعار کس قدر پُر اثر ہیں:-

ایک وہ اشک جو ہوں دردِ محبت میں رواں　　خازنِ جنسِ وفا مخبرِ صد کاہشِ جاں
ایک وہ اشک جو دیں قلب کو بیوہ کے قرار　　چارہ سازوں کی تسلی سے نہ ہو جب معوکار
سب براہین و دلائل کا جواب ایک نگاہ　　ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے خدا ہی کی پناہ
اشک وہ اشک جو ہوں قوم کے غم میں جاری　　جس سے سیماب کی ہو قلب پہ حالت طاری
غیر کے درد میں گر خونِ جگر ہو پانی　　رونے والے کو گدائی میں ملے سلطانی
تارِ آنسو کا جو ہو دیدۂ تائب کو حصول　　جا سکے جس پہ دعا تا بہ سرِ بامِ قبول
رات ہو، بند ہوں آنکھیں، کوئی آواز نہ ہو　　اور بجز ذاتِ خدا ہمدم و ہمراز نہ ہو
یہی آنسو ہیں جو مقبولِ خدا رہتے ہیں　　یہی آنسو ہیں کہ جن کے لئے ہم کہتے ہیں

ہوتے گر سات سمندر کے فراہم موتی
ایک آنسو کے برابر بھی نہ قیمت ہوتی

غبارہ کی تشبیہات کی داد نہیں دی جا سکتی :-

حسیں پری کوئی مستِ مئے صبوح چلی　　نکل کے قالبِ خاکی سے جیسے روح چلی
تپِ دروں سے غبارِ سرابِ دشت ہے تو　　فضائے چرخ پہ آوازِ بازگشت ہے تو
پڑا ہے یا کسی میکش کا صبرِ رندانہ　　الٹ گیا ہے مئے آتشیں کا پیمانہ
فلک کا اہلِ زمیں کو پیام ہے کوئی　　کہ دستِ ساقیِ کوثر میں جام ہے کوئی
یہ آگ کا کوئی اڑتا ہوا شرارہ ہے　　کہ آسمان کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہے
ڈھلک کے دیدۂ سالک سے کوئی اشکِ نیاز　　چلا ہے ہونے کو دامانِ عفو پہ ممتاز
فنا کے دوش پہ کچھ اس طرح سوار ہے تو　　کہ بیکسوں کا چراغِ سرِ مزار ہے تو

نظر فروزِ تعلق بہار ہے تیری
حریفِ زندگیِ مستعار ہے تیری

رواں کی نظمیں تمام تر فلسفیانہ ہیں اور یہی حال اُن کی غزلوں کا ہے :-

ہستی مجھے خود اپنی معمہ ہے اِک رواں　　آزاد بھی نہیں ہوں گرفتار بھی نہیں

کیا غضب ہے ہوں تو آنکھیں دیکھنے کے واسطے　　اور ہم چاہیں کہ کچھ دیکھیں مگر دیکھا نہ جائے

ایک عالم محوِ نظارہ ہے اور وہ پردہ دار　　گر اسی کا نام پردا ہے تو وہ پردا کریں

جب فنا ہونا یقینی ہے دلی جذبات کا — یاس کا غم کامیابی کی مسرت کیا کریں

اب دور کیا تم نے اسے ہوش و خرد مجھ کو — قربت مجھے حاصل تھی جب تک کہ میں غافل تھا

قطرہ کی یہ ہستی ہے میں نازشِ دریا ہوں — ذرّے کی یہ خود بینی میں موجدِ ساحل تھا
دیوانۂ الفت کو ہے تمہید بھی آزادی — میں بندِ سلاسل میں آوازِ سلاسل تھا

دلِ انساں میں جب فطرت نے رکھیں قوتیں لاکھوں — تو اک کمزور الفت بھی بطرزِ امتحاں رکھدی

لہو سے اپنے جو رہتا ہے آپ تر دامن — اُسی غریب کو شاید رواںؔ بھی کہتے ہیں

ہنستے ہو طوقِ غلامی پا کے گردن میں رواںؔ — تم کو اس پر خون کے آنسو بہانا چاہیئے

حسن کی اطاعت بھی اصل میں عبادت ہے — میری بت پرستی میں شانِ حق پرستی ہے
کعبہ دل کا ہے یہ خانہ خدا ہے یہ — اُف یہ کیا کہا تم نے دل کی کوئی ہستی ہے

زمیں سے آسماں تک بھر دیا ہے جوشِ آزادی — اسیروں نے تمہارے جو کیا، آزاد کیا کرتے
جہانِ آرزو کے ذرہ ذرہ میں تزلزل تھا — رواں ہم حسرتِ تعمیرِ بے بنیاد کیا کرتے

سنگِ زمینِ کعبہ خود بڑھ کر جبیں کو بوسہ دے — ایسے بھی چند سجدے ہیں ناصیۂ نیاز میں

بادہ کشانِ ذوق کے ضعفِ حواس پر نہ جا — لغمتِ بے خودی بھی ہے خمکدۂ مجاز میں

خالق ہے نقدِ ہستی بربادِ گفتگو ہوں — ڈھلکی ہوئی صُراحی چھلکا ہوا سبو ہوں
اِک نقطہ میں ہے پنہاں دونوں کی شرحِ ہستی — قاتل کی آستیں پہ پھیلا ہوا لہو ہوں

جہاں میں صورتِ فوارہ زندگی ہے مری — کہ آپ اپنی بلندی پہ اشکبار ہوں میں

نفسِ گمراہ کا اعلان قیامت ہوتا — مار ڈالا مجھے اندیشۂ رسوائی نے
بندگی باعثِ اصلاحِ عمل ہو جاتی — ساتھ ہی چھوڑ دیا ذوقِ جبیں سائی نے

دوسرا خیال یہ ہے کہ

عظمتِ روح کا احساس بھی باقی نہ رہا — ہم کو برباد کیا مشقِ جبیں سائی نے

اے مرے دلِ رنگیں کے روندنے والے — بجا، بجا! کہ یہ تصویر ہے زمانے کی
وہ عرضِ حال میں اشکوں پہ معترض ہیں عبث — میں کیا کروں یہی سرخی ہے اس فسانے کی

پیہم دیئے وہ رنج کہ انساں بنا دیا ۔ منت پذیر ہوں ستمِ روزگار کا

کچھ عجب روداد ہے انسان کی روداد بھی ۔ سو اسیروں کا اسیر آزاد کا آزاد بھی
حشر کیا ہے اِک دلِ معذور کا احساسِ غم ۔ میں تو میں ہوں، منتشر ہے عالمِ ایجاد بھی

رواں کس کو خبر عنوانِ آغازِ جہاں کیا تھا ۔ زمیں کا کیا تھا نقشہ اور رنگِ آسماں کیا تھا
ہم اتنے فاصلے پر آ گئے ہیں عہدِ ماضی سے ۔ خبر بھی نہیں اجداد کا نام و نشاں کیا تھا

تڑپتی پھرتی ہے اِک برقِ عرفاں میکدے بھر میں ۔ کبھی مینا میں خم سے اور کبھی مینا سے ساغر میں

شعاعِ نورِ ایماں دل تک آتے دیر لگتی ہے ۔ بڑی دشواریوں سے روشنی ہوتی ہے اس گھر میں

رکھ دیا ہمت نے بڑھکر حدِ منزل پر قدم ۔ میں ابھی شکوہ طرازِ گردشِ ایام تھا
آفریں اُس کو کہ جس نے زندگی کی نذرِ دوست ۔ ورنہ خالی جان دیدینا بھی کوئی کام تھا
اب چمن میں رہ کے بھی لطفِ چمن حاصل نہیں ۔ ہاں مگر جب تک قفس میں تھے قفس بدنام تھا
جنبشِ برگِ شجر سے تا بہ طوفانِ حیات ۔ ایک ہی پیغامبر تھا ایک ہی پیغام تھا

کوئی تفسیرِ بابِ زندگانی میں نہیں ممکن ۔ حیات و موت بھی اک نام ہے تبدیلِ عنواں کا

ازل سے ہے یہی بابِ نیاز کی سرخی ۔ جو آفتاب کی پہلی کرن میں آئی ہے

دیکھو کتنی بجلیاں رہتی ہیں سرگرمِ طواف ۔ آہ اے آسودۂ ایوانِ نازِ زندگی

ناخنِ امتیاز کی عقدہ کشائیاں کجا ۔ آپ میں راز بن گیا سعیِ کشودِ راز میں

اثر کچھ بھی سہی، میں شوخیِ جدت کا قائل ہوں ۔ کہ وہ پیکاں سے بھرنا چاہتے ہیں زخم پیکاں کا

مرگِ بے ہنگام کہتے ہیں جسے آج اہلِ درد ۔ کل یہی صورت بدل کر زندگی ہو جائے گی
ذکر ہے زنداں میں وہ گلزار پر بجلی گرتی ۔ آج میرے آستیاں میں روشنی ہو جائے گی

نفس نفس متغیر ہے عالمِ فانی ۔ کسی کو آئے تو کس طرح اعتبار آئے

سو طرح کے نقشے ہیں سو طرح کی تصویریں ۔ پھر بھی ورقِ ہستی سادہ نظر آتا ہے
تاریکیِ عصیاں ہے عکس اپنی نگاہوں کا ۔ اندھے کو ہر آئینہ اندھا نظر آتا ہے
دشوار ہے دنیا میں انسان کا خوش رہنا ۔ جو دل نظر آتا ہے چھالا نظر آتا ہے

بسنت رُت

(از فیاض الدین احمد خاں فیاض گوالیاری، بی۔اے)

نئی پہلی کرن سورج کی یوں رقصاں ہمالے میں
پجارن جیسے کوئی صبح دم آئے شوالے میں

سہانی سردیاں آئیں ہوا میں نرمیاں آئیں
سنہری ساعتیں لیکر بسنتی گرمیاں آئیں

بہت خاموش اور پرکیف تبدیلی ہے نیچر میں
کوئی جس طرح کشتی کھے رہا ہو پریم ساگر میں

ادھر سرسوں کا سونا کاسنی پھولوں میں السی کے
ادھر شبنم کا جھولے جھولنا جھولوں میں السی کے

ہوا کے ساتھ جو کی خوشنما بالوں کا لہرانا
ہری چادر میں لاکھوں گیسوؤں والوں کا لہرانا

چنے کے سبز کاہی کھیت سے اٹھتے ہوئے گیہوں
کنارے پر ندی کی ریت سے اٹھتے ہوئے گیہوں

سنہری رنگ چھاتا جا رہا ہے کونے کونے میں
زمرد جس طرح حل کر رہا ہو کوئی سونے میں!

غزل

(از حضرت فیاض گوالیاری بی۔اے)

موت سے پہلے ایکبار اُن کی نظر سے پی نہ دیکھ
مر کے تو عمر کاٹ دی کوئی گھڑی کو جی نہ دیکھ

تجھی غم کی زندگی موت سے کچھ سوا سمجھ
مرگِ عدو کا ذکر کیا، میری حیات ہی نہ دیکھ

تنگ ہے راہِ شوق میں نقشِ قدم پہ لوٹنا
بڑھ کے جدھر سے آچکا، مڑ کے اُدھر کبھی نہ دیکھ

ہوتی ہیں یوں بھی پرسشیں دیتے ہیں یوں بھی دادِ عشق
نیچی نظر سے دیکھ لے آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھ

جرأتِ شوق آج تو دامنِ یار تھام لے
حالِ تباہِ عشق دیکھ، حُسن کی برہمی نہ دیکھ

بڑھنے دے چشمِ آرزو رسمِ نگاہ گاہ گاہ
دیکھ رہے ہیں وہ ادھر، دیکھ انھیں ابھی نہ دیکھ!

ستارے

از جناب "مظہر عزیز"

میں ہر شب سوتے سوتے جب اچانک چونک پڑتا ہوں
نگاہیں آسمانوں کی طرف کھنچتی سی جاتی ہیں
فضا کی تیرگی سے خوف کھاتا ہوں، لرزتا ہوں
مری آنکھوں کے آگے مشعلیں سی جلتی جاتی ہیں!

اور ان میں سے ہر اک مشعل جہاں کی راہبر ہو کر
اندھیرے میں کچھ اس انداز سے جل کر بھڑکتی ہے
کہ گویا آنے والے حادثوں سے باخبر ہو کر
فضا کی وسعتوں کو آتشیں پیغام دیتی ہے،

یہ شعلے ملتہب ہو ہو کے اُٹھے ہیں بلندی پر
کہ شمع قلبِ انساں تیرگی میں بجھتی جاتی ہے
مگر پھر بھی اُسی صورت پرانی وضع سے۔ شب بھر
تباہی کی طرف تیزی سے دُنیا بڑھتی جاتی ہے

پڑاؤ

(پنڈت برجیندر ناتھ گوڑ)

شام ہی تھی مگر اندھیرا رات کا دھوکا دیتا تھا۔ آسمان بادلوں کی چادر سے گھر گیا اور موسلا دھار پانی برسنے لگا۔

جب پیپل کے پیڑ سے چھن کر پانی نیچے آنے لگا، تو میں نے سوچا کہ اُس طرف جو ٹین کا چھپر ہے اس میں چل کر پناہ لیجئے۔ لیکن پانی تیزی سے برس رہا تھا اور سرد ہوائیں چل رہی تھیں، اس لئے ایک بار جی میں آیا کہ اس خیال کو چھوڑ دو، سڑک پر گزرتے ہوئے بھیگ جاؤ گے۔ مگر پیپل کے پتوں سے بھی تو پانی کی دھاریں چھن چھن کر آ رہی تھیں۔

اس لئے میں پیپل کے نیچے سے بھاگ کر ٹین کے نیچے پہونچا، وہاں کیچڑ تھی، پولی مٹی میں جوتے سمیت پیر دھنس گئے نظر اُٹھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو جوان عورتیں پانی سے بچنے کے لئے کھڑی ہیں، ایک کے چہرہ پر گھونگھٹ کا نقاب ہے اور دوسری بے نقاب، دوسری غالباً کنواری تھی، اُس نے میرے پیر مٹی میں دھنسے ہوئے دیکھکر کسی قدر طنز آمیز ہمدردی سے مجھ پر نظر ڈالی۔

میں نے کہا "معاف کیجئے گا مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ لوگ یہاں تشریف فرما ہیں، ورنہ پیپل کے نیچے ہی بھیگتا رہتا۔"

بے نقاب نے نقاب والی کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا "آپ کہیں تو میں چلا جاؤں؟"

اُس نے جواب دیا "نہیں آپ کھڑے رہیئے، یہ ہماری زمین تو ہے نہیں، ہم بھی آپ ہی کے سے راہگیر ہیں۔"

میں نے کہا "میں یہ کب کہتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ آپ عورت ذات ہیں اور میں مرد۔ کسی نے یوں تنہائی میں دیکھ لیا تو نہیں معلوم کیا سمجھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کہیں تو میں چلا جاؤں۔"

اُس نے جواب دیا "آپ کھڑے رہیں، راہگیروں سے کوئی کیوں بدظن ہونے لگا۔"

میں نے کہا "شاباش، کدھر کا رُخ ہے؟"

اُس نے جواب دیا "اسٹیشن"

میں نے کہا" وہیں تیں بھی جارہا ہوں، لیکن وہاں سے کہاں کا قصد ہے؟"
ایک گہری سانس لیکر اُس نے کہا" وہاں سے ابھی تو لکھنؤ جائیں گے، پھر جہاں قسمت لے جائے"
اُس کی تکلیف اور پریشانی کے خیال سے میں نے کہا" میں بھی لکھنؤ جارہا ہوں"
نقاب پوش نے اس کا ہاتھ دبایا تو اُس نے کہا" ہماری خاطر تھوڑی سی زحمت گوارا فرمائیں گے؟"
میں نے جواب دیا" بخوشی، فرمائیے"
اُس نے نقاب پوش کی طرف اشارہ کرکے کہا" یہ میری بھاوج ہیں، مہینہ بھر ہوا میرے بھائی صاحب اس گاؤں میں اُستاد مقرر ہوکر آئے تھے، آتے ہی ہیضہ ہوگیا، دو ہی دن میں چل بسے"
لڑکی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے نقاب پوش دیوار کے سہارے کھڑی تھی اور ٹین پر زور زور سے پانی گر رہا تھا۔
لڑکی کہہ رہی تھی" بھائی کے سوا دنیا میں ہمارا کون تھا، اب نام لینے کو بھی کوئی نہ رہا"
اتنا کہہ کر لڑکی سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔
کچھ تسلی آمیز لفظ کہکر میں نے پوچھا" لیکن لکھنؤ کس کے پاس جارہی ہو، اور میں تمھاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"
ایک چھوٹا سا بکس جو بغل میں دبا تھا نکال کر کھولا، اور اُس میں سے ایک کتاب نکالی، کتاب کے اندر سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا اور بولی" بھائی صاحب کا تبادلہ ہونے سے پہلے یہ خط آیا تھا، وہ ان کی بڑی تعریف کرتے تھے یہ بھی انھیں بہت مانتے تھے، خط سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے"
لفافہ ہاتھ میں لیتے ہی میں غرقِ حیرت ہوگیا، اس پر میرے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے دوست کا پتہ تھا۔ خط کھول کر دیکھا وہ بھی میرا ہی لکھا تھا۔
میری حالت غیر ہوگئی، جسے میں نے یہ خط لکھا تھا وہ دنیا میں نہیں رہا، اور اس خط کے بھروسے پردہ مخدرات مجھ سے طالب امداد ہیں، کس بلا کی مصیبت تھی!
"آپ ہمیں ان کے گھر پہونچا دیں گے؟" اس لڑکی نے پوچھا،
میں نے خط کو لفافے میں رکھتے ہوئے کہا" ہاں"
اُس نے کہا" آپ روتے کیوں ہیں؟ کیا ہماری حالت سے آپ کے دل پر اتنی گہری چوٹ لگی؟
"میں ہی ہوں جس کے پاس تم جارہی ہو"
نقاب پوش اور میرے دوست کی بہن نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور اسی عالم میں دونوں

کے منھ سے ایک چیخ نکل گئی۔

پانی برس چکا تھا، اس کے ہاتھ سے صندوقچہ اور گٹھری لے کر میں نے کہا "چلو پانی ٹھہر گیا۔"

وہ دونوں بٹن کے چھپر سے نکل کر میرے پیچھے پیچھے ہولیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ میرا دوست نہیں رہا، کیوں نہیں رہا، اپنی بہن اور بیوی کو میرے آسرے پر کیسے چھوڑ گیا۔ کچھ سمجھ جاتا تو جاتا۔

مگر ٹین کا چھپر بہت پیچھے رہ گیا اور پانی میں تر بتر وہ دونوں بھی میرے ساتھ ساتھ سڑک پر چل رہی تھیں۔

(مترجمہ۔ آرمیڈینتی)　　(راز ادھری)

واردات

(از جناب حافظ محمد صدیق صاحب صدیق کانپوری)

میں کیا کہوں چمن میں کہ کیا سانحہ ہوا　　اک شاخِ گل پہ گھر تھا سو نذرِ بلا ہوا

دل ہے مگر اب اس میں کوئی آرزو نہیں　　اس گھر میں اک چراغ ہے لیکن بجھا ہوا

سوزِ غمِ فراق کی حدت نہ پوچھیئے　　جو اشک میری آنکھ سے ٹپکا جلا ہوا

تم کو یہ روزِ عید مبارک ہو دوستو　　ہم غم زدہ ہیں دل ہے ہمارا دکھا ہوا

بس نخلِ نو دمیدہ تھا میری بساط کیا　　بادِ خزاں کے جھونکوں سے گلشن فنا ہوا

افسوس رازِ مرگ مرا فاش ہو گیا　　لاشے پہ وہ جو آئے تو محشر بپا ہوا

رو رو کے ختم کر دیا عمرِ عزیز کو
صدیقِ خوش نوا کی طبیعت کو کیا ہوا

مورخ اور شاعر

(از جناب فاروق محشر بدایونی)

(مورخ)

میری ہر سانس سے آتی ہے ہوائے ماضی — میں دیا کرتا ہوں پیغام بقائے ماضی
میری رفتارِ تخیل پہ ہے عالم کا نظام — میرے افکار میں مضمر ہے حیاتِ اقوام
قدر کرتے ہیں سلاطینِ زمانہ میری — خون رُلواتی ہے سُرخیِ فسانہ میری
یاد ایامِ گذشتہ کی دلاتا ہوں میں — قوم کو راہ ترقی کی دکھاتا ہوں میں
میرے اقوال میں گنجائشِ اوہام نہیں — بحثِ الفاظ و معانی سے مجھے کام نہیں
وقت کے آہنی احکام پہ چلتا ہوں میں — رُخ بدلتا ہے زمانہ تو بدلتا ہوں میں
میرے مشرب میں دروغ اور تعصب ہے گناہ — کچھ اگر شک ہو تو تاریخ کے صفحے ہیں گواہ
مجھ کو گڑھنا نہیں آتا کوئی فرضی تخئیل — اپنے دعوے کو نہیں رکھتا ہوں محتاج دلیل
قصۂ بیضۂ عنقا نہیں بھاتا مجھکو — گل و بلبل کا فسانہ نہیں آتا مجھکو
نہ "پرے سرحدِ ادراک سے میرا مسجود" — نہ مجھے توڑنا آتے ہیں شریعت کے قیود
نہ پرستارِ محبت نہ طلبگارِ شراب — نہ درِ حسن پہ لُٹنے کے لئے ہوں بیتاب
فکر کو زحمتِ بیجا سے سروکار نہیں — میں رہینِ گلۂ زاہد و مے خوار نہیں
سوچوں تیری طرح میں بھی جو خیالی باتیں — ایک مصرع کے تجسس میں گنوا دوں راتیں
تو نے ایسا بھی کوئی شعر لکھا اے شاعر — جس سے آئینۂ ماضی کی جھلک ہو ظاہر
ایسی بھی نظم زباں سے کبھی دہرائی ہے — جس نے تاریخ کے صفحے پہ جگہ پائی ہے
سامنے رکھ کے کبھی آئینۂ ماضی و حال — دل میں تو لایا ہے مستقبلِ روشن کا خیال
کی کبھی قصۂ اسلاف کی عزت تو نے — یا فقط پائی ہے الفاظ پہ قدرت تو نے
تو پیامی ہے تو پیغام سنا دے شاعر! — قوم کو پہلا سبق یاد دلا دے شاعر!!

(شاعر)

اے مؤرخ دلِ شاعر کو نہ کر تو بے چین / جب تجھے علم نہیں کیا ہے مرا نصب العین
قوم کی فکرِ ترقی میں غم اندوز ہوں میں / تجھ کو معلوم نہیں؟ شاعرِ امروز ہوں میں
میرے جذبات وخیالات کی تضحیک نہ کر / صاحبِ ہوش ہے تو کر مری جدّت پہ نظر
مجھ کو اللہ نے بخشی ہے متاعِ الہام / میرے مشرب میں دروغ اور تعصب ہے حرام
پوچھ تیری ہے جو سرکارِ شہنشاہی میں / میں بھی مقبول ہوں دربارِ شہنشاہی میں
بیڑیاں جہل کی اب توڑ چکا ہے شاعر / حُسن کی دیوی سے منھ موڑ چکا ہے شاعر
اب اُسے فکر یہ ہے قوم کو دلشاد کرے / بھول بیٹھے ہیں جسے سب وہ سبق یاد کرے
انقلابات کو بڑھ بڑھ کے کہے زندہ باد / اپنے نعروں سے ضلالت کی ہلا دے بُنیاد
میری آواز کو آشفتہ بیانی نہ سمجھ / مجھ کو بس قادرِ الفاظ و معانی نہ سمجھ
میرے پیمانۂ تخئیل میں ہے ایسی شراب / جس کا اِک جُرعہ بنا دیتا ہے پیری کو شباب
پہلے "عورت کی پرستش" تھا غزل کا مفہوم / اب یہ ہوتا ہے بنامِ وطنیت مرقوم
میں اگر مصلحتِ وقت سے مڑنا چاہوں / ابھی عالم کے مرقّع کو بدل سکتا ہوں
صیغۂ راز میں پنہاں ہے فنا میرا / نام تعظیم سے لیتا ہے زمانہ میرا
میری آواز سے ہنس دیتے ہیں روتے مزدور / پانی پانی ہے مرے سامنے دولت کا غرور
ایک مصرع میں یہ راتیں جو گنوا دیتا ہوں / اِسی مصرع سے زمانے کو جگا دیتا ہوں
میرا دیوان ہے گنجینۂ اسرارِ حیات / جس میں ہر دَور کی موجود ہے تاریخِ حیات
انگلیوں پر ہیں مرے سارے زمانے کے علوم / منطق و فلسفہ و حکمت و تاریخ و نجوم

تجھ کو جس فن پہ ہے ناز اُس پہ بھی حاوی ہوں میں
محوِ آئینۂ ارضی و سماوی ہوں میں

تصحیح

زمانہ یادگار نمبر میں صفحہ ۹۷ - سطر ۸ کے بعد یہ شعر درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ ناظرین براہ کرم اضافہ کر لیں:-

با ہزاراں خروش آیا تھا / اے نگم بھائی جوش آیا تھا

نوائے تازہ

(حضرت محوی صدیقی لکھنوی)

التفاتِ کرم نہ ہو جائے ختم اُمیدِ غم نہ ہو جائے
زندگی صرفِ غم نہ ہو جائے کہیں ایسا ستم نہ ہو جائے
سُن تو اے بے نیازِ سجدۂ عشق سر کہیں اور خم نہ ہو جائے
اب نظر بھی بہ مشکل اُٹھتی ہے یہ بھی میرا قدم نہ ہو جائے
جی دھڑکتا ہے اے امیدِ وصال تو بھی پامالِ غم نہ ہو جائے
بڑھتے بڑھتے نگاہِ دزدیدہ آشنائے کرم نہ ہو جائے
عشق سے حسن کا بلند ہے نام سرنگوں یہ علم نہ ہو جائے
روکیے اپنی شوخ نظروں کو شوقِ مشقِ ستم نہ ہو جائے
روز افزوں ہے خستگی دل کی یہ پیامِ عدم نہ ہو جائے
ہائے کس شوق سے پلاتے ہیں کہیں اکسیر سم نہ ہو جائے
دیکھنا تشنہ لب نگاہوں میں رازِ دل مرتسم نہ ہو جائے
یادِ جاناں ہے زندگی کی جان یہ بھی نذرِ الم نہ ہو جائے
دل کا افسانہ اور مری تحریر شق زبانِ قلم نہ ہو جائے
عمرِ رفتہ کو دے کوئی آواز نگہِ لطف کم نہ ہو جائے
سوزِ دل کا یقین کیا جب تک خشک آنکھوں سے نم نہ ہو جائے
کون نرگس کہے اِن آنکھوں کو حاصلِ مدح ذم نہ ہو جائے
خون کے آنسوؤں سے دامن پر حسرتِ دل رقم نہ ہو جائے
آہ یہ جنتِ نگاہِ شباب نقشِ مبہم ارم نہ ہو جائے
کیوں نہ کر دیں وہ دل کا قصہ پاک آج پوری قسم نہ ہو جائے

آگ ہے آگ سوزِ دل محوی
تو بھی اس میں بھسم نہ ہو جائے

پنڈت کشن پرشاد کول کے ادبی کارنامے

(از ڈاکٹر محمد حفیظ سید ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ لٹ)

ملکی اور قومی خدمات کے علاوہ کشن پرشاد صاحب کول نے اردو ادب کی جو خدمت اپنے ناولوں اور ڈراموں کے ذریعے کی ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ممکن ہے ارباب ذوق کی عدم توجہی کی وجہ سے انھیں وہ مقبولیت حاصل نہ ہو جو اُن کے ادبی کارناموں کا تقاضا ہے، تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ اسی دور میں ادبی رجحانات کو دیکھتے ہوئے ہمیں احساس ہوگا کہ ناول اور ڈرامانگاری کا زیادہ تر دارومدار تاریخی رومان پر مبنی ہے جس میں روزانہ زندگی کے حقائق سے ہٹ کر تخیلی زندگی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ عبدالحلیم شرر اور محمد علی کے کارنامے اسی رجحان کے علمبردار ہیں، راشد الخیری کی "آفتاب دمشق" "یاسمین شام" اور "ماہ عجم" وغیرہ میں بھی تاریخی رومان کا معتد بہ عنصر شامل ہے۔ ان ادیبوں نے قوتِ مشاہدہ سے زیادہ قوتِ تخیلہ سے کام لیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ادیبوں کا ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو سماجی و نفسیاتی ادب اور حقیقت نگاری کی جانب زیادہ متوجہ ہے جس میں پریم چند، انصار ناصری، فضل حق قریشی، رسوا، امتیاز علی تاج، اوپندر ناتھ اشک، ڈاکٹر عابد حسین اور کسی حد تک فیاض علی وغیرہ بھی شامل ہیں جو زندگی کے ہر پہلو پر نظر رکھتے ہیں اور انسانی فطرت کی تمام الجھنیں نمایاں کرتے رہتے ہیں جس سے ان کی حقیقت پسندی کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ کشن پرشاد صاحب کول کو بھی ہمیں اسی گروہ میں شامل کرنا چاہیئے، جن کی حقیقت شناس نگاہیں سیاسی، سماجی اور نفسیاتی کشمکش کا مشاہدہ کرتی رہتی ہیں، جس کا اظہار انھوں نے "نشا" "سادھو اور بیسوا" "شاما" اور "مجبور وفا" وغیرہ میں کیا ہے۔

چونکہ کول صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ ملکی اور قومی خدمات کے لئے وقف رہا، اس لئے ہندوستان کی سیاسی کشمکش اور عوام کے حالات کی حقیقی تصویریں ان کے تمام ڈراموں اور ناولوں میں موجود ہیں۔ کانگریس اور مختلف جماعتوں میں جو کشمکش جاری رہتی ہے اور اُن کے اثرات جو عوام پر پڑتے رہتے ہیں اُس کی مثالوں سے بھی کول صاحب کی اکثر کتابیں خالی نہیں ہیں۔ سیاسی پہلو کے علاوہ روزمرہ کے عام واقعات، انسانی فطرت اور جذبات کو اپنے کرداروں کے ذریعے جس خوبی اور صداقت سے پیش کیا ہے اُس کی مثالیں اُن کے تمام ڈراموں اور ناولوں میں مل سکتی ہیں۔ ان کے کردار ہماری ہی دنیا کی جیتی جاگتی

تصویریں ہیں جن میں حیات کی تمام سرگرمیاں اور جد وجہد موجود ہیں۔ "نشا" کو پڑھنے کے بعد یہ ممکن نہیں کہ ذہن سے "نشا" کی شخصیت فراموش ہوسکے۔

کول صاحب کے ناولوں اور ڈراموں میں زیادہ تر متوسط درجہ کی سماجی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس میں رسوم وقیود، شادی وغم، محبت ونفرت اور حیات انسانی کے تمام نفسیاتی پہلوؤں پر نہایت خوبی سے تمام فنی اور ادبی نزاکتوں کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے جس سے اُن کے قلب کی گہرائی، بالغ نظری، خلوص، قومی درد اور مشاہدہ کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کی تصانیف کسی مصلح قوم یا سیاسی لیڈر کی تقریروں کی آئینہ دار نہیں ہیں اور نہ کسی گروہ کی تنقید کی گئی ہے، بلکہ ان کا ہر کارنامہ ایک ادبی شان لئے ہوئے ہے جس میں کول صاحب نے ایک ادیب کی ذمہ داریوں کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے۔

مقامی رنگ اور خصوصیات کے پیش کرنے میں بھی کول صاحب نے ہندوستانی ماحول اور فضا کا کافی خیال رکھا ہے۔ پلاٹ کی دلچسپی کے ساتھ کردار اور مکالمے کی تدریجی ترقی کو بھی اچھی طرح نباہا ہے۔ اکثر مکالموں کے ذریعے ایسا ماحول پیش کرتے ہیں جس سے طبقاتی خصوصیت کی حقیقی جھلک نمایاں ہوجاتی ہے۔ "نشا" (ایک ڈرامہ ہے جسے کول صاحب کا شاہکار کہنا چاہیئے) میں ایک جگہ طوائف کے کوٹھے کا ذکر کیا گیا ہے جہاں نہال چند، ہریش اور پرکاش، زہرہ بائی کا گانا سن رہے ہیں، جب وہ یہ شعر گاتی ہے:۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو (غالب)

نونہال بابو کہہ اُٹھتے ہیں کہ "کیوں بھئی ہریش سنا، کیا کہتی ہیں، اشارہ یار تیری طرف ہے، بڑا خوش قسمت ہے" پورا جملہ ایک ایسا ماحول پیش کردیتا ہے جس میں ایک شاہد بازاری کا وجود اور اُس کے متعلق پوری فضا آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ کردار کی تدریجی ترقی کے ساتھ ساتھ مکالمے میں بھی کافی فرق نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ "نشا" کا ایک زمانہ تھا کہ جب وہ اپنی ننھی سوتیلی بہن سے کہہ رہی تھی "دیکھو یہ نہیں کرتے، پھر ہم تمھاری گڑیا کے کپڑے نہیں سئیں گے" اور اگر دودھ پی لوگی تو پھر اچھے اچھے کپڑے گڑیا کے سجادیں گے، تم تو بڑی رانی بیٹی ہو۔ کہا مان جاتی ہو۔" ان الفاظ میں کتنی سادگی ہے اور دنیاوی تفکرات سے آزادی پوشیدہ ہے۔ زبان کی سادگی کے ساتھ جذبات کی سادگی کا اظہار ہورہا ہے لیکن وہی "نشا" کچھ دنوں کے بعد اپنی سہیلی سُمترا سے کہتی ہے:۔

(ایک آہ سرد بھر کر) "مجھ پر تو زندگی کی وہ سب منزلیں گذر چکی جو تم پر ساٹھ برس کی عمر کے بعد گزریں گی سُمترا! تم میری گنتی اب بھی لڑکیوں میں کرتی ہو؟" ان پُردرد جملوں میں کسی کی زندگی کا جنازہ نظر آرہا ہے۔

اور محسوس ہوتا ہے کہ حیات کی تلخیاں تنشا کی روح کو چھلنی کر رہی ہیں، مکالمہ اور کردار کی تدریجی ترقی میں بڑی مناسبت ہوتی ہے۔ جہاں اچھے اچھے ادیب بھٹک جاتے ہیں۔ لیکن کول صاحب نے اس چیز کی تکمیل بڑی کامیابی کے ساتھ کی ہے۔

انسانی فطرت اور جذبات اور وہ بھی ایک عورت کے اس قدر وسیع اور دُھندلے ہوتے ہیں کہ ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ایک ہندوستانی عورت کا قلب، مذہبی اور سماجی رسوم و قیود اور شرم و حیا کا اس قدر پابند ہوتا ہے کہ اکثر وہ اپنی تمام تمناؤں اور خواہشوں کے اُمنڈتے ہوئے سیلاب کو ہمیشہ کے لئے چُھپا دینا چاہتی ہے۔ لیکن وہ اپنی فطری تقاضوں کو بھی نہیں ہٹا سکتی۔ اسی نقطہ کو کول صاحب اتنی اچھی طرح ظاہر کر گئے ہیں کہ ان کے فنّی کمال کی داد دینی پڑتی ہے۔

سمترا:۔ "چلو ہٹو، تم بھی غضب کرتی ہو، دو برس ہونے آئے، اب کیا عمر بھر سیاپا ہی لئے بیٹھی رہو گی ایک تو ایشور کی ویسے ہی مار ہے تو کیا اب گھڑی دو گھڑی ہنسنے بولنے سے بھی گئے؟ کیا جھولا جھولنے اور گانے میں کوئی ہرج ہے، تمہاری طبیعت نہیں چاہتی؟"

تنشا (آزردہ ہوکر) "طبیعت کا کیا ذکر ہے، انسان کا دل تو بڑا چنچل ہوتا ہے، پر لوک لاج بھی تو کوئی چیز ہے"

اِن الفاظ میں ظاہر ہے کہ ایک ہندوستانی عورت کا قلب دھڑک رہا ہے جس میں اس کے حقیقی جذبات پوشیدہ ہیں لیکن جسمانی اور معاشرتی قوانین سے مجبور ہے۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ کول صاحب نفسیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں، عورت کا قلب اور فطرت ایک ایسا معمّہ ہے جس کا حل معمولی انسان کا کام نہیں ہے، عورت کو کوئی دھوکا نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ خود اپنے شباب کے دھوکے میں نہ آ جائے۔ وہ خود فریب میں آنا نہیں چاہتی لیکن اس کی جوانی ہمیشہ فریب کا نشانہ بننا چاہتی ہے۔ وہ ہی تنشا جو اپنی زندگی کی تمام رعنائیوں کو دفن کر چکی تھی جس کے خیال میں زندگی کا مفہوم سوائے رنج و غم کے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ ہر کشن کی محبت آمیز التجاؤں سے اپنے جیون میں ایک تڑپ محسوس کرنے لگتی ہے اور کول صاحب کی نکتہ رس نگاہوں نے جھولے اور "گھن گرجے گھن بجری چمکے" کی ایسی فضا پیدا کر دی ہے جس سے اس کے قلب میں یقیناً انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس قلبی اضطراب اور زندگی کی کروٹ کو جس صداقت اور حُسن کے ساتھ کول صاحب نے پیش کیا ہے وہ فنی حیثیت سے ایک شہپارہ ہے۔ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ایک نوجوان عورت اور اُس کے ارادوں کی قسمت صرف چند محبت بھرے میٹھے بول ہیں جو اُسے خود فراموش کر سکتے ہیں، وہی تنشا جو چند منٹ پیشتر سماجی زندگی کے قوانین کی پابند نظر آ رہی تھی، اس کا نقشہ کول صاحب کے الفاظ میں دیکھئے:۔

ہریش (نشا کا ہاتھ پکڑکر) ایک دفعہ پیار کر لینے دو"
نشا۔ (مسکراکر) "کیا کرتے ہو، کوئی آتا ہوگا۔ ایسی بھی کیا بے صبری ہے۔"
(ہریش. نشا کو پیار کر لیتا ہے) "اچھا اب الگ ہٹو، میں جاتی ہوں، سمترا میرا انتظار کر رہی ہوگی بڑی دیر لگ گئی۔"
ہریش۔ "تو پھر کل آؤنگا۔"
نشا۔ نہیں، روز روز کا آنا ٹھیک نہیں، تیسرے چوتھے دن، بس۔"
ہریش۔ "ابھی کافی ستایا نہیں ہے اور ستانا چاہتی ہو۔"
نشا۔ (جاتے جاتے مسکراکر) ناشکرا پن اسی کو کہتے ہیں، ہاں جی ستانا تو ہمارا کام ہی ہے" (چلی جاتی ہے)

اس مکالمے میں جتنے الفاظ ہیں اور جس انداز میں ادا کئے گئے ہیں، اپنے اندر زندگی کا نفسیاتی پہلو چھپائے ہوئے ہیں، جو اپنی ادبی نزاکتوں کے ساتھ حیات انسانی کی حقیقی آئینہ دار ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں سے مثال پیش کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ کیونکہ اُن کی تمام تصانیف ایسے جواہر پاروں سے مالا مال ہیں جو اُردو ادب کے لئے مایۂ ناز کہے جا سکتے ہیں۔ "مجبور وفا" سیاسی کشمکش کے زمانہ کا ایک ناول ہے جس میں ہر طبقے کے لوگوں کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس پر سوسائٹی کا رنگ اچھی طرح نمایاں کیا گیا ہے اور جو اپنے زمانہ کی ایک صحیح تاریخ ہے۔ "سادھو او ربیسوا" اور "شاما" کی اہمیت بھی حقیقت نگاری کا ایک مکمل مرقع ہے جس میں ہر طبقے اور مختلف لوگوں کی ذہنی، قلبی، سماجی زندگی کے نقشے پیش کئے گئے ہیں۔ زبان میں آزاد کی رنگینی یا نذیر احمد کا چٹخارہ یا شرر کی دلکشی نہیں ہے، لیکن سادگی، صفائی، برجستگی اور حقیقت کا اظہار ہر جگہ موجود ہے جس کی وجہ سے کردار میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ ناولوں اور ڈراموں کے علاوہ کول صاحب نے ایک کتاب "ہندوستان کا نیا دستور حکومت" تصنیف کی ہے جس میں اُنھوں نے جدید قانون ہند کو جو اپریل ۱۹۳۷ء میں نافذ کیا گیا ہے، نہایت ہی خوش سلیقہ اور منطقی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اور جسے ایک کم تعلیم یافتہ شخص بھی نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اس سے ہمیں کول صاحب کی سیاسی دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہم کول صاحب کو اُردو ادب کی اس بیش بہا خدمت پر جس کا اُنھوں نے اپنے ادبی کارناموں کے ذریعے ثبوت دیا ہے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ وہ ناول اور ڈرامانگاری کو ایک ایسی منزل پر پہونچا دینگے جو حقیقت پسندی کا نمونہ قرار دیا جائیگا۔ اُردو ادب میں ڈراموں اور ناولوں کی کمی ہے اور جو موجود ہیں اُنکی فنی حیثیت سے اتنی کمی ہے کہ ہمیں کبھی کبھی مایوس ہو جانا پڑتا ہے لیکن جب ہم اپنے موجودہ ادیبوں اور اُنکی کوششوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہماری مُردہ اُمیدوں میں جان پڑ جاتی ہے اور ایک شاندار مستقبل کا یقین ہو جاتا ہے۔ اس ادبی قحط کے زمانہ میں پنڈت کشن پرشاد صاحب کول کی کوششوں پر اُردو ادب کو جس قدر ناز ہو کم ہے۔

علمی مباحثہ

ایک خط اور اُس کا جواب

(از جناب محمد سعید صاحب اور فراق گورکھپوری)

محترم پروفیسر صاحب، آداب نیاز مندانہ قبول کیجیے۔

اپنی عرضداشت سے پیشتر ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنا تعارف خود کرا دوں، غالباً فروری سنہ ۴۲ء میں خواجہ احمد صاحب فاروقی کے ہمراہ جناب کے در دولت پر حاضر ہوا تھا اور ہم دونوں نے مل کر بہت دیر تک جناب کا قیمتی وقت ضائع کیا تھا۔ میں بذات خود نہ ادیب ہوں اور نہ شاعر لیکن خواجہ موصوف چونکہ شاعری اور ادب سے ایک گونہ اُنس رکھتے ہیں اس لئے آپ نے مہربانی فرما کر ہم لوگوں کو اپنا کلام بھی سنایا تھا۔ یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب آپ بیلی روڈ پر پروفیسر الیاس صاحب کے بنگلہ کے پاس مقیم تھے۔ اس کے بعد یونیورسٹی میں بھی جناب کا نیاز حاصل ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ گورکھپور تقریباً میرا وطن ثانی بھی ہے اور اس لحاظ سے بھی مجھے اُمید ہے کہ جو کچھ میں آپ کی خدمت میں عرض کرنے والا ہوں آپ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں گے۔ آخری اور قطعی فیصلہ میں آپ ہی پر چھوڑتا ہوں۔

اس اسکول میں منجملہ دیگر اخبارات ساقی بھی آتا ہے اور اس لئے اس سال غالباً ستمبر یا اگست سے آپ کے مضامین زیر عنوان باتیں دیکھنے کا برابر موقع ملتا رہا۔ میں بدقسمتی سے نہ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں اور نہ فلسفی اس لئے اُن مضامین کے الفاظ میں جو معانی مضمر ہونگے اُن کی تہ تک باوجود کوشش میں ابتک نہیں پہونچ سکا ہوں۔ لیکن ادب کے ساتھ اس قدر ضرور گذارش ہے کہ اس سلسلے کے بعض مضامین کا انداز بیان اگر ناروا نہیں تو دلشکن ضرور تھا۔ اور وہ بھی بالخصوص آپ جیسے سنجیدہ صلح کل اور عالمگیر انسانیت کے حامی کے قلم سے۔ میرے یہ جملے چھوٹا منھ اور بڑی بات کے مصداق ضرور ہیں جس کی میں آپ سے معافی چاہتا ہوں لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس خط کے لکھنے کی نوبت محض اس لئے آئی کہ آپ کے مضامین کی بنا پر اخباری دنیا میں بڑی بے چینی پھیل گئی اور جب میں اُن بے چین کن تبصروں اور تنقیدوں کو دیکھتے دیکھتے گھبرا گیا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ آپ سے شرف ملاقات کی بنا پر میرے ضمیر نے مجھ پر ملامت کی کہ میں نے اب تک سب واقعات آپ کے کان تک نہ پہنچائے۔

میرے محترم! آپ نے وہ مضامین جس کسی خیال کے ماتحت لکھے ہوں ممکن ہے کہ وہ سو فیصدی درست ہوں لیکن طبقۂ عوام ابھی ان باتوں کو اس قدر عریاں طریقے سے سننے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے میری آپ سے مؤدب گذارش ہے کہ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ساقی کے صفحات میں اس غلط فہمی کا ازالہ ضرور کر دیجئے جو ان مضامین کی بنا پر جناب کی طرف سے اکثر و بیشتر

دلوں میں پیدا ہوتی جا رہی ہے، تاکہ ان پر یہ بات روشن ہو جائے کہ آپ نے جو کچھ بھی لکھا تھا وہ کسی کے مذہبی جذبات کی دلشکنی کی خاطر نہ تھا، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی یا بُدھ۔

میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ خلوص اور نیک نیتی کی بنا پر ہے۔ اگر ناگوار خاطر گذرے تو میرا مکتوب پھاڑ کر پھینک دیجئے گا۔ اور اگر آپ چاہیں گے تو میں مزید تشفی کے لئے آپ سے پھر تحریری معافی مانگوں گا۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی بات دریافت طلب ہو تو میں اس کے جواب کے لئے ہر وقت حاضر ہوں۔

اگر الیاس صاحب سے ملاقات ہو تو اُن کی خدمت میں سلام نیازمندانہ عرض کر دیجئے گا۔

نگار نے حال میں "یاس نمبر" نکالا ہے۔ گورکھپوری ہونے کی حیثیت سے اور ادیب و شاعر کی حیثیت سے بھی آپ کے مضمون کی اس میں کمی ضرور ہے۔

اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیریت ہوگا۔ نیازمند سعید

۴ بنیک روڈ۔ الہ آباد
۳۱ جنوری ۱۹۳۳ء

جواب

محب مکرم، سلام شوق، آپ کا نہایت خوشخط اور خوش لہجہ گرامی نامہ پاکر میں بہت خوش ہوا۔ آپ کی معذرتیں بالکل بے ضرورت تھیں۔ "ساقی میں باتیں" کے زیر عنوان جو کچھ میں نے لکھا تھا وہ براہ راست مذہب، مذہبی عقائد اور مذہب کے پیشواؤں پر حملہ نہیں تھا۔ میرا حملہ تھا دور حاضر میں مذہب کے غلط نظریہ، غلط استعمال اور اُسے غلط اہمیت دینے پر۔ آپ جانتے ہیں اور بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ سائنس کے دور کے قبل دنیا بھر میں مذہب انسان کے ہر شعبۂ زندگی پر مسلط تھا۔ فوجداری اور مال کے قانون مذہبی تھے (اب تک بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہیں) تعلیم مذہبی تھی، عدالتیں مذہبی تھیں، سیاست مذہبی تھی، قومیت و ملت مذہبی تھی، پوری زندگی مذہب سے رنگی رہی اور لپٹی ہوئی تھی۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ (The Renaissance) کے بعد سے سائنس کا دور ایک مہذب کفر کا دور شروع ہوا۔ یہاں تک کہ اس نشاۃ ثانیہ سے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان زیادہ متاثر ہوئے۔ ایرانی شاعری میں حافظ، مولانا روم، خیام اور تمام شعراء نے "کفر" یا "کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست" کے نغمے گانے لگے۔ اسلام کو آئے ہوئے آٹھ نو سو برس ہو چکے تھے اور حجازیت بدل رہی تھی عجمیت سے۔ غرضکہ زندہ دل اور روشن خیال دنیا میں یہ عمل شروع ہو گیا تھا کہ مذہب کا دائرۂ عمل و حکومت تنگ ہوتا جائے یہاں تک کہ مذہب خارجی زندگی سے نکل کر داخلی وجدانی اور روحانی چیز ہوتا چلا جائے۔ غالب کا اشارہ اسی طرف تھا جب اُس نے کہا "ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں"۔ اور حافظ کا بھی جب اُس نے کہا "چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند"۔ ہاں تو رفتہ رفتہ نظام زندگی اور اس کے مختلف شعبوں کی صورت گری مذہب کے ہاتھ سے ایک لامذہب سیاست، لامذہب

جمہوریت لامذہب عقلیت اور سائنس اور لامذہب نظم آرائی لیتی گئی۔ یہ دنیا کی تاریخ کے ناقابل انکار حقائق ہیں
اس کے بعد سائنس کی ترقی اور عقلی فلسفہ کا دور شروع ہونے کے ساتھ دنیا کی خارجی زندگی اور امور زندگی پر سرمایہ داری
و سرمایہ داروں کا تسلط شروع ہوا (Industrial Revolution) انقلاب فرانس اور وسطی
طبقے کا ابھرنا (Rise of the middle classes) سب دور رس واقعے اور وسیع البسط مظاہرے
مذہب اور جاگیرداری (Feudalism) کے الوداع اور خیرباد کے مظاہرے تھے۔ یورپ میں آسانی سے
یہ دور نہیں آیا۔ (Holy Inquisition) کی یاد تازہ کر لیجئے۔ مگر ہوا وہی جو ہونا تھا یعنی صنعتی انقلاب
کے اثر سے جاگیرداری کے انحطاط کے ساتھ مذہب کا اثر بھی سیاسی، اقتصادی، سماجی، تعلیمی اور دیگر تمدنی شعبوں پر کمزور ہوتا گیا۔
اب مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں تمدن کی باگ ڈور نہیں رہ گئی۔ مذہبی عقائد بھی خدا اور روح ایسی ان دیکھی چیزوں آسمانی
چیزوں یا مفروضات تک محدود ہو کر رہ گئے۔ سائنس اور انسانی علوم کے تمام شعبوں سے اخلاقیات اور قانون سازی
کے دائرے سے ادب اور دیگر فنون لطیفہ کے حدود سے بھی مذہب چھٹتا گیا۔ زمین آسمان، ستاروں، سورج
چاند۔ حیوانات و نباتات زندگی کے متعلق اور نیچر کے تمام ظاہرات کے متعلق مشاہدات، تجربات، خیالات، و تصورات و
عقائد کو مرتب کرنے کا کام غیر مذہبیت یا لامذہبیت یا معیار عقلیت کے سپرد کر دیا گیا۔ آج جو الزام کچھ لوگ میری ناچیز
تحریروں کو دیکھ کر عائد کر رہے ہیں اس سے کہیں سخت الزام سائنس اور سیاست کے اُن پیشواؤں اور شہیدوں پر عائد
ہو چکے ہیں جو سائنس اور سیاست کو مذہب کے بندھن سے پہلے پہل چھڑانے اُٹھے تھے۔ ڈھائی ہزار برس پہلے بودھ مت
کے مفکروں اور محققوں پر یہی ہوا۔ اور Holy Inquisition کا ذکر ابھی کر ہی چکا ہوں۔ جو سیاست
اور سائنس بلکہ زندگی کے کسی بھی معاملہ میں دیانتدارانہ آزاد خیالی کا دشمن تھا۔ اسلام کی تاریخ میں بھی اس بات کی کمی نہیں
ہے منصور اور سرمد کی خونیں داستانیں اس کی شہادت ہیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سے ہندوستان پر نظر ڈالئے پہلی چوٹ نئی زندگی کی مذہب ہی پر پڑی۔ بعد کو یہ بغاوت
مذہبی اصلاح کہلائی اور بات بھی یہی تھی، کیونکہ یہ بغاوت اصلاحی تھی، انقلابی نہیں تھی، پھر بھی انقلاب نما ضرور تھی۔
راجہ رام موہن رائے، ایشور چند ودیا ساگر، سوامی دیانند سرسوتی، سر سید احمد ان سب پر کفر کے فتوے لگائے گئے
تھے۔ گاندھی جی کے اچھوت اُدھار یا ہریجن تحریک کی جو مخالفت ہوئی اُسے بھی نہ بھولئے۔ خلافت تحریک نے جو
شرح آندھی اُٹھائی تھی اس کے پیچ و خم کو بھی ذرا یاد کیجئے۔ حلال، حرام، آیتوں، حوالوں اور فتووں کے آئے دن بھرمار تھی۔
ہندوستان بھر میں جمعیت العلمائے ہند کا طوطی بولتا تھا۔ اُدھر تاریخ نے خاموشی سے اپنی ستم ظریفی جاری رکھی اور کمال اتاترک
کے ہاتھوں ترکی میں وہ سب کچھ ہوا جسے آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں یعنی جس مذہبیت زدہ غلط اور بے جا
اور فرسودہ سیاست کی پیداوار خلافت کا تصور تھا وہ خلافت اسی ترکی کے ہاتھوں ختم ہوئی جس ترکی کو اس

کی ڈھال تلوار یاروں نے سمجھ رکھا تھا، آج مسلم لیگ اور ہندوستان کے نوے فی صد مسلمانوں میں مسلمانوں کی سب سے زبردست مذہبی جماعت یعنی جمعیت العلمائے ہند کا کیا اثر رہ گیا ہے۔ کیا دینیات و سیاسیات کی ہم آہنگی کا یہ مظاہرہ ہے؟ سرحد پر ڈاکٹر خان کی لڑکی کا بیاہ ایک غیر مسلم سے ہوتا ہے اور انھیں مذہبی طوفان بدتمیزی کا عارضی طور پر شکار بن جانا پڑتا ہے، ادھر قائد اعظم جناح کی لڑکی کا بیاہ ایک غیر مسلم سے ہوتا ہے اور وہ اُسی آن بان سے مسلم لیگ کی گدی پر براجمان ہیں جیسے پہلے تھے۔ آئے دن کروڑوں مسلمانوں کے اتفاق رائے سے مسلم لیگ کے ارباب قضا و قدر جمعیت علمائے ہند کو دھتا بتا رہے ہیں، ایک مسلمان لڑکی ہندو سماج میں پناہ لیتی ہے اور سوامی شردھانند کو گولی ماردی جاتی ہے۔ اُسی دلّی میں آصف علی کا بیاہ ہندو لڑکی سے ہوتا ہے اور ہنستی ہوئی پیشانی سے ہندو سماج دونوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔ آصف علی کے مقابلے میں مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا کے نمایندے ٹکے کو نہیں پوچھے جاتے۔ کیا اس ڈرامے کو آپ نہیں دیکھ رہے ہیں، کیا اسے آپ مذہب پرستی کہنے کو تیار ہیں آج مولانا ابو الکلام آزاد سے بڑھکر عربی علوم اور مسلم دینیات پر کس کو زیادہ عبور ہے، لیکن مسلمانوں کی لیڈری تو دور رہی اُن کے پیچھے نماز پڑھنے کو بھی کوئی بندۂ خدا آمادہ نہیں۔ یہ ہے آج ہندوستان میں مذہب اور سیاست کی لیلا اور ہندو مہاسبھا بھی کیا ایک سنجیدہ مضحکہ بن کر نہیں رہ گئی ہے جس مہاتما گاندھی کو سیاست کو مذہبی فرقہ پرستی کے بندھن سے چھڑانے والا سمجھا جاتا تھا اُنھیں کے متعلق کبھی یہ سرگوشیاں ہوتی ہیں کبھی کھُلّم کھلّا یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی فکریات (Ideology) مذہبیت زدہ ہے اور ٹیگور آنجہانی اور پنڈت جواہر لال نہرو ان کے بعض نظریوں سے اپنی بیزاری کا اظہار کرنے سے نہ چوکے۔ دیکھئے مذہب اور سیاست کا ناٹک۔

ہاں تو میری یہی گذارش تھی کہ علم اور سیاست دونوں میدانوں میں مذہب دم توڑ رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ مذہب سے تاریخ کا دباؤ اور تاریخ کے ٹھوکے جن لوگوں کو چونکا کر آزاد کر رہے ہیں وہ کچھ ایسے تصورات و جذبات و رجحانات کو ابھی کلیجوں سے لگائے ہوئے ہیں جنھیں وہ اپنے نزدیک مذہبی تصورات سمجھتے ہیں، وہی بات ہوئی

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں

ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں (فانی)

لیکن یہ بیری بیری یا استسقا (Beriberi) کی بیماری دائمی نہیں ہے، شام ابد کی بھی صبح ہوتی ہے اور مُردوں سے شرط باندھکر سونے والے بھی چونکنے لگے ہیں۔ بیسویں صدی انقلابی صدی ہے چین ہندوستان سے بڑا ملک ہے اور اس کی اہمیت ہندوستان سے بیس ہے اُنیس نہیں۔ وہاں کی پچاس کروڑ آبادی میں نوے فی صدی لوگ بدھ مذہب کے پیرو ہیں، مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی اقلیت ہے، اکّا دکّا عیسائی بھی ہیں۔ لیکن انقلاب چین کے روح رواں اور اس انقلاب کے دل دماغ اور اس کے ہاتھ پاؤں ڈاکٹر سن یات سین تھے جو عیسائی تھے جنرل ارفو

چیانگ کائی شیخ اور اُن کی اہلیہ عیسائی ہیں۔ یہ لوگ اگر اس جہل مرکب کے شکار ہوتے کہ عیسائی تہذیب اور کلچر عام انسانی یا چینی تہذیب سے جدا چیز ہے اور چینی عیسائی، چینی بدھسٹ اور چینی مسلمان تین نیشن ہیں۔ ان کا بھی اگر ملی نظریہ اتنا ہی تاریک ہوتا جتنا اقبال کا تھا یا خیر سے جتنا کچھ ہمارے دیگر اہل وطن کا ہے تو آج چین کہاں ہوتا؟ ترکی کے پاک اور ہاتھوں سے خلافت کا قصہ پاک ہوا۔ ترک مسلمان ہیں لیکن ترکستان کے لکھو کھا روشن خیال مسلمان عرب، سیریا، ایران، مصر، افغانستان یا ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اپنے دل کے کسی حصہ میں وہ جگہ دینے کو ہرگز تیار نہیں اُنھیں اپنے آپ سے اس سے زیادہ قریب سمجھنے کو ہرگز تیار نہیں، اُنھیں اس سے زیادہ اہمیت و خصوصیت دینے کے لئے ہرگز آمادہ نہیں جو وہ غیر ملکیوں اور غیر مسلموں کو دیتے ہیں بے حیائی اور ذلالت کی بھی حد ہوتی ہے۔ پان اسلامزم کو جو لوگ سیاست نامہ سمجھ بیٹھے ہیں اُنھیں جان لینا چاہیئے کہ ترکستان، حجاز و عرب، ایران، مصر، افغانستان کے مسلمانوں کی نظر میں اب وہ محض ایک ساقی نامہ رہ گیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان جب اسلامی اخوت کے نام سے ان ملکوں سے جذبۂ یگانگی کا اظہار کرتے ہیں جب ان ملکوں سے اپنا پن ظاہر کرتے ہیں، جب ان ملکوں کے باشندوں کو اسلامی بھائی کہکر پکارتے ہیں تو ان ملکوں کے باشندوں کے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نفرت نئی چیز نہیں ہے، شاید آپ کو اس وفد کا طربیہ اور المیہ حشر معلوم ہے جو ٹیپو سلطان نے خلیفۃ المسلمین کو بھیجی تھی۔ مذہب کا سمبندھ اب محض "اپرانت سمبندھ" رہ گیا ہے "اپرانت سمبندھ" کیا؟ اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک مہاشے جی اپنے دروازے پر اطمینان سے بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ایک دوسرے صاحب نے آکر اُنھیں نہایت تپاک سے سلام کیا۔ مکان والے نے پوچھا کہ آپ کون؟ جواب ملا "میرے آپ کے اپرانت سمبندھ ہے۔" "یہ اپرانت سمبندھ کیا؟" پھر جواب ملا کہ آپ کے پچھواڑے جھربیریا کا ایک پیڑ ہے اور بیر ہی کی لکڑی کی کھونٹی میرے گھر کے جانتے (چکی) میں گڑی ہوئی ہے، چونکہ وہی لکڑی ہے اس لئے میرے آپکے اپرانت سمبندھ ہے۔" پان اسلامزم بھی چیز ہے۔ سیاسی تنظیم میں مذہب کی وہی جگہ ہے جو ان صاحب و ران صاحب میں تعلق ہے جن میں سے ایک کے گھر کے پچھواڑے جھربیریا کا پیڑ تھا، اور دوسرے صاحب کی چکی میں بیر کی لکڑی کی کھونٹی تھی۔

ہاں تو جب یورپ میں سائنس اور صنعتی انقلاب کے فتوحات شروع ہوئے تو وہاں کی دنیا بدلی، زندگی کے تمام شعبوں سے مذہب کا دیس نکالا (اخراج) شروع ہوا۔ اب اہل مذہب نے اپنی شکست دیکھکر اس کی کوشش کی کہ جھگڑا کو باقاعدہ پیچھے ہٹنے کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ اقتصادیات، اصول قانون سازی، عمرانیات، علوم و فنون، سیاسیات و اخلاقیات سب ایک غیر مذہبی حکومت ایک لامذہب تمدن اور سائنس کا

نظام سے قریب تر ہوتے گئے، مذہب جس کی حکومت کی گدی کے قریب ترین جگہ تھی اب کھسکنے لگا یہ کہتا ہوا

یاں تو جو آئے ہے وہ پاس ہی بیٹھے ہے ترے ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

غیب سے آواز آئی "جہاں بھی ٹھکانا نہ ملے وہاں تک"

جب تک کرۂ ارض پر انگلستان، جرمنی، فرانس، امریکہ، روس، چین، جاپان اور ہندوستان کی غیر مسلم آبادیوں میں روشنی نہیں لہرائی تھی اور زندگی نے انگڑائی نہیں لی تھی اُس وقت تو پان اسلامزم کا کچھ مفہوم بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن آج تو حقیقی پان اسلامزم غیر مسلم دنیا کو ایک گستاخ چیلنج سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر دنیا بھر کے مسلمان اپنے غیر مسلم ہموطنوں یا غیر ملکی غیر مسلموں کے مقابلے میں منظم ہونا چاہیں تو اس کا نتیجہ ہوگا فساد و شر اور جنگ جنگ اور محض جنگ، جس میں اقبال کا فلسفۂ خودی آڑے نہیں آئے گی۔

سچ ہے دنیا نہیں دکاں لیکن صحنِ مسجد بھی وہ نہیں ہے جناب

سائنس کے معنے محض کارخانوں کا قائم ہونا نہیں ہے بلکہ مذہبی حلقوں کا مٹ جانا بھی ہے۔ ہندوستان سے باہر کے مسلمان اسے سمجھ گئے ہیں اور اس عالمگیر انقلاب کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ یاد ش بخیر مولانا محمد علی اور بڑے بھائی (The big brother) مولانا شوکت علی کی جو مزاج پرسی ابن سعود نے کی تھی اُسے نہ بھولیئے۔ سائنس تمام مذہبی، ملکی، قومی، نسلی، طبقوی اور محدود ملّی سرحدوں کو توڑ چلا ہے۔ اب ہندو سیاست، مسلم سیاست، ہندو تہذیب، مسلم کلچر، ہندو سنگٹھن، مسلم تنظیم کی جگہ دنیا میں نہیں اور نہ عیسائی تہذیب کا وقت رہا۔ اب انسان کے لئے الگ الگ قوموں میں بٹ کر جینا اور پنپنا ناممکن ہے۔ اقبال ایک طرف تو مردِ آفاقی اور آفاقیت کا نعرہ بلند کرتے ہیں، دوسری طرف سارے یورپ میں انہیں سسلی کی ایک ٹوٹی مسجد رلاتی ہے درآں حالیکہ بیسویں صدی کا آفاقی انسان میر کے الفاظ میں ان سے کہے جا رہا ہے کہ:-

سر نشینِ رہِ میخانہ ہوں میں کیا جانوں تیری مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

تو مذہب کو سیاست اور اجتماعی زندگی سے الگ کر کے تاریخ نے ملکی قومیت (Nationalism) اور دَورِ سرمایہ داری قائم کیا جس کی ترقی یافتہ صورت ملوکیت (Imperialism) ہے۔ ابھی تک مذہب مندروں، مٹھوں، مسجدوں، خانقاہوں اور گرجوں میں پناہ گزین تھا اور کچھ لوگوں کے دلوں میں بھی پناہ گزین ہے لیکن جو طبقوی نظام اب تک قائم رہا اس جنگ میں اسی نظام کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز آ رہی ہے اہل مذہب یہ خواب خرگوش دیکھ رہے ہیں کہ سیٹھ جی ہٹیں تو گدی پر ہم آ براجیں، پھر رام راج قائم ہو، خلافت اور امامت قائم ہو، پوپوں اور پادریوں کا راج قائم ہو۔ مگر یہ سب ہے حماقت۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سچ مچ ایسا ہوگا؟ لیکن آج دنیا کی نگاہیں کن پر پڑ رہی ہیں، لامذہب سائنس کے

علمبردار اشتراکیوں پر۔

ہمیں پر اب نگاہِ مضطرب اٹھتی ہے عالم کی   کہ اس بے چین دنیا کے لئے دارالاماں ہم ہیں

اور یہی اشتراکی دنیا کی روایات اور اس کے کلچر کے امانت دار ثابت ہوں گے۔ ہمارے آباء اجداد جو اس دنیا میں اب نہیں ہیں اُن کی وراثت بھی اب اشتراکیوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ غیر اشتراکی مردہ ہو چکے ہیں۔ مذاہب عالم نے جو خدمتیں انجام دی ہیں، اُن کی تعلیم میں جو کارآمد حصے ہیں اس کی حفاظت بھی اشتراکیوں ہی کے ہاتھوں ہو سکے گی۔

جو خود مُردہ ہیں وہ مُردوں کے وارث ہو نہیں سکتے   نئی دنیا میں ناموس سلف کے پاسباں ہم ہیں

آپ ہی سوچیں کہ سائینس و فلسفہ میں، علم و ادب میں، صحافت میں، زندگی کے ہر شعبے میں، سیاست میں، تدبر میں، نیا نظام بنانے میں، بیدار مغزی اور روشن خیالی میں، دورِ حاضر کی رہبری میں، دورِ مستقبل کی پیشوائی میں، دنیا کے ہر ملک ہر حصے میں آج جو لوگ پیش پیش ہیں کیا وہ لوگ مذہب کو کوئی بھی اہمیت دے رہے ہیں۔ کیا یہ لوگ صوفیائے کرام ہیں، علماء ہیں "ترجمانِ حقیقت" قسم کے آدمی ہیں، مذہبی ملت کے حامی ہیں، یا ان اسلامزم یا عیسائیت کے حامی ہیں، سرمایہ داری کے حامی ہیں، ملوکیت کے حامی ہیں، ملکی اقتدار کے حامی ہیں؟ دنیا بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اور بہت سخت منزلوں سے گزر رہی ہے۔

اب گذرتا ہے وہاں سے زندگی کا کارواں   موت کی بھی جن فضاؤں سے نکل آئے زباں

اقبال کا یہ کہنا جھوٹ اور بالکل جھوٹ تھا کہ موجودہ تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ موجودہ تہذیب اس جنگ میں خودکشی نہیں کر رہی ہے بلکہ نیا جنم لے رہی ہے۔ یہ نشوونما کا کرب ہے (Growing pain) ہے۔ اور یہ اگاؤ اشتراکیت کی آتی ہوئی بہار کی بشارت دے رہی ہے۔ کیا آج کسی ملک میں کمیونسٹ پارٹی سے زیادہ زندہ کوئی اور پارٹی ہے، کسی اور پارٹی کے پاس خیر و برکت کا وہ پیغام اور پروگرام ہے، یا کوئی بھی اور پارٹی زندگی کا وہ ثبوت دے رہی ہے جو کمیونسٹ پارٹی دے رہی ہے۔ اب مذہب میں اور اہلِ مذہب میں، قومیت اور ملوکیت اور سرمایہ داری کے نظریے اور اصولوں میں وہ زندگی وہ تازگی باقی نہیں رہی جس کا روشن ثبوت کمیونسٹ پارٹی دے رہی ہے۔ آج یہی پارٹی انسانیت کے سب سے زیادہ احساس سب سے زیادہ حساس رگ ہے۔

کیا اپنے اہلِ وطن کو ان باتوں کی طرف توجہ دلا کر میں نے کسی کی دلشکنی کی ہے؟ کیا اپنے اہلِ وطن کی خدمت کے نام سے میں انھیں ایسی مہلک رائے دوں کہ وہ ہندوستان کے آئندہ نظام کی اساس مذہب پر رکھیں؟ ایسی اگر ہم گمراہ رائے دینا مجھے نہیں آتا۔ میں اس کی موافقت میں نہیں جہاں کا اہلِ مذہب پر ظلم ڈھائے

جائیں یا اُن ظلموں کا انتقام لیا جائے جو اہل مذہب نے لامذہبوں پر کئے ہیں۔ مگر نظام عالم سیاست اور حکومت کی باگ ڈور، دنیا کے ہر شعبے کے انتظام کے اختیارات نہ ہیں اہل مذہب کو دینے کے لئے تیار ہوں نہ انھیں جو مذہبی عقائد کی بنا پر انسانوں میں فساد و تفریق اور ملت کے نام پر مختلف مذہب والوں کو ایک دوسرے الگ تھلگ ہو کر رقیبانہ نظاموں کے قائم کرنے کی دُھن میں ہیں۔ اب دنیا بھر کی تہذیب و تمدن اور اخلاقیات ایک ہوں گے اور سیاست بھی۔ یہ ناممکن ہے کہ ہم کسی خاص عقیدہ والوں کو اپنی ملت کا آدمی سمجھیں اور دوسروں کو غیر یا اجنبی۔ یہ تہذیب نہیں ہوگی بربریت ہوگی۔ محدود طبقوں اور ملتوں سے ناتا توڑ کر عالمگیر انسانیت سے ناتا جوڑنا تکلیف دہ ضرور ہے لیکن جو جنگ آج دنیا میں ہو رہی ہے ویسی ہی جنگ ہمارے دلوں میں بھی ہونا ناگزیر ہے اس جنگ کا ایک روحانی اور اخلاقی پہلو بھی ہے جو اس جنگ کی خارجی تکلیفوں سے کم تکلیف دہ نہیں۔

مٹا ہے کوئی عقیدہ تو خون تھوکا ہے نئے خیال کی تکلیف اُٹھی ہے مشکل سے

نئے خیال کی تکلیف! الاماں، کہ حیات تمام زخم نہاں ہے، تمام نشتر ہے

اب شاید آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جہاں تک ذاتی خیالات کا تعلق ہے میں نے مذہب پر کوئی حملہ نہیں کیا تھا۔ صرف اس خیال پر حملہ کیا تھا کہ مذہب کی بنا پر انسانوں یا انسانیت کے کسی حصہ کو منظم ہونا چاہیئے یا مذہبی عقائد کی بنا پر الگ الگ ملتیں قائم رکھی جائیں یا مذہبی احکام و عقائد کو سیاست میں جگہ دی جائے یا اہل مذہب کو بنا نظام قائم کرنے کا اختیار دیا جائے۔ اور یہ عمل دنیا میں صدیوں سے جاری ہے ہر مذہب کی تاریخ اس کی شاہد ہے ترکستان میں یہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان میں بھی ایسا کیوں نہ ہو؟ دنیا میں ایک عالمگیر خیر و برکت سے بھرپور نظام قائم ہو کر رہے گا اور یہ بہت جلد ہوگا۔ تاریخ اس کا انتظار نہیں کرے گی کہ پہلے سب لوگ مسلمان یا عیسائی یا ہندو ہو جائیں۔ پھر عالمگیر نظام قائم ہو۔ مذاہب نیم مردہ حالت میں کچھ دنوں قائم رہیں گے لیکن لامذہب کمیونسٹ پارٹی اپنے اختیار سے اور اپنے جس بھرے ہاتھوں سے دنیا بھر میں ایک نظام قائم کر دیگی۔

نیاز کیش
فراق گورکھپوری

تصحیح

زمانہ" یادگار نمبر بابت ماہ فروری و مارچ ۱۹۳۳ء میں کتابت کی حسب ذیل غلطیاں رہ گئی ہیں، ناظرین ان کی صحت فرمالیں:۔

صفحہ ۳۴ سطر ۱۲ پر "دددو" کے بجائے "ذردد" ہوگیا ہے

صفحہ ۸۵ میں ذوالقعۃ الموت" کے عنوان کے ماتحت صاحب مضمون کا نام حضرت ابرؔ احسنی" کے بجائے ابرار حسنی" چھپ گیا ہے۔

صفحہ ۱۰۱ سطر ۱۰ میں بجائے "صفو" کے "صفت" ہونا چاہیئے۔

تنقید کتب

بھُوت (ڈرامہ) مصنفہ مسٹر مظہر عزیز، ایم۔ اے، پی۔ سی۔ ایس۔

اُردو میں اچھے ڈراموں کا فقدان ہے، بلکہ اگر زیادہ وسیع نظر سے دیکھا جائے تو سنسکرت کے شہرہ آفاق ڈراموں کے بعد اس ملک میں یہ فن کس مپرسی میں پڑ گیا ہے۔ اب سے کچھ ہی زمانہ پہلے ڈرامہ کے نام سے جو شے پبلک کے سامنے پیش کی جاتی تھی وہ حقیقت سے کوسوں دور اور عمل (Action) سے بالکل خالی ہوتی تھی اور دراصل اوپرا کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ البتہ اس طرف بنگال میں اسٹیج کے revival کے ساتھ ساتھ اس صنفِ سخن میں بھی ترقی ہوئی، تاہم مغرب کے مقابلہ میں ابھی ہم طفلِ مکتب ہیں۔ ان حالات میں بہترین یورپین ڈراموں کے ترجمے ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہو سکتے ہیں۔ ڈرامہ نویس کو دیگر اہلِ قلم پر یہ فوقیت ہوتی ہے کہ اس کے کردار صحیح معنوں میں جیتے جاگتے ہوتے ہیں اور وہ ہمارے محسوسات پر زیادہ کاری ضرب لگا سکتا ہے۔ ہنرک ابسن یورپین ڈرامہ کے دورِ جدید کا موجد ہے H.C. Menker کے الفاظ میں جس کے تعارف کا ترجمہ شامل کر کے مسٹر مظہر عزیز نے کتاب کا لطف دوبالا کر دیا ہے "ابسن کا ڈرامہ کوئی معمولی اسٹیجی ڈرامہ نہ تھا بلکہ ایک بلائے بے درماں تھا، سکون ملنے کے بجائے اس سے دل و دماغ پر اور زیادہ زور پڑتا تھا ... یہ تماشہ صرف اسٹیج تک محدود نہ تھا بلکہ اسٹیج کو پھلانگ کر تماشائیوں کو بھی محیط کر لیتا تھا، اور اسٹیج کی حدوں کو توڑ پھوڑ کر باہر بھی اپنا طلسمی جال پھیلا دیتا تھا۔

مسٹر مظہر عزیز نے ہنرک ابسن کے مشہور ڈرامہ "Ghost" کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ لائق مصنف نے غیر ملکی پلاٹ کو اس طرح سے یہاں کی سوشل اور سماجی حالت پر چسپاں کر کے اپنی زبان میں اس کو ایسا سمو لیا ہے کہ کہیں سے بھی پڑھنے والا محسوس نہیں کر سکتا کہ تمثیل طبعزاد نہیں بلکہ ترجمہ ہے۔ اسی طرح ڈرامہ کا پس منظر اور مکالمے خالص ہندوستانی ہیں۔ جوزف، بجینا اور پادری سینڈرز کی گفتگو سے ان کی تعلیمی اور سوشل فرق بخوبی روشن ہو جاتا ہے، جو لائق مترجم کا مقصد ہے۔ پسماندہ اقوام کی کثیر تعداد نے دینِ مسیحی قبول کیا ہے لہٰذا جوزف داس کی شخصیت عین حقیقت کے مطابق local colour لئے ہوئے ہے۔ مسٹر مظہر عزیز نے ترجمہ کی صبر آزما مشکلات کو اس خوبی سے حل کیا ہے کہ پڑھنے والے کو کتاب میں زندگی کی دھڑکن محسوس ہوتی ہے۔ ڈرامہ کے آغاز میں H.C. Menken کے تعارف سے جو اُردو میں ایک نئی چیز ہے، یہ تعارف اس تمثیل کے صحیح appreciation کیلئے ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ مالی بعض تصانیف کیلئے اسکا انٹروڈکشن۔ یہ چھپتی جاگتی کتاب جلد میں اُردو اکیڈیمی لاہور سے مل سکتی ہے۔

THE ZAMANA Regd. No.

زمانہ

بیادگار منشی دیا نرائن صاحب نگم

نمبر ۵	مئی سنہ ۱۹۴۳ء	جلد ۱

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

بچوں کے امراض کا بہترین علاج

آر۔ کے کیمیکل ورکس کا تیار کردہ

हरा भरा ہرا بھرا हरा भरा

بچوں کے سوکھا مرض کا سو فیصدی کامیاب علاج

"ہرا بھرا" بچوں کو موٹا اور تندرست بناتا ہے۔ سردی کی تمام بیماریوں، کھانسی بخار بلغم کے لئے اکسیر ہے۔ تلی اور جگر کی خرابی اور پیٹ کی تمام بیماریوں کو مکمل طور پر رفع کر دیتا ہے اس کے استعمال سے بچوں کے دانت آسانی سے نکل آتے ہیں۔ بچوں کے ہرے پیلے دست کو ٹھیک کرتا ہے اس کا جیسا نام ہے ویسی ہی اسمیں خوبی ہے۔ ایک مرتبہ استعمال کر کے اس کے حیرت انگیز فائدوں کے آپ قائل ہو جائیں گے قیمت فی شیشی ایک روپیہ عہ

تھوک خریدار نمونہ مفت طلب کریں

ہر جگہ ہر دوکان پر ملتا ہے

ہرا بھرا تیل

हरा भरा तेल

یہ تیل سوکھا روگ کی اچوک دوا ہے۔ اس تیل کی مالش کرنے سے سوکھا روگ دفع ہو جاتا ہے۔ بچہ تندرست ہو کر نئے جیون میں قدم رکھتا ہے۔ اگر آپ کے بچے کو کوئی روگ نہیں ہے تب بھی آپ اس ہرا بھرا تیل کی مالش ضرور کروائیں [illegible] کیجئے۔ جیسا اس کا نام ہے ویسا ہی فائدہ ہے۔ گورنمنٹ سے رجسٹری [illegible] قیمت فی تولہ ایک روپیہ عہ

ہر جگہ ہر [illegible]

آر۔ کے کیمیکل ورکس

زمانہ

جلد ۸۰ — مئی ۱۹۴۲ء — نمبر ۵

فلسفۂ صداقت

طبیعیات اور مابعد الطبیعیات

(منتصد ولی الرحمٰن ایم۔ اے۔ جامعۂ عثمانیہ)

جو چیزیں سادہ اور خالص سمجھی جاتی تھیں وہ طبیعیات کی روز افزوں ترقی کی بدولت برابر مرکب ثابت ہو رہی ہیں۔ ہائڈروجن کا ذرہ[ـه] مدت سے سادہ اور خالص ہونے کی مثالی حد سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب شبہ ہے کہ وہ سلسلۂ عناصر کی سب سے آخری کڑی نہیں ہے۔ پہلے اس کو بلا ساخت اور بے شکل مادہ متصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ برقی اجزا کا ایسا مخصوص و منفرد نظام ثابت کیا ہے جو اپنے غالباً عارضی توازن کو باقی رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کو نظامِ شمسی کے مشابہ کہا جا سکتا ہے۔ بسیط چیزوں کی ترکیب کو معلوم کرنے کا یہی میلان فلسفے میں بھی نمایاں ہو رہا ہے۔ ہم اپنے سادہ اور معمولی خیالات و افکار کو جس قدر علحدہ علحدہ کرتے ہیں اسی قدر زیادہ باریک اور گہرے سوالات ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں۔ اس بات کا خیال ہی کس قدر ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ صداقت جیسی معمولی اور مبتذل یا اتنا وہ چیز کیا ہے۔ لیکن اگر اس کے معنوں کی تعریف و وضاحت کی کوشش کی جائے تو بہت سی خلافِ اُمید مشکلات اور صداقت کی ماہیت کی فلسفیانہ توضیح میں کتنے مختلف اور ایک دوسرے کی ضد اُصول روشنی میں آتے ہیں۔ آجکل جو وسیع اختلاف اس مسئلے کے متعلق فلسفیوں میں ہے وہ سب اسی کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے ہم کسی خاص ضرورت کی وجہ سے حل کرنے پر مجبور نہیں اور جو شخص کہ اس کی دلچسپی سے بے خبر ہے۔ اس کے لئے لازمی نہیں کہ وہ خواہ مخواہ اس پر اپنا وقت خراب کرے اور دماغ کھپائے۔ ہم اپنی زبان اس زبان کی صرف و نحو کی واقفیت سے بہت قبل بولنا شروع کر دیتے ہیں اسی طرح ہم نے منطق پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو، ہمارا استدلال صحیح ہی ہوتا ہے۔

اس علم کو بعض اوقات "منطق صوری" بھی کہتے ہیں۔ ابھی بہت زمانہ نہیں گزرا کہ اس میں وہ اُصول بیان ہوتے تھے جن کے ماتحت ہم بحث کرتے تھے اور ان قواعد کی توضیح کی جاتی تھی جو ان اصول پر مبنی ہیں۔ اور جن پر عمل کرنے سے صداقت

ـه Equilibrium. of Atom.

حاصل ہوتی تھی، اور غلط رائے یا غلطی سے بچا جاتا تھا۔ "صوری" اس کو اس وجہ سے کہتے تھے کہ اس میں موضوع استدلال سے کچھ سروکار نہ ہوتا تھا، اس میں صرف اُس صورت پر بحث ہوتی تھی جو اس استدلال کی ہونی چاہئیے، اس طرح کا جو صوری علم صدیوں مسلم و مقبول رہا، وہ نہایت آسانی کے ساتھ ایک چھوٹے سے رسالہ میں پورے کا پورا بیان ہو سکتا تھا لیکن جدید فلسفے کی ترقی سے اس میں ایک غیر معمولی تغیر ہوا۔ اب حال یہ ہے کہ جو شخص ان تمام مسائل پر عبور حاصل کرنا چاہتا ہے جو منطقی اعمال کے مسئلے کے گرد مرکوز ہیں، اس کو ان تمام رسائل کے ایک پورے کتب خانے کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، جو مخصوص موضوعات پر تصنیف کئے گئے ہیں، اور ان تمام بحثوں میں شریک ہونا پڑتا ہے جو پورے کے پورے فلسفے پر حاوی ہیں۔ صداقت کا مخصوص مسئلہ بالکل جدید مسئلہ ہے اور فلسفی مصنفین کی موجودہ نسل میں پیدا ہوا ہے، یہی آجکل غالباً سب سے بڑا موضوع ہے جس پر فلسفی غور کر رہے ہیں۔ لیکن یہ خیال رکھنا چاہئیے کہ اگرچہ یہ مسئلہ گذشتہ چند برسوں سے زیر بحث ہے تاہم یہ بالکل نیا نہیں، ایک لحاظ سے یہ خود فلسفے کا ہم عمر ہے حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے پانچ سو سال پہلے سقراط سے بھی پہلی نسل میں پروطوغوراس (۴۸۱ - ۴۱۱ ق م) ایک نامور فلسفی گزرا ہے جس نے ایک کتاب "صداقت"[۱] نامی لکھی تھی، لیکن اس زمانے کی عام حالت کے مطابق اس کے مذہبی خیالات ایتھنز والوں کے خیالات سے بہت مختلف تھے، وہ ان کے دیوتاؤں کا مذاق اڑایا کرتا تھا اس کی کوشش یہ تھی کہ "تحریر و تقریر کو ان کے وجود اور عدم وجود سے پاک کردے" اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر الحاد کا الزام لگایا گیا، اور اس کی تمام تصانیف منظر عام پر جلا دی گئیں، خود وہ یا تو شہر بدر کیا گیا یا ایتھنز سے بھاگ جانے پر مجبور ہوا۔ سسلی جاتے ہوئے اس کا جہاز راستے میں ڈوب گیا، اور اس طرح اس کا ستر برس کی عمر میں خاتمہ ہوا۔ افلاطون نے اپنے مکالمے تھی اے ٹی ٹس[۲] میں اس کا خلاصہ بیان کیا ہے۔ یہی خلاصہ اس کتاب کے متعلق ہمارے علم کا ماخذ ہے۔ افلاطون نے بیان کیا ہے کہ پروطوغورس کی تعلیم یہ تھی کہ "انسان تمام اشیاء کا معیار ہے، اس میں ان اشیاء کا وجود بھی شامل ہے جو موجود ہیں اور ان اشیاء کا وجود بھی جو غیر موجود ہیں۔" سقراط تھی اے ٹی ٹس کو مخاطب کر کے سوال کرتا ہے "کیا تم نے اس کو پڑھا ہے؟" تھی اے ٹی ٹس جواب دیتا ہے "ہاں بار بار پڑھا ہے" افلاطون پروطوغورس کے اس عقیدے کا مخالف تھا۔ اس کے نزدیک اس عقیدے کے مطابق صداقت کے لحاظ سے دیوتا، انسان اور مینڈک سب برابر ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ اس نے اس عقیدے سے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر انسان ہی تمام اشیاء کا معیار ہے تو ہر شخص کی رائے خود اس کے لئے صحیح ہے اس کے مقابلے میں افلاطون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کسی خالص خارجی[۳] حقیقت کا نظر آنا ہی اس کی صداقت ہے۔

یہی مسئلہ جس نے پرانے زمانہ کے فلسفیوں کو پریشان رکھا تھا، اب پھر فلسفیوں کی دلچسپی کا مرکز بنا ہے۔ اس بحث کا فیصلہ کرنا اس مضمون کا مقصد نہیں۔ یہ گویا ان حضرات کا رہنما ہے جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کس مسئلہ نے آجکل کے فلسفیوں کو عملیت[۴] اور عقلیت کے متضاد گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔

اس مضمون سے ان حضرات کو یقیناً دلچسپی نہ ہوگی جو ان مقررہ تعریفوں اور اٹل اصولوں کے مطالعے کی تکلیف گوارا نہیں

۱؎ The Truth of Protagoras ۲؎ THEAETETUS ۳؎ Objective ۴؎ Pragmatism.

کرنا چاہتے جن پر فلسفہ اور سائنس مبنی ہیں۔ اکثر حضرات طبیعی اور طبعی علوم کے مطالعے میں مصروف ہیں اور اکثر کو (جنھوں نے اپنے آپ کو اجتماعی اور سیاسی علوم کے لئے وقف کر رکھا ہے) اُن مشکل امتیازات وحدبندیوں، عقلی باریک بینیوں اور نفاستوں سے سخت نفرت ہے، جو اُن کے نزدیک منطق اور مابعد الطبیعیات کا خاص موضوع اور گویا کائنات ہیں۔ لیکن سائنس کی طرف رجحان رکھنے والے ذہن کا رویہ معلوم کرنا دشوار نہیں۔ اس کو طبعی علم کے اصول کی شرح کرنے والے ایک مشہور شخص نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ یوں بیان کیا ہے: "انسانی علم کے جو ممکن نتیجے ہو سکتے ہیں ہم ان کو "خطوط وحدانی کے اندر فرض کر سکتے ہیں، اور خطوط وحدانی کے باہر لا" رکھ سکتے ہیں۔ جو مابعد الطبیعیات کے ماہر کا کھیل ہے۔ "خطوط وحدانی اور اُن کے باہر لا" یعنی ان خطوط وحدانی کے مابعد کے نامعلوم اور ناقابل علم امکانات کی ریاضیاتی تمثیل سے کسی قدر صحت کے ساتھ ہمارے موضوع بحث کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یہ تمثیل ایک لاادری کے نقطۂ نظر اور عقیدے کا بیان ہے۔ مابعد الطبیعیات کے ماہر اور اس کے کھلونے کا جو خاکہ اس تمثیل میں پیش کیا گیا ہے اس کو ایک بالکل وہمی چیز ہونے کی وجہ سے سر دست نظر انداز کر سکتے ہیں۔ لاادری کا یہ ناقابل علم لا طبیعیات کا وہ "مابعد" نہیں جس کو مابعد الطبیعیات کا ماہر معلوم کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ طبیعیات کا واحد "مابعد" ہماری سوجھ بوجھ یا تجربہ ہے، اور یہی مابعد الطبیعیات کا موضوع بحث ہے۔ ان خطوط وحدانی کی ماہیت کے متعلق تین عقائد ممکن ہیں (۱) یہ صرف اُس وسعت کا محض تخیل و تصور ہے جہاں تک علم پہونچا ہے یا پہونچ سکتا ہے، ان کو علم سے کوئی قریب کا تعلق نہیں۔ یہ اس علم کی خارجی حد کی تعیین کرتے ہیں۔ یہ حقیقیت کا عقیدہ ہے۔ (۲) تمام علم اپنے تمام مخصوص و منفرد اجزا سے قریبی تعلق رکھتا ہے جن اشیا کو ہم جانتے ہیں وہ ان قائم بالذات واقعات و حادثات کا مجموعہ محض نہیں، جن کو ہم نے معلوم کر لیا ہے۔ جو خطوط وحدانی ہمارے علم پر حاوی ہیں، وہ اس علم کو ایک خاص صورت دیتے ہیں، اور ماتحت چھوٹے اجزا کو کل کے ساتھ ملا کر ایک بسیط اور خالص ادراکی نظام بناتے ہیں۔ یہ تصوریت کا عقیدہ ہے۔ (۳) انسانی علم دراصل انسانی فعلیت اور انسانی ضروریات کے لحاظ سے اضافی ہوتا ہے۔ خطوط وحدانی اس فعلیت کی ہر دم بدلنے والی حدود ہیں، ان کے اندر جو کچھ ہے وہ انسانی مقاصد اور شخصیت کے لئے مناسب ہے اور ان کے باہر جو کچھ ہے وہ ان کے لئے نامناسب ہے، یہ عملیت کا فلسفہ ہے۔

اس تحقیق سے نہ صرف اس ذہن کو جو سائنس کی طرف مائل ہے بلکہ اُس ذہن کو بھی جس کا رجحان اخلاقیات و مذہب کی طرف ہے نفرت نہیں تو کوفت ضرور ہوتی ہے۔ یہ سوال کہ صداقت کیا ہے؟ ہر شخص کے ذہن میں اُن الفاظ کی یاد تازہ کرے گا جو ایک زبردست عالمگیر آفت کے وقت ایک رومن منصف کی زبان سے نکلے تھے۔ پلاطس کے اس سوال کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسے منصف کی تجویز ہے جو اپنے زیر سماعت مقدمے کی اہمیت سے بے پروا تھا۔ یہ گویا اس عقیدے کا اظہار تھا کہ روحانی صداقت کا کوئی انکشاف ایسا نہیں جو انسانی فطرت کیلئے انتہائی اہمیت رکھتا ہو۔ یا پھر کم از کم یہ کوئی "خطا پروف" معیار ایسا نہیں جس سے کہ یہ صداقت معلوم کی جا سکتی ہے۔ صداقت کے اس مخصوص مسئلے پر بحث کرنا اس وقت ہمارا مقصد نہیں۔

Agnostic — Brackets — Sir Ray Lankester.
Pilate — Pragmatism — Idealism — Realism.

لیکن برعکس اس کے بعض ذہن ایسے بھی ہیں جو سائینس کے نظریوں اور اجتماعی، سیاسی اور مذہبی نصب العینوں کی قیمتوں کو محض تسلیم کر لینے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ یہ ان کی جانچ پڑتال بھی کرتے ہیں۔ جن ابتدائی اصول کی یہ ذہن جستجو کیا کرتے ہیں وہ زیادہ عملی ذہنوں کے لئے ایک بے ضرر شغل یا عقل بڑھانے کے بیکار مشغلہ کے ہم معنی ہے لیکن یہ جستجو کرنے والا ذہن انسانی فطرت کی ایک ایسی گہری اور بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے جو ممکن ہے کہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے کبھی پوری نہ ہو سکتی ہو۔ یہ ضرورت عقلی اطمینان اور تشفی کی ضرورت ہے، اور اسی عقلی اطمینان و تشفی کی ماہیت اس وقت ہمارے لئے مسئلہ صداقت ہے۔

صداقت وحقیقت کے مسئلے کے متعلق اس طرح دو عقیدے ہو جاتے ہیں، ایک عقیدہ اُن لوگوں کا ہے جو ہر مسئلے کی جانچ کسی عملی معیار سے کرتے ہیں، اور دوسرا اُن لوگوں کا جو بصیرت یا تفکر کی مدد سے اس پردے کو چاک کرنا چاہتے ہیں جس میں وجود کے معنی چھپے ہوئے ہیں۔ پہلا عقیدہ ایک ماہر سائینس سے مخصوص معلوم ہوتا ہے جس کو یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ حقیقت کا مسئلہ بہت صاف اور سادہ ہے جسے کم عقل سے کم عقل شخص بھی سمجھ سکتا ہے۔ اس کے نزدیک ایک عامی اور بڑے سے بڑے محقق اور عالم کے خیالات وعقائد میں صرف درجے کا فرق ہوتا ہے۔ اگر سائینس کے مطالعہ سے ہم فطرت پر پوری طرح حاوی اور قابض نہیں ہو جاتے تو پھر اس کے جواز کے لئے کسی نہ کسی عذر کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ سائینس ہمارے شعور اور زندگی کو مادی عناصر کی کیمیاوی ترکیب کا نتیجہ ثابت کرتی ہے۔ اس کے برعکس فلسفہ کے نزدیک یہ جبلی اور خلقی احساس ہے کہ کائنات کا مسئلہ عوام کے تجربہ کو اپنا رہنما بنانے والے عامی کیلئے ایک سربستہ راز ہے۔ سائینس کی بڑی سے بڑی تحقیق کے نتائج بھی اس معاملے میں اس کی چنداں مدد نہیں کرتے۔ یا تو مادے میں اس چیز سے زیادہ کوئی اور چیز ہے، جو تین پہلوؤں والے مکان[1] سے گھری ہوئی ہے، یا پھر کائنات کی اُٹھان اور نمود مادے کے علاوہ کسی اور چیز کی رہین منت ہے۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ طبیعی علم کائنات کے سربستہ رازوں کو کھول سکتا ہے، اسکے لئے کائنات یقیناً بہت حقیر چیز ہے۔ اس کائنات کے معنوں کی ایک جھلک دیکھنے کی شدید خواہش ہی فلسفی کو ترغیب دلاتی ہے کہ وہ قوت استدلال کے اُس تفکری رُجحان کی پیروی کر کے اس حقیقی دنیا سے آگے دیکھنے کی کوشش کرے۔ جو اس کی فطرت کے عقلی جزو کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے۔

۲ - ظاہر و حقیقت

اگر غور کیا جائے تو ہماری شعوری زندگی ایک نہ ختم ہونے والا انقلاب ہے۔ شعور کے پہلے لمحے سے لے کر آخری تک کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا جسے گزشتہ لمحے کی تکرار کہا جا سکے۔ پھر بھی زندگی کے لمحوں کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لمحے دراصل سلسلۂ انقلاب کی مربوط کڑیاں ہیں، پھر ان لمحوں کی جو حالت اب تک رہی ہے وہ آئندہ بھی رہیگی یہاں تک کہ موت ہمارے شعور کا خاتمہ کر دیگی۔ اس لحاظ سے شعور اور زندگی بالکل ایک ہی چیز ہیں۔ اگرچہ شعور کے ذکر کے وقت ہمارے ذہن میں انفعالیت کا خیال غالب ہوتا ہے، اور زندگی کے ذکر میں فعلیت کا۔ وقوف اور فعلیت کے مرکب ہونے کی حیثیت سے شعور ایک تکوّن ہے۔ گزشتہ

[1] Three-Dimensional spacial

زمانہ پیچھے چھوٹ نہیں جاتا، یہ حافظے اور یادداشت کی صورت میں ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ مستقبل ایک ایسا سابقاً متعین نظام نہیں جس کو ہم ایک فطری کمزوری کی وجہ سے جان نہیں سکتے یہ دراصل ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ شعوری زندگی ایک مستقل زمانۂ حال ہے، جو ماضی کی مدد سے پیدا ہوتا ہے اور مستقبل کو پیدا کرتا ہے۔

شعور کی یہی حقیقت ہمارا ہر دم بدلنے والا تجربہ ہے لیکن ایک اور حقیقت ایسی معلوم ہوتی ہے جس سے اس کو لازمی تعلق بھی ہے اور جو اس کا مدمقابل بھی ہے۔ یہ مادی یا طبیعی کائنات کی حقیقت ہے۔ طبیعی حقیقت کی دنیا ایک ایسے مادے سے مرکب معلوم ہوتی ہے جو مکان کے ساتھ صورت بدلتا ہے۔ یہ طبیعی دنیا اُن ٹھوس اشیاء سے مرکب نظر آتی ہے جو مادے سے بنائی گئی ہیں طبیعیات کی اصطلاح میں تغیر مادے کی باز ترتیب یا مکان میں تبدیلِ مقام ہے۔

نفسی حقیقت تو براہِ راست ہمارے تجربے میں آتی ہے لیکن طبیعی حقیقت اس طرح ہمارے علم میں نہیں آتی۔ یہ دراصل وہ تاویل و تعبیر ہے، جو ہم اپنے احساسی تجربے کی کرتے ہیں، براہِ راست یا ذاتی تجربہ اپنے معروضات رکھتا ہے، جن کو حسی معطیات[1] کہتے ہیں۔ یہ معروضات وہ ہیں، جن کو ہم اپنی آنکھوں سے واقعۃً دیکھتے ہیں اور جن کو ہم اپنے کانوں سے حقیقتاً سنتے ہیں وغیرہ۔ یہی معروضات طبیعی اشیاء کو فرض یا منتج کرنے کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں طبیعی اشیاء وہ اشیاء ہیں جن کا وجود ہمارے تجربے پر تو موقوف نہیں لیکن ہمارے تجربے کی علت ضرور ہے۔ جس عمل سے کہ ہم باہر کی دنیا کی ماہیت کو اپنے محسوس تجربے کی بنا پر منتج کرتے ہیں وہ منطقی ہے۔ اس میں ادراک، تصور، تفکر یا استدلال شامل ہیں، اسی منطقی عمل کی غایت یا اس کا نصب العین جس کو یہ حاصل کرنا چاہتا ہے، صداقت ہے، مختصراً یوں کہنا چاہیئے کہ "حقیقت کا علم صداقت ہے"۔

ماحصل اس تمام تقریر کا یہ ہے کہ حقیقتیں دو قسم کی ہوتی ہیں: (۱) ہمارے محسوس تجربے کی حقیقت، جو ہمارے تمام سوچ بچار کی جڑ ہے، اور (۲) وہ حقیقت، جس کو ہم اپنے اس بچار سے معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلی حقیقت بلاواسطہ ہے۔ یعنی یہ نفسِ شعوری تجربہ ہے۔ دوسری وہ حقیقت ہے، جس کو ہم واقعہ تجربہ سے پیدا کرتے ہیں اور جس سے ہم اپنے وجود کی علت سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلی حقیقت کو ہم محسوس کہتے ہیں اور دوسری پر تفکر کرتے ہیں۔ اگر بلاواسطہ علم اور بالواسطہ علم یا "استناج" میں محض یقین کے احساس یا یقین کی ماہیت کا فرق ہوتا تب تو یہ امتیاز اس قدر مشکل سے سمجھ میں آنے والا نہ تھا جتنا کہ موجودہ حالت میں ہے۔ تصوریت اور حقیقیت کے نظریات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق فلسفیوں کی رائیں کس قدر مختلف اور علیحدہ علیحدہ ہیں۔ جن چیزوں کو ہم محض منتج کرسکتے ہیں، ان میں سے بعض کا ہم کو اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا کہ اُن کا، جن کو ہم براہِ راست معلوم کرتے ہیں۔ مثلاً ہم اس واقعے میں شبہ نہیں کرسکتے کہ ہمارے علاوہ اور بھی بہت سے انسان ہیں باوجود اس کے ہم کو براہِ راست علم صرف ایک شعور کا ہوسکتا ہے۔ اور وہ خود ہمارا اپنا شعور ہے ہمارا یہ علم کہ ہمارے ذہن کے علاوہ اور ذہن بھی ہیں ایک نتیجہ ہے جو ہم بعض اُن چیزوں کے کردار کے مشاہدے سے نکالتے ہیں جن کا ہم کو بلاواسطہ تجربہ ہوتا ہے۔ یہ استناج

---

[1] Sense data کے Objects

خود ہمارے اپنے شعور کے تجربے کی بنا پر ہوتا ہے۔ پھر جو چیزیں کہ ہم سے بالواسطہ تعلق رکھتی معلوم ہوتی ہیں یعنی وہ چیزیں جن کو ہم دیکھتے ہیں سنتے یا چھوتے ہیں وہ بھی اس چیز میں بہت ہی چھوٹے سے جزو کی صورت میں بلاواسطہ طور پر موجود ہوتی ہیں جس کو ہم اس کی پوری حقیقت کہتے اور سمجھتے ہیں۔ اس چھوٹے سے جزو کے علاوہ باقی سب منتج کیا جاتا ہے۔ ایک معمولی دیکھنے سننے یا چھونے سے ہم ایسی حقیقت کو منتج کر لیتے ہیں جو اس چیز سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جس کا تجربہ ہم کو اس احساس میں ہوتا ہے۔

تجربے پر تشبیہ کرنا فکر کرنا ہے۔ جب ہماری توجہ کسی چیز، مثلاً روشنی کی چمک، یا کسی آواز یا کسی درد کی طرف منعطف ہوتی ہے تو ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں کہ "یہ کیا ہے؟" ایسی حالت میں "یہ" یعنی ایک سادہ محسوس تجربہ، اپنے اندر ایک معنی رکھتا ہے، یا ہمارے لئے ایک پیغام لاتا ہے، اور ہم "کیا" کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ ہم اس وجود کو تو محض "ظاہر" سمجھتے ہیں، اور "حقیقت" کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت کی یہ تلاش، جس کا علم ہم کو اس "ظاہر" سے ہوتا ہے، فکر کا منطقی عمل ہے۔ اس منطقی عمل کی غرض یا اس کا مقصد یہ ہے کہ محسوس تجربے کی بلاواسطہ حقیقت کی جگہ ایک بالواسطہ حقیقت، یعنی اُس حقیقت کو دلوائے جو ہمارے علم میں لائی گئی ہے۔ لہٰذا جونہی کہ ہم فکر کرنا شروع کرتے ہیں، بلاواسطہ طور پر موجود وجود "ظاہر" بن کر ہمارے فکر کے تمام نشو و بروز میں ایک ایسی چیز بن جاتا ہے جو توجیہ کا محتاج ہے۔ ہم اس حقیقت کی تلاش کرتے ہیں جس سے اس کی توجیہ ممکن ہے۔

"ظاہر" و "حقیقت" کے اسی امتیاز میں صداقت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ کسی مخصوص نظریۂ علم پر موقوف نہیں ہوتا اس حد تک تو تصوریت اور حقیقیت میں کوئی اختلاف نہیں۔ تصوریت ایک قائم بالذات حقیقت کے امکان علم سے انکار کر سکتی ہے، حقیقیت اصرار کر سکتی ہے کہ یہ نفس شعور کے اندر موجود ہے۔ ان دونوں میں کوئی سا مسلک بھی صحیح ہو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جو حقیقت کہ تفکر کی مدد سے ذہن میں آتی ہے وہ اس حقیقت سے بالکل مختلف ہوتی ہے، جس کا ہم کو احساس میں بلاواسطہ تجربہ ہوتا ہے۔ اگر ہم فلسفے سے بالکل بے بہرہ بھی ہوں، اگر ہم تمام نظریات علم سے ناواقف ہوں، اور ماہیت علم کے متعلق بالکل وہی عقائد رکھتے ہوں جو ایک عامی کے ہوتے ہیں، تب بھی اس واقعے میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اشیاء کی اصلی حقیقت ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے، اس کو صرف سائنس، یا عملی عقل سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کے متعلق ہمارا علم صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ پہلی صورت میں یہ اصلی معنوں میں علم ہے اور دوسری صورت میں یہ علم نہیں بلکہ رائے ہے، یا پھر غلطی۔

مختصر یہ کہ جس حقیقت کا علم صداقت کہلاتا ہے وہ احساس کی بلاواسطہ حقیقت نہیں۔ بلکہ تفکر کی بالواسطہ حقیقت ہے۔ یہ دعویٰ کہ علم صحیح و صادق ہے، قابل فہم معنی صرف اس وقت رکھ سکتا ہے جب یہ فرض کر لیا جائے کہ علم اور معلومہ حقیقت یا وجود اور معلومہ وجود کا علم دو مختلف چیزیں ہیں۔ بلاواسطہ علم یعنی واقعۃً محسوس شعوری تجربے میں اس قسم کی تمیز نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس علم کی صحت یا غلطی کا دعویٰ کرنا بالکل بے معنی ہے، میرے دانت میں درد اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ مجھے علم نہ ہو جائے کہ میرے دانت

میں درد ہے یعنی دانت کے ایک واقعۃً محسوس درد میں جاننا اور ہونا نہ صرف ناقابلِ علیحدگی بلکہ ناقابلِ تمیز بھی ہیں۔ لیکن اگر میں دانت کے درد کو ایک قائم بالذات نظامِ حقیقت کا جزو سمجھوں تب اس کے متعلق میرا علم صحیح یا غلط ہو سکتا ہے۔ اب میں اس کو کسی عصبے کے ہوا لگ جانے یا اس میں پیپ پڑ جانے کا اثر سمجھتا ہوں، یعنی اب میں اس کو ایک ایسی چیز سمجھتا ہوں جو میرے شعور سے علیحدہ ہو کر بھی پیدا ہو سکتی ہے، اور جو حالات کے بدل جانے کے ساتھ ہی ختم ہو جائیگی۔ اسی طرح جب میں کوئی منظر دیکھتا ہوں تو آسمان کی نیلاہٹ، اور زمین کے مختلف رنگ جن کا مجھے واقعۃً تجربہ ہوتا ہے صحیح یا غلط نہیں ہوتے۔ یہ بلا واسطہ تجربہ ہیں جن میں جاننا ہوتا ہے اور ہونا جاننا۔ صحت و غلطی کا اطلاق اس تجربے کی تاویل و تعبیر یعنی اُس قائم بالذات حقیقت پر ہوتا ہے جس کو میں اس تجربے سے منتج کرتا ہوں۔ اس طرح ہم علم کی دو قسمیں بنا سکتے ہیں: ۔

اول بلا واسطہ اور دوم بالواسطہ، ان کو واقفیت[1] اور بیان[2] کہنا اور بھی بہتر ہوگا۔ اس لحاظ سے جب ہم کہتے ہیں کہ ایک ایک چیز ہے، یا کسی چیز کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ وہ حقیقی ہے، تو ہمارے دو مطلب ہو سکتے ہیں، اول یہ کہ یہ اُس متغیر وجود کا حصہ ہے جس کو ہم واقعتاً محسوس کرتے ہیں اور جس کو ہم شعور یا زندگی کہتے ہیں۔ دوم یہ کہ یہ ایک قائم بالذات نظامِ اشیا کا حصہ ہے جس پر ہم فکر صرف اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ہم اپنے احساس کی ماہیت کی نہیں بلکہ اس کے وجود کی توجیہ کر سکیں۔

ماہیتِ احساس کی توجیہ تو ناممکن ہے۔ ہم محض بیان کی مدد سے بہت سی اشیاء کو جانتے ہیں، جن سے ہم کو حقیقی واقفیت کبھی بھی نہیں ہو سکتی۔ اصلیت یہ ہے کہ اس تمام علم کا یہی حال ہے جو ہماری زندگیوں پر متصرف ہے اور جن سے ہم اس حقیقت کو متصور کرتے ہیں جو ہمارے گردوپیش ہے۔ لیکن ان اشیا کے علم کیلئے ہم اُس حقیقت کے دست نگر ہوتے ہیں جس کا علم ہم کو واقفیت سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر ہمارا بلا واسطہ احساسی تجربہ اور وہ علم جو اس سے حاصل ہوتا ہے ایک عظیم تر اور وسیع تر حقیقت کی واحد شہادت ہی نہیں بلکہ ان کی ضرورت ہمکو اُن الفاظ کے لئے بھی ہوتی ہے جن کی مدد سے ہم اس کو بیان کرتے ہیں، اس صورت کے لئے ہوتی ہے جس میں کہ ہم اس کو پیش کرتے ہیں اور اس مادّے کے لئے ہوتی ہے جس سے ہم اس کو مرکب کرتے ہیں۔ یہی مطالعہ فلسفے کی حقیقی بنیاد ہے اور اسی سے فلسفے کا نقطۂ نظر بالآخر قرار پاتا ہے۔ یہی واقعہ یہی ناقابلِ انکار واقعہ کہ تمام حقیقت یہ کسی قسم کی ہو اور کسی طرح بھی معلوم ہوئی ہو اس کا علم فکر سے ہوا ہو یا احساس سے، اس کا ادراک ہوا ہو یا تصور، یہ یاد کی گئی ہو یا تخیل میں لائی گئی ہو بالآخر احساسی تجربے پر مشتمل ہوتی ہے یہی واقعہ تمام مسائلِ فلسفہ کا سرچشمہ ہے، یہی واقعہ ہے کہ جس کو تسلیم کرنے پر سائنس کے مادیت پرست ماہرین مجبور ہیں خواہ ان کو مابعد الطبیعیات کے طریقوں اور نتیجوں سے کتنی ہی نفرت ہو۔

لہٰذا ماہیتِ صداقت کے مخصوص مسئلے کو اُس حقیقت سے تعلق ہے جس کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ اس علم بیان کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے اور جسکو ہم نے اس شعور کے وجود سے آزاد سمجھا ہے جسکی مدد سے ہمکو اس کا علم ہوتا ہے، اس مہر کی ماہیت و نوعیت کیا ہے جس کے مطابقت کر دینے سے ایک علم صحیح و صادق ہو جاتا ہے؟

---

[1] ACQUAINTANCE. [2] DESCRIPTION

زندگی[۱]

(جنتِ کشمیر کی ایک حسین و جمیل ندی کی کہانی سے متاثر ہو کر)

(حضرت روش صدیقی)

قصرِ کہسار سے اک حور رواں ہوتی ہے
مست و آشفتہ و وارفتہ و بیگانۂ ہوش
مسکراتی ہوئی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
نہ کچھ اندیشۂ فردا نہ خیالِ غمِ دوش

کبھی ہمراہِ نسیمِ سحری لطفِ خرام
شاہدِ ابرِ خراماں سے کبھی دوش بدوش
کبھی ساحل سے گریزاں، کبھی شوقِ ساحل
کہیں بیگانۂ آغوش، کہیں خود آغوش

خامشی مطربِ فطرت کی متانت سے قریں
اور کبھی نغمۂ معصوم ہم آہنگ سروش
کبھی ہر لحہ رفیقانِ سفر سے باتیں
اور کبھی خود ہی کسی بات سے پہروں خاموش

رہبرِ قافلۂ شوق، نگاہِ سرشار
اور خود بے خبرِ شوق ادائے مدہوش
کبھی آنچل کی لطافت میں فروغِ رخسار
کبھی مصروفِ حجاباتِ ردائے گلپوش

---

[۱] یہ نظم ۲۰۔ نومبر ۱۹۴۲ء کو لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہو چکی ہے۔

آپ ہی آپ کبھی تیز روی پر خنداں
اور کبھی تمکنتِ ناز سے تصویرِ خموش
کبھی دامن کشِ احساس، کبھی استغنا
کہیں بیداریِ زاہد، کہیں خوابِ مینوش
روحِ معصومیِ انساں ہے خراماں شاید!
شوخیِ صنعتِ یزداں ہے خراماں شاید!
جب یہ کہسار سے میداں میں پہونچ جاتی ہے
ایک دوشیزۂ معصوم نظر آتی ہے
صبح سینے سے لگاتی ہے، تو ہوتی ہے خفا
شام آغوش میں لیتی ہے تو شرماتی ہے
چہرۂ شوقِ تعارف سے نقاب اُٹھتے ہی
سایۂ سروِ خراماں سے جھجک جاتی ہے
لالہ و گل سے ہے مانوس بہت کچھ، لیکن
چمنستاں سے گذرتے ہوئے کتراتی ہے
چھیڑتی ہے کبھی چھینٹوں سے حسیں کلیوں کو
چپکے چپکے کوئی پیغام سُنا جاتی ہے
کہیں پاتی ہے جو آوارہ نگاہوں کا ہجوم
اجنبی بن کے خموشی سے گذر جاتی ہے
ہو کوئی عالمِ تنہا تو بہ صد جوشِ نوا
ایک ہی گیت بہ اندازِ دگر گاتی ہے
کوئی شورشِ گہ تہذیب اگر ہو نزدیک
چھوڑ کر راہ بہت دور نکل جاتی ہے
روکتی ہے کششِ منظر و ماحول، اگر
دامن افشاں و گریزاں ہی چلی جاتی ہے
جس کی تکمیل نہ ممکن ہو کسی منزل سے

دل میں پنہاں وہ تقاضائے سفر پاتی ہے
دیکھکر جہلم سرشار کو وارفتۂ شوق
اک عجب عالم شاداں میں پہونچ جاتی ہے
آپ ہی آپ قدم سست سے ہوجاتے ہیں
جیسے کونین کو بیزارِ سفر پاتی ہے
رُکتی جاتی ہے جھجکتی ہے، مگر پھر بڑھکر
جنتِ عشرتِ آغوش میں کھو جاتی ہے
منتہا ہے یہی طغیانِ طلب کوشی کا
زندگی نام ہے تسکینِ ہم آغوشی کا

تقابل

(حضرت آثرؔ لکھنوی)

فلک کو ہوں اپنے ستارے مبارک
سمندر کو موتی ہیں پیارے، مبارک
چمن کو گلوں کے اشارے مبارک
محبّت کے مجکو نظارے مبارک

فلک اپنی عظمت پہ نازاں بجا ہے
محبّت مگر اس سے بھی ماورا ہے
ستارے ہوں، موتی ہوں یا ماہ پارے
چمک میرے اشکوں میں ان سے سوا ہے

پھر اک بار دل کو مرے شاد کردے
حریم محبت کو آباد کردے
نہیں ہے یہ ممکن تو یہ تو ہے ممکن
مجھے قیدِ ہستی سے آزاد کردے

مشہوراتِ بے اصل

(منظور الحق کلیم، گورنمنٹ ہائی اسکول غازیپور)

دنیا کے تاریخ کی سیر بھی عجیب دلچسپ ہے مگر اس سے استفادہ ہر ایک کا کام نہیں، بالخصوص ہندوستان کی تاریخ تو انسان کو کسی نتیجے پر پہونچنے ہی نہیں دیتی۔ اس سے کوئی صحیح رائے قائم کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

پتھر اور دھات کے زمانے کو چھوڑیئے آریوں کے زمانے کی بھی کوئی ایسی مستند کتاب نہیں جس سے اُس وقت کے حالات کا صحیح اندازہ ہوسکے۔ صرف آریوں کی مذہبی کتب رگ وید وغیرہ ونیز بعد کی تصنیفات مہابھارت۔ رامائن۔ پران وغیرہ سے جستہ جستہ حالات کا پتہ لگتا ہے۔ اس لئے مورخ کو آریوں کے صحیح حالات جاننے کے لئے انھیں کتابوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اور بے جوڑ غیر مسلسل واقعات سے اصلیت کا اندازہ لگانا پڑتا ہے۔

اس کے بعد کا دور کچھ روشن دور کہا جا سکتا ہے، مگر واقعات کہانیوں کا بھیس بدلکر تاریخی اعتبارات سے اپنی ساکھ کھو چکے ہیں۔ ان پر مذہبی رنگ چڑھا کر کچھ کا کچھ بنا دیا گیا ہے۔

دور سوم اس سے زیادہ روشن دور ہے، اور یہ زمانہ مسلمانوں کی آمد کا ابتدائی زمانہ ہے، جو کچھ سرمایہ اس کے لئے ہم پہونچا ہے مذہبی تعصبات میں غرق ہے۔ ابھی مسلمانوں نے کوئی مستقل حکومت قائم نہیں کی تھی اس لئے اُنھوں نے بھی اس وقت کی کوئی مستند یادگار نہیں چھوڑی۔ ہندوؤں نے جو حالات لکھے ایک رُخی تصویر کھینچی اور اُس کو بھی اتنا مسخ کر دیا کہ صحیح خد و خال کا سمجھنا محال ہوگیا۔ پرتھی راج راسو سے تاریخی تشنہ کامی کچھ دور ہوتی مگر قصیدہ خوانی کے سراب نے تشنہ کام ہی رکھا۔

عرب تاریخ نگاروں نے جو اصول تاریخ نگاری کے پیش کئے تھے اس پر اس روشن زمانے میں جب عمل نہیں تو اُس وقت تو ابتدائی دور تھا اُس کی اُمید ہی بیجا ہے۔

دورِ چہارم میں جبکہ مسلمانوں نے ہند کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اس کا اہتمام کیا مگر یہ دولت حکومت کے ساتھ ساتھ فنا ہوگئی اور اس کی جگہ پر جعلی سکے رائج کردئے گئے، اور اس چیز کو حکومت کے قیام کا آلہ بنا لیا گیا۔ پروپیگنڈے کے طور پر اس کی مختلف صورتیں ظہور میں آئیں۔ بعض انگریزوں نے اصل تصویر کو مسخ کرکے ایک ایسی ملتی جلتی تصویر پیش کی جسے لوگوں نے مشتبہ نگاہوں سے ضرور دیکھا مگر سوائے تسلیم کرلینے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ بعض نے ذرا اور رنگ بدلا اور قابل قبول بنایا۔ اس طرح بدلتے بدلتے رنگ و روغن حتیٰ کہ خد و خال تک بدل ڈالا اور اس کے لئے ہندوستانی جو پیٹ کے بندے تھے آلۂ کار بنے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان بادشاہوں کی تاریخ ایک برائیوں کی فہرست بن کر رہ گئی۔ اس کے غلط ہونے

کا شبہ اس طرح رفع کر دیا گیا کہ مسلمان جو اس واقعہ میں خود موجود تھا مورخ کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ جب تاریخ کی دنیا ایسی تاریک ہو تو کوئی صحیح رائے کیا قائم کر سکتا ہے۔

موجودہ دور ایسا ہے کہ تاریخ سے صحیح حال جاننے کے بجائے اسکا جانچنا ہی کمال ہے کہ تاریخ کہاں تک غلطیوں کا طومار ہے یہ کام بھی ایسا نہیں اس کے لئے ہمیں انھیں کی تحریروں سے ان کی غلطیاں نکالنی ہونگی۔ یا دوسرے مورخ کے بیان کو سامنے لا کر ان کی تردید کرنی ہوگی۔ اگر یہ کام بھی ہو جائے تو ایک بڑی بھاری خدمت ہے کیونکہ منافرت کی خلیج جو روز بروز وسیع ہوتی جاتی ہے کمی کی طرف مائل ہوگی۔

اتنی فرصت اور اتنا مواد کہاں کہ کل تاریخ پر ایسی روشنی ڈالی جائے، ہم چند واقعات مشہورات بے اصل کے عنوان سے پیش کر کے معاصرین کو ادھر مائل کر دیتے ہیں، اگر انھوں نے ادھر توجہ کی تو ایک بڑا کام ہو جائیگا۔

اس وقت زیر مطالعہ ایک قلمی تاریخ حدیقۃ الاقالیم ہے، مصنف نے اس کتاب میں حسب ذیل کتابوں کے حوالے دیے ہیں صبح صادق۔ ہفت اقلیم۔ تاریخ فرشتہ۔ مرآۃ الاسرار۔ تاریخ حکما۔ یہ کتاب مولوی محفوظ علی صاحب رئیس کگرا شہرستا بھاینور کے کتب خانہ میں ہے۔ سائز ۱۳×۹ ہے جو ۱۰۶۷ صفحات پر مشتمل ہے کاغذ بانس کا ہے ابھی تک یہ کتاب محفوظ حالت میں ہے۔ ذیل کے اقتباس سے مصنف، وجہ تصنیف اور معاون تصنیف کا پتہ چل جاویگا۔ کتاب ہذا پر مہر کا سجع یہ ہے "محسن الدولہ ذوالفقار جنگ مرزا محمود علی خاں بہادر جنگ مولوی الحسینی ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء۔ ان کے اکثر نوٹ حاشیہ پر ہیں جو ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۱ء کے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۴۷ھ میں یہ کتاب اُن کے مطالعہ میں تھی

"اما بعد محرر ایں اوراق عاصی مرتضیٰ حسین المخاطب اللہ یار عثمانی بلگرامی بر نظر اصحاب بصیرت جلوہ میدہد کہ از عمر دہ سالگی مطابق یک ہزار و یکصد و چہل و دو ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (۱۱۴۲ھ) تا بہ سن پنجاہ و پنج موافق ایک ہزار و یکصد و ہشتاد و ہفت ہجری (۱۱۸۷ھ) از عہد وزارت تاج و تخت صاحبقران امیر تیمور گورگان محمد شاہ بادشاہ صاحبقران ثانی خدایگان مغفور تا وسط سلطنت اید مدت عالی گہر بادشاہ المخاطب بہ شاہ عالم بادشاہ ثانی خلد اللہ ملکہ در خدمت بسیاری از امرا اہل ہند مثل امیر اعظم عظیم الشان مبارز الملک دلاور جنگ سید سربلند خاں تونی مرحوم کہ بوسیلہ اش بمنصب بادشاہی رسیدہ و دیگر امیر کبیر قاطع الکفرہ والمرتدین برہان الملک سید سعادت خاں بہادر نیشاپوری و امادش امیر با تدبیر صفدر رونق وزیر الملک صفدر جنگ و امیر عالی جاہ میر محمد قاسم خاں بہادر ناظم بنگالہ و عظیم آباد پٹنہ و امیر سخنداں شیریں بیان علی قلی خاں بہادر عباسی شش انگشتے داغستانی و شیر بیشہ ہیجا امیر الامرا بخشی الملک احمد خاں بہادر ابن غضنفر جنگ محمد خاں بنگش فرخ آبادی نور اللہ مرقدہم وغیرہ بصیغہ نوکری و خدمات عمدہ حضوری بسر بردہ و چند سال از نیرنگی زمانہ خانہ نشین شدہ بود سن پنجاہ و ہفت سالگی مطابق ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۶۷ء یکہزار و یکصد و نود ہجری در آخر جمادی .... دوستے بے ریو و رنگ رجب علی نامی ساکن پارہ در خدمت صاحب افضال

فرنگ مسمّی بہ مسٹر والاصفات مجمع حسنات کپتان جوناتھان اسکاٹ (جان اسکاٹ) انگریز المخاطب بہ جلال الدولہ مفاخر الملک زاد اللہ اقبالہٗ کہ ترجمہ نام شریفش اللہ بخش باشد و اسکاٹ نام جدا بقبلہ است .... مشرف می شد و در زمرۂ منشیان کہ ایں وقت در سرکار صاحبان انگریز امتیاز مردم نجیبا ازیں بالاتر نیست بہ بعد قدرشناسی و معرفت دانش ایشاں را مصاحب و ندیم مجلس خویش می گردانند منسلک گردید. و صاحبان انگریز کہ از راہ فطانت و دانائی طالب علم و ہنر اند صاحب ما دریں باب بفہمے ذکا و فطانتے رسا میدارد و در مطالعۂ کتب در عذرہ عربی و فارسی و شنیدن حکایات غریب و عجیب و سخنان حکمت و احوال اسلاف و نوے تمام دارد بنا بر ضیا فت طبع عالی در عہد وارث وزیر ابن الوزیر ابن الوزیر آصف جاہ وزیر الممالک آصف الدولہ یحییٰ خاں بہادر ابن شجاع الدولہ طال اللہ تعالیٰ عمرہٗ و اقبالہٗ نسخے چند از کتب معتبرہ کہ نامہائے آں در ضمن کتاب اکثر جا مرقوم است ...... اقتباسے شائستہ کردہ در سلک تحریر کشید و بحدیقۃ الاقالیم موسوم گردانید. ...... اما مقبول آن گاہ شود کہ بقبول نظر عالیش گردد. اگر دانایان و سخن سنجان انگریز بدقت و محنت مؤلف در پیرایہ ساتی بچشم بیش نظر فرمایند از سر انصاف در سر زمانہ و اوقات بحال مؤلف و اولاد و زناش بہ امداد و مراعات از بیش خود و سرکار کمپنی و سلطان الوقت تا بہ ابد الآباد دور فلک بکام باد بر دارند عجب نبود۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ پتہ آسانی سے چل جاتا ہے کہ یہ ضخیم کتاب انگریز صاحبان کی خوشنودیِ مزاج کے لئے لکھی گئی، اور اس کو اپنی اور اپنے اولاد کی پرورش کا ذریعہ بنایا۔ نتیجتاً اس سے یہ بھی واضح ہو جائیگا کہ ہر وہ واقعات جو انگریزوں کے حریفوں کے از قسم مظالم ہونگے روشن طریقے پر پیش کئے جائیں گے اور انگریزوں کی شکست یا دست درازیاں حجاب خفا میں رکھنے کی کوشش کیجائیگی۔ اس کے ثبوت میں ملاحظہ ہو:۔

ایں اول تالیف است الفن سیر کہ در ہندوستان بزبان فرس بیروں از الفاظ اخلاق در عہد سلطنت انگریز مشتمل بر اکثر احوال آں گروہ پر شکوہ آنچہ از کتب بدست آوردہ و بتدبیرے از مسٹر والاصفات جوناتھان اسکاٹ (مسٹر جان اسکاٹ) اصغا نمودہ و بہمراہی ایں جماعۃ بمشاہدہ درآمدہ دریں نسخہ مرقوم ساختہ و بعضے رمز و اشارہ کہ در عین بدو دولت گردہ موصوف از عالم غیب (نشہ کی حالت میں) بے قصد خواہش از معاملات مشاہدہ رفتہ اطلاع برقیم آں طولانی دارد و اصل اصولش ایں فقرہ است صعود فن سیر ہمہ تیز و تند است تفصیلش سربستہ بہتر در پس پردہ گوشہا باشد

خط کشیدہ جملے سے اس کا پتہ چل جاتا ہے کہ صحیح حالات اس خوف سے کہ نقصان نہ پہنچے ظاہر نہیں کئے گئے۔ یہ بھی مؤلف کی ہمت ہے کہ اس مختصر اشارے سے لوگوں کو متنبہ کر دیا کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی غرض و غایت تاریخ نویسی نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔

اس احتیاط پر جو مزید احتیاط کی گئی اُسے بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

"پوشیدہ نماند کہ ایں کتاب ہنوز مسودہ نادرست بود کہ از انجملہ پیش صاحب والاشان جونا تھان اسکاٹ وکرنیل بولبرڈ و دیگر در چونپور و نیز مولوی درویش علی بعد ازاں تمام کتاب را بنظر ثانی کم و کاست کردہ بدستخط خویش مرقوم ساختہ"

مذکورہ بالا اقتباس سے اِس احتیاط کا پتہ چل جاتا ہے کہ باوجودیکہ اپنے میر منشی سے تاریخ مرتب کرائی گئی پھر بھی خود ایک نظر دیکھ لینا اور مزید احتیاط کے لئے مولوی درویش علی صاحب کی نظر سے گذرنا بھی ضروری سمجھا گیا۔ اس سے یہ بھی روشن ہوتا ہے کہ اس پروپیگنڈے میں بہت سے غریب مولوی پیٹ پوجا کے لئے شریک تھے۔

اب مذکورہ بالا روشنی میں ذیل کے اقتباس پر نظر ڈالئے:-

(اقلیم دوم احوال حیدر نایک صفحہ ۵۲ اول) ہم دریں اثنا ملک میسور بتصرف حیدر علی مشہور بحیدر نایک در آمد وابتدائے احوال حیدر نایک آنست کہ پدرش فتح نایک سرہنگے کم مایہ از دہاقین بیجاپور بود نایک در اصطلاح آن دیار قومیست از ارا ذل ترین مسلمان کہ جاہل باشند و بیشتر ازیں آں جماعہ پیوستہ پیادگی اختیار دارند۔ بالجملہ فتح نایک مدتے ملازم سعادت اللہ خاں ناظم ارکاٹ بود بعد انقضائے دولتش در کولار توطن گزیدہ بتلاش روزگار بادہ پسر خود شاہباز وحیدر علی برآمدہ در سرداران ملازم راجہ نندراج زمیندار میسور شد بعد چندے جمعدار سہ صد پیادہ گشت و پس از چند سال درگذشت پسر کلانش شہباز بجائے پدر نشست۔ حیدر نایک حسد بردہ از برادر جدا شدہ ملازم مرتضیٰ خاں جاگیردار دیلور شدہ وچوں شہباز نایک درگذشت حیدر نایک بطمع رعایت مورد ثی سرنگ پٹن آمد راجہ آنجا نظر بحقوق پدر و برادرش کردہ از معتمداں خاص خویش گردانید ہنگامیکہ در ۱۱۶۶ھ دیوان کلاجور بہ نیابت راجہ میسور و ترچناپلی بکمک محمد علی خاں ابن انورالدین خاں گوپامئوی آمدہ بود وحیدر نایک ہمراہ دیوان بود چوں دیوان موصوف از ترچناپلی مراجعت سرنگ پٹن نمود مردم سپاہ بنا بر تنخواہ شورش کردند حیدر نایک کہ آں وقت سردار ہزار سپاہ بود قضیہ سپاہ را بصفی تنخواہ انفصال داد از آں روز اعتبارش افزوں تر گشت حیدر نایک مردم سپاہ را با خود متفق ساختہ دقت فرصت دیوان ملکہ جورے را بگرفت وحبس کرد و راجہ را بطریق نظر بند بر مسند ریاست گزاشت و در اندک بر تمامی خزاین و دفائن راجہ متصرف شد و بتالیف قلوب سپاہ و رعایا پرداخت و در اندک ایام در حشمت و جوانمردی شہرۂ آفاق گشت اما صفاتش را کسانیکہ ہمراہ او بودند می نویسند حیدر نایک مردیست اُمی ترش رو ستیزہ خو۔ بظاہر مسلمان میل بہ نماز و روزہ ندارد"۔

اقتباس بالا میں اور اس کے نسب پر حملہ کرکے رذیل ثابت کیا پھر کار اور بظاہر مسلمان مگر نماز روزہ سے الگ بتایا، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ سمجھ میں نہیں آتا کہ سپاہ و رعایا اس سے کیوں خوش تھی اور تھوڑے ہی زمانہ میں حشمت جوانمردی میں شہرۂ آفاق کس طرح ہوگیا۔ یہ متضاد باتیں تاریخ کی صحت کی دلیل ہیں، یہیں تک نہیں آگے مؤلف کے اس جملہ "بتالیف قلوب سپاہ و رعایا پرداخت و در اندک ایام در حشمت و جوانمردی شہرۂ آفاق گشت"۔ کا مزید ثبوت متضاد صورت میں ملاحظہ ہو:-

"جنوبی سرنگاپٹن مملکت وسیع بہ غایت آباد فرمانروائے آنجا زنے است ملقب بہ کسی رانی در ممالکت بتخانہ ایست کلاں و افضل ترین نذر آں بت بینی مردان است کہ بریدہ آنجا نیاز میکنند چنانچہ جلادان از طرف رانی مامور ایں کار اند تا از دارو وصادر وباشندہ آنجا بینی ما بقدر معین بدعا و فریب حاصل کردہ داخل سرکار میکنند و در عوض آں انعام وافر ارزانی می گیرند۔"

حیدر نایک با رانی آنجا اتحادے بہم سانید و مشارکت و معاونت او با دائے شرائط معہود سبب بہبود خود دانست عالمے را مقطوع الانف گردانید چہ او کفارہ ہر گناہ بینی بریدن قرار دادہ و قتے لشکریانش از تکلیف مالا یطاق تنگ آمدہ راہ فرار گرفتند و گرفتار شدہ بخدمتش آمدند بینی ہائے ایشاں راکمسر بریدن فرمودہ رسالہ بینی بریدگان علاحدہ قائم نمود۔"

اس اقتباس سے اس کی شجاعت پر کیا اچھی روشنی پڑتی ہے تعجب ہے کہ جب کمپنی کی فوج کو شکست دی تو سب کی ناک کاٹ کر کیوں نہیں چڑھا دی یہیں تک دل کا بخار نہیں نکلتا، آگے ملاحظہ ہو۔

"شراب نوشی بنہایت رواج داد و فحش و زنا را از جملہ سیئہ ضروری انگاشت و رسم نکاح از میان برداشت و دختر زنان شریف و رذیل را بظلم گرفتہ ازالہ بکارت می کرد۔"

ان اوصاف کو دیکھئے اور مؤلف کے اس جملہ کو پڑھئے "بتالیف قلوب سپاہ و رعایا پرداخت الخ" کیا ایسے افعال قبیحہ تالیف قلوب کا سبب بن سکتے ہیں، ایسے زانی کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اعتدال مزاجش آں چنانکہ سنین عمرش ہفتاد درگزشتہ بود در ہیچ قوی فتورے نبود"

کثرت زنا کو ملاحظہ فرمائیے اس کے بعد اس کے قویٰ کی کرامات دیکھئے یہیں پر یہ تصیدہ خوانی ختم نہیں ہوتی آگے فرماتے ہیں

"ستردن موئے بدن حتی ابرو و مژہ ہر روز مقرر داشتہ و دیگر اسیران کہ در رزم بدست می آیند مردان جوان متعینہ بارگیران اصطبل و زنان پاکیزہ تا ازالہ بکارت داخل محل و صبیان حوالہ اتالیق و زمرہ جیلہ ہا واز جملہ عصمیتان رد کردہ او کسانے را کہ گرفتہ سپاہ برگزیند در قسمت ایشاں جبری مقرر کردہ در تنخواہ آنکس وضع میکرد و آنچہ از اسیران کسے نمی گرفت معرفت دلالان فروختہ می نمود و ابکا را بعد ازالہ بکارت با حیلہ ہائے بہم رسن قطع نظر از کفو و نسب و ملت و حرفہ جفت میکرد و مکالمہ و مخالطہ با زنان در خلوت و جلوت نزد آدمے محرمات آلودہ چہ می گفت کہ نساء مخلوق اند برائے مجامعت برائے مصاحبت۔"

اس چٹکلے کی سیر بھی کر لی مجھے تعجب ہے کہ مصور نے کہاں سے اس کی تصویر کھینچی تھی کہ حیدر علی کی ہر تصویر میں داڑھی اور چہرے کے تمام بال دکھائی دیتے ہیں غالباً اس نے اس تاریخ کو نہیں دیکھا تھا، اب آگے دوسرے عیوب سنئے:-

"تجربہ سی مزاج آں قدر کہ ٹاٹ در لیسمان کہنہ از اصطبل وغیرہ را بہ نمد زین و پالان بکار می برد و ما بدست کا غذ پاں

میفروخت وملازمان خود را رخصت نمی داد و مراد شس در کنار ادمی نہاد و می گفت اہل خانہ بطلبند یا
ہمیں جا کہ خدا شوند۔"

اتنے اوصاف شمار کرانے کے بعد تحریر ہے" اما در جوانمردی وشجاعت ولشکرکشی وقواعد رزم جوئی وملک گیری ورعیت
پروری وعدالت سرآمد روزگار بوده وبرسپاه ورعایا حکم نافذ داشت۔

مذکورہ اوصاف کتنے متضاد ہیں ناظرین خود تصفیہ کریں حیدر علی کا کیرکٹر بیان کرنے کے بعد حالات جنگ بیان کئے
گئے ہیں جس کے متعلق صرف محمود خاں صاحب ثابت جنگ کا نوٹ جو حاشیہ ۵۷ص اول پر درج ہے لکھدینا کافی ہے:-

"حیدر نایک سہ دفعہ جنرل منرو را کہ بر شجاع الدولہ وزیر در بکسر ظفر یافتہ بود شکست فاحش داده چوں ایں
موزخ اول کسے است کہ دین خود بدنیا فروختہ متنفر شده۔ نوشتن شکست انگریز را مکروه می داند ہذا مرقوم
نمی سازد دیگر جائیکہ ناچار میشود کہ بدون تحریر حال آں وقت سلسلۂ سخن از انتظام می افتد (محمود)

ناظرین اگر موقع ملا تو بلیک ہول اور جزیہ اور اورنگ زیب کے متعلق بھی اس کتاب کی روشنی میں کچھ
پیش کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

غزل

(حضرت نیساں اکبرآبادی)

میں اپنی محبت کا اثر دیکھ رہا ہوں
مائل بہ کرم اُن کی نظر دیکھ رہا ہوں

ہیں چہرۂ پُرنور پہ بکھری ہوئی زلفیں
یا شام کے پہلو میں سحر دیکھ رہا ہوں

زورِ کششِ حسن ہے یا جذبِ محبت
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

اللہ رے تصور کی یہ اعجاز نمائی
جیسے میں اُنھیں پیشِ نظر دیکھ رہا ہوں

میرا دلِ بیتاب ابھی تک نہیں ٹھیرا
یہ اُن کی نگاہوں کا اثر دیکھ رہا ہوں

خود حسن مٹانے کے لئے عشق کو آیا
افسانہ بعنوانِ دِگر دیکھ رہا ہوں

نیساں میں انھیں دیکھنے جاتا ہوں مگر آج
کھوئی ہوئی خود اپنی نظر دیکھ رہا ہوں

دورِ اکبری کی یاد

(از حضرت محمود اسرائیلی بمبئی)

گیا وہ دَور کہ اکسیر تھی یہ خاکِ وطن — دوائے کلفتِ غربت، علاجِ رنج و محن
نہ اب وہ بلبلِ شیریں بیاں، نہ گل نہ چمن — کسے سنائیے اکبر کی داستانِ کہن!
نہ بزمِ عیش، نہ مینا، نہ مے، نہ ساقی ہے
ہے صرف جام تہی جس کا دَور باقی ہے

یہ ہند مہر و وفا کی عجیب بستی تھی — دلوں میں درد تھا، الفت تھی، حق پرستی تھی
گھٹا خلوص کی حُسن کی طرح برستی تھی — نہ کاوشیں تھیں نہ اخلاق کی یہ پستی تھی
جو ہم وطن تھے وہ سب ساتھ ساتھ رہتے تھے
وہ ایک دوسرے کو بھائی بھائی کہتے تھے

وہی وطن ہدفِ ابتلا ہے کیا کہیے — نشانۂ ستمِ ناروا ہے، کیا کہیے
دلوں میں بغض ہے، حرص ہوا ہے کیا کہیے — زمانہ ہی کی کچھ ایسی ہوا ہے، کیا کہیے
کوئی ہمارا دلِ داغدار کیا دیکھے
اس اجڑے باغ کی سونی بہار کیا دیکھے

وہ غیر قوموں سے اکبر کی خوئے غمخواری — وہ اس کا حُسنِ سلوک اور وہ رواداری
وہ اس کا فیض جو دریا کی مثل تھا جاری — خلوص جس میں نہ تھی نام کو بھی عیاری
زبانِ حال سے یوں صاف صاف کہتے ہیں
برادرانِ وطن! یوں وطن میں رہتے ہیں

نہ ہو ستون ہی جس میں وہ پل نہیں ہوتا — جو برگِ گل نہوں یکجا تو گل نہیں ہوتا
الگ ہوں جزو جو کل سے تو کل نہیں ہوتا — جو جام و خم نہوں تو دورِ مُل نہیں ہوتا
جو آب و گل ہیں شامل تو باغ پھلتا ہے
بغیر تیل کے کوئی چراغ جلتا ہے؟

جو عہدِ نو کے تمدّن کی دیکھتے ہیں بہار ہے رنگ ونسل کی تفریق آج جن کا شعار
پُرانی روشنی کی ضو ہے جنکو موجبِ عار ہوئے ہیں مغربی تہذیب کے جو لوگ شکار

اُنھیں سیاستِ اکبر سبق سکھاتی ہے
کتابِ الفت کا زرّیں ورق دکھاتی ہے

اگرچہ پردۂ نخوت دلوں پہ چھایا ہے مگر زمانے نے پھر ایک پلٹا کھایا ہے
اور اتحاد کا نکتہ ہمیں سمجھایا ہے جبھی زمانۂ اکبر کا ذکر آیا ہے

مزا تو جب ہے کہ ناقوس پھر اذانیں دیں
وطن پہ اہلِ وطن مل کے اپنی جانیں دیں

بھونرا

(از حضرت شایق ہندو)

تیرا مذاقِ رندی ہے کس قدر رسیدہ
ائے عالمِ نمو کے عیاشِ برگزیدہ
ہر شاخِ گل کے آگے یہ رقصِ والہانہ
انداز تیرا ہر اک ہے کتنا صوفیانہ
پیہم ہے تجھ پہ طاری وجدانِ حق پرستی
بالجہر پڑھ رہا ہے ہر سُو درودِ مستی
ہر زادۂ چمن سے ہے ساز باز تیرا
ہوتا ہے ہر کسی سے راز و نیاز تیرا
جوشِ نمو کا ہر اک ساماں ترے لئے ہے
ہر پھول کی جوانی ارزاں ترے لئے ہے
کس درجہ پُر اثر ہے یہ تیری لحن زائی
ہر گل کو کر دیا ہے محوِ خود نمائی
یہ کوتہ آستینی اور یہ دراز دستی
ہر دم ہوس پرستی، ہر دم ہوس پرستی
اُف عصمتِ چمن سے بیباکیاں یہ تیری
پھولوں کی خلوتوں میں دراکیاں یہ تیری
غنچوں سے گرم جوشی کلیوں سے تنگ بوسی
ہر کنجِ گل ہے تیرا اک حجلۂ عروسی
نسرین و نسترن سے ہے مست ہم نشینی
رخسارہائے گل سے کرتا ہے بوسہ چینی
لالوں کی گرم خوئی ہنس ہنس کے جھیلتا ہے
گو جل چکا ہے پھر بھی شعلوں سے کھیلتا ہے
اس سوختہ تَر میں اب بھی ہے لاگ باقی
باہر سے جل بجھا ہے اندر ہے آگ باقی

کرشمۂ قدرت

(از جناب الفت بی اے وزیرآبادی)

اگر ایک مبتلائے دردِ زہ عورت سے پوچھا جائے کہ کیا اُسے ایک اور بچے کی تمنا ہے۔ تو یقیناً وہ پُرزور الفاظ میں کہیگی "نہیں"۔ ایک مرنے والے کے لواحقین اور احباب اُسے پہلی منزل تک پہونچانے کے دوران میں کیسی کیسی بیراگ کی باتیں کرتے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ "موت کے بعد کیا ہوتا ہے" اس معمے کو حل کرنے میں تو زمانۂ قدیم سے آج تک ہزاروں لوگ سرگرداں رہے اور ہیں۔ فلاں شخص کس طرح مرگیا؟ کیوں مرگیا؟ مرکر کہاں گیا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب کی تلاش میں عقل انسانی ہمیشہ دشتِ فلسفہ میں بھٹکتی رہی۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس بات کی طرف کوئی مطلق دھیان نہیں دیتا کہ زندگی کیا ہے؟ ایک ذی روح کہاں سے آتا اور کہاں جاتا ہے؟ کس طرح عناصر میں روح حلول کرجانے سے مٹی کے پتلے میں زندگی کی لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ غرض یہ مسئلہ حیات و ممات ایک عقدۂ لاینحل ہے۔ مجھے بھی ایک واقعہ یاد آگیا ہے، سُنیئے اور اس پر غور کیجئے:۔

ایک شخص تھا سیرامنی، دوستوں میں سبتو اور گھر میں "منی" کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا باپ سرکاری ٹھیکیدار تھا۔ اس کام میں اس نے خوب کمایا تھا، منی باپ کا ہونہار اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے شہر میں اتنی غیر منقولہ جائداد خرید رکھی تھی کہ اس کی وفات کے بعد جب حساب کتاب کی پڑتال کی گئی تو منی کو معلوم ہوا کہ صرف مکانات کے کرایہ ہی سے وہ اپنی زندگی عیش وعشرت میں بسر کرسکتا ہے۔ پھر بھی شغل کے طور پر اُس نے بیمہ زندگی کا کام شروع کردیا۔ سمجھدار اور دیانتدار ہونے کے سبب سے تھوڑے ہی عرصہ میں اُس نے کافی روپیہ کمایا، اس پر خانگی سکون سونے پر سُہاگہ تھا۔ اُس کی بیوی سندری واقعی ایک دُرِ بے بہا تھی۔ یہ جوڑا نہایت خوش وخرم جوانی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اور اُن کی خانگی زندگی ہمسایوں کے لئے باعثِ رشک تھی۔ اُن کی محبت ایک پہاڑی ڈھلوان کے پودے کے مانند پروان چڑھتی گئی۔ مندرجۂ ذیل واقعہ سے آپ خود اندازہ لگالیں کہ وہ کس طرح ایک دوسرے پر جان چھڑکتا تھا۔

منی نے مجھے ایک دن چائے کی دعوت دی۔ میں اس گھرانے کا پرانا بہی خواہ تھا اور منی کہا کرتا تھا کہ مجھے دیکھکر اُسے اپنا باپ یاد آجاتا ہے۔ میں نے دعوت قبول کرلی اور گیا۔ وہ ایک خوشنما بنگلے میں رہتے تھے۔ میں جاکر ایک کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ سندری نے آکر مجھے نمسکار کی۔ میں کچھ گھبرا سا گیا، کیونکہ اس جدید فیشن کے جوڑے سے مجھے پرانی طرز کے آداب کی توقع نہ تھی، ورنہ میں بھی حسب دستور کچھ پھل اور سپاریاں ساتھ لے جاتا۔ میں نے سندری کو صدق دل سے آشیرباد دی اور اس سے پوچھا "مجھے پہچانتی ہو؟" میں نے اس کی شادی کے بعد اُسے بہت کم دیکھا۔ اُس نے مُسکرا کر کہا "یہ اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں"

اور خاوند سے ذرا ہٹ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ستی نے کہا "اچھا سندرا کیا صلاح ہے، چچا جی کو باورچی کا تیار کیا ہوا کھائی کا پانی پلواؤگی یا اپنے ہاتھ سے تیار کر کے خوش ذائقہ قہوہ؟"

اور مجھے مخاطب کر کے بولا "چچا جی، مدراس بھر میں سندری جیسا قہوہ اور کوئی تیار نہیں کر سکتا۔ وہ دیکھئے نامیز پر کتنا کچھ رکھا ہے۔ قہوہ تیار کرنے کا ایسا قیمتی اور پر تکلف سامان شاید ہی کسی اور گھر میں ہو لیکن یہ خاص خاص مہمانوں کے لئے قہوہ تیار کرتی ہیں، اوروں کے لئے تو باورچی ہی ہے، اور اس کے مقابلہ میں وہ کھائی کا پانی ہی ہوتا ہے۔"

میں کہنے ہی کو تھا کہ مجھے قہوہ کی کوئی خاص تمیز نہیں، میرے لئے میونسپلٹی کے نل کا پانی بھی کافی ہے۔ لیکن سندری اٹھکر فوراً قہوہ تیار کرنے لگی۔ پیالیاں وغیرہ کشتی میں سجا کر ہمارے آگے رکھنے میں اچانک چائے دانی گر پڑی اور گرم گرم قہوہ اس کے پاؤں پر پڑا۔ ستی لپک کر پہونچا اور اپنی قمیص کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر اس کا پاؤں پونچھنے لگا۔ وہ نقشہ ابھی تک میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ کتنے آدمی ہیں جو ایک غیر کے سامنے اس طرح بیوی کے پاؤں صاف کرتے ہیں؟ اسے چارپائی پر لٹا کر فوراً جلی ہوئی جگہ پر پلستر لگایا ڈاکٹر کو فون کرو نوکروں کو بلایا، غرض ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ جب ڈاکٹر آیا اور اس کی مرہم پٹی کرنے لگا تو میں سندری کے کمرے میں جا کر معذرت خواہ ہوا کہ میرے ہی سبب سے یہ حادثہ ہوا۔ مگر سندری کہنے لگی

"آپ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں" اور پھر شوہر کو مخاطب کر کے بولی "چچا جی کو قہوہ بھی نہ ملا۔ جلدی سے لاکر پلوا دیجئے" ستی فوراً باورچی خانہ کی طرف لپکا۔ میں جب رخصت ہونے لگا تو ستی نے کہا "چچا جی معاف کیجئے گا، میں آپ کی کچھ خدمت نہ کر سکا، اس حادثے نے تو ......"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "عزیز من میں خوب سمجھتا ہوں، کوئی بات نہیں، اگر میں نہ آتا تو یہ حادثہ نہ ہوتا" "یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، جو ہونا ہوتا ہے وہ بہر حال ہو کر ہی رہتا ہے۔ اس کی دیکھ بھال میں میں آپ کی طرف متوجہ نہ ہو سکا دراصل بات یہ ہے کہ سندری ... بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

میں نے اس کا شانہ تھپک کر کہا "تب تو مبارک ہو بھئی ایشور لڑکا دے، مگر ... تمہیں لڑکی کی خواہش تو نہیں؟"

"کچھ ہو چچا جی، سب ایشور کی دین ہے، ایسا نہ ہو کہ اس حادثہ کا کوئی برا اثر پڑے؟"

"کوئی فکر نہ کرو، ایشور پر بھروسہ رکھو، ہاں مجھے اس کی حالت سے مطلع کرتے رہنا ہفتے کے بعد میں پھر اسے دیکھنے آؤنگا۔"

میں نے اسے پھر کبھی نہ دیکھا، کاروباری الجھنوں سے اتنی فرصت ہی نہ ملی کئی ماہ بعد جبکہ میں ترچی کی طرف دورے پر گیا ہوا تھا میں نے سنا کہ سندری اسقاط حمل کے صدمہ سے جانبر نہ ہوئی۔ میں نے بذریعہ تار ماتم پرسی کی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ حساب کی پڑتال سے مجھے لمحہ بھر کی فرصت نہ تھی۔ کئی ماہ بعد جب میں مدراس میں تھا تو میں نے ستی کا پتہ لگانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ میرے دل میں بہت سے وسوسے پیدا ہوئے اور میں نے تحقیقات میں سعی بلیغ کی، مگر لڑکا کسی کو اپنی نقل و حرکت کا پتہ بتلائے بغیر غائب تھا۔ اس کے بنک کا افسر اعلیٰ میرا ہم سبق رہ چکا تھا۔ اس نے نہایت غمناک

لیجے میں کچھ حالات بہم پہونچائے۔ منی نے تمام جائداد فروخت کرکے تمام رقم بنک کے حصّے خریدنے میں لگادی، وہ حصے اُس کے نام بنک میں جمع تھے۔ اُس کی ہدایات کے مطابق بنک والوں نے بمبئی، دہلی اور کلکتہ میں اُس کے نام حساب کھول رکھے تھے۔ بنک والوں کے پاس اُس نے ایک سربہ مہر لفافہ بھی جمع کرادیا تھا جو اُس کی موت کے بعد کھولا جانے کو تھا۔ بنک کا منیجر بھی بیچارہ مشوش تھا، اُسے خدشہ تھا کہ بیوی کی موت سے منی کے دماغ میں کچھ فتور آگیا تھا اور بظاہر وہ کسی خوفناک مہم کے درپے تھا۔ میں نے پوچھا "اُس کی خبر ملے کتنا عرصہ ہوا؟" اُس نے جواب دیا "ہمیں اور تو کچھ علم نہیں، ہاں پچھلی دفعہ اُس نے ہماری دہلی کی شاخ سے کچھ رقم نکلوائی تھی، ممکن ہے وہ دہلی کے نزدیک ہی کہیں ہو۔"

اُس رات میں نے خود کو منی کی حالت میں تصوّر کرکے بہت قیاس آرائی کی کہ ان دنوں حالات میں کیا کرتا، کیا منی اس روح فرسا حادثہ کو فراموش کرنے کی خاطر جہاں گردی کر رہا ہے؟ کیا اس طرح سندری کی یاد اُس کے دل سے محو ہو جائیگی؟ مگر اِسکا کوئی جواب نہ ملتا، آخرکار میں نے اخبار میں یہ اشتہار دیدیا۔

"منی۔ مجھے تمھاری بڑی آرزو ہے، تمھیں ملنے اور تم سے تبادلۂ خیالات کو جی چاہتا ہے۔ جواب "چچا" معرفت بکس........

مجھے جواب کی کوئی توقع نہ تھی مگر ایک ماہ بعد جواب پاکر بہت متعجب ہوا۔ خط ہردوار سے ڈاک میں ڈالا گیا تھا۔ مضمون یہ تھا۔

"چچا جان، دنیوی سلسلے کی تمھیں ایک کڑی ہو جس کے توڑنے کی میں کوشش میں ہوں، میں ایک بہت اہم معمّہ حل کرنے کے درپے ہوں، سندری کا جسم خاکی تو ضرور ناپید ہوگیا مگر میری سندری کا کیا ہوا، اُس کی شخصیت، انانیت، روح کیا ہوئی، میرا عالموں، مُنیوں اور خاموش ستاروں بھرے آسمان سے یہی ایک سوال ہے اور جب تک اس کا جواب نہ لونگا مجھے چین نہ آئیگا۔ جس دن سے وہ جدا ہوئی ہے، میرے اندر ایک طوفان بپا رہتا ہے۔ یہاں کا ایک مہاتما کہتا ہے، جبتک میں اس طوفان کو دبانے میں کامیاب نہ ہونگا میری جستجو بیکار ہے، میری کوئی فکر نہ کرو، کیونکہ میں دنیا کے لئے ایسا ہی گم ہوگیا ہوں جس طرح میری سندری:

آپ کا "منی"

اُس نے اپنا پتہ کچھ نہ لکھا تھا جو جواب دیا جاسکے، مگر مجھے اتنی تسکین ہوگئی کہ وہ زندہ ہے۔ سندری کی جستجو میں کامیابی کی کیا اُمید ہوسکتی تھی، سال گزرتے گئے، مگر ہر سال مقررہ دن مجھے اس کا ایک خط مل جاتا، بظاہر وہ کسی سالانہ تقریب کے سلسلہ میں ہوتا، پہلا پیغام تھا "میں ابھی اس کی جستجو میں ہوں، یہ جستجو دائمی ہے۔" دوسرا تھا "میرے اور اس کے لئے دُعا کریں۔"

یہ پیامات آتے رہے، میں اُس کے عزم صمیم کا قائل تھا۔ آٹھ سال بعد ایک رات دس بجے کے بعد مدراس میں نوکر نے ایک شخص کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے پوچھا "کون ہے؟"

نوکر نے جواب دیا "کوئی اجنبی ہے حضور، شمالی حصہ کا رہنے والا معلوم ہوتا ہے، ڈاڑھی رکھے ہوئے ہے اور........"

"اچھا اندر بلا لو"

جتنی کے بال اور داڑھی ٹیگور کی سی تھی، اس کا لباس شمالی علاقہ کا تھا۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی۔ ان کی مقناطیسی قوت ناقابل بیان ہے۔ میں نے اُسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور کچھ تامل کے بعد پوچھا "کیا میں جان سکتا ہوں کہ مجھے کس سے شرف نیاز حاصل ہے"۔

"آپ مجھے تنی کے نام سے تو جانتے ہی ہیں"

میں مبہوت ہو گیا، مگر آواز واقعی تنی کی تھی۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی جی چاہتا تھا کہ اُسے چھاتی سے لگالوں اور سوالوں کی بھرمار کردوں، مگر جیسے میری طاقت سلب ہو گئی ہو۔ میں بیٹھا بیٹھا اُسی کی طرف گھورتا رہا۔ کچھ وقفہ کے بعد جو میرے لئے عرصۂ محشر سے کم نہ تھا اُس نے یوں سلسلۂ کلام شروع کیا:۔

آٹھ سال کی بات ہے۔ ٹھیک اسی دن اور اسی ساعت میری سندرتا مجھ سے چھن گئی۔ ان آٹھ سالوں میں میں متواتر سفر میں رہا ہوں۔ دنیا اور زندگی سے مجھے اب کوئی اُنس نہ تھا، صرف آپ کے خیال نے مجھے زندہ رکھا۔ لیکن یہ ایک چیز ہے (اُس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجھے پھر سماج کا رکن بننا پڑیگا۔ ملاحظہ فرمائیے"

میں نے وہ کاغذ اُس کے ہاتھ سے لیا اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے چشمہ لگایا، تنی آنکھیں موند، ٹانگیں پھیلا جسم ڈھیلا چھوڑ کر بے خود سا ہو گیا۔ کاغذ ایک روحانی سوسائٹی کے رکن کی رپورٹ تھی، لکھا تھا:۔

"گوری، مسٹر پنج ناتھ آئر، کلرک مدراس کارپوریشن کی ساتویں اولاد ہے۔ اس کی چار بڑی بہنیں، تین بڑے اور ایک بچنسالہ بھائی ہیں، سب سے بڑی بہن شادی شدہ ہے۔ مسٹر پنج ناتھ کی ماہوار آمدنی کل پینسٹھ ۶۵ روپے ہے، اس لئے وہ نہایت افلاس، و تنگدستی کی زندگی بسر کرتے ہیں، جہاں تک میں دریافت کر سکا ہوں، جب گوری تین سال کی تھی، والدین نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ بچوں کو قہوہ کی عادت نہیں کیونکہ سامانِ تعیش کی خاندان کو استطاعت نہیں۔ کسی ہمسائے نے گوری کو قہوہ کی ایک پیالی دی۔ گوری پر اس کا عجیب اثر ہوا، وہ بیخود ہو گئی اور جب ہوش میں آئی تو واہی تباہی بکنے لگی۔ والدین ڈر گئے شاید بچہ کو زہر دیا گیا ہے، بڑی لے دے ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد سے گوری کا رویہ والدین کے لئے باعث تشویش رہا ہے۔ بعض کی رائے ہے کہ گوری کو آسیب ہے بسا اوقات جب اُسے دورہ پڑتا ہے وہ چلاتی ہے اور اپنے خاوند کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کرتی ہے، کہتی ہے میرا خاوند میرے فراق میں تڑپ رہا ہے اور اگر میں اس کے پاس نہ گئی تو وہ خودکشی کر لیگا۔ قہوہ کی پیالی آبحیات کا کام کرتی ہے۔ مگر اس کے ردِ عمل کے خوف سے اسے قہوہ نوشی کی ممانعت ہے۔ کئی منتر جھاڑنے والے آسیب دور کرنے والے آئے مگر ناداری کی وجہ سے والدین اخراجات کے متحمل نہ ہو سکے۔ اس لئے اس معاینہ سے کوئی خاص فائدہ یا نقصان نہیں ہوا۔ والدین بہت سراسیمہ ہیں۔ جب بھی اس پر یہ دورہ پڑتا ہے اُسے ایک کمرہ

میں بند کر دیا جاتا ہے اور جب وہ جی بھر کر رو لیتی ہے تو پھر سو جاتی ہے۔ بہت مشکل سے میں نے گوری کے والدین کو چند تجربات پر رضامند کیا۔ میں لڑکی کو کلپاک والے بنگلے میں لے گیا جہاں کسی وقت مسٹر سبرامن رہتے تھے۔ گو عمارت میں چند تغیرات واقع ہو چکے ہیں، گوری جھٹ عمارت کو پہچان کر چلّا اٹھی "میں پہلے جنم میں یہاں رہا کرتی تھی"۔ کچھ سامان وہاں نہ پا کر اسے مایوسی ہوئی، بالخصوص وہ ایک میز کے متعلق دریافت کرتی رہی جس پر قہوہ تیار کرنے کا سامان رکھا جاتا تھا، وہ باغ میں بہت دیر تک گھومتی رہی، اور ایک نشست کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ مجھے بہت پسند تھی"۔ پھر اُسے سبرامن کی عکسی تصویر دکھائی گئی تو اُس نے کہا "یہ میرے خاوند کی ہے" اور پوچھنے لگی "وہ کہاں ہیں؟" وہ اپنے خاوند کو "سندریش" کے نام سے پکارتی ہے اور "سبرامن" اُس کے ذہن سے اتر گیا ہے۔"

"اس میں شک نہیں کہ یہ ایک اور مثال ہے جس میں پہلے جنم کے واقعات دوسرے جنم میں یاد رہتے ہیں۔ شمالی ہند میں بھی ایک اسی طرح کا واقعہ ہوا جس کا اخبارات میں بڑا چرچا ہوا تھا۔ مزید برآں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے یہ خبر نشر ہو چکی ہے کہ ایک چھوٹی سی لڑکی کو تلسی داس کی رامائن ازبر ہے۔ اس لئے گوری کے حالات مزید تجسس کے محتاج ہیں اور اس شخص نے جو گمنام رہنا پسند کرتا ہے اس کے متعلق بہت سی آسانیاں ہم پہونچائی ہیں، حسب خواہش گوری کی عکسی تصویر ملفوف ہے۔"

"ہے ایشور کیا یہ سچ ہے" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا، اور تنی نے آنکھیں کھول دیں اور بولا:۔

"شک کی گنجائش نہیں، کم از کم میں تو اسے سچ سمجھتا ہوں لطف کی بات تو یہ ہے کہ میں یوگ، کرامات، علم ارواح کی دنیا میں آٹھ سال تک یونہی بھٹکتا رہا ہوں، اب حسنِ اتفاق سے میری جستجو کامیاب ہوئی، یہ سب سندری کا طفیل ہے، اس کی محبت میری محبت سے کہیں زیادہ ہوگی، اور جب اُس نے اس دنیا کو چھوڑا تو اُس کے دل میں یہ زبردست خواہش ہوگی کہ مجھے پہلے جنم کی باتیں یاد رہیں۔ ذرا اس فوٹو کو تو دیکھئے، کیا بھونڈی سی شکل ہے، کیا ایسے بدصورت جسم میں میری سندری کی خوبصورت روح رہ سکتی ہے؟"

میں نے جواب دیا "میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا، آخر روح کی خوبصورتی کا معیار کیا ہے، وہ سانچہ جس میں کہ کوئی کالبد ڈھلتا ہے بہت حد تک وراثت کا مرہون ہوتا ہے اور روح کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مگر یہ تمھیں "سندریش" کیوں لکھا گیا۔"

وہ ایک جھرجھری لے کر کہنے لگا "سندری مجھے پیار سے یونہی بلایا کرتی تھی، آپ جانتے ہیں میں اُسے سندر کہا کرتا تھا، وہ کہتی آپ میرے مالک ہیں اور سندری کے ایشور سے سندریش ہو گیا۔ کسی اور کو اس بات کا علم نہیں۔"

"کیا تم اُس سے ملے ہو؟"

"بس تو، میں سوچ رہا ہوں ملوں یا نہ ملوں، میں آج ہی شام کو مدراس پہونچا ہوں اور ایک انگریزی ہوٹل میں مقیم ہوں۔ میں نے آپ کے بارہ میں دریافت کیا اور یہ سُنکر خوشی ہوئی کہ آپ شہر ہی میں ہیں اس لئے میں سیدھا آپ ہی کے ہاں آرہا ہوں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو مجھے مستقبل کے متعلق کچھ مشورہ دیجئے، میرے تو حواس بجا نہیں۔"

"کیا تم گوری کے گھر والوں سے ملنا پسند کروگے؟"

"کوئی خاص خواہش تو نہیں۔"

"لیکن لڑکی کو تو ضرور دیکھنا چاہتے ہوگے؛"

وہ خاموش رہا۔

"اچھا، میں گوری اور اُس کے والدین سے ملکر تمھیں کل شام کو ہوٹل میں بلونگا، تم میرے مکان کو اپنا گھر سمجھکر بے تکلف جب چاہو آسکتے ہو۔ بلکہ ہوٹل چھوڑ کر یہیں آرہو تو اور بھی اچھا ہے۔"

"شکریہ"

قصہ مختصر سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ منی میں وہ جوش نہ تھا جو ہونا چاہیئے تھا، نجانے اُسے کیا ہو جانے کی توقع تھی، اور اُس پر کیسی یاس طاری تھی۔ بہر حال منی میں جوش کی کمی کو میں اپنی سرگرمیوں سے پورا کر رہا تھا۔ اگلے دن میں گوری کے گھر والوں سے ملا اور سوسائٹی کی رپورٹ کی تصدیق کی، انھیں اس بات پر رضامند کرلیا کہ شام کو گوری میرے ساتھ سیر کو جائیگی منی سے میں نے فون پر کہہ دیا کہ چھ بجے شام کو میرا موٹر اُسے لینے کے لئے ہوٹل پہونچے گا، اگر ساحل سمندر پر آجائے تو گوری اُس سے مل سکے گی۔ گوری کہنے کو تو آٹھ سال کی تھی مگر بلا کی ذہین۔ میں اُسے شام کو ساحل سمندر پر لے گیا۔ اس سے بہت پوچھ گچھ کا اور اُسے بتایا کہ ایک ایسا شخص جو اُسے پچھلے جنم میں جانتا تھا آئیگا، اگر اُسے پہچان سکے تو یہ مزید ثبوت ہوگا کہ تمھیں پچھلے جنم کی باتیں یاد ہیں۔ اُس نے بھولے پن سے کہا "وہ کون ہے؟"

میں نے جواب دیا "اگر میں تمھیں یہ بتادوں تو باقی کیا رہا۔ اچھا بھلا یہ تو بتاؤ کہ مجھے دیکھکر تمھیں کسی ایسے شخص کی یاد آتی ہے جسے تم نے پچھلے جنم میں دیکھا ہو؟"

"کچھ خیال تو آتا ہے مگر اچھی طرح یاد نہیں آپ کون ہیں اور آپ کا کیا نام ہے۔ ہاں تو وہ شخص کب آئیگا؟"

"یہ تم نے کیسے جان لیا کہ وہ مرد ہے؟"

"یونہی اندازہ ہے۔"

"ہے تو ٹھیک"

اتنے میں موٹر کی آواز آئی اور منی اتر پڑا، ڈرائیور اُسے وہاں لے آیا جہاں میں اور گوری ریت پر بیٹھے ہوئے تھے میں نے منی کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ بیٹھ گیا اور غور سے گوری کو اس طرح دیکھنے لگا گویا وہ چڑیا گھر کا نرالا جانور ہے۔ گوری بھی

بہت دیر تک اُس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

"گوری، یہ کون ہے؟"

"میرا خیال ہے، میں جانتی ہوں اور نہیں بھی جانتی .... کوئی چیز ...."

"کیا؟"

"کوئی چیز راہ میں حائل ہے، جسے میں دیکھ نہیں سکتی۔"

منی نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا

"اب میں سمجھ گئی"

"کیا؟"

"میں جان گئی کیا چیز حائل ہے۔ اگر وہ اپنی داڑھی اُتار دے تو میں بتا سکوں گی کہ وہ کون ہے۔"

منی کے منہ سے بے ساختہ نکلا "فضول بکواس" اور وہ اُٹھکر چلا گیا۔

میں جب منی کو ہوٹل میں ملا، مجھے اُسے یہ یقین دلانے میں پورا گھنٹہ صرف ہوگیا کہ تمہارا رویہ قابل اعتراض تھا۔ آخرکار میں نے اُسے ایک طریق کار پر رضامند کرلیا۔ تجویز یہ ہوئی کہ اُسی پُرانے بنگلہ میں ایک سین تیار کرلیا جائے۔ منی اپنی داڑھی منڈوا ڈالے اور وہاں گوری سے ملے۔ اُس کی مدد سے میں نے بنگلہ کو اُسی طرح آراستہ کیا جس طرح سندری کی زندگی میں تھا۔ دُو دن بعد منی داڑھی منڈا پرانا لباس پہن گوری کا منتظر بیٹھا تھا۔ میں گوری کو لیکر بنگلے میں پہونچا۔ وہ نظارہ میں قیامت تک فراموش نہیں کرسکتا۔

گوری نشست گاہ میں داخل ہوتے ہی بھونچکی سی رہ گئی۔ منی پر ایک نگاہ ڈالتے ہی چیخ مارکر اس کے قدموں میں گرکر بولی "سندریش" منی کی حالت بھی دگرگوں ہوگئی، اُس نے اُسے سینے سے لپٹا کر صوفے پر لٹا دیا اور کہنے لگا "

" جلدی تھوڑا سا قہوہ لاؤ، وہ بوتل میں رکھا ہے۔"

فرش پر بیٹھکر گوری کا سر ہاتھوں سے تھام اُس نے قہوہ کا گلاس اُس کے منہ سے لگا دیا۔ گوری محبت کے کچھ لفظ بڑبڑانے لگی جو صرف منی ہی سمجھ سکا۔"

یہ ہے کہانی۔ منی کی تمام جائداد گوری کے نام ہبہ ہے، اگر دولت خوشی کا موجب ہوسکتی ہے تو گوری کو اپنے مستقبل کا کوئی خوف نہیں۔ لیکن تم پوچھو گے منی کا کیا حشر ہوا؟

آٹھ سال کی جستجو میں منی یوگ اور روحانیت کی مشق کرتا رہا تھا، مخفی روحانی طاقت اُبھر آئی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ اسے کام میں نہ لا سکا۔ ایک دن اُس نے کہا "گوری کے متعلق میرے عجیب احساسات ہیں بعض اوقات وہ میری ماں کی یاد تازہ کردیتی ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ مجھے دودھ پیتے بچے کی طرح ماں کی چھاتی سے چپٹ

جانے کی خواہش ہے۔ پھر سندرا کی شکل آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور محبت کی آگ شعلہ زن ہو جاتی ہے۔ صرف ایک بات باعثِ تسکین ہے اور وہ یہ دائمی احساس کہ اگر سندرا مر نہ جاتی تو ہمارا بچہ ہو بہو گوری کا ہمشکل اور ہم عمر ہوتا، ہے نا عجیب بات چچا جان۔ ماں بیوی اور بچہ ایک ہی وجود ہیں۔ لیکن شاید صنفِ نازک کا راز بھی یہی ہے۔"

غزل

(حضرت پرواز جعفری)

ہے حسن سنبھالا کس درجہ نشاط آمیز
اور اُس کی نظر ہے پُر سوز و جنوں انگیز

اب سازِ تمنا میں وہ درد کہاں باقی
جو ساز کو بھی چھیڑے وہ سوزِ جنوں آمیز

ہیں قصر میں یوں بیٹھے سجادۂ اسرارِ ملوکانہ
کیا دبدبۂ کسریٰ کیا طنطنۂ چنگیز

ہے فقر و محبت سے معراجِ بقا حاصل
نادار کی ہستی تھا جو مصلحت انگیز

یہ حسن کی رنگینی لالہ ہے نہ شعلہ ہے
یہ عشق کی اِک لَو ہے بجلی سے زیادہ تیز

میرے ساتھی

(از جناب بشیر ساجد، بی۔اے)

میں اُن کے ساتھ نکلا تھا تمنا زارِ کالج سے
غلام آباد ہندوستاں کی پہنائی میں ہم پھیلے
کسی معشوق کی خلوت میں جاکر سو گیا کوئی
کلرک انگریز کے دفتر میں فوراً ہو گیا کوئی
وطن اور قوم کی خدمت کے غم میں کھو گیا کوئی
دلوں میں مذہبی نفرت کے کانٹے بو گیا کوئی
بہت پھیلے مرے ساتھی ولیکن پھر بھی کم پھیلے
جہالت کے گلے میں ڈال کر تعلیم کا پھندا
کسی نے تنگ بیکاری سے آکر خودکشی کرلی
کسی نے جاہلوں کے لوٹنے کو لیڈری کرلی
کسی نے "مولویت" ہی سے قائم برتری کرلی
کسی نے فوج یا خفیہ پولس میں نوکری کرلی
چلایا بڑھ کے غیروں سے وطن کی لوٹ کا دھندا
فراست سے، وکالت سے خطابت سے، سیاست سے
کمائے دام، اچھالا نام اپنا خوب دُنیا میں
بڑھے جاتے ہیں روز و شب تمناؤں کے صحرا میں
سیاہی اور سفیدی اِک ہے اِن کی چشمِ مینا میں

جگر کاوی سے بھر ڈالے ہیں اپنے نقش فردا میں
چُرا کر رنگ ہندوستاں کی تصویر قسمت سے
چمن میں پھول تھے گلچینیاں کیں آشناؤں نے

مگر میں رہ گیا مبہوت بزمِ لالہ و گل میں
نہ صیادوں میں شامل نے ہوا خواہانِ بلبل میں
صدا ہو کر بسا اشعار کے مینا کی قلقل میں
چُھپے گھبرا کے کچھ ! جیسے اپنے خول کے بل میں
وطن میں شیریاں شاہینیاں کیں آشناؤں نے
نکما رہ گیا ہو کر میں شعریت کے فالج سے

"مَیں"

(از جناب تسنیم صاحب گجراتی)

جذبۂ دل کے حامل نہیں ہیں — برقِ نظر کیا رقصِ شرر کیا
ہیں عرش و سدرہ میری ہی منزل — روکیں گے مجھکو شمس و قمر کیا
یزداں کے دل کی میں آرزو ہوں — پائیں گے مجھ کو قدسی نظر کیا
میں جاودانی، مَیں لامکانی — مجھ پہ اجل کا ہوگا اثر کیا
راہِ طلب میں قول ہے دل کا — ہمت کے آگے ہیں بحر و بر کیا

یہ ارتجالی نغمات ہیں کچھ
اس شاعری میں سوزِ جگر کیا

مصر تاریخ کی روشنی میں

(از جناب مجیب احمد انصاری (کراچی)

مصر اُن قدیم ملکوں میں سے ہے جہاں تہذیب وشائستگی کا آغاز ہوا ملکی قانون اور رسم ورواج کے قواعد مرتب ہوئے۔ سب سے پہلا بادشاہ مینس ہوا جس کا دورِ حکومت بڑی چھان بین کے بعد دو ہزار دو سو سال قبل مسیح معلوم ہوا ہے۔ اس کے بعد کچھ کچھ سلسلۂ بادشاہی کا پایا جاتا ہے۔ مسٹر ولکنسن نے ایک کتاب (General View of the Egypt. عام نظارۂ مصر لکھی ہے جس میں اس شجرہ پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیم کا سنہ ۱۹۲۰ قبل مسیح اس ملک میں تشریف فرما ہونا اور ملک کا زرخیز ہونا انجیل سے بھی ظاہر ہے۔ غرض ہر لحاظ سے یہ سرزمین دنیا میں بے مثل مانی گئی ہے اور یہاں کے آثارِ قدیمہ اس بات کے شاہد ہیں کہ یہاں کے لوگ اُس زمانہ میں یکتائے روزگار تھے۔ یونانیوں کے علم وفضل کا سرچشمہ یہی سرزمین تھی۔ فیثاغورث اور افلاطون جیسے دانائے روزگار فلسفی یہیں کی درسگاہوں سے فیضیاب ہوئے تھے۔ کتب طب وتشریح ادویہ اول یہیں مرتب ہوئیں۔ مصر کے قدیمی مقابر ومنادر، مادّی حالت، بے مثل زرخیزی اور تجارتی شہرت نے سیاحوں، محققوں، مدبّروں اور نفع رسانیٔ خلائق کے آرزومندوں کو اپنا والہ وشیدا بنا لیا۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ ہمارے تمام تاریخی واقعات کا آغاز اور انسانی تہذیب کی ابتدا (خواہ وہ بسبب زمانہائے دراز گذرنے کے کیسی ہی پیچ در پیچ کیوں نہو) حام بن نوح کی اسی سرزمین سے ہوتی ہے۔

مصر کا انگریزی نام ایجپٹ (Egypt) کیوں ہے؟ اُس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایجپٹ دراصل یونانی زبان کا لفظ ہے جو شاہ ایجبٹس ولد بلیس کے نام سے اخذ کیا گیا ہے۔ لیکن عبرانی کتب مقدسہ میں اُس کو مزرائم یا مصرائم لکھا ہے۔ اسی لئے اہل عرب ومشرق اُس کو اب تک مصر کہتے ہیں۔ اگر ہم کتب مقدسہ کا غور وخوض سے مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اس سرزمین کو اولادِ حام بن نوح نے آباد کیا تھا۔ نیز بعض قدیمی تحریروں، کتبوں (بالخصوص مقبروں کے کتبوں) اور کندوں سے یہ خوب واضح ہو جاتا ہے کہ شروع میں کوہ قاف کے باشندوں نے شہر تھیبز کی بنیاد رکھی اور پھر جنوب کی طرف وادیٔ نیل میں بڑھتے چلے گئے۔ خواہ وہ اپنے ہمراہ کچھ علوم وفنون لائے ہوں یا نہ لائے ہوں مگر اس میں شک نہیں کہ انھوں نے بہت تھوڑے عرصہ میں بہت نمایاں ترقی کی۔ کیونکہ شاہ مصرائم کی چند پشتوں کے بعد خوشنما عمارتیں اور خوبصورت مقابر اُن کی ہنرمندی کی گواہی دینے لگے۔ قواعدِ سیاست تمدن اور تہذیب وشائستگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ فرقۂ اناث کی عزت وتعلیم کا ایسا ہی خیال تھا جیسا کہ اب دنیا کے تمام ممالک میں ہے۔

سرزمین مصر کو ایک قسم کی بڑی وادی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، کیونکہ سیین سے بحیرۂ شام کے کنارے تک چھ سو میل طولاً

یہ وادی ایک مثلثی میدان میں ختم ہوتی ہے۔ بیسن سے القاہرہ کا فاصلہ پانچسو میل ہے، جہاں وادی مذکور آٹھ میل چوڑی ہے جس کے دو طرفہ پہاڑیاں مشرقی جانب بحیرۂ قلزم کے متوازی چلی گئی ہیں، اور دوسری طرف صحرائے طرابلس میں ختم ہوتی ہے۔ وادی مصر کی پہاڑیاں نہایت قابل غور ہیں کیونکہ فرعون بطلیموس اور انطونیوس کے عہد حکومت میں عالیشان عمارات کے واسطے یہاں سے مسالہ بہم پہونچایا جاتا تھا، بلکہ اطالیہ (اٹلی) کے اکثر محلات میں بھی ان کانوں کا پتھر لگایا گیا تھا جن کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات صناعان روم کے کمال اور بادشاہوں کی فیاضی کے اب تک شاہد ہیں۔

عرض البلد شمالی کے ۲۴ درجہ سے دریائے نیل کے دو طرفہ سلسلۂ کوہ شروع ہوتا ہے اور شہر استوان کے قریب آبشار ول میں پانی کی روانی سنسان اور تاریک پہاڑوں کی چٹانوں میں عجیب خوف پیدا کرتی ہے۔ اور آگے بڑھکر سنگلاخ پہاڑوں کا یہ سلسلہ آتا ہے جہاں سے بڑے بڑے بتوں، مورتیوں اور میناروں کے لئے پتھر نکالا گیا ہے۔ آگے بڑھکر شمال کی طرف چونہ کا پتھر ملتا ہے جو شہر کے عام مکانات اور مخروطی میناروں کے اندرونی حصہ میں لگایا گیا ہے۔ اسنی سے دس میل شمالاً یہ وادی اس قدر تنگ ہے کہ ایک تنہا مسافر بھی دریا کے کنارے پر سفر نہیں کر سکتا کیونکہ دریا کے دو طرفہ سیدھے اور سر بفلک پہاڑ ہیں پھر وہ راستہ آتا ہے جس کو جبلین کہتے ہیں جس کے سامنے آرمونٹ اور تھیبز (قدیمی دار الخلافۂ مصر) کے کھنڈرات اپنی قدیمی شان کو یاد دلا رہے ہیں۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ شہر تھیبز سے آبشار کا فاصلہ ٹھیک اتنا ہی ہے جتنا مصر کی دوسری دار الحکومت میمفس کا سمندر سے۔ الغرض یہ سلسلۂ کوہ کم و بیش ساحل سمندر تک چلا گیا ہے، اور مشرقی کنارہ بحیرۂ قلزم کے متوازی عربیہ کے پہاڑوں سے مل جاتا ہے۔

وہ ترچھی وادی جو بحیرۂ قلزم کو جاتی ہے وادی قیصر کہلاتی ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں بنی اسرائیل گمراہ ہوئے تھے اور پیشتر اس راہ سے مسافر بالائی مصر کا سفر کیا کرتے تھے۔ چند وادیاں اور بھی زمانہ حال میں دریافت ہوئی ہیں اور غالباً ابھی اور بھی دریافت ہوتی رہیں گی۔ لیکن زمانۂ قدیم کی شاہراہیں اب بالکل تباہ و برباد ہو چکی ہیں، اور یہی سچ پوچھو تو ملک کی بدنظمی کے اسباب ہوئے ورنہ کسی زمانے میں بحیرۂ قلزم کے کنارے کے شہر تجارت کی بڑی منڈی تھے یا آج شہر بیرینس جو کبھی دولت و ثروت کا مرکز تھا ایسا گمنام پڑا ہے کہ اُس کا کوئی راستہ بھی نہیں جانتا۔ علاوہ بریں تنگ و تاریک درے بھی ہیں جن کا مجملاً حال عربوں اور یونانیوں نے اپنی اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ جو اب سے ساٹھ سال پیشتر تک محققین یورپ کی نظروں سے پوشیدہ تھے مگر اب وہ درہ یا وہ راستہ جرجیہ واسنی سے نخلستان الوحل خارجیہ کو اور قینم سے الوحل علیہ کو جاتے ہیں۔ اسی طرح فشنطاریہ یعنی نخلستان ایمن بھی بندیۂ مغربی پھیلاؤ بحر تیار سے مصر میں شامل ہوتا ہے۔

القاہرہ سے اہرام مصر کا نظارہ نہایت پر کیف اور مسرت آگیں ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ کیونکہ اُن کے قرب و جوار میں کوئی ایسی رفیع الشان دوسری چیز نہیں جو اُن کی بلندی کے امتیاز کو ظاہر کرے، اور اتنے دُور کا فاصلہ صرف چار پانچ میل معلوم ہوتا ہے مگر در اصل یہ نظر کا دھوکا ہوتا ہے اور جوں جوں

انسان اُن کی طرف جاتا ہے اُس کی رفعت و وسعت کا خیال وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اور جن دنوں میں رود نیل میں طغیانی ہوتی ہے تو بیس بائیس میل کا پھیر کھاکر اہرام تک پہونچا جاتا ہے۔ اس وقت راستہ کا نظارہ نہایت دلفریب اور فرح بخش ہوتا ہے، اور سرسبز کھجور کے درخت، ریگ کے ٹیلے اور چٹانیں، مناور، غیر آباد گاؤں، کیکر کے درخت اور پانی کا شور و غل اور بہتے ہوئے درخت اتنے بلیے سفر کو آسان کر دیتے ہیں۔

صبح کی دھندلی روشنی میں ان کا نظارہ اور بھی عجیب لطف دیتا ہے، شعاعوں کی چمک سے یہ برف کی مانند سفید دکھلائی دیتی ہیں، اور ان کی بلندی دیکھکر یقین ہو جاتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی شئے ایسی اونچی نظر سے نہیں گذری ان کی قدامت، وسعت ارتفاع، شان و شوکت اور عظمت کا خیال انسان کو محو کرکے رکھدیتا ہے۔

طلبِ صادق

(از مسٹر بیتاب بریلوی، بی۔ اے)

مجھ کو انساں مرے مولا نہ بنایا ہوتا
اور بنانا تھا تو دیوانہ بنایا ہوتا

خدمتِ قوم کی توقیر مجھے دی ہوتی
کاش پروانہ کی تقدیر مجھے دی ہوتی

شمع کافور کی مانند گھُلا جاتا ہوں
فاقہ مستی میں فقط قوم کا غم کھاتا ہوں

ہاتھ خالی ہے مگر آنکھ بھری رہتی ہے
کشتِ غم آہ کے شعلوں سے ہری رہتی ہے

باعثِ ننگ ہوں دنیا میں گرفتار ہوں میں
مادرِ ہند کے شانوں پہ گراں بار ہوں میں

عہد و پیمانِ گذشتہ سے پھرا جاتا ہوں
غیر کیا اپنی ہی نظروں میں گرا جاتا ہوں

وہ مصیبت ہے کسی شئے کا نہیں ہوش مجھے
کردیا ہے مری دنیا نے فراموش مجھے

کیا کروں گردشِ تقدیر سے مجبور ہوں میں
کامرانی سے مرادوں کی بہت دور ہوں میں

جانتا ہوں کہ یہ سب عقل کی کمزوری ہے
نیک کاموں سے مری فردِ عمل کوری ہے

خود پرستی کو بہانہ تو بنا آتا ہے
شمع کا نور ہی فانوس ہوا جاتا ہے

برق وش اپنے نشیمن پہ نظر رکھتا ہوں
اور بربادیِ گلشن پہ نظر رکھتا ہوں

خارِ اغیار سے چھوٹا نہیں دامن میرا
نہیں سیراب مرے خون سے گلشن میرا

جنسِ اُلفت کا میں طالب سر بازار نہیں
یوں تو سودا ہے مگر دل سے خریدار نہیں

اس سے بہتر تھا کہ وہ پھول بنا تا مجکو
کچھ اس انداز سے کانٹوں پہ کھلاتا مجکو

راہِ آزادیِ ملت میں بچھاتے جس کو
لوگ جکڑے ہوئے تیروں پہ چڑھاتے جس کو

چاندنی رات

(از منشی جگناتھ آزاد ایم-اے)

چاندنی رات مسلط ہے کہستانوں پر دُور گہرائی میں جاتی ہوئی ڈھلوانوں پر
عیش و آرام سے معمور شبستانوں پر اور بوسیدہ و ویران سے غمخانوں پر

چاندنی رات! دلآویز ہے افسانہ ترا
بادۂ کیف سے لبریز ہے پیمانہ ترا

روشنی تجھ سے ہے آبادی میں ویرانے میں کاخ زردار میں مزدور کے کاشانے میں
سب کا حصہ ہے شبانہ ترے پیمانے میں سبھی مینخوار ہیں یکساں ترے میخانے میں

کس کا محبوب نہیں حسنِ فسوں کار ترا
حسرت دیدۂ مشتاق ہے دیدار ترا

جگمگا اُٹھا ترے فیض سے کہسار مری شجر طور کی مانند ہیں اشجار مری
پیکرِ نور ہے ہر کوچہ و بازار مری قابلِ دید ہے کیا رونقِ گلزار مری

ذرے ذرے سے عیاں شانِ دلارائی ہے
اور ہر برگ شجر پیکر زیبائی ہے

چاندنی شب کا پہاڑوں پہ سماں دیکھتا ہوں خاک پر نور کا دریا ہے رواں دیکھتا ہوں
گرچہ ہر شے کو حسیں اور جواں دیکھتا ہوں دل کی گہرائی میں اک سوزِ نہاں دیکھتا ہوں

رفعتِ کوہ پہ ہوں فکر کہاں پھرتا ہے
پستیِ ہند کا آنکھوں میں سماں پھرتا ہے

چاند! جب عالمِ ظلمت کو زوال آتا ہے اور تو عرش پہ با حسن و جمال آتا ہے
دلِ غمناک میں اکثر یہ خیال آتا ہے جس سے اُمید کی دنیا پہ ملال آتا ہے

کیا کبھی ہو گی نہ پُر نور شبِ تارِ وطن؟
اور شاداب نہ ہو گا کبھی گلزارِ وطن؟

منشی دیا نرائن نگم مرحوم

(از مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔اے)

میں رسالہ زمانہ سے جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۹۰۸ء سے واقف ہونے کا شرف رکھتا ہوں اُسی زمانہ میں منشی دیا نرائن صاحب آنجہانی کی خدمت میں نظمیں روانہ کیا کرتا تھا جو اُن کے معزز پرچہ میں شائع ہوتی تھیں، اُس وقت بہت کم لوگ نظموں کی طرف مائل تھے اور زیادہ تر غزلوں کے گرد ستے نکالتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں ایک دو غزل کے منتخب اشعار "پیام یار" لکھنؤ میں بھی چھپ چکے تھے اور میری نظمیں "آفتاب" جھالراپاٹن اور علی گڑھ "منتھلی" میں بھی نکل چکی تھیں جب میں نے رسالہ زمانہ کے آستانہ پر دستک دی اور مجھے باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ منشی صاحب نہ صرف اچھے نثر نگار تھے بلکہ اچھے لکھنے والوں سے اُن کے تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔ میرا ان کا تعارف صرف غائبانہ تھا اور ایک عرصہ تک ہم دونوں اسی غائبانہ تعلق پر قائم رہے۔ ایک مرتبہ حُسنِ اتفاق سے (غالباً سنہ ۱۹۱۳ء میں) الٰہ آباد جا رہا تھا کہ کانپور اسٹیشن پر اڈیٹر زمانہ مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ اب نہ وہ میری شکل سے واقف اور نہ میں اُن سے واقف۔ لیکن میں نے اپنے درجہ کے اندر کی نشست سے دیکھا کہ ایک صاحب دُبلے پتلے پاس کے زینے سے ایک حجم فیفر کے ساتھ اُتر رہے ہیں۔ اُن کی تصویر اُسی زمانہ میں اُن کے اپنے پرچہ میں شائع ہو چکی تھی۔ لہٰذا خیال ہوا کہ شاید یہ حضرت نگم ہیں، اور میں آفتابہ لیکر اُسی زینہ کے قریب نل سے پانی لینے کے لئے اپنے درجہ سے باہر نکلا کہ وہی نزار و نحیف صاحب میرے قریب آکر مجھ سے دریافت فرماتے ہیں کہ "کیا آپ غازی آباد سے آرہے ہیں؟" میں اس زمانہ میں غازی آباد میں وکالت کرتا تھا۔ بس ان کا یہ دریافت کرنا تھا کہ میں نے کہا کہ آپ حضرت نگم ہیں۔ اور چلئے ایک دوسرے سے روشناس بھی ہو گئے۔

رسالہ زمانہ میں اول اول میں نظمیں لکھتا تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد مضامین بھی لکھنے لگا، اور اب پچھلے دس سال سے تو شاید میں نے کوئی نظم منشی صاحب کی خدمت میں بغرضِ طباعت روانہ نہیں کی۔ ایک مرتبہ اُن کو میری تصویر شائع کرنے کا خیال ہوا (غالباً سنہ ۱۹۱۳ء میں) میں نے اُن کے متواتر اصرار پر ایک یا دو سال بعد تصویر بھیجی جس کو پھر وہ شائع نہ کر سکے۔

منشی صاحب آنجہانی سے نہ میں نے کوئی معاوضہ لیا اور نہ کوئی تحفہ قبول کیا پہلی اور آخری ملاقات کے وقت اُنھوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ لال املی کے کمبل بہت اچھے ہوتے ہیں۔ الٰہ آباد کی واپسی پر میں ایک کمبل آپ کی نذر کرونگا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ ۱۹۲۵ء میں سیر المصنفین جلد اول کا اشتہار رسالہ زمانہ میں مفت چھپوایا اور اس کتاب کی بکری کے لئے بھی معقول کمیشن دیا۔ حالانکہ منشی صاحب اپنے مضمون نگاروں کی خدمت کے لئے ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے۔ وہ نہایت خلیق منکسر مزاج

اور اعتدال پسند انسان تھے.

منشی صاحب آنجہانی کی وفات حسرت آیات سے خود اُردو ادب کو صدمۂ عظیم پہونچا. اُردو کے خلاف جو ایک طوفان بے سرو پا برپا ہوا تھا اُس میں وہ ایک پہاڑ کی طرح کھڑے رہے اور ذرا جنبش نہ ہوئی بلکہ موجوں کے تھپیڑے کھائے اور اُن کو پیچھے ہٹا دیا اُنھوں نے سنہ ۱۹۰۳ء سے سنہ ۱۹۴۲ء تک جو اُردو کی خدمات اپنے رسالہ اور اخبار کے ذریعہ سے کی ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں. انھوں نے ذاتی نفع و منفعت کو بالائے طاق رکھا اور اُردو ادب کی خدمت کے باعث جو نقصانات ہوئے اُن کو بطیب خاطر گوارا کیا لیکن پیچھے قدم نہیں ہٹایا. منشی پریم چند آنجہانی خود نگم صاحب کی توجہ اور اثر سے افسانہ نویس اور مصنف ہو گئے اور نہ معلوم کتنی ہستیاں ہیں جو رسالہ زمانہ میں مضامین لکھتے لکھتے مصنف کے درجہ تک پہونچ گئے ہیں. یہ فخر بیجا نہ ہوگا کہ رسالہ زمانہ اپنی آن بان کے ساتھ چالیس سال سے متواتر جاری ہے اور کبھی بند نہیں ہوا. لیکن کوئی رسالہ اُردو زبان میں ایسا نہیں جو اتنا قدیم ہو یا اتنے عرصہ تک سلسلہ وار جاری رہا ہو. رسالہ کا معیار بھی ہمیشہ بلند رہا اور قابل تعریف.

تاثرات

(از جناب محمود یار خاں اثر ایم. اے. جوناگڑھ)

ہر چند ناکام آرزو ہوں — خوش ہوں کہ صرفِ جستجو ہوں
حسنِ بہار آفریں کے صدقے — سرگشتۂ کیفِ رنگ و بو ہوں
سود و زیاں کا خیال کیوں ہو — وارستۂ فکرِ ما و تو ہوں
کیوں رنگِ عشرت کی جستجو میں — آوارہ مانندِ موجِ بو ہوں
ہر قطرۂ اشک ہے فروزاں — میں گریۂ غم کی آبرو ہوں
وہ زندگی کیا، نہ ہو جو طوفاں — بہرِ حیاتِ انقلاب جو ہوں
بیتاب دل ہے جو برق آسا — جاں دادۂ حسنِ شعلہ رو ہوں
بے برگیِ عشق ہے نمایاں — اِک نقشۂ یاس ہو بہو ہوں
شاکی نہیں دہر کی جفا کا — لذت کشِ غم ہوں سُرخرو ہوں
تخئیل کی سرخوشی نہ پوچھو — بیگانۂ ساغر و سبو ہوں
صد شکر، ہے کچھ خیال اُن کو — خوش ہوں کہ موضوعِ گفتگو ہوں

ہیں خونچکاں اے اثر جو آنکھیں
دنیائے الفت میں سُرخ رُو ہوں

ماتمِ پدر

(از کیلاش ورما تخلص ہنگامی، بی۔اے)

فضا مایوس کن ہے اور تارے جھلملاتے ہیں   طیورِ خوشنوا بھی درد کے نغمے سناتے ہیں
زمیں میں بھی ہے لرزش آسماں بھی تھرتھراتا ہے   بیاں ہو قصۂ غم کیا کلیجہ منہ کو آتا ہے
نہ ذرّوں میں چمک مہرِ مبیں میں ہے نہ تابانی   رخِ مہتاب سے بھی ہو گئی رخصت درخشانی
ادھر شمعیں ہیں گریاں اور ادھر بےحال پروانے   زبانِ اہلِ محفل پر ہیں دردانگیز افسانے
جنابِ سحرؔ کی رحلت سے یہ کیسا سماں بدلا
زمیں بدلی، زماں بدلا، نظامِ دو جہاں بدلا

نہ موجوں میں ترنّم ہے نہ دریا میں روانی ہے   جگرِ ساحل کا اک آئینۂ سوزِ نہانی ہے
خزاں کا دَور ہے لطفِ بہاراں ہو گیا رخصت   چمن سیراب کیا ہو ابرِ باراں ہو گیا رخصت
جہاں کا ذرّہ ذرّہ سوزشِ غم سے تپیدہ ہے   چمن کا غنچہ غنچہ سرنگوں ہے آبدیدہ ہے
شجر سکتے میں ہیں، خاموش مرغانِ گلستاں ہیں   بہار و باغ کے جتنے بھی اجزا ہیں پریشاں ہیں
نہ اب وہ کیف کا عالم، نہ اب وہ جوشِ مستی ہے
در و دیوار سے رہ رہ کے مایوسی برستی ہے

نگاہِ یاس میں تاریک سا تاریک منظر ہے   نہ کوئی میرا مونس ہے، نہ کوئی میرا رہبر ہے
گلستاں بن گیا ہے ایک وحشت خیز ویرانہ   مری قسمت ہے گردش میں تو ہیں سب مجھ سے بیگانہ
بھنور میں ڈوب جائے گا سفینہ آہ کیا میرا   خدا حافظ کہ غرقابِ فنا ہے ناخدا میرا
جگر تفتیدہ ہے اِک آگ سی اٹھتی ہے سینے میں   نظر آتا ہے مرنے کا نظارہ مجھکو جینے میں
مگر مرنے سے بھی معذور ہوں، مرنے کو مرتا ہوں
پچھاڑیں کھا رہا ہوں، ماتمِ مرحوم کرتا ہوں

مری مجبوریاں بھی مجھ پہ اب آنسو بہاتی ہیں   مری مہجوریاں بھی مجھکو رہ رہ کر ستاتی ہیں
کوئی اپنا نہیں کس کو سناؤں حالِ زار اپنا   ہوا ہے نیشِ غم سے کلیجہ تار تار اپنا

لہ حضرت اعلاؔ ورما سحر ہنگامی

نجانے کیوں چڑھا آتا ہے ظالم آسماں سر پر
گرایا ہے غم و آلام کا کوہِ گراں سر پر
نہ ہمدم کوئی اپنا ہے، نہ کوئی پاسباں اپنا
ہوا جاتا ہے غرقِ یاس قلبِ ناتواں اپنا
زبانِ بے زباں سے اب تو دل کی ترجمانی ہے
کچھ اپنی داستاں ہے اور کچھ ان کی کہانی ہے

نہیں جب سایۂ سر، کون سر پہ ہاتھ رکھے گا
جگہ آنکھوں میں دیگر کون ہر دم ساتھ رکھے گا
گلے مل مل کے رخصت ہو رہی ہیں حسرتیں دل سے
یہ موجیں ہو رہی ہیں منتشر ٹکرا کے ساحل سے
پریشانی نے مجھکو کر دیا عاجز، پریشاں ہوں
شکارِ یاس و حسرت ہوں، اسیرِ رنج و حرماں ہوں
نفس کی ہر صدا دیتی ہے پیغامِ فنا مجھکو
فنا ہی میں نظر آتی ہے امیدِ بقا مجھکو
میسّر ہو مجھے اس دارِ فانی سے سفر کرنا
مقدر ہے غم و آلام میں رہ کر بسر کرنا

قطعہ بر رحلت جناب سحر ہنگامی

حضرت ابو الفاضل راز چاندپوری

آہ! وہ سحر، سحر ہنگامی
شاعرِ خوش کلام و سحر طراز
وہ ادیبِ لبیب و صاحبِ دل
نکتہ سنجِ رموزِ سوز و گداز
مستِ خمخانۂ مئے اردو
عارفِ کیفِ بادۂ شیراز
رہروِ منزلِ خلوص و وفا
جادہ پیمائے راہِ راز و نیاز
پیکرِ حسنِ خلق و لطف و کرم
صاف گو، خوش نظر، خلوص نواز
واقفِ رازِ نظرتِ عالم
آشنائے جہانِ سوز و ساز
حیف صد حیف، بزمِ ہستی سے
اٹھ گیا، اٹھ گیا وہ سحر طراز

تنقیدِ کتب

دیوان ثاقب

(نوشتۂ پنڈت امرناتھ جھا صاحب وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی)

(مترجمہ۔ سید محمد حسن احسن طبا طبائی، ایم۔ اے۔ بی ٹی)

مشاعروں اور مجلسوں کے منظر پر ایک انسان نظر آتا ہے نحیف الجثہ، اپنے خیالات میں ڈوبا، اپنے ماحول پر متجسس نگاہیں ڈالتا، کبھی مسکراتا، کبھی اپنی شاعری کے نشہ میں چور اور آدابِ ظاہری سے بے پروا، اپنی روح کی پوشیدہ قوتِ احساس کو ظاہر کرتا اور کبھی حقیقی تعریف کے اعتراف میں اپنی جگہ سے یکایک اٹھتا، یہ شاعر ہے۔ لیکن خبردار یہ نقد و تبصرہ کا وقت نہیں ہے، ان محفلوں کی تحسین تعریف کی صدائیں کانوں میں گونج رہی ہیں اور دل و دماغ پر ان کے اثرات چھائے ہیں۔

شائبۂ عناد سے پاک اور اعتدال سے متصف نقد و تبصرہ اور یادِ ماضی کے لئے سکون و راحت سے معمور ماحول کی ضرورت ہے اور ہم انھیں خیالات پر واقعی فخر کر سکتے ہیں جو اس فضا میں فکر کرنے کا نتیجہ ہوں۔

مرزا ثاقب قزلباش اُن شعرا میں سے ہیں جن کا کمال مرضِ فنا سے مامون و مصئون نہیں، مگر جنھوں نے لیلائے شاعری پر اپنی عمرِ گرانمایہ قربان کر دی۔ اور اپنے عشق کا دامن داغِ بے وفائی سے محفوظ رکھا۔ وہ قریب قریب نصف صدی سے شاعری کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اور گو انصاف انھیں غیر فانی شعرا کی صف میں جگہ دینے میں تامل کرتا ہے لیکن یہ بھی خلافِ حقیقت ہوگا اگر یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ خیالات کی جدت اور طرزِ ادا کی تازگی کے لحاظ سے ثاقب صاحب دورِ آخر کے شعرا میں کافی ممتاز درجہ پر فائز ہیں۔ ان کا کلام باعتبار فن کامل ہے لیکن ترنم و موسیقی کا فقدان محسوس و نمایاں وصف ہے۔ ان کی نغمہ سنجیاں دلکشی و دلفریبی سے محروم ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے نظریوں میں کافی ذہنی استحکام نہیں ہے اور وہ ان ممتاز ترین زمزمہ پردازانِ چمنستانِ سخن میں سے نہیں، جن کے راگ ہمارے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔

غزل کی تاریخ کافی طولانی ہے خواہ اس کا تعلق اُردو سے ہو یا فارسی سے، اکثر ممتاز شعرا نے اسے اپنے اظہارِ خیال کا مرغوب طریقہ سمجھا ہے۔ انسانی جذبات اس میں نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے اشارات و تلمیحات کافی مشہور ہیں۔ غزل کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ جذبۂ محبت کا مخصوص و مکمل مرقع ہے۔ عاشقوں کی حسرتوں

در اُمیدوں اور معشوقوں کی حیرت انگیز کیفیتوں کو باکمال شعرا نے اس خوبی سے نظم کیا ہے کہ ایک ڈرا حوصلہ مند شاعر بھی غزل کہتا ہوا جھجکتا ہے۔ تاہم قبول عام کی وجہ سے غزل ابھی تک شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ وہ شاعر جو اس دور آخر میں غزل میں تازگی پیدا کرتا اور اس کے ساز پر نئے نئے راگ چھیڑتا ہے وہ حقیقی امتیاز حاصل کرتا ہے۔ غزل حقیقت میں نظم عاشقانہ کا نام ہے۔ ابھی تک اس کی نغمہ ہائے محبت سے معطر ہے اور اس کے عناصر میں سلطانِ مذاق نوازی موجود ہے۔ لیکن زمانۂ حال کے شاعروں کے رجحان نے اب اسے زیادہ تر اپنے فلسفۂ حیات کا آلۂ اظہار بنا لیا ہے۔ غزل کی بنیاد عروض پر قائم ہے اور اس سے اس کے مختصر ہونے میں مدد ملتی ہے۔ ثاقب کی غزلوں میں بہت سے ایسے مفید اقوال منتشر ملتے ہیں جن کی تہ میں تجربات زندگی پنہاں ہیں۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ ہر غزل وقتی کیفیت اور عروض کی مخصوص پابندیوں کے ساتھ نظم کی جاتی ہے لیکن ان منتشر اشعار کا مجموعی اثر زندگی کے ایک مستقل نظریہ کو پیش کرتا ہے۔

چھپاؤ آپ کو جس رنگ یا جس بھیس میں چاہو
مگر چشم حقیقت بیں سے پردہ ہو نہیں سکتا

جو کچھ ہوا عالم میں، ہوتا نہ تو کیا ہوتا!
بہتر تھا بگڑنے کو یہ دل نہ بنا ہوتا

جہاں تھا تنگ جس طولِ عمل کے پھیل جانے سے
لحد میں آ گیا سارا وہ قصہ مختصر ہو کر

افسوس ہے کہ شمع فانی نے ختم ہو کر
مجھکو وہی بتایا جس کو میں جانتا تھا

اپنے ہی دل کی آگ میں آخر پگھل گئی
شامِ حیات موت کے سانچے میں ڈھل گئی

یہ ہے بہتے ہوئے دریا کی آواز
وہیں جانا ہے آئے تھے جہاں سے

ہنس کے بھی رو کے بھی کہا لیکن
مطلبِ دل کبھی ادا نہ ہوا

دل کے قصے کہاں نہیں ہوتے؟
ہاں، وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے

موت وہ اچھی کہ جس کے بعد مل جائے حیات
جو سبب ہو موت کا وہ زندگی بیکار ہے

یا میرے رونے سے یا تصویرِ عالم تھی یہی
جب کھلیں آنکھیں تو عالم دیدۂ پُر آب تھا

ہم تو ہر ذرّے سے رونے کی صدا سنتے ہیں
لوگ ویرانے کو کہتے ہیں کہ آباد نہیں

میں کہہ رہا ہوں باغ ہو، گل ہو، بہار ہو
تقدیر کہہ رہی ہے کہ غم کے شکار ہو

رحم دیتا ہے کوئی خوش ہو کوئی ناشاد ہو
جب اُجڑ جائے نشیمن تو قفس آباد ہو

بانٹ لیں دنیا کو ہم تم مل کے عیش و رنج میں
ایک جانب قہقہے ہوں ایک طرف فریاد ہو

بُن نہ دیکھ نشیمن کو دیکھ اے بلبل
بہار ہی میں کبھی آگ بھی برستی ہے

میری پیری سے کیوں تعجب ہے
رنج والے جوان نہیں ہوتے

اِن مخصوص اشعار کا مجموعی اثر یہ ہوتا ہے کہ موہوم سی افسردگی پیدا ہوتی ہے آنکھوں میں نمی محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ قطعی یقین ہوتا ہے کہ دنیا رنج وغم کی ایک وادی ہے۔ کوشش کرنا بے معنی ہے خاتمہ پہلے سے مقدر ہو چکا ہے زندگی کی راہ میں ہچکیاں ہیں سسکیاں ہیں آہیں ہیں اور ایک ٹوٹا ہوا دل۔ بہار ہمیں ایک لمحے کے لئے خوش کرنے آتی ہے اور ہم آمدِ بہار کی مسرت میں گم ہوجاتے ہیں پھر بادل گرجتے ہیں بجلی چمکتی ہے اور آشیانے جل کر خاک ہو جاتے ہیں تنہائی اور جدائی ہماری قسمت میں لکھی ہے۔ دعا کے لئے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھانا بیکار ہے۔ یہ تو ظلم اور تغافل کا دوسرا نام ہے۔ یہ خیالات کہاں تک محض روایات پر مبنی ہیں اور کس حد تک شاعر اس غمگین فضا کے متعلق اپنی ذاتی رائے پیش کرتا ہے یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ مولانا ثاقب کے کلام میں مسرت اور سکون قریب قریب مفقود ہیں اور اس بنا پر اگر یہ رائے قائم کی جائے تو شاید زیادہ غلط نہ ہوگا کہ مولانا ثاقب کو زندگی میں سکون و راحت کی آرزو اور زیادہ تر اپنے خیالات کی دنیا میں بسنے کی حسرت ہے جہاں اُنھیں زندگی کی حقیقت سے نجات مل سکتی ہے۔ اسی طرح خیالات اور تمنائیں خود ایک مخصوص حقیقت اختیار کر لیتی ہیں یہاں شاعر یہ بہتر سمجھتا ہے کہ اپنی تخئیل کا رخ اپنے ہم سفیروں کی طرف پھیر دے اور اُن کی یاد میں وہ مسرتیں حاصل کرے جن کی کمی وہ خود محسوس کرتا ہے۔

"رنج والے جواں نہیں ہوتے"

یہ بالکل فطری بات ہے کہ زیادہ تر اشعار عاشقانہ ہیں اور یہ بات بھی اُتنی ہی فطری ہے کہ زیادہ تر مضامین فرسودہ ہیں پھر بھی ثاقب صاحب اپنے اندازِ بیان میں تازگی بخش تنوّع اور تشبیہات میں صفائی باقی رکھنے میں کامیاب ہیں۔ ساقی۔ واعظ۔ شمع و پروانہ۔ دیر و حرم۔ توبہ۔ بلبل اور بہار۔ صیاد اور آشیانہ۔ ثاقب صاحب نے اپنے اشعار میں اُن تمام مشہور تشبیہوں اور استعاروں کو نظم کیا ہے۔ لیکن اس خوبی سے کہ پڑھنے والے کے لئے ان کی فرسودگی و بوسیدگی باعثِ تکدّرِ طبع نہیں ہوتی۔ بطور مثال

گلچیں بُرا کیا جو یہ تنکے جلا دیئے	تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دُور تھا
آئے ہو گورِ غریباں میں تو باتیں نہ کرو	ذرّے کچھ کہتے ہیں خاموش ذرا ہو جانا
چل بیاباں کی طرف جی نہیں گھبرانے کا	روحِ مجنوں سے گھر آباد ہے ویرانے کا
بڑھائے حوصلے دریا دلی نے ساقی کے	ذرا سے جام میں سو بار آفتاب آیا
شبِ فراق میں دل سے بھی بات کر نہ سکا	وہ تخلیہ تھا کہ کوئی بجز ہوا نہ رہا
ایک جلتی شمع اُٹھوادی بہت اچھا کیا	سوختہ دل تھا میں کوئی رونقِ محفل نہ تھا
وہ لحد پہ اُن کا آنا وہ قدم قدم پہ محشر	مری نیند کیوں اُچٹتی اگر ایک بار ہوتا
اِک مرا آشیاں ہے کہ جلکر ہے بےنشاں	اِک طُور ہے کہ جب سے جلا نام ہوگیا

آڑ میں کوئی چھپا ہوگا بس اتنا یاد تھا
پتہ پتہ باغ کا میرے لئے صیاد تھا

جلوۂ حسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا
میں نہیں سمجھا مگر ہاں دل تڑپ کر رہ گیا

چھوٹتے نہ پر امید رہائی تو نہ جاتی
کھلتے ہوئے لیکن در زنداں نہیں دیکھا

کہنے کو شست پر کی اسیری تو تھی مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

گزرے گی یونہی شام و سحر دیکھتے رہنا
جو ہے وہ نہ آئے گا نظر دیکھتے رہنا

دیار دل میں کہیں دوست کا پتہ نہ ملا
وہ بدنصیب ہوں کعبہ میں بھی خدا نہ ملا

فارسی اور اردو کی عاشقانہ شاعری کی متاع بہا گراں زیادہ تر افسردگی ہے۔ کامیابی سے زیادہ ناکامی اس کی خصوصیت ہے حصول مدعا کے عوض حسرتِ وصل، کی بجائے فراق، اور ہمدردی کے بدلے جور و تغافل، ایسی شاعری میں زیادہ تر انھیں باتوں سے تاثیر پیدا ہوتی ہے، لیکن اس سے اپنے ناقص ہونے کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے جس سے ہم کبھی کبھی اُکتا جاتے ہیں۔ قیامت کے دن بھی الزام عائد کئے جائیں گے۔ شکایتیں ہونگی تہمتیں لگائی جائیں گی، یا شاید خوفزدہ خاموشی چھائی ہوگی جس میں نہ شکایتیں سُنی جائینگی نہ حسرتیں زبان تک آئیں گی۔ اس شاعری میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شعر ملتا ہے جو مسرت انگیز ہو یا آئندہ مسرت کا مژدہ سناتا ہو۔ ان اشعار کا رنگ وہی ہے جو ہمیں براؤننگ کی نظم "پراسپیس" (Prospice) میں ملتا ہے۔ لیکن عاشق ان تمام باتوں کے باوجود محبت میں ثابت قدم رہتا ہے یا تو بہ طیب خاطر یا ایک ایسے جذبہ کے تحت میں جس پر وہ قابو نہیں رکھتا وہ اپنی اذیتوں میں خوشی محسوس کرتا ہے اُسے انتہائی ناامیدی کی تاریکی میں بھی رُخ محبوب کی شعاع نظر آتی ہے بہت سے خوش نصیب رقیب ہوتے ہوئے بھی اُسے اعتماد ہوتا ہے کہ اس کی وفاداری اسے مقصد سے ہم کنار کریگی۔ افسردگی اور محرومی کا انجام قطعی کامیابی ہے۔ کیونکہ وہ اپنا سب کچھ محبت کی بازی میں لگا چکا ہے۔ ایسا کامل ذاتی ایثار بیکار ثابت نہیں ہوسکتا۔ اپنا گھر، اپنے دوست، اپنے مشغلے اور اپنا ایمان یقیناً اُس نے ان سب کو بیکار نہیں قربان کیا ہے۔

ثاقب کا دیوان جس سے چند اشعار منتخب کرکے پیش کئے گئے ہیں ان کے فنافی الشعر ہونے کی دلیل بین ہے ان سے ان کی قادر الکلامی، فنی قابلیت اور فلسفیانہ اور عاشقانہ طبیعت پر روشنی پڑتی ہے، اپنا ذاتی نظریہ وہ بڑی خوبی سے نظم کرتے ہیں۔ دنیا اُن کے اکثر اشعار کو بھول جائیگی، وہ زمانہ بھی آئیگا جب اس دیوان کا مطالعہ دورِ ماضیہ کے ایک نمونے کی حیثیت سے کیا جائیگا۔ لیکن بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن کو آئندہ نسلیں خوشی سے فنا نہ ہونے دیں گی۔

رفتارِ زمانہ

جنگ کی رفتار بدستور جاری ہے۔ اس اثناء میں محاذاتِ جنگ اور سیاسیاتِ ہند میں بہت سے نئے واقعات رونما ہوئے، جہاں تک جنگ کا تعلق ہے اس وقت روس، لیبیا، برما اور جنوب مغربی بحرالکاہل، شمالی بحرالکاہل اور چین میں لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ جن کے مختصر حالات ذیل میں درج ہیں:۔

روس | روس میں کاکیشیا کے سرا لینن گراڈ سے لیکر روستوف تک جنگ کی رفتار دھیمی رہی۔ عام خیال یہ ہے کہ اول تو برف پگھلنے کی وجہ سے زمین میں ایسی دلدلی کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ ٹینکوں، لاریوں اور فوجوں کی نقل و حرکت دشوار تھی جب تک پانی سوکھ کر زمین سخت ہو اُس وقت تک جنگی سرگرمیوں کا سرد پڑ جانا ایک قدرتی بات تھی، تاہم اس اثناء میں فریقین ایک دوسرے سے بے خبر نہیں رہے۔ وہ ایک دوسرے کی طاقت سے بخوبی واقف ہیں، اس لئے دونوں وسیع پیمانہ پر جنگی تیاریوں میں مصروف رہے، دونوں ٹکر لینے کو تیار ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ روس میں کیا اور کب فریقین کی طرف حملہ ہو جائے۔

روستوف اور خارکوف روسیوں نے جرمنوں سے چھین لئے تھے، مگر خارکوف کو تو دوبارہ فتح کر لینے میں جرمن کامیاب ہو گئے تھے، البتہ روستوف جو شمال کی طرف سے کاکیشیا کی کلید ہے ابھی تک روسیوں ہی کے قبضہ میں ہے۔ جرمن فوجیں اس وقت ٹاگنروگ کے خطا پر مورچہ بند ہیں۔ اسی اثناء میں جرمن فوجوں نے دریائے ڈونیتز کو پار کر لینے کی زبردست کوشش کی، مگر ان کی کوشش بہادر روسیوں نے ہر بار ناکام بنا دی۔ یہ بھی خبر آئی تھی کہ اوریل کے جنوب میں جنگ کے شعلے پھر بھڑک اُٹھے ہیں۔ لیکن بعد میں اس سلسلہ کی کوئی خبر موصول نہیں ہوئی۔

وادی دریائے کیرچ میں جو مغربی کاکیشیا میں کریمیا کے سامنے واقع ہے جنگ کی آگ پھر بھڑک اُٹھی ہے۔ یہاں روسی فوجیں دشمن کے مورچوں کو توڑ کر آگے بڑھ گئی ہیں اور اب وہ جرمن مورچوں میں سترہ چوڑے شگاف ڈال کر اتنی پیش قدمی کر چکی ہیں کہ بحر اسود کی اہم بندرگاہ نوورو شسک سے صرف آٹھ میل کے فاصلہ پر رہ گئی ہیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ کریمیکایا کے میدان میں بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ لیکن فتح کا سہرا روسیوں کے سر رہا اور جرمن سات ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اب کریمیکایا روسیوں کے قبضہ میں ہے۔ بعض ماہرینِ جنگ کا خیال ہے کہ جرمن روسیوں کے مقابلہ میں اس قدر تنگ کر چور ہو گئے ہیں کہ اب ان میں جارحانہ کاروائیوں کی ہمت نہیں رہی ہے۔ اسی لئے وہ جگہ جگہ خندقیں کھود کر مورچہ بند ہو بیٹھے ہیں تاکہ اگر روسی حملہ کریں تو انہیں روکیں۔ مگر بعض مبصرین کا خیال اس کے برعکس ہے وہ کہتے ہیں کہ غالباً موجودہ گرمیوں میں جرمن فوجیں کاکیشیا تک پہنچ کر اپنا مستقر بنا کر ماسکو کی طرف پھر پیش قدمی کریں گی۔ گذشتہ واقعات و جرمن Military fanaticism کو دیکھتے

ہوئے۔ عام خیال ہے کہ موسم گرما میں جنگ کے شعلے پھر اس محاذ پر بھڑک اٹھیں گے اور جرمنی کاکیشیا اور یوکرین پر قبضہ کرنے کی ایک سر توڑ کوشش کریگا اور یہ جنگ سخت ہیبت ناک ثابت ہوگی۔ لیکن جرمنی کو ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑیگا اور اس لڑائی کا انجام یہ ہوگا کہ موسم سرما میں جرمن گھٹنے ٹیک دیں گے۔

روس کی امداد روسیوں کی فتوحات کا راز اُن کی بہادری، حب وطن، تنظیم، سامان جنگ کی بہتات اور اس امداد میں مضمر ہے جو انھیں امریکہ و برطانیہ کی طرف سے دیگئی اور دی جارہی ہے۔ امریکہ کے محکمۂ دھار دپٹہ کے افسر اعلیٰ نے اپنے تازہ بیان میں بتایا ہے کہ وہ کئی ہزار ہوائی جہاز، لاکھوں موٹر لاریاں اور ٹھیلے اور دس لاکھ ٹن سے زیادہ سامان خوراک روس کو بھیج چکے ہیں۔ امریکن افسر نے بتایا کہ یکم اپریل ۱۹۴۳ء تک پینتیس ۳۵ لاکھ ٹن سامان سمندری جہازوں کے ذریعہ سے روس بھیجا جا چکا ہے جس کی قیمت ایک ارب اسی کروڑ چھپن ۵۶ لاکھ اور ستتر ہزار ڈالر ہے۔ یہ سچ ہے کہ جرمن آبدوز کشتیوں کی وجہ سے یہ کل سامان اپنی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکا لیکن اس میں سے زیادہ تر سامان صحیح سلامت پہونچ گیا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ شمالی بحری راستے سے بھیجا گیا اور یہیں زیادہ نقصان بھی ہوا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جو ہوائی اور سمندری جہاز روس کو بھیجے گئے اُن کی قیمت سرسٹھ کروڑ پچاس لاکھ ڈالر ہے۔ یکم اپریل ۱۹۴۳ء تک دس لاکھ ٹن سامان خوراک روس کو بھیجا جا چکا ہے۔

روس و پولینڈ افسوس ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ فسطائی طاقتوں کو کچلنے کے لئے پورے پورے اتفاق و اتحاد کی انتہائی ضرورت ہے حکومت روس اور حکومت پولینڈ میں (جو آجکل لندن میں ہے) تنازعہ ہوگیا۔ اور حکومت روس نے ناراض ہوکر پولینڈ سے اپنے سیاسی تعلقات منقطع کرلیے ہیں۔ بنائے تنازعہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ پولینڈ نے کچھ ایسے علاقے کا روس سے مطالبہ کیا جس کا تعلق یوکرین، سفید روس، اور لیتھونیہ سے ہے اور جن سے روس دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔ اس مطالبہ کے جواز سے اس وقت بحث نہیں لیکن جنگ کے دوران میں اس قسم کا مطالبہ کرنا دانشمندانہ سیاست نہیں کہا جاسکتا۔ دوسری وجہ تنازعہ یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ سمولنسک کے جنگل میں جو اس وقت جرمنی کے قبضہ میں ہے بارہ ہزار پولش افسروں کی لاشیں برآمد ہوئیں۔ یہ علاقہ روس و پولینڈ کی جنگ کے وقت روس کے قبضہ میں تھا جرمنوں کا دعویٰ ہے کہ یہ افسران روسیوں نے قتل کئے تھے۔ حکومت پولینڈ نے جرمن پروپگنڈا سے متاثر ہوکر مطالبہ کیا کہ اس معاملہ کی بذریعہ بین الاقوامی ریڈ کراس سوسائٹی تفتیش کرائی جائے۔ روس نے یہ مطالبہ منظور نہیں کیا۔ اس پر جرمن اور پولش اخباروں نے روس کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کردی۔ یہ بات روس کو ناگوار گزری۔ تیسری بنائے نزاع پولینڈ کا یہ مطالبہ ہے کہ روس میں پولش افسران و سپاہیوں کو روس سے واپس آنے کی اجازت دی جائے۔ اس باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس نے پولینڈ سے اپنے سیاسی تعلقات منقطع کرلئے۔ اب پولینڈ نے بین الاقوامی ریڈ کراس سوسائٹی کے ذریعہ سے تفتیش کا مطالبہ چھوڑ دیا ہے۔ برطانیہ و امریکہ کوشش کررہے ہیں کہ کسی صورت سے روس و پولینڈ کے اختلافات مٹ جائیں اور امید کی جاتی ہے کہ آپس کی یہ پھوٹ جلد ختم ہوجائیگی۔

ٹیونیشیا ٹیونس کی لڑائی اب آخری مرحلہ تک پہونچ رہی ہے۔ مغربی طرابلس خالی کرانے کے بعد آٹھویں برطانی لشکر نے فوری تیز گامی سے

پیش قدمیاں کی تھیں اور دشمنوں پر آمادہ یلغار ڈالا تھا کہ وہ یکے بعد دیگرے بہت سے شہر مورچے اور بندرگاہیں خالی کرتا چلا گیا۔ مگر اس طرف اتحادی افواج کی پیش قدمیاں کچھ دھیمی پڑ گئی ہیں۔ اس وقت دشمن تیونس کی شمالی پہاڑیوں میں مورچہ بند ہے، اور اگرچہ ان پہاڑی مورچوں کا توڑنا آسان نہیں ہے، پھر بھی اتحادی فوجیں ہر محاذ پر کچھ نہ کچھ پیش قدمی کر رہی ہیں۔ دشمن ہر جگہ بڑی سختی کے ساتھ مزاحمت کر رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے آخر دم تک لڑنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ بایں ہمہ اس کی پسپائیوں کا سلسلہ جاری ہے اور یقین ہے کہ بہت کم مدت میں شمالی افریقہ کی سرزمین دشمن کے قدموں سے خالی ہو جائیگی۔ دشمن نے تیونس اور بزرطہ کو سب سے زیادہ قلعہ بند کیا ہے۔ امریکن فوجوں نے مطر کا مورچہ فتح کر لیا ہے۔ ادھر برطانوی لشکر نے دھاوا کر کے جبل بوعکاظ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب تیونس تک تمام میدان برطانوی فوجوں کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ برطانوی فوجیں تیونس کی طرف اور امریکن فوجیں فرانسیسی فوجوں کے ساتھ بزرطہ کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ اگر اتحادی فوجیں تیونس و بزرطہ کے درمیان یا تیونس اور مطر کے درمیان دشمنوں کا سلسلۂ تعلقات منقطع کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو دشمن کا صفایا بہت جلد ہو جائیگا۔ صرف شمال مشرق میں ایک تنگ سا گوشہ باقی رہ جائے گا جہاں دشمنوں کو پناہ مل سکے گی۔ افریقہ سے دشمن اپنی فوجیں بچا کر نہیں لے جا سکتا کیونکہ اس وقت بحیرۂ روم اور ہوا میں اتحادی سمندری اور ہوائی بیڑوں کو زبردست فوقیت حاصل ہے اور وہ بھاگتی ہوئی دشمن فوج کا صفایا کر دیں گے۔ تیونس سے جو تازہ ترین اطلاعات آئی ہیں اُن سے معلوم ہوا ہے کہ برطانوی فوجوں نے شہر تیونس پر اور امریکن فوجوں نے بزرطہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ دشمنوں کے پچاس ہزار سپاہی اور چار جنرل قید ہو چکے ہیں۔ جرمن جنرل رومیل تیونس سے پہلے ہی چلا گیا تھا اب جنرل آرنم بھی بھاگ گیا ہے۔ تیونس کی لڑائیوں میں دشمنوں کو کس قدر نقصان پہونچایا گیا؟ اس کے متعلق اتحادیوں کے شائع کردہ تازہ بیان سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۱ نومبر ۱۹۴۲ء سے ۲۵ مئی ۱۹۴۳ء تک اتحادی ہوائی جہازوں نے دشمنوں کے ایک ہزار چھ سو پچپن ہوائی جہاز تباہ کئے ہیں۔ اور چھ سو اکتیس ہوائی جہاز اتحادیوں کے ضائع ہوئے ہیں۔ اتحادی ہوائی جہازوں نے دشمن کے اہم ٹھکانوں پر ایک کروڑ پچاسی لاکھ چھبیس ہزار سات سو بیس پونڈ وزنی بم گرائے ہیں اور ہوائی حملوں سے دشمنوں کے باسٹھ سمندری جہاز ڈبو دئیے ہیں۔

برہما گذشتہ جاڑوں میں اتحادی فوجوں نے اچانک حملہ کر کے برہما کے ستر میل اندر دو مقامات پر بلا مقابلہ قبضہ کر لیا تھا، اُس وقت سے بہت دنوں تک برہما کے محاذ کی سرگرمیوں کی تفصیلات آنا بند رہیں۔ البتہ اتحادی ہوائی جہازوں نے رنگون، مانڈلے اور برہما کے بہت سے دیگر اہم مقامات پر حملوں کی خبریں تفصیل کے ساتھ آتی رہیں۔ جاپانی ہوائی جہازوں نے بھی آسام اور بنگال کے بعض مقامات خصوصاً چٹگاؤں پر وقتاً فوقتاً حملے کئے۔ اب اراکان کے محاذ کی جو خبریں "اسٹیٹسمین" کے خاص نامہ نگار اور بعض دوسرے دیکھنے والوں کے موصول شدہ بیانات سے معلوم ہوا ہے کہ اراکان میں جنگی پوزیشن خاطر خواہ نہیں ہے جاپانی فوجیں پیش قدمی کرنے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔ اگرچہ یہ پیش قدمی شدید نقصانات اٹھا کر ہوئی ہے۔ انگریزی فوجوں نے بعض مقامات کو جن پر برسات کے زمانہ میں قبضہ رکھنا دشوار ہوتا خالی کر دیئے ہیں۔ نئی دہلی سے جو سرکاری اطلاعنامے شائع ہوتے ہیں اُن سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جاپانی شدید نقصانات اٹھانے کے باوجود پیش قدمی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان کی کوششیں ناکامیاب بنا دی جاتی ہیں۔ بہر حال

معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حملہ کی پہل جاپانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ تازہ خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ انگریزی فوجیں بوتھیڈانگ سے ہٹ گئی ہیں اور جاپانیوں کا دباؤ بڑھتا جاتا ہے۔

چین | چین میں جاپانیوں کی سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں اور آجکل کوہستان تھیانگستان کے مختلف مقامات پر گھمسان کی لڑائیاں ہورہی ہیں۔ جاپانی فوجیں بعض مقامات پر قبضہ کرنے میں کامیاب بھی ہوگئی ہیں۔ مگر چینی بہادر بڑی پامردی اور استقلال کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کررہے ہیں۔ کاش چینیوں کو مدد پہونچنے کے راستے کھلے ہوتے تو وہ جاپانیوں کے دانت کھٹے کردیتے چین میں کچھ امریکن ہوائی جہاز موجود ہیں جو جاپانی ٹھکانوں پر حملے کرکے نقصان پہونچاتے رہتے ہیں۔ چین سے خبریں عموماً کم آتی ہیں، بہرحال لڑائی ہورہی ہے۔

بحرالکاہل | اس وقت جنوب مغربی اور شمالی بحرالکاہل میں لڑائیاں ہورہی ہیں، اور یہ زیادہ تر ہوائی اور سمندری ہوتی ہیں۔ شمالی بحرالکاہل میں امریکہ کے صوبہ الاسکا کے مغرب میں مجمع الجزائر الیوشن کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ ان جزیروں کا اہم ترین مقام جسے دارالحکومت ہی سمجھنا چاہیئے شہر کسکا ہے۔ جاپانیوں نے شروع ہی میں ان جزیروں میں سے اکثر پر قبضہ کرکے اپنے سمندری اور ہوائی اڈے بنالئے تھے۔ امریکن ہوائی جہاز بار بار آکر ان جاپانی اڈوں پر بمباری کرکے نقصان پہونچاتے ہیں۔ بعض روز حملوں کی اس قدر شدت ہوجاتی ہے کہ ایک ایک دن میں نو مرتبہ حملہ کیا جاتا ہے۔

جنوب مغربی بحرالکاہل میں جاپانیوں کی بحری و ہوائی طاقت بڑھتی جارہی ہے، اور جاپانی آبدوز کشتیاں بھی آسٹریلیا کے مشرقی سمندروں میں جہازوں کو نقصان پہونچارہی ہیں۔ اگرچہ آسٹریلیا اور امریکہ کے ہوائی جہاز جاپانیوں کی ہوائی اور بحری طاقت کو زبردست نقصان پہونچاچکے ہیں اور پہونچارہے ہیں، پھر بھی سمندر کے اس حصہ میں جاپانی طاقت بڑھتی جارہی ہے۔ پچھلے دنوں آسٹریلیا کے ایک ذمہ دار افسر نے بیان کیا تھا کہ آسٹریلیا کے شمال میں جو جزیرے واقع ہیں ان میں جاپانیوں نے دو لاکھ سے زیادہ فوج اور ہزاروں ہوائی جہاز لاڈالے ہیں، اور انھوں نے ہزاروں میل تک ہوائی اڈوں کا سلسلہ قائم کرلیا ہے۔ امریکن جنرل میک آرتھر نے بھی اس بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا تھا کہ آسٹریلیا کے شمال میں جو جزیرے واقع ہیں نیز جزائر شرق الہند کی تمام سمندری راہوں پر جاپانیوں کا قبضہ ہے۔ اب جاپانی جہازوں کی بڑی تعداد نے شمالی آسٹریلیا کی بندرگاہ پورٹ ڈارون پر ہوائی حملہ کرکے ایک بار پھر ظاہر کردیا ہے کہ آسٹریلیا کو ابھی جاپانی حملہ کا خطرہ باقی ہے۔ بہرحال ان جزیروں کے اندر فریقین کی بری فوجوں کی لڑائی تو کہیں نہیں ہورہی ہے۔ البتہ ہوائی اور بحری آویزشیں ہوتی رہتی ہیں جن میں فریقین کا نقصان ہوتا ہے۔

امریکہ | جنگ کی وجہ سے دنیا جو اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہورہی ہے اس سے تنگ آکر مزدور طبقے کارخانوں کے مالکان کے سامنے اپنے مطالبات عموماً پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان میں آئے دن ایسا ہوتا رہتا ہے۔ امریکہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ جہاں تقریباً پانچ لاکھ مزدوروں نے جو کوئلہ کی کانوں میں کام کرتے ہیں اضافۂ اجرت کا مطالبہ کرکے ہڑتال کردی۔ پریسیڈنٹ روزویلٹ نے اس وقت بڑی دانائی سے کام لیا۔ انھوں نے ہڑتالیوں سے کہا کہ میں اس وقت بحیثیت پریسیڈنٹ امریکہ یا کمانڈر بحیثیت افواج

بری، بحری وہوائی امریکہ نہیں بلکہ مزدوروں کے ایک دوست کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ آپ ہڑتال نہ کیجئے لیکن مزدوروں کی یونین نے پریسیڈنٹ کی اس اپیل پر کوئی توجہ نہ کی، تو پریسیڈنٹ روز ویلٹ نے تمام کانوں پر سرکاری قبضہ کر لیا۔ کوئلہ کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی یونین نے اس شرط پر کام شروع کر دیا ہے کہ دو ہفتہ کے اندر اندر ان کے مطالبات پر گفت وشنید کر کے سمجھوتہ کر لیا جائے۔ بات چیت ہو رہی ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ سمجھوتہ ہو جائیگا۔

جنوبی افریقہ | جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ نے ایک نیا قانون پاس کیا ہے جس کی رو سے کوئی ہندوستانی اُن علاقوں میں جو یوروپینوں کے لئے مخصوص ہیں، نہ رہ سکتا ہے نہ جائداد خرید سکتا ہے اور نہ کاروبار کر سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ کی گورنمنٹ آج سے ہی نہیں بلکہ مدتوں سے ہندوستانیوں کو کچل ڈالنے کی تدبیریں اختیار کر رہی ہے۔ اس سے پہلے جنوبی افریقہ میں ہندوستانی تارکانِ وطن کا داخلہ بند کر دیا گیا تھا۔ لطف یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کی گورنمنٹ نے اس بارہ میں گورنمنٹ برطانیہ سے بھی کوئی صلاح ومشورہ نہیں کیا۔ ہم خوش ہیں کہ حکومت ہند نے جنوبی افریقہ کی اس کارروائی کے خلاف سخت اور سنجیدہ الفاظ میں احتجاج کیا ہے۔ لیکن ہندوستان اور جنوبی افریقہ کی حکومتوں میں فرق ہے۔ جنوبی افریقہ کی حکومت آزاد وخود مختار حکومت ہے مگر ہندوستان ایک ماتحت اور غلام ملک ہے جسے برٹش گورنمنٹ کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔ اگر ہندوستان بھی آزاد ہوتا تو دنیا کا کوئی ملک بھی اس کے فرزندوں کی اس قدر توہین نہیں کر سکتا تھا جتنی کہ جنوبی افریقہ نے کی ہے۔ جنوبی افریقہ کی گورنمنٹ کو کم سے کم اتنا ہی خیال کر لینا چاہیئے تھا کہ اس وقت ہندوستان جنگ میں جان ومال سے مدد دے رہا ہے، اس لئے دوران جنگ میں تو ہندوستانیوں کے حقوق پامال کرنا مناسب نہیں تھا۔ اور برٹش گورنمنٹ کو بھی لازم تھا کہ وہ جنوبی افریقہ کو جتا دیتی کہ اس وقت جنوبی افریقہ کا ہندوستانیوں کے خلاف قدم اُٹھانا اتنا ہی نقصان دہ ثابت ہوگا جتنا کہ پولینڈ کا یہ مطالبہ ثابت ہوا کہ بارہ ہزار پول افسروں کی موت کے معاملہ کی تفتیش بین الاقوامی ریڈ کراس سوسائٹی کے ذریعہ سے کرائی جائے۔

ہندوستان | اسی اثنا میں ہندوستان میں پیر پگارو کے مریدوں کا جو "حُر" کہلاتے تھے بڑی سختی سے استیصال کیا گیا۔ خود پیر پگارو اور اُس کے بڑے بڑے مریدوں کو پھانسی دیدی گئی۔ ان کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ ضبط کر لی گئی۔ اس کے علاوہ صوبوں کی وزارتوں میں بھی ردوبدل ہوا ہے۔ وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل میں بھی تغیرات ہوئے نئے وائسرائے کا تقرر ہونے والا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ آل انڈیا مومن کانفرنس اور آل انڈیا ہندو سبھا کے جلسے یکے بعد دیگرے ہوئے۔ ان جملہ واقعات کی تفصیلات ذیل میں جدا جدا درج کی جاتی ہیں:-

سندھ | سندھ میں پہلے خان بہادر اللہ بخش کی وزارت قائم تھی، اور چونکہ انہیں سندھ اسمبلی کی کانگریسی پارٹی کی خاموش حمایت حاصل تھی اس لئے ان کی پوزیشن کافی مضبوط تھی۔ مگر خان بہادر اللہ بخش کی چند باتیں حکومت کو ناگوار گذریں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے پریس اور پلیٹ فارم سے قوم پرستانہ خیالات کا اظہار کیا، دوسرے انہوں نے "خان بہادر" اور "او۔بی۔ای" کا خطاب واپس کر دیا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر سندھ نے انہیں برخاست کر دیا۔ چند روز کے بعد وزارت کی تشکیل کا کام گورنر

سر ابراہیم رحمت اللہ کے سپرد کیا جو مسلم لیگ کے لیڈر ہیں۔ سر ابراہیم رحمت اللہ نے کوشش کی مگر سابق وزارت کے ہندو وزیروں نے تعاون کرنے سے انکار کر دیا، لیکن سر ابراہیم ہندو پارٹی کو توڑ لینے میں کامیاب ہو گئے جنھوں نے اپنی پارٹی کی مخالفت کے باوجود وزارت قبول کر لی، اس طرح سندھ میں نئی وزارت قائم ہو گئی جس کے وزیر اعظم اور تمام مسلم وزرا مسلم لیگ کے ممبر ہیں۔ اس طرح گویا سندھ میں مسلم لیگی وزارت قائم ہو گئی۔

پنجاب | پنجاب کے سابق وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں کے اچانک انتقال کر جانے سے پنجاب کی وزارت میں بھی رد و بدل ہوا۔ میجر خضر حیات خاں وزیر اعظم مقرر کئے گئے جنھوں نے اپنے ہم خیال حضرات کی ایک وزارت مرتب کی۔ ہندو اور سکھ وزیر بدستور رہے خود میجر خضر حیات خاں مسلم لیگ کے لیڈر ہیں اور ان کے شریک کار مسلم وزرا بھی مسلم لیگ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن عملاً وہ اتحادی پارٹی کے پروگرام پر چل رہی ہے۔ سر چھوٹو رام وزیر مال اور سردار بلدیو سنگھ وزیر ترقیات اس بات کی تردید کر چکے ہیں کہ پنجاب کی وزارت مسلم لیگی ہے۔

بنگال | بنگال کی وزارت جو مسٹر فضل الحق نے بنائی تھی وہ اچھی خاصی چل رہی تھی کیونکہ اسے کرشک پرجا پارٹی اور پرجا پارٹی دونوں کی تائید و حمایت حاصل تھی۔ ان دونوں کی طاقت بنگال اسمبلی میں ۱۰۷ ہے۔ مسٹر فضل الحق نے اپنی پوزیشن زیادہ مضبوط کرنے کے لئے ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی کو اپنی وزارت میں شامل کر لیا۔ لیکن گورنر بنگال اس وزارت سے بدظن تھے۔ رفتہ رفتہ سکریٹریٹ کے عہدہ دار اور مستقل حکام نے ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی کے کاموں میں ایسے روڑے اٹکائے کہ وہ اور ان کے ایک اور ساتھی وزارت سے مستعفی ہو گئے، اور انھوں نے پریس اور پلیٹ فارم سے حکومت بنگال کی مشینری کا تمام راز فاش کر دیا۔ کچھ دنوں بعد گورنر بنگال نے مسٹر فضل الحق کو طلب کیا اور ایک نیشنل گورنمنٹ قائم کرنے کی فرمائش کی۔ کہتے ہیں کہ مسٹر فضل الحق ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ گورنر نے ان سے ایک کاغذ پر دستخط کرنے کا حکم دیا جس پر مسٹر فضل الحق کا استعفا پہلے ہی سے ٹائپ کیا ہوا رکھا تھا۔ چار و نا چار مسٹر فضل الحق کو اس کاغذ پر دستخط کرنے پڑے۔ اس طرح بنگال کی وزارت ٹوٹ گئی اور وہاں گورنری راج قائم ہو گیا۔ وزارت چھوڑنے کے بعد مسٹر فضل الحق نے بھی ملک پر ظاہر کر دیا کہ گورنر اور محکموں کے حکام اعلیٰ نے انھیں ان کی مرضی کے مطابق کام نہیں کرنے دیا تھا۔ اس کے بعد گورنر بنگال نے مسلم لیگ کے لیڈر سر ناظم الدین کو وزارت بنانے کا کام سپرد کیا۔ جنھوں نے بعض لوگوں کو ملا کر وزارت قائم کر لی ہے جس میں سات مسلمان تین ہندو اور تین اچھوت وزیر ہیں۔ ان کے علاوہ ۱۷ پارلیمنٹری سکریٹری مقرر کئے گئے ہیں گویا وزارت کیا ایک پورا لشکر ہے۔ یہ وزارت مسلم لیگی وزارت ہے لیکن یہ زیادہ دنوں چل نہیں سکے گی کیونکہ اسمبلی کے مخالف عنصر کی تعداد زیادہ ہے۔ بہر حال چونکہ ابھی بنگال کونسل اور اسمبلی معطل ہیں اس لئے یہ وزارت قائم ہے اور اسے اپنی طاقت بڑھانے کا موقع ملے گا۔ لیکن واقعات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ صوبوں کے گورنر اور ان کے ماتحت مستقل حکام ہی اصلی راج کرتے ہیں۔ وزیر لوگ بالکل بے دست و پا ہیں۔ اور صوبوں کی اندرونی خود مختاری جس کا اتنا ڈھول پیٹا جاتا تھا بالکل ڈھونگ ہے۔

صوبہ سرحد شمالی مغربی | صوبہ سرحد شمالی مغربی میں بھی مسلم لیگی وزارت قائم ہونے والی ہے۔ کیونکہ گورنر سرحد نے مسلم لیگ کے لیڈر سردار اورنگ زیب خاں کو وزارت بنانے کا کام سپرد کیا ہے۔ انھوں نے صوبہ کے سکھوں کو ملا لیا ہے، پانچ وزیر ہوں گے جن میں چار مسلمان

اور ایک سکہ ہوگا۔

اگزیکٹو کونسل | جب مہاتما گاندھی نے پچھلے دنوں اکیس دن کا برت رکھا، اور حکومت نے اس سلسلہ میں کچھ اچھے جذبات کا اظہار نہ کیا تو وائسرائے کی اگزیکٹیو کونسل کے تین ممبر سر ہومی مودی، مسٹر اینے اور مسٹر سرکار گورنمنٹ کی پالیسی پر احتجاج کرتے ہوئے مستعفی ہو گئے وائسرائے کو ان لوگوں کا جانشین منتخب کرنے میں تقریباً دو ماہ کی مدت لگی اور تینوں خالی جگہیں سر محمد عزیز الحق، ڈاکٹر کھرے اور مسٹر اشوک کمار رائے کے تقرر سے پوری کی گئیں۔ اور اس طرح وائسرائے کی اگزیکٹو کونسل کے ممبر پورے ہوگئے جن کی تعداد ۱۴ ہے۔ دو محکموں کے قلمدانوں میں بھی کچھ رد و بدل ہوا ہے۔ یعنی سر سلطان احمد سے محکمۂ قانون لیکر مسٹر اشوک کمار رائے کو دیدیا گیا ہے اور سر سلطان احمد کو محکمۂ اطلاعات و براڈکاسٹنگ دیدیا گیا ہے۔ ڈاکٹر کھرے کو سمندر پار کے ہندوستانیوں کا محکمہ دیا گیا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب پہلے سی۔ پی۔ میں کانگریسی وزیر اعظم تھے جنھیں ڈسپلن کی بنا پر کانگریس سے خارج کر دیا گیا تھا۔ یہ تینوں ممبر کیسے ہیں؟ ان کی قابلیتیں تو شک و شبہ سے بالا ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی جماعت یا ہندوستان کی پبلک کے نمائندے نہیں ہیں، ورنہ ہندوستان کو ان لوگوں سے کسی قسم کی دلچسپی ہے۔ لیکن ممبروں کی فرقہ وارانہ تعداد پر غور کرنے سے فوراً ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس جدید تقرر میں بھی مسلم لیگ نوازی کارفرما ہے۔ یعنی اب اگزیکٹیو کونسل میں چار ممبر یورپین، چار ہندو، چار مسلم اور ایک اچھوت ہیں۔ اس طرح سے گویا ہندو و مسلمان ممبروں کی تعداد برابر کر دی گئی ہے۔

مسلم لیگ | ۲۴۔ اپریل کو آل انڈیا مسلم لیگ کا تیسواں سالانہ اجلاس مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوا۔ رسمی کارروائیوں کے بعد مسٹر جناح نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا جس میں مسلم صوبوں کے اندر مسلم لیگ کی پوزیشن بیان کی۔ بنگال کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے مسٹر فضل الحق کی پالیسی کی سخت مذمت کی۔ وزارتوں کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا کہ مسلم لیگ اُس وزارت کا ہرگز ساتھ نہیں دیگی جو لیگ کی پالیسی پر عملدرآمد نہیں کریگی۔ ہندوستان کی موجودہ صورتِ حالات کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر جناح نے حسب دستور تمام ذمہ داری مہاتما گاندھی اور کانگریس پارٹی پر ڈال دی، اور کہا کہ کانگریس کی پالیسی اب بھی ویسی ہی ہے جو پہلے تھی۔ اس لئے کانگریس سے کسی گفت و شنید کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حکومت برطانیہ کو مخاطب کرتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا کہ ایک طرف تو وہ یہ کہتی ہے کہ کانگریس ایک باغی جماعت ہے اور ملک کا بہت بڑا حصہ اس کے ساتھ نہیں ہے۔ دوسری طرف جب حکومت کے اختیارات منتقل کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ کانگریس جیسی اہم جماعت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آخر میں مسٹر جناح نے یہ بھی کہا کہ مسلم لیگ ہندو لیڈروں سے پاکستان کی بنا پر سمجھوتہ کرنے کو تیار ہے۔

مومن کانفرنس | مسلم لیگ کے بعد ہی ۲۷۔ اپریل کو دہلی میں آل انڈیا مومن کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا جس میں مسٹر ظہیر الدین ایڈووکیٹ بالہ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ گورنمنٹ نے اپنے سیاسی تدبر کا کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کیا۔ خصوصاً اس نے مہاتما گاندھی متعلق نہایت نامناسب رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ ادھر گاندھی جی کی پوزیشن بھی ڈانواڈول ہے، ان کی موجودہ سیاست ختم ہو جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ گورنمنٹ کانگریس کی پوزیشن کے متعلق اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرے تاکہ کانگریس کو بھی اپنی پوزیشن پر دوبارہ غور کرنے کا موقعہ مل سکے۔ اور وہ تبدیل شدہ حالات کا صحیح جائزہ لے سکے۔

مسٹر ظہیر الدین نے صدر مسلم لیگ کے اس دعوے کی پرزور تردید کی کہ مسلم لیگ تمام ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت ہے۔ اور کہا کہ یہ دعویٰ نہ صرف غلط اور شر انگیز ہے بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔ کیونکہ ساڑھے چار کروڑ مومن قطعی طور پر مسلم لیگ کے ساتھ نہیں ہیں، اور نہ وہ لیگ کی پاکستانی اسکیم پر کوئی اعتقاد رکھتے ہیں، بلکہ وہ پاکستان کی مذمت کرتے ہیں۔ مسٹر ظہیر الدین نے کہا کہ اگر مسلم لیگ کا پاکستان منظور ہو جائے تو اس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچے گا۔ کیونکہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں وہ مفلوج ہو جائیں گے اور اُن کی حیثیت سدیلوں یا چودلوں کی سی ہو جائیگی۔ مجھے یقین ہے کہ اس صورت میں پاکستان والے ان مسلمانوں کی کوئی امداد نہ کر سکیں گے۔

آخر میں مسٹر ظہیر الدین نے جنوبی افریقہ کے نئے قانون کی مذمت کی اور کہا کہ انتہائی افسوسناک بات ہے کہ اس وقت جبکہ اتحادی قومیں دنیا بھر کی قوموں کی آزادی اور انصاف کی خاطر لڑ رہی ہیں، جنوبی افریقہ میں رنگ و نسل کے امتیاز کی بنا پر قانون پاس کیا جاتا ہے۔ برٹش گورنمنٹ کو شرم سے اپنی گردن جھکا لینا چاہئے اور آئندہ دولت مشترکہ برطانیہ کا نام نہیں لینا چاہئیے جنوبی افریقہ کی حکومت نوٹ کرے کہ ہندوستان اس بے انصافی کو کبھی فراموش نہیں کریگا۔

پنجاب پراونشل ہندو سبھا ۲۔ مئی کو لائلپور میں پنجاب پراونشل ہندو سبھا کا اجلاس زیر صدارت ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی ہوا جسمیں بہت سے ہندو لیڈروں نے پرجوش تقریریں کیں اور مندرجہ ذیل ریزولیوشن پاس کئے گئے۔ (۱) جنوبی افریقہ کی حکومت کے پاس کردہ جدید قانون کی مذمت کی گئی جس کے ذریعہ سے ہندوستانیوں کے حقوق کو پامال کر دیا گیا ہے (۲) دوسرا ریزولیوشن سردار سنت سنگھ ایم۔ ایل۔ اے نے پیش کر کے گورنر بنگال کی مطلق العنانہ اور خودسرانہ کارروائیوں کی مذمت کی گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ گورنر بنگال کو تبدیل کر دیا جائے۔ اسی ریزولیوشن میں گورنر سندھ کے رویہ کی بھی مذمت کی گئی۔ سردار صاحب نے پنجاب وزارت کو گورنر کا آلۂ کار بیان کیا اور مسٹر جناح کے بارہ میں کہا کہ وہ صوبوں میں مسلم لیگی وزارتیں بنا کر ہندوستان کی غلامی کی زنجیریں مضبوط کر رہے ہیں (۳) تیسرا ریزولیوشن لالہ کندن لال وجھنے پنجاب کی یونینسٹ وزارت کے خلاف پیش کیا جس میں بیان کیا گیا کہ یہ وزارت ہندوؤں کو کچلنے کی کوشش کرتی ہے لیکن ہندوؤں کی قربانیاں انھیں قائم رکھیں گی۔ (۴) چوتھا ریزولیوشن رائے بہادر مہر چند کھنہ نے مسلم لیگ کی پاکستانی اسکیم کے خلاف پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں آتم نرنے کا حامی ہوں۔ لیکن یہ اصول مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں، عیسائیوں سب کے لئے ہونا چاہئیے۔ جب برطانیہ انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور ویلز میں تقسیم ہونا گوارا نہیں کر سکتا، اور مصر مسلم مصر اور غیر مسلم مصر بن جانا پسند نہیں کر سکتا تو پھر ہندوستان کیونکر تقسیم ہونا گوارا کر سکتا ہے۔

تصحیح۔ زمانہ اپریل ۱۹۴۳ء میں افسانہ پڑاو میں ترجمہ مسٹر سلیم جعفر غلط چھپ گیا ہے۔ صحیح ترجمہ اربد شنا مضمون بعنوان "چند بردائی" صفحہ ۱۹۹ نوٹ نمبر ۴ میں چ کی جگہ چ ہونا چاہئے۔ اسی طرح نوٹ نمبر ۵ میں मौज کی جگہ मौज ہونا چاہئے۔ ناظرین درست فرمائیں۔



بچوں کے سوکھا روگ کی تیر بہدف اکسیری دوا

یوں تو دنیا میں ہزاروں بیماریاں ہیں مگر یہ ظالم دشمن جان سوکھا [illegible] جس کو سوکھا روگ بھی کہتے ہیں بہت بری بلا ہے۔ اس نے لاکھوں ماؤں کی گودیں خالی کر دیں۔ [illegible] نے خاک میں ملا دیا۔ اس بیماری کا حال ان غمزدہ دکھیاری ماؤں سے پوچھیے جن کے پیارے بچے سوکھا روگ [illegible] چہرے دلوں کو داغ دے جاتے ہیں۔ سوکھا روگ کے واسطے ماں باپ طرح طرح کے کام کرتے [illegible] سر کی رگ سے خون نکلواتے ہیں۔ پیٹھ پر پان میں دوا ڈال کر کشتہ نکلواتے ہیں۔ گلے [illegible] ہیں۔ جھاڑ پھونک کرواتے ہیں۔ گلے میں گنڈے ڈلواتے ہیں۔ لال تیل اور لال تیل ملواتے ہیں اور [illegible] سے لوگوں کو سوکھا روگ کی پہچان نہیں ہوتی اور نا واقفیت سے طرح طرح کے علاج و تدابیر کے با وجود [illegible] جاتا ہے اس لئے اس مرض کی عمومی علامات درج ذیل کی جاتی ہیں تاکہ تشخیص مرض میں آسانی [illegible] جائیں فوراً روغن سوکھا استعمال کرکے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یہ مرض عام طور سے پیٹ کے [illegible] میں رفتہ رفتہ پکڑتا ہے اور اس کے مہینے تک رہتا ہے اس عرصے میں لاکھوں بچے اس مرض کا شکار [illegible] بدن سست رہتا ہے بھارت قائم ہو جاتی ہے آنکھیں ہر وقت ڈھال [illegible] مرض کا [illegible] بچہ سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے۔ آخر بالکل بگڑ جاتا ہے [illegible] بچہ رہتا نہیں۔ بچے کے ہاتھ پاؤں اور گردن کی [illegible] چڑھ جاتی ہے اور پیٹ بڑھ جاتا ہے [illegible]

[illegible]

سیرِ کائنات

یہ کتاب نامور سائنس داں سر جیمس جینس کی مشہور و معروف کتاب

THROUGH SPACE AND TIME.

کا ترجمہ ہے، جس میں زمین۔ ہوا۔ آسمان۔ ماہتاب۔ آفتاب۔ سیاروں اور ستاروں وغیرہ پر نہایت بسط و تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ طرز تحریر نہایت دلچسپ اور سادہ ہے، اور ترجمہ میں اصطلاحات سے حتی الوسع اجتناب کیا گیا ہے۔ اس لئے خواص کے علاوہ عوام بھی بغیر کسی دقت کے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں

لیتھو کے متعدد نقشوں اور تصویروں کے علاوہ ہاف ٹون کی ستائیس تصویریں بھی شامل ہیں، جن سے کتاب کی افادی حیثیت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔

کتابت و طباعت عمدہ۔ جلد مضبوط اور گرد پوش خوبصورت قیمت ۲؎ ۱۲؍

مکتبہ جامعہ

دہلی نئی دہلی لکھنؤ بمبئی

پرنٹر خواجہ عبدالمجید استقلالی پریس کانپور
پبلشر: کلیان داس سکسینہ بی اے
... ایم اے